URDU KHUDNAWISHT PAR TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT

A thesis submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

In Urdu

Submitted

By

RUSHDA SHAHEEN

Reg. No. 17HUPH03

Supervisor

Dr. RAFIA BEGUM

Assistant Professor

Department of Urdu,
School of Humanities,
University of Hyderabad,
Hyderabad
Telangana, India – 500046

July 2022

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE
राष्ट्रीय अपेक्षाएँ, वैश्विक मानक
National Needs, Global Standards

اردو خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

جولائی 2022

مقالہ نگار

رشدہ شاہین

اندراج نمبر: 17HUPH03

نگراں

ڈاکٹر رفیعہ بیگم

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول آف ہیومینٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد 500046

تلنگانہ، انڈیا

University of Hyderabad

(A Central University by an Act of the Parliament)

Department of Urdu

School of Humanities

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE
राष्ट्रीय अपेक्षाएँ, वैश्विक मानक
National Needs, Global Standards

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"URDU KHUDNAWISHT PAR TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT"** submitted by **RUSHDA SHAHEEN** bearing Enrolment Number **17HUPH03** in partial fulfillment of the requirements for award of **Doctor of Philosophy** in the School of Humanities, Department of Urdu is bonafide work carried out by her under my supervision and guidance.

The thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or full to this or any other university or institution for award of any degree or diploma.

Papers related to this thesis have been –

A. Published in the following publications:

1. **"Khawateen ki Khudnawishton Main Hindustani Shinakht Ki Akkasi"** in Monthly *Khawateen Duniya,* NCPUL, New Dehli, Vol. 6, Issue: 6, Pages 24-29, May 2022. (ISSN: 2581-4826)
2. **"Aazadi Hind Ka Mard-E-Mujahid: Hasrat Muhani"** in International Refereed Journal for Urdu Literature, Malegaon, Maharashtra, Vol. VIII, Special Issue, Pages 184 to 190, February 2020 (ISSN: 2320-5396)

B.Presented at the following Conferences:

1. Three Days International Seminar on *"Indian Religion, Philosophy & Literature"* organised by Banaras Hindu University, Varanasi UP, and presented a paper entitled **"Warood-E-Masood Main Mazhabi Wa Saqafati Pahlu"**. Dated 25 to 26 Feb 2019.
2. Two days National Seminar on *"Urdu Prose Genres"* organised by Govt. Degree College (W) Hussaini Alam, Hyderabad, and presented a paper entitled **"Khudnawisht Ki Tareef -O- Fun"**. Dated 18 to 19 March 2021.

Further, the student has passed the following courses towards the fulfilment of coursework required for PhD

S.No.	Course Code	Course Title	Credits	Result
01	HU701	Research Methodology	4	Pass
02	HU702	Practical Criticism	4	Pass
03	HU721	Textual Criticism	4	Pass

Supervisor **Head of the Department** **Dean School of Humanities**

University of Hyderabad

(A Central University by an Act of the Parliament)

Department of Urdu

School of Humanities

DECLARATION

I, **RUSHDA SHAHEEN,** hereby declare that the research embodied in the present thesis entitled **"URDU KHUDNAWISHT PAR TAQSEEM-E-HIND KE ASRAAT"** submitted by me under the supervision of **Dr. RAFIA BEGUM** is bonafide research work for the award of **Doctor of Philosophy** in **Urdu** from the **University of Hyderabad**. I also declare to the best of my knowledge that it has not been submitted in part or full to this or any other university or institution for the award of any degree or diploma. I hereby declare that my thesis can be deposited in Shodhganga/INFLIBNET.

Place: Hyderabad **RUSHDA SHAHEEN**

Date: **Signature of the Student**

Reg. No. 17HUPH03

﴿فہرست﴾

☆ پیش لفظ 2

☆ باب اول : اردو خودنوشت کا آغاز وارتقا، فن اور تکنیک 11

☆ باب دوم : تقسیم ہند کا تاریخی وسیاسی پس منظر اور اس کے اثرات 58

☆ باب سوم : اردو خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات 109

☆ باب چہارم : ترجمہ شدہ خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات 380

☆ ماحصل 459

☆ کتابیات 473

پیش لفظ

پیش لفظ

انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے اور آہستہ آہستہ اپنی طاقت میں اضافہ کر کے پورے ملک پر قابض ہو گئے۔ پہلے اپنے تجارتی مفادات کے لیے کوٹھیوں کو قلعہ بند کرنا شروع کیا اور پھر اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے ہندوستان کے سیاسی حالات میں نہ صرف مداخلت کرنی شروع کی بلکہ یہاں کے راجاؤں، نوابوں، زمینداروں وغیرہ کو آپسی اختلافات و تنازعات میں الجھائے رکھنے میں جُٹ گئے۔ بالآخر ان راجاؤں مہاراجاؤں کو آپس میں لڑا کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط اُس وقت مضبوط ہوا جب انہوں نے پلاسی کی لڑائی (1757) میں سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ جمایا۔ اس کے بعد بکسر کی لڑائی (1764) کے بعد تو تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں ان کا قبضہ ہو گیا۔ بعد ازاں جنوبی ہند میں انگریزوں نے فوج کشی شروع کی اور میسور کے سلطان کو ہرا کر وہاں بھی قابض ہو گئے۔ انہوں نے میسور اور بنگال کے حکمرانوں کو پسپا کرنے کے بعد نظام اور مرہٹوں پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا۔

انگریزوں کے ظلم و ستم اور استحصال و استبداد سے جب ہندوستانی عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو مختلف بغاوتیں اور تحریکیں منصۂ شہود پر ابھر آئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے، بے شمار مضروب ہوئے، کروڑوں روپے مالیت کا اثاثہ برباد ہوا۔ طویل جدوجہد کے بعد ملک آزاد تو ہوا لیکن دو ٹکڑوں میں۔ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ انسانی تاریخ کا یہ بڑا المیہ ہے کہ ایک ملک کو طویل جدوجہد کے بعد آزادی تو ملی لیکن اس کی خوشیاں نصیب نہ ہوئیں۔ یہ آزادی محض وحشت اور بربریت لے کر آئی جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بقول فیض احمد فیضؔ

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

صبح آزادی کا انتظار کرنے والے لوگ ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ آزادی کے بعد ہر طرح کے ظلم و ستم، غریبی، بھوک و افلاس، استحصال وغیرہ سے نجات مل جائے گی۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی، وہ آج بھی مختلف صورتوں میں دیکھنے کو مل رہی ہے جس میں تب سے لے کر اب

تک محض مظلوم اور بے گناہ ہی جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔ مابعد تقسیم سارے رشتے اور ساری محبتیں فسادات کی نذر ہو گئیں۔ وہ تمام روایتیں جو برسوں سے ہندوستان کا خاصہ تھیں روند ڈالی گئیں۔ ان سب سے لوگوں کو شدید ذہنی جھٹکے لگے، پورے معاشرے میں بے چینی اور مایوسی پھیل گئی، خوف اور دہشت نے مستقل طور پر لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

تقسیم ملک کے نتیجے میں لوگوں کی زندگی کا ہر ایک پہلو اثر انداز ہوا اس لیے فطری طور پر ہمارا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ سماج کا حساس ادیب ان سب تبدیلیوں میں اپنے تجربات و احساسات کو کیسے پیش نہیں کرتا۔ چناں چہ ادب کی تمام اصناف میں تقسیم ہند اور اس کے اثرات کا برملا ذکر مختلف صورتوں میں مل جاتا ہے۔ مختلف زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں نے اس موضوع پر نظم و نثر کی صورت میں اپنی تخلیقات کو پیش کیا ہے۔ خودنوشت بھی تخلیقی ادب کی ایک صنف ہے لہٰذا اس میں بھی تقسیم ہند کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنے ماضی سے جڑے حالات و واقعات کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں یادوں کا ایک سلسلہ نغمہ زن ہوتا ہے جو اس کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اپنی زندگی سے متعلق یادوں و واقعوں کو اپنے دوستوں یا احباب کو بتانے کی خواہش بھی کہیں نہ کہیں انسان میں ضرور ہوتی ہے۔ کچھ لوگ زبانی اپنے حالاتِ زندگی سے واقف کراتے ہیں تو کچھ لوگ اس کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر آنے والی نسلوں کے لیے یادگار چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی تحریر کو خودنوشت کا نام دیا گیا ہے۔ خودنوشت میں مصنف اپنی خوبیوں، خامیوں، خوشیوں، غموں اور دیگر احساسات و محسوسات میں دوسروں کو اس طور پر شامل کر لیتا ہے کہ زندگی کے تمام حالات و واقعات سامنے آجاتے ہیں۔ ان حالات میں اس دور کے مختلف سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی، مذہبی، تاریخی، ادبی، اخلاقی اور جمالیاتی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آگے چل کر یہ تحریریں اس قدر کارآمد ثابت ہوتی ہیں کہ ان کے توسط سے اس شخص کے عہد و سماج اور دیگر حالات و واقعات کا باریک بینی سے محاکمہ کیا جا سکتا ہے۔

1857ء کے بعد بدلے ہوئے حالات میں جہاں اردو کے ادیبوں نے دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی وہیں وہ خودنوشت کی جانب بھی متوجہ ہوئے۔ اس طرح اردو خودنوشت کا باقاعدہ آغاز 1857 کے بعد ہوا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جعفر تھانیسری نے ''کالا پانی'' لکھ کر اردو میں باقاعدہ خودنوشت نگاری کا آغاز کیا۔ آہستہ آہستہ یہ روایت پروان چڑھی اور ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گئی۔

سیاسی نوعیت کی خودنوشتوں کا جہاں تک سوال ہے تو اردو ادب میں ان کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس قسم کی

خودنوشتوں میں تقسیم ہند کے محرکات و سانحات کا ذکر کسی میں تفصیل سے تو کسی میں اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔لیکن اس حوالے سے اب تک کوئی کتاب یا خاطر خواہ تحقیقی کام میری نظر سے نہیں گزرا۔البتہ چند مضامین مجھے ضرور ملے جن میں خواتین کی خودنوشتوں یا مخصوص افراد کی خودنوشتوں کو موضوع بحث بنا کر تقسیم ہند کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا جائزہ لیا گیا ہے۔حالاں کہ اردو خودنوشت کے تنقیدی جائزے پر کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔لیکن ان میں تقسیم ہند سے پہلے یا بعد میں ہونے والے حالات و واقعات کا ذکر ضمنی طور پر آیا ہے۔شاعری اور فکشن پر تقسیم ہند کے اثرات کے جائزے پر مشتمل متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔چناں چہ میری نظر خودنوشت کی جانب مبذول ہوئی۔اس صنف میں جس چیز کو سب سے زیادہ اولیت دی گئی وہ 'صداقت' ہے۔اس لیے خودنوشت میں ہندوستان کے ایک خاص عہد کے سیاسی حالات کے تذکرے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیوں کہ خودنوشت نگاروں نے آزادی کی جدوجہد اور تقسیم کے بعد ہونے والے واقعات کو جوں کا توں پیش کیا ہے۔فرق اتنا ہے کہ کسی نے تفصیل سے تو کسی نے اختصار سے کام لیا ہے۔میں نے محسوس کیا کہ کیوں نہ اس حوالے سے تحقیقی کام کیا جائے جس میں تقسیم کے محرکات کے ساتھ اس کے اثرات کا جائزہ بھی شامل مقالہ ہو۔

پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کے بعد میں نے اپنی نگراں سے اردو خودنوشت اور تقسیم ہند کے متعلق دلچسپی کا اظہار کیا۔انہوں نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی۔چوں کہ اس موضوع پر خصوصاً خودنوشت کے حوالے سے کوئی جامع کام نہیں ہوا ہے۔اس لیے میں نے پی ایچ ڈی کے لیے اس موضوع کو ریسرچ کمیٹی کے سامنے رکھا۔اس طرح میری نگراں اور دیگر اساتذہ کرام کی منظوری سے میرے پی ایچ ڈی کا موضوع ''اردو خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات'' طے پایا۔

موضوع کے تعین کے بعد میرے لیے مواد کی دستیابی کا مسئلہ درپیش ہوا۔اس سلسلے میں یونیورسٹی آف حیدرآباد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ کے علاوہ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، ادارہ ادبیات اردو اور اردو اکادمی (حیدرآباد) کی لائبریریوں میں تلاش و جستجو کے بعد چند خودنوشتیں میسر ہوئیں۔اس کے علاوہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریریوں سے بھی مواد حاصل کرنے کی کوشش کی۔میں یہاں یہ اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ بیشتر خودنوشتیں مجھے اردو کی سب سے بڑی ویب سائٹ 'ریختہ ڈاٹ آرگ' سے حاصل ہوئیں۔اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اپنے تحقیق سے متعلق 70 فیصد مواد اسی ویب سائٹ سے ملا تو بے جا نہ ہوگا۔مواد حاصل کرنے میں مختلف پبلشرز سے بھی کافی مدد ملی مثلاً عرشیہ پبلی کیشنز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ھدیٰ پبلی کیشنز، دکن

ٹریڈرس، این سی پی یو ایل، مکتبہ دانش، کتاب دار، کتابی دنیا، مکتبہ جامعہ، خدا بخش اورینٹل لائبریری وغیرہ جہاں سے وقتاً فوقتاً اردو خودنوشتیں شائع ہوتی رہی ہیں۔

تحقیق کے اس کام کا صحیح طور پر احاطہ کرنے کے لیے میں نے مقالے کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول **''اردو خودنوشت کا آغاز وارتقا، فن اور تکنیک''** ہے۔ اس میں ابتدا سے تا حال مختصر تعارف کے ساتھ اردو خودنوشت کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد خودنوشت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے اس کے فن وتکنیک کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم خودنوشت کے لیے رائج اصطلاحوں، ناقدین ادب کی تعریفوں، خودنوشت کی خصوصیتوں، اصولوں اور ضابطوں پر زیر بحث کرتے ہوئے خودنوشت کے فن کو سمجھنے اور عام مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ہیئت وموضوع کے لحاظ سے خودنوشت کی اقسام، اس سے قریب ترین غیر افسانوی ادب کی دیگر اصناف کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کا دوسرا باب **''تقسیم ہند کا تاریخی وسیاسی پس منظر اور اس کے اثرات''** پر مبنی ہے۔ جس میں تفصیل کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی وتاریخی پس منظر، انگریزوں کی آمد، ان کی چالاکیوں، پھوٹ ڈالو اور راج کرو سمیت مختلف پالیسیوں، ہندوستانیوں پر کیے گئے ان کے ظلم وستم، حصول آزادی کے لیے کی گئی جدوجہد، مختلف لڑائیوں، بغاوتوں اور تحریکوں وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انگریزوں کے ذریعے بنائے گئے چند قوانین یا مشن جن کو ہندوستانی سیاست میں کافی اہمیت حاصل ہے، ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ملک میں کانگریس ومسلم لیگ کے قیام، تحریک آزادی میں ان کے کردار، دونوں پارٹیوں کے درمیان تقسیم ہند اور دیگر معاملات پر اختلافات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی آزادی سے پہلے ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑھتی فرقہ پرستی، تقسیم ہند کے وجوہات اور آزادی کے بعد ہونے والے خوں ریز فسادات، آبادیوں کی منتقلی، اغوا شدہ عورتوں کے مسائل اور ان کی بازیابی، ہندوستان کے مختلف ریاستوں کے الحاق اور اس کی وجہ سے ہونے والے تنازعات، شرنارتھیوں ومہاجروں کی مشکلات کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں **''اردو خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات''** کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالے میں ان ہی خودنوشتوں کو شامل کیا گیا ہے، جو 1947 کے بعد شائع ہوئیں اور جس میں انگریزوں کے ظلم وستم، آزادی کی جدوجہد، تقسیم ہند اور اس کے اثرات کا ذکر ہوا ہے۔ اس باب میں خودنوشتوں کی زمانی ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جن خودنوشتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے ان میں سرگزشت (عبدالمجید سالک)، مشاہدات (ہوش بلگرامی)، ناقابل فراموش (دیوان سنگھ

مفتوں)، یادوں کی برات (جوشؔ ملیح آبادی)، لاہور کا جو ذکر کیا (گوپال متل)، آزادی کی چھاؤں میں (بیگم انیس قدوائی)، کیا دن تھے (قاضی جلیل عباسی)، گردراہ (اختر حسین رائے پوری)، شہاب نامہ (قدرت اللہ شہاب)، خواب باقی ہیں (آل احمد سرور)، آشرم (شکیل الرحمٰن)، جو رہی سو بے خبری رہی (ادا جعفریؔ)، میں کیا میری حیات کیا (اطہر صدیقی)، نوائے زندگی (ساجدہ زیدی)، بیتے ہوئے دن (رتن سنگھ)، پردہ کھلتا ہے (حبیب تنویر)، دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (جتیندر بلو)، افسانہ در افسانہ (شان الحق حقی)۔

مذکورہ باب میں ہی چند خودنوشتوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ان میں خاطرات (ظفر حسن ایبک)، میرے گزشتہ شب و روز (جگن ناتھ آزاد)، سحر ہونے تک (آغا جانی کاشمیری)، لطیف کی کہانی (عبداللطیف بجنوری)، یادایام (نواب احمد خاں چھتاری)، اپنی تلاش میں (کلیم الدین احمد)، آپ بیتی (عبدالماجد دریابادی)، آئینہ ایام (کرنل غلام سرور)، یادوں کا جشن (مہندر سنگھ بیدی)، سلسلہ روز و شب (صالحہ عابد حسین)، آتش چنار (شیخ عبداللہ)، شام کی منڈیر سے (وزیر آغا)، بمبئی کی بزم آرائیاں (رفعت سروش)، داستان میری (اقبال حسین)، ابھی سن لو مجھ سے (کلیم عاجز)، شورش دوراں (حمیدہ سالم)، گئو دھول (سید محمد عقیل)، بری عورت کی کتھا (کشور ناہید)، ڈگر سے ہٹ کر (سیدہ بانو احمد)، ہجرتوں کے سلسلے (محمد لطف اللہ خاں)، اس آباد خرابے میں (اختر الایمان)، منزلیں گرد کی مانند (خلیق ابراہیم خلیق)، چراغوں کا دھواں (انتظار حسین)، تمنائے بے تاب (رشید امجد)، پردے سے پارلیمنٹ تک (شائستہ سہروردی)، رقص شرر (ملک زادہ منظور)، دیواروں کے بیچ (ندا فاضلی) وغیرہ شامل ہیں۔

علاوہ ازیں باب سوم میں ہی کچھ خودنوشتوں کے محض نام شامل کیے گئے ہیں جن میں جدوجہد آزادی و تقسیم سے متعلق خودنوشت نگاروں نے اپنے تجربات کی بنا پر رائے پیش کی ہے۔

مقالے کا چوتھا باب **''ترجمہ شدہ خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات''** کے جائزے پر مشتمل ہے۔جس میں مختلف زبانوں مثلاً پنجابی، ہندی، انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی خودنوشتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ان کے نام کچھ اس طرح ہیں، آزادی ہند (مولانا ابوالکلام آزاد)، اپنی کہانی (راجندر پرساد)، رسیدی ٹکٹ (امرتا پریتم)، سچ، محبت اور ذرا سا کینہ (خوشونت سنگھ)۔

حاصل مطالعہ میں گزشتہ چار ابواب کا مجموعی طور پر جائزہ پیش کرتے ہوئے تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ قاری کو اس کے مطالعے سے مقالے کا اجمالی خاکہ ذہن نشین ہو جائے۔ساتھ ہی خودنوشت نگاروں کے ذریعے بیان کیے گئے حالات و واقعات کے تضاد یا مماثلت کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔اسی طرح

تقسیم ہند کے سلسلے میں مختلف خودنوشت نگاروں کے نقطہ نظر کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

مقالے کے آخر میں **کتابیات** پیش کی گئی ہے۔ جس میں کتابیات کے اصولوں کے مطابق ان تمام بنیادی اور ثانوی ماخذ کو درج کیا گیا ہے جو مقالے کی تکمیل میں براہ راست یا بالواسطہ معاون ثابت ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی رسائل وجرائد، اخبارات اور دوسرے ذرائع جن سے راقمہ نے استفادہ حاصل کیا ہے ان کی بھی فہرست شامل مقالہ ہے۔

پی ایچ ڈی کا یہ دورانیہ کسی پُر خار راستے سے کم نہ تھا۔ گرچہ بے شمار مشکلات نے جہاں میرے حوصلوں کو پست اور متزلزل کیا وہیں اللہ رب العزت اور اس کی بے شمار رحمتوں نے حوصلہ دیا۔ جب جب میرے قدم ڈگمگائے تب تب اس غفور الرحیم اور اس کے مخلص بندوں نے سہارا دیا۔ اس کی رحمتیں اور کرم نوازیاں شاملِ زندگی نہیں رہتیں تو میرا ثابت قدم رہنا محال تھا۔ میں اپنے عظیم رب کی بے حد شکر گزار ہوں جس کی نوازشوں اور عنایتوں کی بدولت میرا یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

میں جانتی ہوں میرے چند رسمی کلمات ان لوگوں کا حق ادا نہیں کر پائیں گے جنہوں نے اس مقالے کی ترتیب وتنظیم میں میری بھرپور مدد کی۔ تاہم شکریے کے فرائض میں صدر شعبہ اردو پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صاحب کی ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں مفید و بصیرت آمیز مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ ان کی نرم گفتاری نے مجھے بھی ان سے بلا جھجک ادبی مسائل پر بات چیت کرنے اور مشورہ لینے کا مشفقانہ حوصلہ عطا کیا۔

میں اپنی مشفقہ نگراں ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کی بے حد شکر گزار ہوں جن کی شفقت اور رہنمائی نے تحقیق وتنقید کے تمام مراحل کو آسان کر دیا۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میرے اس مقالے کو لفظ بہ لفظ پڑھ کر حسب ضرورت زبان کی نوک پلک درست کی۔ انہوں نے خلوص ومحبت سے ہر مشکل مرحلے پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان گزرے سالوں میں کبھی کبھی ان کی مہربانیاں اتنی زیادہ ہو جاتیں کہ مجھے ان میں اپنی ماں کا عکس نظر آنے لگتا۔ حالاں کہ ان کی محبتوں اور تعاون کا شکریہ لفظوں میں ادا کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ انہیں شادمانیوں و کامرانیوں سے ہمکنار کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو کرے۔ (آمین یارب العالمین)

علاوہ ازیں اپنے ڈی آر سی ممبران (ڈاکٹر اے آر منظر اور ڈاکٹر محمد کاشف صاحب) اور شعبہ کے تمام اساتذہ کرام کی بھی بے حد ممنون ومشکور ہوں جو تحقیق کے دوران بالخصوص ڈاکٹوریل میٹنگ میں اپنے نیک اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ ان کی بھی شفقتیں ومحبتیں میرے ساتھ رہیں۔ ساتھ ہی میں ان تمام کتب خانوں کے عملہ کی بھی

شکر گزار ہوں جن سے میں نے استفادہ حاصل کیا۔

شکریے کی رسم میں گھر والوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتی ہوں جن کی نیک دعائیں اور تمنائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ والدین نے اگر خواب نہ دیکھا ہوتا تو میں اس مقام پر شاید نہ پہنچ پاتی۔ والدین (محترم ظل الرحمٰن و محترمہ پروین بانو) کی دعاؤں، گھر کی بزرگ ہستیوں جن میں نانی (محترمہ صالحہ خاتوں)، بڑے ابو (محترم ابوالکلام)، بڑی امی (محترمہ عنیزہ خاتون) وغیرہ شامل ہیں، ان کی شفقتوں، چھوٹے بھائیوں (صفوان و ریان) اور چھوٹی بہنوں (شبستاں، شغف و اریبہ) کی بے شمار محبتوں نے مجھے ہر موڑ اور ہر مقام پر سہارا دیا۔ ہر مشکل وقت میں ان کی حوصلہ افزائی سے میرا عزم و استقلال مزید مستحکم ہوتا گیا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ان سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین ثم آمین)

میں آج جب اس مقام پر پہنچ کر گھر والوں کو یاد کرتے ہوئے یہ سطور رقم کر رہی ہوں تو نانا مرحوم کی یادیں دل کو تڑپا رہی ہیں۔ میری زندگی کا وہ شخص جو مجھے ڈاکٹر بنتے اور سب سے بڑھ کر جنہوں نے اس تحقیقی مقالے کے مطالعے کی خواہش کی تھی۔ آج میرے ساتھ نہیں ہیں۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ دکھ رہے گا کہ جس دن میرا پی ایچ ڈی میں داخلہ ہوا اسی دن یعنی 4 اگست 2017 بروز جمعہ بوقت شام ان کا انتقال ہو گیا۔ مشیت ایزدی دیکھئے کہ میرے داخلے کا بھی انہیں علم نہ ہو سکا۔ ان کی خواہش تو آج پوری ہو رہی ہے لیکن وہ آنکھیں ہی نہیں ہیں جو اس تحقیقی کام کو دیکھ سکیں، وہ ہاتھ ہی نہیں ہیں جو خوشی کے مارے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین یا رب العالمین)۔ نانا کی یادیں، باتیں اور نصیحتیں تا عمر میرے ساتھ رہیں گی۔ جنہوں نے بچپن میں آزادی اور اس کی جدوجہد کی کہانیاں متعدد بار سنائیں اور شاید وہیں سے میری جستجو رہی کہ اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کروں۔ ان ہی کوششوں اور جستجو کا نتیجہ یہ مقالہ ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر صحافی محمد افضل بٹ صاحب اور نوجوان مصنف محمد اشرف لون صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے مقالے کی پروف ریڈنگ میں میری بھرپور مدد کی۔ اللہ ان کو اس خلوص اور محبت کا اجر دے۔ (آمین) ساتھ ہی ساتھ میں اپنے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ریسرچ کے دوران ان کی مدد اور نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ ان سب کے علاوہ 'ریختہ ڈاٹ آرگ'، جو میں سمجھتی ہوں کہ اردو دنیا کی سب سے بڑی آن لائن ویب سائٹ ہے۔ جس سے مجھے زائد از پچاس فیصد خودنوشتیں دستیاب ہو گئیں۔ ساتھ ہی مختلف کتابیں اور پرانے رسالوں کی کاپیاں بھی مل گئیں جو مجھے تلاش بسیار کے باوجود بھی نہ مل پاتیں۔ آن لائن لیپ ٹاپ اور موبائل سے ضخیم

خودنوشوں و کتابوں کا مطالعہ ایک پیچیدہ عمل تھا بلکہ اس نے آنکھوں پر بھی برا اثر ڈالا۔ میں دل سے ریختہ کے بانی محترم سنجیو صراف صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں جن کی اردو دوستی اور بے لوث خدمات نے ایک اسکالر کے تحقیقی کام میں کافی مدد دی۔ پرانے رسالوں واخباروں کی پرنٹ کاپیوں، نایاب خودنوشتوں اور کتابوں کا مذکورہ سائٹ پر ملنا ہم جیسے تشنہ لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔

میں ان تمام لوگوں کی خدمت میں بھی ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں جنہوں نے ہر طرح سے میرا تعاون کیا۔ میں فرداً فرداً یہاں ذکر نہیں کر سکتی لیکن میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے تمام معاونین کو صحت و عافیت کے ساتھ ساتھ کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ (آمین)۔ ان ہی الفاظ کے ساتھ یہ مقالہ ممتحن حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔

شکریہ!

رشدہ شاھین

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد 500046

﴿باب اول﴾

اردو خودنوشت کا آغاز وارتقا، فن اور تکنیک

اردو خودنوشت کا آغاز وارتقا فن اور تکنیک

☆ اردو خودنوشت کا آغاز وارتقا:

خالق کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات کے تاج سے سرفراز کر کے روئے زمین پر بھیجا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت کی دہلیز پر قدم رکھنے تک کے سفر کے دوران انسان متنوع ارتقائی منازل ومراحل طے کرتا ہے اور اپنی حیات کے دوران وہ مختلف نشیب وفراز کے ادوار سے بھی گزرتا ہے۔ کبھی وہ مسرور ہوتا ہے تو کبھی مغموم، کبھی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہے تو کبھی تنزلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہر انسان فطرت کے زیر اثر اپنے ماضی سے جڑے حالات وواقعات کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں بہت ساری یادیں ڈیرہ زن ہوتی ہیں جو اس کے دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات وجود میں آتے ہیں جن کو وہ بھلا نہیں پاتا، ان واقعات کے کچھ حصے اپنے عزیز واقارب کے درمیان بیان کرتا رہتا ہے۔ دراصل خالق کائنات نے انسانی سرشت میں انکشافِ ذات کے رجحان کو ہمیشہ غالب رکھا ہے اور روزِ ازل ہی سے انسان اپنی شخصیت میں خوابیدہ اوصاف کو اجاگر کرنے کا خواہش مند رہا ہے۔ اپنی ذات سے ہٹ کر کسی دوسرے کو اپنی زندگی میں محسوس کرنا اور اسے اپنے ذاتی تجربات میں شریک کرنے کا شوق ہمیشہ سے اس کی جبلّت کا حصہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت لکھنے کا رواج زمانۂ قدیم سے شروع ہوا اور آج تک جاری وساری ہے۔ یہ انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مشکلات ومسائل اور آسائشوں وتجربات کو اپنے خاص حلقہ احباب کے سامنے بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی رودادِ زندگی کو لوگوں کے سامنے پیش ہی کرے، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دل میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کے حالات وواقعات کا لوگوں کو پتہ چلے۔ اب یہ اس شخص پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے حالات وواقعات کس طرح عوام الناس کے سامنے پیش کرے۔ کچھ لوگ زبانی اپنے حالاتِ زندگی سے واقف کراتے ہیں تو کچھ لوگ اپنی رودادِ زندگی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر آنے والی نسلوں کے لیے یادگار چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی تحریر کو خودنوشت کا نام دیا گیا ہے۔

خودنوشت کی ابتدا کا ثبوت مہیا کرنا دشوار ہے۔ کیوں کہ مختلف صورتوں میں اسے لکھنے کا رواج زمانۂ قدیم سے ہی شروع ہوا جو ایک صنف کی حیثیت سے آج تک جاری وساری ہے۔ گویا خودنوشت کا آغاز وارتقا اور تاریخ

صدیوں پر محیط ہے۔ بقول علم الدین سالک:

''آپ بیتی اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ انسان خود۔ اس کا آغاز انسان کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ زمانے کی گردش نے آپ بیتیوں کے نام و نشان مٹا دیے۔ تاہم بعض زبانوں میں آج سے ہزار سال پہلے کی لکھی ہوئی آپ بیتیاں موجود ہیں۔''1

اردو کی دیگر اصناف ادب کی طرح خودنوشت بھی ایسی صنف ہے جو اٹھارہویں صدی میں براہِ راست انگریزی ادب سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ لیکن فارسی ادب میں اس کی روایت کافی مضبوط اور معتبر انداز میں موجود تھی۔ جس میں علماء، صوفیا، امرا اور شعرا کے ایسے تذکرے موجود ہیں جن میں بعض جگہ آپ بیتی کے طور پر کچھ حالات قلم بند کر دیے گئے ہیں اگر ان کو ایک جگہ مرتب کر دیا جائے تو ان کا شمار خودنوشت کے زمرے میں کیا جا سکتا ہے۔ خودنوشت نگاری کی جھلکیاں ہزاروں سال پہلے ویدوں سے لے کر ہرش و ردھن کے عہد تک تصنیف ہونے والی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خودنوشت کا رواج قدیم ہندوستان میں نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو ایک صنف کی حیثیت سے اس کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں تھا۔ یہ روایت مسلم حکمراں اپنے ساتھ لے کر آئے، چناں چہ باہر سے آنے والے حاکموں میں التمش، تیمور، اور بابر کے علاوہ جہانگیر نے بھی اپنی حالات زندگی قلم بند کیے ہیں۔ اس طرح خودنوشت نگاری کی روایت نے ہندوستانی ادب میں اپنے نقش اجاگر کرنے شروع کیے۔ اس میں خاص کر تزک بابری، فتوحات فیروز شاہی، جہانگیر نامہ، رقعات عالمگیری وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ لیکن یہ ساری تصانیف فارسی میں ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی میں باضابطہ طور پر خودنوشت لکھنے کا رواج اردو سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔

اردو خودنوشت جو آج اس قدر مقبول اور معتبر صنف ہے، شروع میں ہرگز ایسی نہ تھی۔ خودنوشت کے ہلکے نقوش زمانۂ قدیم کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ بقول علم الدین سالک:

''تاریخ کی ان تمام اصناف میں ہر مصنف نے تاریخ اور تذکروں کے آخر میں آپ بیتی کے طور پر اپنے تھوڑے بہت حالات لکھ دیے ہیں۔ اگر انہیں یکجا کر لیا جائے تو آپ بیتیوں کا ایک بیش بہا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔''2

اردو میں خودنوشت کے ابتدائی نقوش ہمیں صوفیائے کرام کے ملفوظات میں ملتے ہیں۔ تبلیغ دین کے سلسلے میں جب اولیا و صوفیا کرام عوام کو خطاب کرتے تھے تو ان کے کچھ مقربین ان خطابات کے اہم نکات کو درج کر لیا کرتے تھے اور پھر ان کی روشنی میں مسودات تیار کر لیتے تھے۔ پھر صوفیائے کرام کی تصدیق کے بعد ان ملفوظات کو عوام الناس

تک پہنچا دیا جاتا۔ یوں مختلف صوفیائے کرام کے ادوار میں تبلیغ دین کے حوالے سے کی گئی کاوشوں کے ثمرات آنے والے زمانوں تک منتقل ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ مختلف علمائے کرام کے خطوط میں بھی خودنوشت کے نقوش نظر آتے ہیں۔ ان خطوط میں بعض اولیائے کرام کے خطوط اس قدر تفصیل سے ہیں کہ انہیں سامنے رکھ کر اس دور کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ پرانے دور کے خطوط، تذکروں اور ملفوظات کے علاوہ قدیم شعرا کے کلام میں بھی خودنوشت کے ہلکے نقوش ملتے ہیں۔ جیسے دکن کی منظوم داستانوں وغیرہ میں شاعروں نے اپنے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کے تقریباً تمام قدیم اور جدید شاعروں اور ادیبوں نے اپنے سوانحی اشارے لکھے ہیں۔ لیکن ہم انہیں خودنوشت نہیں کہہ سکتے۔ اردو کے مشہور شاعر میر تقی میرؔ نے اپنی خودنوشت ''ذکرِ میر'' اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں لکھی تھی۔ یہ فارسی زبان میں ایک مشہور خودنوشت ہے جس کو پڑھے بغیر میرؔ کے کلام کی داخلی کیفیات کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذکر میر کو اردو خودنوشت میں شمار نہیں کر سکتے، لیکن پھر بھی اردو کے ایک عظیم شاعر کی خودنوشت ہونے کی وجہ سے اردو خودنوشت کے ارتقا میں اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ نواب واجد علی شاہ نے بھی ''پری خانہ'' کے نام سے اپنی خودنوشت فارسی زبان میں لکھی تھی۔ ان دونوں خودنوشتوں کا اردو ترجمہ و تلخیص نثار احمد فاروقی نے نہایت جانفشانی کے ساتھ کیا ہے۔

اس کے بعد طویل عرصے تک اس کام پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ اگرچہ خود دنوشت کے دھندلے دھندلے نقوش فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تالیفات کے دیباچوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن خودنوشت کا باقاعدہ آغاز 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا اور تمام محققین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ خودنوشت کو باقاعدہ صنف کی صورت میں مقبولیت انیسویں صدی کے اواخر میں حاصل ہوئی اور یوں بیسویں صدی میں یہ ایک مستند صنف کی حیثیت اختیار کر گئی۔

1857ء کی جنگِ آزادی کے فوراً بعد ہی مختلف لوگوں نے انگریزوں کے خلاف لڑی گئی جنگ کے اہم واقعات رقم کرنا شروع کر دیے تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ وہ تھے جنہوں نے جنگ میں جرأت و بہادری کے کارنامے اپنی یادداشتوں کی صورت میں لکھے۔ ان تحریروں میں چوں کہ مکمل حالاتِ زندگی کے بجائے مصنفین صرف اہم واقعات یا خدمات کا ذکر کرتے تھے لہٰذا انہیں جزوی طور پر خودنوشت کہا جاسکتا ہے۔

اردو میں دستیاب ہونے والی پہلی مطبوعہ تصنیف جو خودنوشت کی صفت رکھتی ہے اور مصنف کی زندگی کا تقریباً پورا احاطہ کرتی ہے، وہ جعفر تھانیسری کی تصنیف ''تواریخ عجیب (کالا پانی)'' ہے۔ یہ خودنوشت 1302ھ میں

منظر عام پر آئی۔ انگریز سرکار کے خلاف جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے نتیجے میں مولانا جعفر تھانیسری کو کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ وہ جدو جہد آزادی کے ایک نامور مجاہد تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے خلاف بات کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ ہر کوئی خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھتا تھا۔ لیکن سزا کاٹنے کے بعد جعفر تھانیسری نے اپنی خاموشی کو توڑا اور اپنی قید کے حالات و واقعات قلم بند کیے۔ اس خودنوشت میں جزائر انڈمان کے باشندوں کے رسم و رواج، مذہبی عقائد اور مختلف تہواروں کے حالات ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کالا پانی میں ایک طرف انگریزوں کے ظلم و بربریت کی داستان بیان کی گئی ہے، تو دوسری طرف وہابی تحریک کے کارنامے بھی ملتے ہیں۔ ان کی خودنوشت کے تانے بانے میں احیائے دین اور آزادی وطن کے عناصر ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو ان کا قلم انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف خوب چلا، تو دوسری طرف ان کی تحریر میں مختلف موقعوں پر تبلیغ دین اور احکام خداوندی پر چلنے کی تلقین بھی ملتی ہے۔ یہ خودنوشت اس لیے بھی اہم ہے کیوں کہ اس میں اس عہد کے جبر و ظلم کی تاریخ بھی ہے۔ اس پر آشوب دور میں اس مرد مجاہد نے اس کتاب کے ذریعہ ایک ایسا نقش چھوڑا ہے جو آنے والوں کے لیے مشعل راہ بن گیا ہے۔

کم و بیش اسی زمانے میں عبدالغفور نسّاخ نے اپنی خودنوشت ''سوانح عمری'' کے نام سے لکھی۔ جو طویل عرصے تک ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، کلکتہ میں غیر مطبوعہ شکل میں موجود تھی اور حال ہی میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس خودنوشت سوانح کے مطالعے سے نسّاخ کی شخصیت و سیرت پر روشنی ضرور پڑتی ہے، لیکن ان کی زندگی کے متعلق تفصیلی واقعات و حالاتِ زندگی کا پتہ نہیں چلتا ہے۔

جعفر تھانیسری اور عبدالغفور نسّاخ کی خودنوشتوں کو عموماً اردو کی اولین خودنوشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہاج الدین علوی لکھتے ہیں کہ:

> ''اردو میں سب سے پہلے شائع ہونے والی خودنوشت تواریخ عجیب 1302ھ میں منظر عام پر آئی۔''3

علم الدین سالک لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس قدر ملک ترقی کرتا گیا اس قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں۔ چناں چہ سب سے پہلی آپ بیتی جو اردو زبان میں لکھی گئی وہ مولانا جعفر کی 'کالا پانی' ہے۔''4

ڈاکٹر مظہر مہدی نے خودنوشت نگاری کی اولیت کا سہرا عبدالغفور نسّاخ کے سر پر باندھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اردو میں اب تک دستیاب خودنوشتوں میں عبدالغفور نساخ کی سوانح عمری کو اولیت حاصل ہے۔ اس کا سنہ تصنیف معلوم نہ ہوسکا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ 87-1886ء کے درمیان لکھی گئی ہوگی کیوں کہ اس میں 1885ء تک کے حالات درج ہیں۔''5

کم وبیش اسی زمانے میں نواب اکبر علی خاں کی بیٹی شہر بانو بیگم نے اپنی خودنوشت ''بیتی کہانی'' کے عنوان سے لکھی اور 1887 میں اسے دیباچے کے اضافے کے ساتھ کتابی شکل دے دی گئی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس خودنوشت کو از سرِ نو مرتب کر کے 1995 میں شائع کیا اور اسے اردو کی اولین نسوانی خودنوشت قرار دیا۔

بہر حال ان ہی خودنوشتوں کے ذریعے اردو میں خودنوشت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دھیرے دھیرے یہ صنف آگے بڑھی اور پروان چڑھتی رہی۔ چناں چہ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ظہیر دہلوی نے اپنی خودنوشت ''داستانِ غدر'' لکھی، جو 1910 میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، 1857 کے ہنگامے میں دہلی کی بربادی اور خصوصاً بادشاہ نیز امرا و شرفا کی بدحالی کی داستان قلم بند کی گئی ہے۔ اس خودنوشت میں ظہیر دہلوی نے لال قلعے کے زوال اور دہلی کی تہذیب کی خوبصورت منظر نگاری بھی کی ہے۔ اس کے بعد غوث علی شاہ قلندر کی خودنوشت ''تذکرۂ غوثیہ'' ہے۔ یہ کتاب تصوف کے رموز اور فقیروں کے تذکرہ سے پُر ہے۔ اس خودنوشت سے مذہبی خودنوشت کی روایت کو فروغ ملا۔

اس کے بعد اس صنف کی روایت آگے بڑھی اور ایک کے بعد ایک خودنوشت منظر عام پر آتی رہی۔ جو اردو کے غیر افسانوی ادب کے سرمایے میں مزید اضافہ کرتی رہیں۔

بیسویں صدی میں خودنوشت نگاروں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ اس صدی کے ابتدائی دور میں یعنی 1919 میں خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت ''آپ بیتی'' منظرِ عام پر آئی۔ اسی خودنوشت سے اردو خودنوشت کے لیے آپ بیتی کے نام کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کو خواجہ حسن نظامی نے ''عرفان ہستی کا بہی کھاتہ'' کہا ہے۔ اس خودنوشت سے مذہبی خودنوشتوں میں تحدیث نعمت اور عرفان ذات کا رنگ شامل ہوتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت مبلغانہ اور ناصحانہ انداز میں لکھی گئی ہے جو انہوں نے شاید اپنے مریدوں کی رہنمائی کے لیے لکھی تھی۔

اسی عہد میں مولانا ابوالکلام نے اپنی خودنوشت ''تذکرہ'' کے عنوان سے لکھوائی۔ جس میں انہوں نے نہ

صرف اپنی تجرباتی زندگی بلکہ اپنے خاندان اور آباواجداد کے کئی صدیوں کے تجربات کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ سیاسی آپ بیتیوں میں مولانا حسرت موہانی کی ''قیدِ فرنگ'' کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔مولانا نے بڑی جرأت اور سچائی سے کام لیتے ہوئے اپنے قید و بند کی روداد کو پیش کیا ہے۔چودھری افضل الحق کی خودنوشت ''میرا افسانہ'' کا شمار بھی اس دور کی سیاسی آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔

1942 میں سرسید رضا علی کی ضخیم خودنوشت ''اعمال نامہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔اس خودنوشت میں پہلی بار فن سوانح نگاری کو پیش نظر رکھا گیا۔اعمال نامہ سے اردو خودنوشت کے سرمایے میں پہلی بار مکمل حالاتِ زندگی اور ادبی و سیاسی نظریات کو پیش کرنے کا آغاز ہوتا ہے۔اس میں مصنف نے ملک کے سیاسی حالات ،لسانی جھگڑے،علی گڑھ کے تعلیمی نظام کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے اگر چہ دیکھا جائے تو یہ خودنوشت اپنی زندگی کے حالات وکوائف پر لکھی ہے مگر اپنے حالات سے کہیں زیادہ اس میں قومیت کا نقشہ پیش کیا ہے۔یہ خودنوشت ان کی ذاتی زندگی کا نقشہ ہی پیش نہیں کرتی بلکہ بہت سے علوم وفنون کی معلومات بھی فراہم کرتی ہے۔

اسی دور میں حکیم احمد شجاع نے تاثراتی انداز میں ''خوں بہا'' کے نام سے اپنی خودنوشت 1943 میں شائع کی۔اس میں مصنف نے اپنی پچاس سالہ زندگی کا احاطہ کیا ہے۔انہوں نے اپنے حالات کے علاوہ اس عہد کے اہم واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔1942 کے بعد اردو میں خودنوشت سوانح نگاری کی نشو نما اور ارتقا بتدریج ہونے لگتی ہے۔اسی دور کی وزیر سلطان بیگم جالندھری کی خودنوشت ''نیرنگیٔ بخت (میری اپنی کہانی)'' اور بملا کماری کی ''ایک ایکٹریس کی آپ بیتی'' کے نام قابل ذکر ہیں۔1943 میں چودھری افضل حق کی خودنوشت ''میرا افسانہ'' شائع ہوئی۔ اس میں ایک محبّ وطن کی قربانیوں اور انگریزوں کے ظلم وستم کو پیش کیا گیا ہے۔

1949 میں نواب سعید خاں چھتاری کی خودنوشت ''یادایام'' دو جلدوں میں منظر عام پر آئی۔اس میں مصنف نے اپنے ساٹھ سالہ زندگی کے اہم واقعات وحالات کو قلم بند کیا ہے۔مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خودنوشت ''نقش حیات'' کے نام سے 1952 میں شائع کی۔جس میں دیوبند کے علمائے کرام کا تذکرہ اور اس دور کے سیاسی حالات ملتے ہیں۔1955 میں عبدالمجید سالک کی خودنوشت ''سرگزشت'' شائع ہوئی۔مصنف نے اس میں صرف اپنی زندگی ہی کو نہیں بلکہ اس عہد کی سیاسی ،علمی وادبی رجحانات کا بھی بخوبی احاطہ کیا ہے۔1955 میں ہوش بلگرامی نے ''مشاہدات'' میں حیدرآباد کے سیاسی حالات کو موضوع بنایا ہے۔دیوان سنگھ مفتون نے ''ناقابل فراموش'' (1957) میں اپنے صحافتی تجربوں اور رجواڑوں کے مقدمات کو پیش کرنے کے ساتھ اس عہد کے سیاسی حالات کو بھی مؤثر انداز

میں بیان کیا ہے۔شاد عظیم آبادی کی خودنوشت ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' 1958 میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت ایک نئے انداز میں لکھی گئی ہے۔اس کا مسودہ تو شاد نے خود تیار کیا لیکن وہ اسے اپنے نام سے شائع نہیں کروانا چاہتے تھے۔ بقول صبیحہ انور:

> ''شاد عظیم آبادی کی آپ بیتی کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ شاید اردو کی تنہا آپ بیتی ہے، جس کا مصنف آپ بیتی کو اپنے بجائے دوسرے کے نام سے شائع کروانا چاہتا ہے۔اس خودنوشت کو شاد عظیم آبادی نے اپنے ایک شاگرد مسلم عظیم آبادی کے نام سے لکھا تھا اور اس کا عنوان 'کمال عمر' رکھا تھا۔ جسے شاد کی وفات کے بعد 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔''6

اس کے علاوہ 1964 میں ظفر حسن ایبک کی خودنوشت ''آپ بیتی''، آغا جان کاشمیری کی ''سحر ہونے تک''، 1965 میں عبدالغفار رمدھولی کی ''طالب علم کی کہانی''، جگن ناتھ آزاد کی خودنوشت ''میرے گزشتہ شب و روز''، 1965 میں ہی ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی ''میری دنیا''، 1967 میں عبدالطیف بجنوری کی ''لطیف کی کہانی''، چودھری خلیق الزماں کی Pathway to Pakistan کا اردو ترجمہ ''شاہراہ پاکستان''، ذوالفقار علی بخاری کی ''سر گزشت''، 1967 میں یوسف حسین خاں کی خودنوشت ''یادوں کی دنیا'' منظر عام پر آئیں۔اردو خودنوشت کی تاریخ میں یادوں کی دنیا کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ مصنف نے اس میں اپنے بیانات وغیرہ کو دلائل سے مستند بنانے کی بنیاد ڈالی ہے۔اس خودنوشت سے یوسف حسین خاں کی نہ صرف شخصیت، سیرت اور نفسیات سے پردہ اٹھتا ہے بلکہ ان کی دوسری تحریروں کے مطالعے میں بھی مدد ملتی ہے۔

شاعر شباب و انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کی خودنوشت 1970 میں ''یادوں کی برات'' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ اردو کی مقبول ترین خودنوشتوں میں سے ایک ہے۔ 780 صفحات پر مشتمل یہ خودنوشت پانچ حصوں پر محیط ہے۔ ہر حصے میں ذیلی عنوانات کے تحت مصنف نے اپنی داستان حیات قلم بند کی ہے۔ جوشؔ نے اس خودنوشت میں اپنی زندگی کے چار بنیادی میلانات شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی کا ذکر کیا ہے۔اس میں فن اور شخصیت کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ جوشؔ نے اپنی 75 سالہ زندگی کا احاطہ کیا ہے انہوں نے آغاز میں ہی اپنے حافظے کی کمزوری کا اعتراف کیا ہے۔اس خودنوشت سے مصنف کے عقائد اور مذہبی نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان سے ہجرت اور پاکستان جانے کے بعد ان کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا بیان انہوں نے بڑے ہی جذباتی اور اچھوتے

انداز میں پیش کیا ہے اس میں شاعرانہ انداز غالب ہے زبان صاف ستھری ہے۔ واقعات کا بیان ''یادوں کی برات'' کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس خودنوشت کے متعلق وہاج الدین علوی لکھتے ہیں:

> ''جوش ملیح آبادی نے یادوں کی برات (1970) تحریر کر کے اردو ادب میں تہلکہ مچا دیا۔ انہوں نے اردو خودنوشت میں بعض ایسے عناصر شامل کیے ہیں جو رُوسو کو زیب دیتے ہیں۔ اردو کا معاشرہ ان کا مشکل سے متحمل ہوسکتا ہے۔ بہر کیف اس خودنوشت سے ایک فائدہ پہنچا کہ اردو کے بہترین نقاد اس فن کی طرف توجہ دینے لگے۔''7

1970 میں سر محمد یامین خان کی ''نامۂ اعمال''، 1971 میں گوپال متل نے ''لاہور کا جو ذکر کیا'' میں لاہور کے علمی، ادبی شخصیتوں اور محفلوں کی تصویر کشی کی ہے۔ اسی سال محمد ظفر اللہ خاں کی ''تحدیث نعمت'' آئی، 1972 میں شورش کاشمیری نے اپنی خودنوشت ''بوئے گل، نالۂ دل، دودو چراغ محفل'' کے نام سے شائع کی، 1973 میں بیگم پاشا صوفی کی ''ہماری زندگی'' منظر عام پر آئی۔ خواجہ غلام السیدین نے اپنی خودنوشت ''مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زباں میں (1974)'' اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے جسے بعد میں ان کی بہن صالحہ عابد حسین نے مکمل کیا اور ''ذکرِ جمیل'' کے نام سے اس کا بقیہ حصہ شائع کیا۔ عتیق احمد صدیقی نے ''یادوں کے سائے میں (1974)'' میں 43-1942 کے وہ حالات درج کیے ہیں جو ایران و مصر سے متعلق ہیں۔

بیتی کہانی (شہر بانو بیگم)، نیرنگیٔ محبت، اور ایک ایکٹریس کی کہانی کے بعد ''آزادی کی چھاؤں میں'' اردو کی چوتھی نسوانی خودنوشت ہے۔ یہ 1974 میں شائع ہوئی اور اس کی مصنفہ بیگم انیس قدوائی ہیں۔ انہوں نے تقسیم ہند کے بعد ہونے والی تباہیوں، پناہ گزینوں کی پریشانیوں و کیمپوں کی بدحالیوں، گاندھی جی کی شہادت وغیرہ کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

اردو کے مشہور شاعر احسان دانش کی خودنوشت ''جہانِ دانش'' 1975 میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت اپنی سادگی اور تخلیقی اسلوب کے لحاظ سے اہم ہے۔ انہوں نے اپنی کمزوریوں اور محرومیوں کو اس خودنوشت میں اس طرح بیان کیا ہے جیسے لگتا ہے کہ یہ کمزوریاں اور محرومیاں ہی ان کے دھندلے نقوش اجاگر کرتی ہیں۔ مزید یہ احساس ہوتا ہے کہ جب یہ دھند چھٹتی ہے تو انسانی اخوت اور مروت و رواداری کے جذبوں سے خلوص کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ فیض احمد فیضؔ نے اپنی خودنوشت ''مہ و سال آشنائی'' کے نام سے لکھی۔ یہ ایک معنی میں یادوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں فیضؔ نے سوویت روس اور وہاں کے لوگوں، تہذیب و معاشرے وغیرہ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ 1975 میں منظور الٰہی

کی خودنوشت ''درِدل کشا'' شائع ہوئی۔کلیم الدین احمد کی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' (1975) ایک ایسے ادیب اور نقاد کی داستان ہے جو اردو ادب میں بت شکن کی حیثیت رکھتا ہے۔انہوں نے فنِ سوانح نگاری کے اصولوں کی روشنی میں اپنی خودنوشت تحریر کی ہے۔اس میں ان کا عہد اور سماج پوری طرح جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔صبیحہ انور لکھتی ہیں:

> ''کلیم الدین احمد کی شخصیت اور فن دونوں کی حیثیت اردو میں بڑی چونکا دینے والی رہی ہے اس لیے ان کی خودنوشت سے توقع ہوئی تھی کہ یہ تصنیف ان کی پراسرار شخصیت اور مخصوص ادبی رویے کو سمجھنے میں مددگار ہوگی مگر اس تصنیف میں ان کی اپنی شخصیت منتشر خیالات میں ایسی گم ہوئی ہے کہ قاری آخر تک اسے تلاش ہی کرتا رہتا ہے،اور اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کلیم الدین احمد صنف خودنوشت سوانح پر اپنی انفرادیت کا کوئی نشان ثبت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔''8

''آشفتہ بیانی میری (1972)'' رشید احمد صدیقی کے جدت طبع اور ندرت اسلوب کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت کو محض اپنے حالات کا آئینہ دار نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو انہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے جذباتی وابستگی کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔

پہلی مزاحیہ خودنوشت شوکت تھانوی نے ''مابدولت'' 1946 میں لکھی تھی۔یہ شوکت تھانوی کے مزاحیہ اسلوب کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔مابدولت کی اشاعت کے تقریباً تیس سال بعد 1976 میں مشتاق احمد یوسفی نے اپنی سرگزشت ''زرگزشت'' کے عنوان سے مرتب کی اور دیباچے کا عنوان ''تزک یوسفی'' رکھا۔اس خودنوشت میں یوسفی نے اپنی ذات کو ظریفانہ انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔افسانوی رنگ میں لکھی گئی اس خودنوشت میں اسلوب کا معیار نہایت عمدہ ہے۔جس کے باعث اس خودنوشت کو اردو کی دیگر خودنوشتوں میں منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے۔ مزاح کے پیرائے میں یوسفی وہ باتیں کہہ گئے ہیں جسے سنجیدہ گفتگو میں زبان تک لانا محال تھا۔یوسفی کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ ادب کا کلاسیکی رچاؤ ملتا ہے۔اس کے علاوہ مزاحیہ اسلوب میں لکھی گئی خودنوشت ''بجنگ آمد'' (1966) ہے۔جس کے مصنف کرنل محمد خاں ہیں۔یہ مصنف کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ اس کا دائرہ فوجی زندگی پر محیط ہے۔چوں کہ کرنل محمد خاں فوجی تھے اس لیے اس میں انہوں نے فوجی زندگی کو موضوع بنایا ہے اور فوجیوں کی تربیت کے سخت مراحل کو نہایت مزاحیہ اسلوب میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔1977 میں رحیم گل کی خودنوشت ''داستان چھوڑ آئے'' اور 1978 میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت '' آپ بیتی '' شائع ہوئی۔مولانا

عبدالماجد دریابادی کی خودنوشت میں ان کی زندگی کے اہم واقعات کی عکاسی ملتی ہے جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی۔اس میں خودنوشت کے تمام خارجی و داخلی تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے۔

مرزا ادیب کی خودنوشت کا نام ''مٹی کا دیا'' ہے، جو 1981 میں شائع ہوئی۔اس میں مصنف کے احوال و کوائف کے علاوہ ان کے تخلیقی سفر کی داستان بھی قلم بند کی گئی ہے۔مشہور شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی کی خودنوشت، جوش ملیح آبادی کی خودنوشت سے اثر پذیری کے نتیجے میں منظر عام پر آئی ،اس لیے انہوں نے اس کا نام'' یادوں کا جشن (1983)'' رکھا ہے۔اس میں ان کی 71 سالہ زندگی کے حالات کے علاوہ ان کے ادبی مشاغل اور مجلسی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت'' گرد راہ'' 1984 میں شائع ہوئی۔یہ مصنف کے وسیع تجربات و مشاہدات کی مظہر ہے۔

1985 میں عشرت رحمانی کی'' عشرتِ فانی''، 1986 میں جیلانی برقؔ کی'' میری داستانِ حیات''، 1987 میں جلیل قدوائی کی'' حیاتِ مستعار''، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی'' رو میں ہے رخشِ عمر'' شائع ہوئی۔ڈاکٹر وزیر آغا کی خودنوشت 1986 میں منظر عام پر آئی ،جس کا نام'' شام کی منڈیر سے'' ہے۔اس میں 1922 سے لے کر 1980 تک کے حالات و واقعات کا ذکر ملتا ہے۔وزیر آغا نے اس میں اپنی زندگی کے نجی حالات و ادبی زندگی کی تفصیلات کو قلم بند کیا ہے جو کہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ وزیر آغا نے اپنی خودنوشت ایک طویل نظم کی صورت میں'' آدھی صدی کے بعد'' کے عنوان سے بھی لکھی تھی جو 1981 میں شائع ہوئی تھی۔

شہرت بخاری کے مضامین کا مجموعہ'' کھوئے ہوؤں کی جستجو'' کے نام سے موسوم ہے جسے بعض خصوصیات کی بنا پر خودنوشت کا درجہ دیا جاتا ہے۔یہ لاہور سے 1987 میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں انہوں نے اپنے آباء و اجداد، پیدائش، بچپن، عہدِ شباب اور اس کے بعد کی زندگی کے حالات و واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت'' شہاب نامہ'' ایک ایسی بھرپور داستان ہے جسے اپنے عہد میں بہت مقبولیت حاصل تھی۔یہ کتاب ان کے انتقال کے ٹھیک ایک سال بعد 1987 میں منظر عام پر آئی۔اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ شہاب نامہ میں تجربات و مشاہدات کا ایک جہاں آباد ہے جو ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔اس خودنوشت میں آزادی سے پہلے ہندوستان اور پھر پاکستان کے سیاسی حالات پر کھل کر تبصرہ کیا گیا ہے۔

رفعت سروش کی'' بمبئی کی بزم آرائیاں''، 1988 میں عبارت بریلوی کی'' یاد عہد رفتہ'' شائع ہوئی۔ مسعود حسین خاں کی خودنوشت'' ورود مسعود'' 1988 میں شائع ہوئی۔اس میں انہوں نے اپنی 69 سالہ زندگی کا احاطہ کیا

ہے۔اپنے بچپن کے حالات، تعلیمی و علمی سرگرمیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔کم و بیش اسی زمانے میں جی۔اے اصغر کی ''زرگزشت''، ڈاکٹر اقبال حسین کی ''داستان میری'' شائع ہوئی۔

بیسویں صدی کے آخری دہائی میں شائع ہونے والی خودنوشتوں میں حمید نسیم کی خودنوشت ''ناممکن کی جستجو (1990)''، یونس احمر کی ''ماضی کے تعاقب میں (1991)''، آل احمد سرور کی ''خواب باقی ہیں (1991)''، حمیدہ اختر کی ''ہم سفر''، سحاب قزلباش کی ''میرا کوئی ماضی نہیں''، نصرت جہاں بیگم کی ''میرے ساتھی، میرے غازی، میرے شہید''، سید محمد عقیل کی ''گئو دھول''، ڈاکٹر شکیل الرحمان کی ''آشرم (1992)''، کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا (1995)''، ادا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی''، اختر لایمان کی ''اس آباد خرابے میں (1997)''، فرحت اللہ بیگ کی ''یادایام (1998)''، نفیس بانو شمع کی ''جنت سے نکالی ہوئی ہوا (1998)''، محمد لطف اللہ خاں کی ''ہجرتوں کے سلسلے (1998)''، انعام الحق کی ''ایام رفتہ (1999)''، انتظار حسین کی ''چراغوں کا دھواں (1999)''، خلیق ابراہیم خلیق کی ''منزلیں گرد کے مانند (1999)'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اکیسویں صدی کے اوائل میں شائع ہونے والی خودنوشتوں میں زبیر رضوی کی ''گردش پا (2000)''، رشید امجد کی ''تمنائے بے تاب (2001)''، مہدی علی صدیقی کی ''بلاکم و کاست (2002)''، ڈاکٹر جاوید اقبال کی ''اپنا گریباں چاک''، اطہر صدیقی کی ''میں کیا میری حیات کیا (2003)''، احمد بشیر کی ''دل بھٹکے گا (2003)''، ڈاکٹر سلیم اختر کی ''نشان جگر سوختہ (2005)''، کلیم عاجز کی ''ابھی سن لو مجھ سے''، وہاب اشرفی کی ''قصہ بے سمت زندگی کا''، یوسف رضا گیلانی کی ''چاہ یوسف سے صدا (2006)''، شہاب عنایت ملک کی ''یادوں کے لمس (2011)'' خواجہ احمد عباس کی ''I Am not an Island''، اجیت کور کی ''خانہ بدوش''، حمیدہ سالم کی ''شورش دوراں''، سعیدہ بانو احمد کی ''ڈگر سے ہٹ کر''، ساقی فاروقی کی ''آپ بیتی پاپ بیتی''، رتن سنگھ کی ''بیتے ہوئے دن''، عشرت رحمانی کی ''عشرت فانی''، شان الحق حقی کی ''افسانہ در افسانہ''، حبیب تنویر کی ''پردہ کھلتا ہے''، جتیندر بلو کی ''دیکھو ہم نے کیسے بسر کی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اردو میں خودنوشتوں کے ترجموں کی بھی روایت رہی ہے۔انگریزی اور دوسری زبانوں کی متعدد خودنوشت سوانح کو اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔سابق صدر جمہوریہ ہند اے پی جے عبدالکلام کی خودنوشت ''Wings of Fire'' کو اردو میں ''پرواز'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔فہیم انور نے رابندر ناتھ ٹیگور کی خودنوشت ''جیون شریتی'' کا بنگالی زبان سے براہ راست اردو میں ترجمہ کیا ہے۔جس کا نام انہوں نے ''میری یادیں'' رکھا۔احمد امین کی خودنوشت

''حیاتی'' جو کہ انہوں نے عربی زبان میں لکھی تھی، اس کا ترجمہ محمد عارف الدین فاروقی نے ''زندگی میری'' کے عنوان سے کیا۔ اسی طرح گاندھی جی کی خودنوشت ''The story of my experiments with truth'' کا سید عابد حسین نے اردو میں ''تلاشِ حق'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں مولانا آزاد کی انگریزی سے ''آزادی ہند''، خوشونت سنگھ کی انگریزی سے ''سچ محبت ذرا سا کینہ''، راجندر پرساد کی ہندی سے ''اپنی کہانی''، امرتا پریتم کی پنجابی سے ''رسیدی ٹکٹ'' کے نام سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ ایسی بہت ساری خودنوشتیں ملتی ہیں، جن کا ترجمہ اردو زبان میں ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو میں صنف خودنوشت کے ارتقا پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں خودنوشت کی روایت گو بہت پرانی نہ سہی لیکن تسلی بخش ضرور تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روایت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اس کا آغاز انیسویں صدی کے ربع آخر سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے رفتار میں تیزی بیسویں صدی کے چوتھی دہائی سے آئی اور یہ صنف بتدریج اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی۔ اردو میں مختلف ادیبوں، سیاسی رہنماؤں، مذہبی شخصیتوں اور مفکرین نے اپنے نظریات و افکار کو خودنوشت کے ذریعے پیش کر کے اس صنفِ ادب کو استحکام بخشا ہے۔ خودنوشت کا سفر ابھی جاری ہے۔ ادباء، شعرا، مذہبی رہنما اور سیاسی قائدین اپنی خودنوشت اب بھی لکھ رہے ہیں۔ جن کے منظر عام پر آنے کے بعد جہاں اردو ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا وہیں اس صنف کی بھی مزید آبیاری ہوگی۔

☆ اردو خودنوشت کا فن اور تکنیک

کسی بھی شخص کا اپنی شخصیت کو تحریری انداز میں اس طرح منظرِ عام پر لانا کہ وہ اپنی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رکھے بلکہ اپنے محاسن اور معائب کو دوسروں کے سامنے بے دھڑک پیش کر دے، ''خودنوشت'' کہلاتی ہے۔ اردو کے نثری اصناف میں خودنوشت، سوانح حیات سے ملتی جلتی غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ خودنوشت نگار ایک ایسا مصور ہوتا ہے جو اپنی ذات کی خود تصویر کشی کرتا ہے۔ برش، کینوس اور رنگوں کے انتخاب میں اسے پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی شخصیت کے نمایاں و مختلف پہلوؤں سے واقف ہوں۔ خودنوشت کسی شخص کی زندگی کے گزرے ہوئے لمحات کی ایک ایسی داستان ہوتی ہے جسے بسا اوقات مبالغہ آرائی یا پھر کسرِ نفسی سے رقم کی گئی ہوتی ہے۔ جب کہ سوانح حیات میں مصنف کسی دوسرے شخص کی حالات زندگی اس کے جنم سے موت تک کے اہم واقعات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے۔

خودنوشت اپنی ذات کے اظہار کا نام ہے جس میں مصنف اپنی زندگی کے متنوع واقعات تحریر کرتا ہے۔ ان میں خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات شامل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی خودنوشت نگار کا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ تاریخی اور سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی ذات سے زیادہ سیاست اور تاریخ پر ہی بحث کرتے ہیں اور پھر ان کی خودنوشت آپ بیتی نہ ہو کر جگ بیتی بن جاتی ہے، اگر مصنف کا تعلق مذکورہ دونوں سے ہے تو پھر وہی خودنوشت ایک اہم معلوماتی کتاب بن کر قارئین کے سامنے آتی ہے، جس کی اپنی الگ ہی اہمیت ہوتی ہے۔ خودنوشت لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لئے بڑی ہمت اور دلیری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اس صنف میں جب کوئی شخص اپنی ہی شخصیت پر تنقید کرتا ہے تو پھر وہ کون سا فرد اور ادارہ ہے جو اس کے دائرۂ تنقید میں نہیں آ سکتا۔

خودنوشت لکھنا خود اعتمادی کا عمل ہے اور یہ عمل کوئی شخص اس وقت شروع کرتا ہے جب وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز دیکھ چکا ہوتا ہے۔ زندگی کے مثبت و منفی حالات و حادثات سے نبرد آزما ہونے کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اپنے ماضی کی طرف نظر کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ میں نے کیا پایا اور کیا کھویا، زندگی کے اس سفر میں آخر کہاں کہاں راہِ راست سے بھٹکا اور کن دشوار گزار راستوں کو عبور کرتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچا، اس مرحلے میں وہ کون سے تجربات ہیں جو مستقبل میں مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ مصنف کے اندر اتنی خود اعتمادی آ جاتی ہے کہ سچ بولنا اس کا مزاج بن جاتا ہے۔ اس کی تنقیدی نظر صرف اپنے آپ پر ہی نہیں پڑتی بلکہ اپنے دوستوں اور عزیزوں پر بھی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے جڑی تمام باتوں کو بلا کم و کاست ضبطِ تحریر میں لاتا ہے۔ اگر مصنف کے اندر اتنی جرأت نہیں ہوگی تو وہ خودنوشت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں صبیحہ انور لکھتی ہیں کہ:

> ''خودنوشت سوانح حیات دیانت داری اور خلوص نیت سے لکھی گئی ہو لیکن کتنے افراد میں یہ ہمت اور حوصلہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے اصلی رنگ و روپ میں دیکھ سکیں..... اپنے ڈھکے چھپے خدوخال کو سرِ بازار پیش کر سکیں اسی لیے اپنی کہانی اپنی زبانی سناتے وقت اکثر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لیے جتنے پردے اس پر سے اٹھائے جا رہے ہیں اس سے زیادہ اس پر ڈالے جا رہے ہیں۔''9

خودنوشت میں کسی بھی شخص کی مکمل زندگی کا بیان نہیں ہوتا ہے اس لیے کوئی بھی خودنوشت مکمل نہیں ہوتی یعنی کہ جس کے بارے میں لکھا گیا ہے اس کا پورا نقشہ نہیں پیش کرتی ہے۔ لکھنے والا اپنے بارے میں، اپنے ماحول، دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ چوں کہ لکھنے والا وہ خود ہوتا ہے اس لیے اس کی زندگی میں اس کی داستانِ حیات

مکمل ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا کیوں کہ طویل عمر پانے کے باوجود بھی کچھ حصہ چھوٹ جائے گا، وہ ہاتھ ہی نہیں رہے گا جن سے وہ خودنوشت لکھی جارہی تھی۔

انسان اپنے بارے میں جتنا جانتا ہے اتنا اور کوئی نہیں جانتا۔اس لیے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کو کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں۔مصنف جتنا اپنے آپ کو بے نقاب کرے گا اتنا ہی اچھا خودنوشت نگار ہے لیکن اس کے باوصف کوئی نہ کوئی پہلو یا بات پوشیدہ رہنے کا قوی امکان رہتا ہے۔کچھ نہ کچھ ان کہا رہ ہی جاتا ہے یا بحالت مجبوری چھوڑنا پڑ جاتا ہے یا ایسی منفی باتوں کو اشاروں اور کنایوں میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس لیے ایسی جگہوں پر جو معنی پوشیدہ ہوتے ہیں ان تک قاری کی رسائی ہونا ضروری ہے اور یہ بات قاری پر منحصر ہوتی ہے۔

خودنوشت کے لیے موضوع اور اسلوب کی کوئی قید نہیں ہوتی اور نہ ہی اس بات کی کوئی بندش ہے کہ اس میں کیا لکھا جانا چاہیے اور کیا نہیں۔ظاہر ہے جو کچھ لکھنے والے کی شخصیت ہوگی وہی اس کا موضوع طے کرے گی۔اگر شخصیت سیاسی ہے تو موضوع بھی سیاسی ہوگا، اگر مصنف شاعر، ادیب یا صحافی ہو تو اس کے موضوعات اس کے پیشے کے لحاظ سے متعین ہوں گے۔سب کچھ ہوسکتا ہے مگر شرط یہی ہے کہ اسے لکھنے والا خود ہی لکھے۔اگر کوئی دوسرا ان حالات کو رقم کرے تو کم از کم یہ راز فاش ہو جائے گا اور اس پر خودنوشت کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ یہ سوانح عمری کے زمرے میں شمار کی جائے گی۔

خودنوشت کے فن کے لیے کتاب کی ضخامت کی بھی کوئی پابندی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی خاص طریقۂ کار ہے جس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔خودنوشت چاہے چند صفحات پر ہی مشتمل ہو یا سیکڑوں صفحات پر محیط ہو بہر حال خودنوشت ہوتی ہے۔تاہم یہ عمومی طور پر ایک مفصل کتاب ہوتی ہے جس میں مختلف باب ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا پھیلاؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔البتہ خودنوشت عام طور پر نثر میں اپنے حالات کو لکھنے کا نام ہے۔یعنی بنیادی طور پر مصنف کے خود لکھے ہوئے اپنے حالات جو کہ نثر میں ہوں خودنوشت کہلاتی ہے۔خودنوشت کا نثر میں ہونا ہی ضروری مان لیا گیا ہے اور جب بھی اس کا ذکر آتا ہے تو خیال نثر ہی کی طرف جاتا ہے۔حالاں کہ یہ کوئی بنیادی شرط نہیں ہے بلکہ رواج سا بن گیا ہے جس نے اصول کی صورت اختیار کر لی ہے۔جب کہ منظوم خودنوشت بھی رقم کی جاسکتی ہے اور اردو میں اس کی کئی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، حمایت علی شاعر وغیرہ کی منظوم خودنوشتیں موجود ہیں۔اردو میں جتنی خودنوشت منظر عام پر آئی ہیں ان میں زیادہ تعداد نثری خودنوشت کی ہے۔عموماً نثر میں سہولت بھی ہوتی ہے۔نظم کی اپنی بندشیں ہوتی ہیں۔جب کہ نثر میں اپنی بات کو مفصل طور سے پیش کیا جاسکتا ہے یہ ایک ایسا میدان ہے جس میں

مصنف بے لاگ اپنی بات تحریر کرتا ہے۔

خودنوشت کا فنی اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جس کا موضوع خود فن کار کی ذات ہے۔ وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سے مکمل طور پر آگاہ ہوتا ہے۔ فن دراصل فن کار کے باریک بین مشاہدات کا ہی نام ہے۔ مگر خودنوشت ایک ایسا فن ہے جس کا موضوع خود لکھنے والے کی ذات ہے اور اس کا مرکز داخلی ہوتا ہے۔ داخلی کے ساتھ ساتھ فن کار کی خارجی زندگی بھی پیش پیش ہوتی ہے لیکن محور داخلی ہوتا ہے اور خارجی عنصر اس سے گریز نہیں کر سکتا ہے۔ اس صنف میں مواد خود کی ذات سے پیدا ہوتا ہے۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر، خود ہی مجرم خود ہی گواہ اور جج ہوتا ہے۔

خودنوشت میں یہ گنجائش نہیں ہوتی ہے کہ لکھنے والا شاعر یا افسانہ نگار کی طرح تخیل اور تصور کی اساس پر اپنی دنیا آباد کرے۔ وہ وہی رقم کر سکتا ہے جو اس کی زندگی میں رونما ہوا ہے۔ کیوں کہ خودنوشت میں صداقت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے خودنوشت اس زمرے کی دیگر اصناف سے زیادہ اہم ترین صنف ہے کیوں کہ اس میں شخصیت اور ذات کے بارے میں وہ حقائق ملتے ہیں، جن سے صرف مصنف ہی واقف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خودنوشت، سوانح حیات سے دو قدم آگے دکھائی دیتی ہے کیوں کہ اکثر سوانح نگار اسی شخص کی سوانح رقم کرتا ہے جس سے وہ حد درجہ متاثر ہوا ہے۔ ان کی شخصیت سے متعلق کوئی منفی بات اگر ہے بھی تو اسے منظر عام پر لانے سے گریز کرتا ہے کیوں کہ ان کی عظمت و مرتبے کا اسے پاس رکھنا ہوتا ہے یا پھر مذکورہ شخص کی بڑھائی میں تعریفوں کے ایسے پل باندھتا اور ان کی شخصیت کو اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ مانو وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ تھا۔ جب کہ خودنوشت میں یہ گنجائش نہیں ہوتی ہے، مصنف خود اپنے حالاتِ زندگی لکھتا ہے اور صداقت اس کا اہم جز ہے۔

ہوسکتا ہے کہ خودنوشت نگار بھی اپنی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو سامنے نہ لا کر صرف مثبت پہلوؤں کا ہی ذکر کرے یا پھر اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو بیان کرنے میں مبالغے سے کام لے، تو ایسی خودنوشت، خودنوشت نہ ہو کر واقعات اور باتوں کی کھتونی معلوم پڑتی ہے۔ قاری بھی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا واقعی مذکورہ شخص ان صفات کا مالک بھی تھا؟ اور جو واقعات پیش کیے ہیں وہ صداقت پر مبنی بھی ہیں کہ نہیں؟ پھر مصنف کی شخصیت کا پڑھنے والے کے ذہن پر منفی اثر پڑتا ہے۔ بہر حال ایسی خودنوشتیں فن کے اصولوں کو پورا نہیں کرتیں اور ان کو اس صنف میں بھی شامل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ خودنوشت کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صبیحہ انور کے مطابق اس صنف میں تین شرطوں کا ہونا لازمی ہے جس سے راقمہ بھی اتفاق کرتی ہے۔ ایک جامع خودنوشت میں پڑھنے والا درج ذیل تین چیزوں کی تلاش اور توقع رکھتا ہے:-

(الف) سچائی اور حقیقت نگاری

(ب) شخصیت

(ج) فن

سچائی:- سچائی اور حقیقت نگاری خودنوشت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ دراصل یہ خودنوشت کے لیے روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر خودنوشت کی بقا ہی ممکن نہیں۔ سچائی ہی کی بدولت تخلیق کار کی زندگی دوبارہ متحرک اور جاندار ہو کر خودنوشت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس سے گریز خودنوشت کی دوسری شرائط کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ اپنی زندگی کے شب و روز کو یادداشت کی بنا پر سمیٹ کر یکجا کرنا، بچپن کی عکاسی کے لیے اپنے خیال کو وہی بے لوث سادگی اور معصومیت ادا کرنا اور جوانی کی تصویر کشی کے لیے احساس و جذبات میں تازگی پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک پُر اثر خودنوشت لکھنے کے لیے مصنف میں ان تمام باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اردو میں کئی ایسی خودنوشتیں منظر عام پر آئی ہیں جن میں حقیقت نگاری کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ان کی فہرست کافی لمبی ہے، ان میں شہاب نامہ (قدرت اللہ شہاب)، ورود مسعود (مسعود حسین خاں)، ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتوں)، گرد راہ (اختر حسین رائے پوری)، سرگزشت (عبدالمجید سالک)، لاہور کا جو ذکر کیا (گوپال متل) اعمال نامہ (رضا علی)، نوائے زندگی (ساجدہ زیدی)، جنت سے نکالی حوا (نفیس بانو شمع)، بری عورت کی کتھا (کشور ناہید) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ایک کامیاب خودنوشت کے لیے حقیقت نگاری کیا ہے؟ اس ضمن میں سید رضا علی نے اپنی خودنوشت اعمال نامہ میں لکھا ہے جو بہت معنی خیز لگتا ہے:

> ''میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آ کر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو پڑھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔'' 10

زندگی کے آخری ایام میں خودنوشت لکھنے کے سبب اکثر باتیں یاد نہیں رہتیں۔ تو ایسی صورت میں کچھ لوگ اپنی زندگی کے شب و روز کے اہم واقعات کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور جب وہ لوگ خودنوشت لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ نوٹ ان کے بہت کام آتے ہیں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ جب حافظہ جواب دینے لگتا ہے تو یہی فوٹ نوٹ اور ان تحریروں سے دماغ اور حافظے کو تازہ کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں بیشتر خودنوشت نگاروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اپنی خودنوشت کا مسودہ تیار کرنے میں ان کو اپنی ڈائری سے کافی مدد ملی۔ اس کے علاوہ مصنف اپنے دوستوں، عزیز و اقارب

سے اپنی زندگی کے مختلف مرحلوں کی معلومات حاصل کرتا ہے۔ بچپن کی بہت سی یادیں دوسروں کی سنی سنائی ذہن کے کسی گوشے میں پڑی رہ جاتی ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر جب اپنی خودنوشت لکھنے بیٹھا تو اس نے تہیہ کیا تھا کہ سائنسی نقطۂ نظر سے کام لے گا لیکن بعد میں اس کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ بچپن سے متعلق اس کی یادیں گنتی کی اور لامحدود ہیں جن کی حیثیت محض تاثرات کی ہے اور بالآخر اس کو اپنے عزیزوں اور دوستوں کا سہارا لینا پڑا۔

بہر کیف دانستہ طور پر غلط بیانی کرنا اور کسی واقعہ کا حافظے سے محو ہو جانا اور غلط بات یاد رہ جانے کی وجہ سے جھوٹ کا سرزرد ہو جانا بالکل مختلف بات ہے۔ سید رضا علی خودنوشت اعمال نامہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے یہ تہیہ کر کے قلم اٹھایا ہے کہ واقعات کو اصل صورت میں پیش کروں گا۔ موجودہ فن تجدید شباب کے ماہروں کی طرح یہ ہرگز کبھی جائز نہ رکھوں گا کہ آنکھیں ماتھے پر پہنچ جائیں، نیچے کا ہونٹ ٹھوڑی پر پڑا ہو یا دونوں کان گلے کا ہار ہو جائیں۔ حقیقت نگاری بڑا مشکل کام ہے۔ بالخصوص جب انسان خود اپنی کہانی لکھنے بیٹھے۔ میری تمام تر کوشش یہ رہی ہے کہ انصاف سے کام لوں گا کسی کا رنگ پھیکا نہ پڑے اور نہ زیادہ گہرا ہونے پائے۔'' 11

اسی دیباچے میں انہوں نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''میرے گلدستے میں دونوں قسم کے پھول ملیں گے۔ میں نے حقیقت نگاری کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ مغربی ممالک میں سوانح حیات لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی بھی بیان کی جاتی ہے۔ دنیا میں واقعات کا سلسلہ اتنا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اس صورت میں پوری ہو سکتی ہے کہ جب دوسروں کے حالات بھی درج کیے جائیں۔'' 12

جب مصنف اپنے حالات کو بے کم و کاست صداقت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے بہتر سے بہتر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو غلطیاں بار بار سرزد ہوتی ہیں کیوں کہ کوئی بھی فن کار اپنی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو سامنے لانے سے ہچکچاتا ہے اور اس کو کہیں نہ کہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ سماج میں جو وقار اور مرتبہ حاصل کر چکا ہے سب پر پانی نہ پھر جائے۔ مصنف ان منفی پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے صرف مثبت پہلوؤں پر ہی بحث کرتا ہے جس کی وجہ سے قاری کو خودنوشت نگار انسان کم فرشتہ زیادہ معلوم پڑتا ہے۔ اس لیے دوسری اصناف میں سچائی و صداقت کی جو اہمیت ہے وہ خودنوشت میں کئی گناہ زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ اس میں فن کار جو تانا بانا بُنا جاتا ہے یا جو بُنتا ہے دونوں ایک ہی شخصیت پر منحصر ہوتی ہے اس لیے مصنف کی ذمہ داری کچھ زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

کسی شخص کی زندگی کی کہانی لکھنا بڑا مشکل عمل ہے اور اگر وہ کہانی خود اپنی ہو تو مشکل اور بڑھ جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنی دلکشی اور گنجائش کے باوجود بھی اردو میں خودنوشت کم لکھی گئی ہیں۔ پھر بھی اس کا ایک وافر ذخیرہ اردو ادب میں موجود ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اردو ادب میں جتنے لکھنے والے ہیں اگر سارے ادباء نے اپنی آپ بیتی لکھی ہوتی تو اس صنف کا حجم کافی بڑا ہوتا۔ غالباً بہت سے لوگوں نے اس لیے اپنی آپ بیتی نہیں لکھی کہ وہ ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتے کہ اپنی زندگی کے بعض گوشوں سے پردہ اٹھا سکیں۔ ان کی ادبی دیانت داری نے یہ گوارہ نہ کیا ہوگا کہ اس صنف کے ساتھ خیانت کریں، سچ کو جھوٹ و افسانہ بنا کر پیش کریں اور لوگوں کو گمراہ کریں۔ یعنی ان کی شخصیت واقعی میں جو تھی اس کے برعکس کچھ اور طریقے سے پیش کریں۔ حبیب تنویر اپنی خودنوشت ''پردہ کھلتا ہے'' میں لکھتے ہیں:

> ''اچھائیوں و برائیوں کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ ہر انسان میں کمیاں، خوبیاں دونوں پائی جاتی ہیں۔ رہا سوانح حیات کا معاملہ تو یہ ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ یادداشت بڑی حد تک داخلی ہوتی ہے۔ پھر جو کچھ بیت چکا ہے اس میں ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جن کا مصنف کی ذات پر گہرا اثر پڑا ہو۔ اس کارروائی میں اگر حق گوئی کا دامن نہ چھوڑا جائے تو دوسرے اشخاص کا ذکر بھی لازمی ہے۔ ان تذکروں میں یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کسی کو صدمہ نہ پہنچے۔''13

اپنی ذات کو سمجھنا اور خامیوں و خوبیوں کو پہچاننا الگ بات ہے اور ان کو دوسروں تک پہنچانا ایک الگ چیز۔ خودنوشت نگار کو اپنی خودنوشت کی مقبولیت اور تاثر کا جادو چلانے کے لیے سچائی اور حقیقت کا مَنتر یاد ہونا بے حد ضروری ہے ورنہ ساری محنت دھری کی دھری رہ جائے گی۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں خودنوشت میں مصنف خود ہی شاہد اور خود ہی ناقد ہے اس لیے اس میں دشواری بھی ہے۔

بسا اوقات مصنف لکھتے وقت اپنی زندگی کے حالات رقم کرنے کے بجائے اس تصوراتی مثالی ہیرو کے حالات کو بیان کرنے لگتا ہے جو کہ وہ خود نہیں ہے بلکہ ہونا چاہتا ہے۔ اس طرح قاری کے سامنے ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت آتی ہے۔ جو نہ اس کے دل کے لیے کشش رکھتی ہے اور نہ ہی دماغ قبول کرتا ہے۔ اس تعلق سے صبیحہ انور لکھتی ہیں کہ:

> ''خودنوشت سوانح حیات لکھتے وقت جس بے باک سچائی کی ضرورت ہوتی ہے اس کے

بغیر وہ نہ خودنوشت کے معیار پر پوری اترتی ہے اور نہ ہی پڑھنے والے کے لیے اپنے اندر کوئی دلچسپی رکھتی ہے۔ اگر خودنوشت نگار حقیقت سے دامن بچاتا ہے تو سب سے بڑا نقصان خود اس کا اپنا ہوتا ہے کیوں کہ پردہ داری اور غلط بیانی سے اس کی زندگی میں سپاٹ اور جھول پیدا ہو جاتا ہے۔'' 14

اس لیے صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کی بھی اہم خودنوشتوں پر نظر ثانی کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف ان ہی خودنوشت کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی جن میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہو۔ خواہ وہ روسو کی ''اعتراف'' ہو یا جوشؔ ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' یا پھر ''شہاب نامہ''، وغیرہ ان کی مقبولیت کا راز وہ بے باکی اور سچائی ہے جس کا سہارا لیتے ہوئے وہ اپنی شخصیت کے مروج ہو جانے سے بھی خوف زدہ نہیں ہوئے۔ اس لیے خامیوں کے باوجود بھی جن خودنوشت میں سچائی اور حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

شخصیت:- یہ بات مسلمہ ہے کہ خودنوشت میں اپنی ذات اور شخصیت ہی سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے جس کے اردگرد مذکورہ صنف طواف کرتی ہے۔ شخصیت کا رنگ کہیں بہت زیادہ شوخ ہوتا ہے تو کہیں پھیکا۔ یہ سب فن کار کے اپنے مزاج، میلان اور رجحانات پر منحصر ہے۔ بنیادی طور پر داخلی کیفیات و واردات خودنوشت کے بطن میں موجود ہوتی ہیں۔ مصنف اپنی ذات سے متعلق حالات کو خود رقم کرتا ہے اور اپنی کامیابی و ناکامی کو پیش کرنا اس کے قلم پر منحصر ہوتا ہے۔ جب کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور اپنی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو سامنے لانے سے گریز کرتا ہے۔ چوں کہ خودنوشت میں خود اپنی ذات کا نقش ہے اس لیے ہر شخص اپنے بعد بھی اپنے وجود کو مثبت روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک اچھی خودنوشت ہمارے سامنے اپنی شخصیت کا بڑا دلچسپ پہلو سامنے لاتی ہے۔ جس میں زندگی کی حقیقت اس انداز میں پیش کی گئی ہوتی ہے کہ قاری مصنف کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بنا نہیں رہ پاتا۔ یہی سادہ خودنوشت کا خاصہ ہے۔

مصنف خودنوشت میں اپنی ذات کے ساتھ اپنے عہد کی اہم شخصیتوں اور اپنے عزیز و اقارب کا خاکہ بھی پیش کرتا ہے۔ اپنے ہم عصروں کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں کہ اپنا ذکر اس طرح کرے کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ مصنف کا مقصد ان پر اپنی فوقیت کو ظاہر کرنا ہے۔ اقبال حسین اپنی خودنوشت ''داستان میری'' میں لکھتے ہیں:

''معاصرین کے متعلق جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے انصاف سے کام لیتے ہوئے ان کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کے تذکروں میں نہ تو کسی کی بے جا تعریف کی گئی ہے اور نہ بے

بنیاد شکایت۔'' 15

ایک اچھی خودنوشت میں زندگی کے حالات و واقعات کو اس طرح پیش کرنا چاہیے جیسا کہ وہ زندگی میں رونما ہوئے ہوں۔ زندگی کے نشیب و فراز اور دکھ سکھ کو ذہن کے نہاں خانوں میں متحرک کرنا بڑی ہنرمندی کا کام ہے۔ مصنف کی زندگی میں ہونے والے واقعات اور اس کی شخصیت کے پہلو کی تہہ داری اتنی وسیع ہوتی ہیں کہ ساری باتوں کو صفحات پر سمیٹنا ممکن نہیں ہے اور اگر ان ساری باتوں کا ذکر کرنے لگے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوگی۔ ایک اچھا فن کار وہی ہے جو ان تمام باتوں کو اس ہنرمندی کے ساتھ پیش کرے کہ پڑھنے والے کو گراں نہ گزرے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کوئی اہم بات لکھنے سے چھوٹ نہ جائے کہ قاری کو پڑھنے کے دوران کچھ کمی کا احساس ہو۔

اپنے ذوق وشوق اور پسند و ناپسند کا ذکر بھی ضروری ہے مگر مصنف کو پند و نصیحت کا دفتر کھولنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی طرح مختلف دلیلوں اور ثبوتوں سے اپنی سیاسی کارکردگیوں اور مذہبی نظریات کی تلقین پڑھنے والے پر ناخوشگوار اثر کرتی ہیں۔ اپنے آبا و اجداد اور رہن سہن کا غیر ضروری ذکر خودنوشت کو آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی بنا دیتا ہے اس طرح اس کا فن کہیں دب کر رہ جاتا ہے۔ اس میں اپنی ذات کے ساتھ اپنے عہد و معاصرین کے حالات کا ذکر کچھ اس طرح کرنا چاہیے کہ قارئین پر گراں نہ گزرے۔

خودنوشت عموماً بڑھاپے کی تخلیق ہوا کرتی ہے۔ مصنف پچاس، ساٹھ یا اس سے زیادہ عمر میں خودنوشت لکھنے پر توجہ کرتا ہے۔ یہ زمانہ زیادہ پختگی کا ہوتا ہے اور اس عمر میں کوئی بنیادی تبدیلی ہونے کا امکان کم رہتا ہے۔ عمر کے اس پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد پیچھے مڑ کر سارے واقعات پر نظر ڈالی جاسکتی ہے اور یہ آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی شخصیت کے کس پہلو کو پیش کرنا ہے کس کو نہیں۔ معمّر آدمی فطرتاً قدامت پسند ہو جاتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بوڑھے ہو کر اپنی آزاد خیالی اور بے باکی کو برقرار رکھتے ہیں۔ جوشؔ کی خودنوشت ''یادوں کی برات''، خوشونت سنگھ کی خودنوشت ''سچ، محبت، ذرا سا کینہ'' وغیرہ اس کی زندہ مثال ہیں۔ دوسری طرف سید رضا علی ہیں جو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ کچھ حضرات اپنی ذات اور شخصیت کو اجاگر کرنے میں سارا زور قلم صرف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی شخصیت کا ذکر مختصر کر کے اپنے ہم عصروں کا ذکر خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔

اپنی ذات کے اظہار کے لیے صفحے کے صفحے سیاہ کیے جاسکتے ہیں۔ اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے ایسا نہیں ہے کہ مصنف کوئی پابندی کرے اور نہ ہی خودنوشت لکھنے کے لیے ایسا کوئی قاعدہ یا قانون ہے کہ یہ کتنے صفحات پر مشتمل ہونی چاہیے۔ یہ بہت مختصر بھی ہوسکتی ہے اور بہت طویل بھی۔ مصنف کے عوامی ہونے کا ایسا خاص مفہوم ہوتا ہے جس

سے اس کو اپنی ذات کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ خودنوشت میں مصنف کی خود کی شخصیت ایسی ہوتی ہے جس کے اردگرد پوری تصنیف گھومتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے متعلق خود ہی بیان دیتا ہے۔ اپنی شخصیت کو پیش کرنے کے اس انداز کے کئی مقصد ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے اپنی کتاب ''اردو میں خودنوشت سوانح حیات'' میں کچھ مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

1۔ اپنے حالات سے دوسروں کو روشناس کرانا۔

2۔ اپنی شخصیت اور کردار کی اہمیت کا مرقع پیش کرنا۔ اپنی ذات پر گزرنے والے حالات اور تجربات سے دوسروں کو روشناس کرانا اور کسی عام غلط فہمی کا ازالہ کرنا۔

4۔ اپنے حالات اگر ایسے ہیں جس میں محنت کر کے غیر معمولی ترقی حاصل کی گئی ہو تو دوسروں کو اس کی ترغیب دلانا۔

5۔ اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی، ادبی حالات کو اپنے زاویہ نگاہ سے پیش کرنا اور اپنے زندگی کے آدرشوں کی تبلیغ کرنا۔

6۔ اپنے ہم عصروں سے اپنے تعلقات واضع کرنا اور ان کے اعمال و افعال پر تنقید کرنا۔

بہر حال خودنوشت ایک ایسی صنف ہے جس کا معاملہ بڑا نجی ہوتا ہے۔ اس میں مصنف کو اپنی زندگی سے متعلق، اپنے زمانے کے دوسرے امور اور افراد سے متعلق لکھنے کی پوری آزادی ہوتی ہے اور اس پر وہ کھل کر اظہار خیال کرتا ہے۔ کسی فرد کی شخصیت کی عکاسی اور تصویر کشی خودنوشت سے بہتر کسی دوسری صنف میں نہیں ہو سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ خودنوشت پوری دیانت داری اور خلوص نیت سے رقم کی گئی ہو۔ علی سردار جعفری قاضی جلیل عباسی کی خودنوشت ''کیا دن تھے'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''کہتے ہیں کہ ہر شخص کے وجود میں ایک کتاب پوشیدہ ہے لیکن اس کتاب کو روح کے اندر سے نکال کر کاغذ پر منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بھولے بسرے واقعات اپنی شکل بدل لیتے ہیں، لمحات آگے پیچھے ہو جاتے ہیں جن میں آدھی یا اس سے بھی کم صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ پھر بھی صداقت کے اس تھوڑے سے اظہار میں ایک لذت ہے۔''16

لیکن بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اصلی رنگ و روپ میں دیکھنے کی ہمت رکھتے ہیں اور اپنے ڈھکے چھپے خدوخال کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ عام طور پر خودنوشت لکھنے سے گریز کی جو چند وجوہات سامنے آتی ہیں اس

میں سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ کچھ لوگ اپنی زندگی کے نجی حالات کو سرِ بازار پیش نہیں کرنا چاہتے۔

فن :- خودنوشت کی تیسری اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ خودنوشت محض یادداشت کا مجموعہ نہیں بلکہ فن کا حصہ بھی ہے۔ایک اچھی خودنوشت صرف اپنی ذات کا بیان اور تاریخی مجموعہ نہیں ہے بلکہ ادبی کارنامہ بھی ہے۔ناولوں اور افسانوں میں کہانی کو پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ واقعات حقیقی لگیں جسے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔لیکن خودنوشت میں تو پورے حقیقی واقعات ہی خوبصورت الفاظ کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔کسی بھی فن کو معراج کی بلندی تک پہنچانے میں جس بے باکی اور جرأت رندانہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف ایک خودنوشت نگار کے ہی نصیب میں ہوتا ہے۔فن اظہار ذات کا دوسرا نام ہے۔چوں کہ خودنوشت کا تعلق اسی سے ہے اور مصنف اپنے شدید داخلی جذبات کو پیش کرتا ہے اس لیے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ادب میں خودنوشت کو ایک فن کی حیثیت سے قبول کیا جا رہا ہے اور ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔

خودنوشت لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔اس کا مصنف ہمیشہ نمایاں شخصیت کا مالک اور صاحبِ کمال ہوتا ہے۔اب یہ ضروری نہیں کہ اُس شخص کا تعلق ادب ہی سے ہو۔زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص اپنی خودنوشت لکھ سکتا ہے۔کوئی بھی شخص اگر زبان پر قدرت رکھتا ہو تو اپنے حالات زندگی کو نثر میں بیان کر کے اپنی ذات اور اس میں پوشیدہ پہلوؤں سے دنیا کو روشناس کرا سکتا ہے۔

فن کے نقطۂ نگاہ سے زبان و بیان کی جو آزادی درکار ہونی چاہیے وہ خودنوشت میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، دونوں ملکوں کے کچھ فوجی افسروں نے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی خودنوشت لکھی ہیں۔فوجی زندگی یوں بھی رنگارنگی، بےفکری، خطرات اور مہمات سے بھرپور ہوتی ہے اس لیے ان کی خودنوشتوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان میں سے بعض نے اپنی خودنوشت انگریزی زبان میں لکھی ہے جو بعد میں ترجمہ ہو کر اردو میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔اس ضمن میں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ خودنوشت کی زبان اور بیان کا حسن بھی مصنف کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے اور اسلوب نگارش عام طور پر نثر ہی ہوتی ہے کیوں کہ نثر میں مبالغہ کی گنجائش کم ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔لیکن شاعری میں ضرورت کے لحاظ سے نام اور مقامات کو توڑ مروڑ کر بحر کے مطابق باندھا جاتا ہے اور پھر مجبوری میں لمبے لمبے فوٹ نوٹ دیے جاتے ہیں۔

ایسی ایک خودنوشت حمایت علی شاعر نے لکھی ہے جو کراچی سے شائع ہونے والے جریدے ''افکار'' کے صفحات پر قسط وار چھپی تھی اور اس میں یہ عیوب موجود تھے۔جگہوں اور اشخاص کے نام آدھے ادھورے نظم کر دیے پھر ان

کی تشریح یا تفہیم کے لیے فوٹ نوٹ لکھے گئے۔ایسی خودنوشت کم اثر انگیز ہوتی ہیں۔راقمہ کے خیال میں خودنوشت کو نثر میں ہی ہونا چاہیے اور اسے حقائق سے اتنا قریب ہونا چاہیے کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے ساتھ اس طرح مل جائے کہ اس کا ہمزاد معلوم ہونے لگے،ساتھ ہی تحریر صداقت اور سچائی کے محاسن سے بھر پور ہو۔خودنوشت نگار کو تعلّی سے بچنا چاہیے۔کم از کم اپنے قلم سے وہ اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے نہ ملائے۔حقائق سے خود اس کی شخصیت کا حسن ابھرنا چاہیے جسے قاری مطالعے کے بعد خود محسوس کرے کہ لکھنے والا واقعی سچ بول رہا ہے۔

خودنوشت میں بعض اوقات خاکہ نگاری اور تنقید نگاری کے بہترین نمونے بھی مل جاتے ہیں اور سیر وسیاحت کے حوالے سے سفرناموں کا لطف بھی خودنوشت میں آجاتا ہے۔مگر یہ اعتدال سے تجاوز کر گیا تو وہ خودنوشت کا حلیہ بگاڑ دے گا۔ایک بات تو ہر مصنف کے لیے ضروری ہے کہ اس کا قلم مہذب معاشرے کے تہذیبی دائرے سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔صداقت نگاری کا مطلب دل آزاری یا کیچڑ اچھالنا نہیں ہونا چاہیے اور یہی مصنف کے فن کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ ناگفتنی بات بھی اس طرح کہہ گزرے کہ طبع نازک پر ناگوار نہ گزرے۔

غرض کہ خودنوشت میں سچائی،شخصیت کے پرتو اور فن کی قدروں کے احساس سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ذاتی بیان کے باوجود خودنوشت میں ہر ایک کو متاثر کرنے والا حسن ہوتا ہے۔دراصل ہر تخلیق خالق کی شخصیت اس کے مزاج،عادات،افکار وعقائد کا نچوڑ ہوتی ہے۔اس کے بغیر وہ بے روح اور کھوکھلی ہوگی۔خودنوشت میں بے باک سچائی اور خلوص کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اس کا مقصد شخصیت کو پیش کرنا ہے اور ضروری ہے کہ تصنیف شخصیت کو واضح کردے اور فن کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جو کچھ بھی کہا جائے صفائی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا جائے۔یوسف حسین خان نے اپنی خودنوشت ''یادوں کی دنیا'' کے ابتدائیہ میں خودنوشت کے لیے سچائی کو سب سے اہم مانا ہے لکھتے ہیں کہ:

> ''خیالی نقوش جب صفحۂ قرطاس پر اتارے جاتے ہیں تو جذبہ کی رنگ آمیزش بھی کسی نہ کسی صورت میں راہ پا جاتی ہے۔تاہم ادیب کے ہاتھ سے صداقت اور حقیقت کا دامن نہیں چھوٹنا چاہیے۔'' 17

خودنوشت کے فن کو سمجھنے کے لیے ان اصناف کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن میں براہ راست تو نہیں لیکن کسی نہ کسی سطح پر خودنوشت کے عنصر شامل ہوتے ہیں یا وہ خودنوشت سے جڑے ہوتے ہیں،نیز ان کے درمیان فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔یہاں ان اصناف کا مختصراً تذکرہ پیش کیا جائے گا۔

1۔ روزنامچہ نگاری:-

انگریزی ادب میں روزنامچہ کے لیے لفظ 'ڈائری' اور 'جرنل' کا استعمال ہوتا ہے۔ کچھ ناقدین اسے محض ڈائری کہتے ہیں۔ جب کہ کچھ نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے اسے روزنامچہ سے تعبیر کیا ہے۔

روزنامچہ دراصل اس تحریر کو کہا جاتا ہے جسے مصنف اپنی زندگی کے روزانہ معمولات کو ایک ڈائری میں قلم بند کرے۔ اس لیے روزنامچہ کسی فرد واحد کے ذریعے روزانہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا ایک اہم دستاویز ہوتا ہے۔ یہ صرف روزمرہ کی زندگی کا ریکارڈ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں تاریخی، سوانحی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور ادبی پہلو بھی ہوتے ہیں۔

یوں تو تمام سوانحی تحریروں کا تعلق زندگی سے ہے اور ایسی تمام تحریروں میں کسی فرد واحد کی زندگی کا کم یا زیادہ لیکھا جوکھا پیش کیا جاتا ہے لیکن روزنامچہ میں مصنف کی ذات کچھ زیادہ حاوی ہوتی ہے۔ مکتوب نگاری میں جس کو خط لکھا جاتا ہے اس کا تصور ذہن میں موجود ہوتا ہے، اور سفرنامے میں بھی مصنف کے ہوتے ہوئے بھی اس کو آس پاس کی چیزیں متاثر کرتی ہیں جو اس کی تحریر میں مل کر ایک الگ رنگ پیش کرتی ہیں۔ جسے ہم آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن روزنامچہ میں مصنف نہ صرف اپنے روزمرہ کے واقعات و مصروفیات کا انکشاف کرتا ہے بلکہ اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے بھی روشناس کرواتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامچہ خودنوشت کے بہت قریب ہے۔ لیکن اس قربت کے باوجود خودنوشت اور روزنامچہ میں فرق پایا جاتا ہے۔ روزنامچہ میں روزانہ ہونے والے واقعات یا مصروفیات کا ذکر ہوتا ہے۔ مصنف دن بھر کے حالات و واقعات کو کم و بیش تحریر کرتا ہے۔ روزنامچہ میں اشخاص کے درمیان مکالمات کو من و عن تحریر میں لایا جاتا ہے۔ جو خودنوشت نگار کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ واقعات کے رونما ہونے کے ایک عرصہ بعد ان کو تحریر میں لاتا ہے۔ اس کے لیے اسے اپنی یادداشت اور قوت تخیل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ان واقعات کی تخلیق جدید کرنی پڑتی ہے اور یہی چیز خودنوشت نگاری کو تخلیقی ادب میں شامل کر دیتی ہے۔

روزنامچے میں وہ سارے واقعات قلم بند ہوتے ہیں جو روز و شب کے پردے پر نمودار ہوتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق مصنف کی ذات سے ہو یا نہ ہو۔ جب کہ خودنوشت میں مصنف ان ہی واقعات کو روشنی میں لاتا ہے جن کا تعلق خود اس کی ذات سے ہو۔ باقی واقعات یا دوسرے لوگوں کا ذکر محض ضمنی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ روزنامچہ اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے جاتے ہیں بلکہ یوں کہیں کہ یہ غیر مدون خودنوشت ہے۔ جب کہ خودنوشت اشاعت کی غرض سے منصوبہ بند طریقے سے لکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ خودنوشت لکھنے میں روزنامچوں کا اہم رول بھی ہوتا ہے۔

اردو میں مظہر علی سندیلوی اور خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے کافی مشہور ہیں۔اس کے علاوہ اختر انصاری کی ادبی ڈائری، جسے ہم روزنامچہ بھی کہہ سکتے ہیں، اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔خواجہ احمد عباس کا روزنامچہ ''مسافر کی ڈائری'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔اس میں ان کے مختلف سفروں کی دلچسپ روداد بیان کی گئی ہے۔ یہ روزنامچہ ڈائری کے ساتھ ساتھ سفرنامہ بھی ہے۔لیکن اس میں جو تکنیک اختیار کی گئی ہے وہ ڈائری والی ہے اس لیے اس کو روزنامچہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

خودنوشت میں روزنامچے کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ روزنامچے میں مصنف کے روزمرہ کے معمولات کا ذکر خود اس کی قلم سے لکھا ہوتا ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ روزنامچہ یا ڈائری روزانہ کے ہونے والے حالات وواقعات کا سرمایہ ہوتا ہے۔جس میں مصنف اپنی ذات اور اپنے آس پاس میں ہونے والے واقعات کو مختصراً تاریخی اعتبار سے تحریر کرتا ہے۔اس میں تاریخی صداقت بھی ہوتی ہے۔بعض ذاتی یا اپنے سے جڑی پوشیدہ باتوں کو کچھ مخصوص علائم کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ جب کہ خودنوشت میں صرف واقعات نہیں ہوتے بلکہ اس پر اظہار خیال بھی شامل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ خودنوشت نگار کسی واقعے کو ضروری نہیں کہ تاریخی صداقت کے ساتھ پیش کرے کیوں کہ خودنوشت زندگی کے آخری ایام میں لکھی جاتی ہے، اس وقت مصنف کا حافظہ اتنا قوی نہیں ہوتا کہ اسے ساری باتیں یاد ہوں، اس لیے بہت سارے واقعات کب رونما ہوئے صحیح تاریخ متعین نہیں کر پاتا اور وہ صرف مہینے یا سال سے کام چلا لیتا ہے۔

خودنوشت اور روزنامچہ دونوں اظہار ذات کے دو مختلف طریقے ہیں۔بہر حال ان تفرقات کے باوجود دونوں اصناف میں گہری مماثلت ہے۔میری اس بات کی دلالت صبیحہ انور کے اس اقتباس سے ہو جاتی ہے:

> ''روزنامچہ ایک ایسی چیز ہے جو آپ بیتی کے قریب ترین پہنچتی ہے اور اس میدان میں سفرنامہ، رپورتاژ، خطوط، ملفوظات وغیرہ کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔روزنامچہ ایک حد تک غیر مدون خودنوشت کا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں روزنامچے اور آپ بیتی دونوں کے لکھنے کے محرکات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔دونوں میں لکھنے والا اپنے اردگرد کے حالات کو اپنی ذات کی عینک سے دیکھ کر قلم بند کرتا ہے۔''18

2۔ مکتوب نگاری:-

خودنوشت کی ایک شکل مکتوب نگاری یا مراسلہ نگاری بھی ہے۔خط و کتابت دراصل ایسا طریقۂ اظہار ہے جس

میں انسان اپنے خیالات کو پیش کرتا ہے۔مکتوب نگاری دنیا کے تمام ادبوں میں عہدِ قدیم سے ہی مروج ہے۔ایران، مصر، روم، چین وغیرہ کی تہذیبوں میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔انگریزی زبان میں پندرہویں اور سولہویں صدی میں اس کا رواج ہوا۔ ہندوستان میں ابوالفضل، فیضی کے خطوط، بیدل کے رقعات، مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ان خطوط میں ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ معاشرے اور ماحول کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔اردو میں خطوط غالب سے جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں حقیقت بیانی پر کافی زور دیا جاتا ہے۔غالب کے خطوط اس کے غماز ہیں۔

مکتوب نگاری میں دو اشخاص (مکتوب اور مکتوب الیہ) کے درمیان تحریری گفتگو ہوتی ہے، جس میں اپنی نجی زندگی کے متعلق بہت سی ایسی باتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے جس کا اظہار کسی دوسری تحریر میں عام طور پر نہیں کیا جاتا۔یہی وجہ ہے کہ مکتوب کسی بھی شخص کی شخصیت اور اس کی نفسیاتی و ذہنی کیفیت کی نمائندہ عکاسی کرتا ہے۔خط چوں کہ ذاتی چیز ہوتی ہے۔اس لیے اس کے ذریعے لکھنے والے کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور یہی چیز اس کی زندگی کے بہت سے لطیف رشتوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

مکتوب نگاری کا فن ذاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔اگرچہ مذہبی، سیاسی، تجارتی، علمی وغیرہ خطوط بھی لکھے جاتے ہیں لیکن ان خطوط کو ادب کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا ہے۔ان ہی خطوط کو ادب کا درجہ حاصل ہوتا ہے جو ذاتی قسم کے ہوتے ہیں۔ان میں مکتوب نگار اپنی زندگی کی بہت چھوٹی باتوں کو بھی پیش کر دیتا ہے جو دوسری تحریروں میں ممکن نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں سوانحی عنصر شامل ہوتے ہیں اور ایسے خطوط بعد میں مکتوب نگار کی سوانح عمری مرتب کرنے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

بہر حال خودنوشت کا جو وصف ہے، حقیقت بیانی و سچائی وہ غالب کے خطوط میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ان کے خطوط میں وہ تمام لوازمات پائے جاتے ہیں جو ایک خودنوشت کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ اگر غالب کے خطوط کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان کی مکمل خودنوشت تیار ہو جائے گی۔ہاں یہ بات ضروری ہے کہ خطوط میں خیال کی ہم آہنگی اور تسلسل کا ہونا ضروری نہیں ہے۔لیکن خودنوشت میں یہ چیزیں پوری طرح موجود ہوتی ہیں۔

3۔ سفرنامے:-

سفرنامہ جسے انگریزی میں Travelougue کہا جاتا ہے، ایک مستقل بیانیہ صنف ہے۔جس میں صرف

ساکت اور جامد فطرت کی عکاسی نہیں کی جاتی بلکہ تحریر کے ذریعے مناظر اور واقعات کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک چلتی پھرتی تصویر کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

عالمی ادب میں سفرنامے کا وجود زمانۂ قدیم سے پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ہر زمانے میں سیاح آتے رہے اور اپنے سفرناموں میں یہاں کے لوگوں کے رہن سہن اور یہاں کی تہذیب وتمدن کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے۔ ہندوستان پر سفرنامے لکھنے والوں میں ہون سانگ، فاہیان، ابن بطوطہ اور عبدالرزاق کا نام سرفہرست ہے اور آج بھی یہ صنف بتدریج آگے بڑھ رہی ہے۔

جب کوئی شخص کسی خاص مقام کا سفر کرتا ہے تو وہ اپنے اس سفر کے دوران مختلف تجربات ومشاہدات سے روبرو ہوتا ہے۔ اگر مسافر حساس اور بالغ النظر ہو تو وہ سفر کے دوران پیش آنے والے حادثات وواقعات اور دیگر تجربات سے وہاں کے لوگوں، عمارتوں، رہن سہن وغیرہ ہر چیز کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اپنے خاص نقطۂ نظر کا استعمال کر کے اسے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے، جو سفرنامے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

سفرنامہ نگار کی حیثیت عام طور پر مورخ کی سی ہوتی ہے۔ جب کہ خودنوشت کا مصنف مورخ نہیں ہوتا ہے۔ خودنوشت میں مصنف واقعات یا کوئی شخص جو اس کے تعلق میں آتے ہیں اس کا ذکر اتنا ہی کرتا ہے، جتنا ان واقعات یا اشخاص سے اس کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ عمارتوں، بازاروں وغیرہ کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ اس کی منظر کشی اور واقعہ نگاری میں جان پیدا ہو جائے۔ اس کے نزدیک ایسی واقعہ نگاری محض ایک وسیلہ ہوتی ہے۔ جب کہ سفرنامے میں یہ بنیادی چیز ہوتی ہے۔ سفرنامہ زندگی کے ایک چھوٹے سے حصے پر مشتمل ہوتا ہے جب کہ خودنوشت زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے۔ سفرنامے خودنوشت کا حصہ ہوتے ہوئے بھی تاریخ سے زیادہ قریب ہے۔ سفرنامہ نگار چوں کہ اپنے سفر کی روداد بیان کرتے وقت اپنی ذات کو مقدم رکھتا ہے۔ جس سے اس کی زندگی اور نفسیات کے بے شمار پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس لیے اس میں خودنوشت کا پہلو حاوی ہوتا ہے۔

4۔ سوانح نگاری:-

ادب کی دوسری اصناف کی طرح سوانح نگاری بھی ایک اہم صنف ہے۔ سوانح نگاری کا رواج بھی قدیم ادب سے ملتا ہے۔ یہودیوں اور یونانیوں کے یہاں یہ رواج تھا کہ وہ قدما کی سرگزشت قلم بند کرتے تھے۔

سوانح نگار ایک طرف موضوع، مواد اور اسلوب پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے تو دوسری طرف شخصیت کے نہاں خانوں سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے اہم چیز موضوع ہوتی ہے۔ موضوع کا انتخاب کرتے وقت

اسے غیر جانب داری، دانشمندی اور ایمانداری کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانح نگار ایسی شخصیت کو اپنے موضوع کے طور پر انتخاب کرتا ہے۔ جس سے اس کی اچھی جان پہچان ہوتی ہے یا اس سے عقیدت رکھتا ہو۔

سوانح نگاری، کسی ایک شخص کی سیرت، شخصیت اور اس کے حالات و واقعات کو کسی دوسرے شخص کے ذریعے معرضِ وجود میں لانے کا نام ہے۔ خودنوشت میں مصنف اپنے زندگی کے حالات و واقعات خود لکھتا ہے۔ دوسرے اشخاص کا ذکر وہ ضمنی طور پر کرتا ہے۔ دونوں میں ادبی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنا لازمی ہوتا ہے۔

اس بحث سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ روزنامچہ نگاری، مکتوب نگاری، سفرنامہ نگاری، سوانح نگاری وغیرہ میں بعض ایسے اجزائے عناصر یا خصوصیات موجود ہیں، جو ایک دوسرے سے مشترک ہیں اور وہ کسی نہ کسی روپ میں خودنوشت میں بھی ملتے ہیں۔ چوں کہ یہ تمام اصناف اپنی ایک الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ صرف چند خصوصیات کے بنا پر ہم ان کو مکمل طور پر خودنوشت کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔ لیکن ان اصناف میں براہ راست تو نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر خودنوشت کے عناصر موجود ہیں اور تقریباً یہ تمام اصناف سوانحی ادب کا ایک حصہ ہیں۔

☆ خودنوشت:-

خودنوشت نثری ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ خودنوشت کا مفہوم یہ ہے کہ مصنف اپنے ہی قلم سے اپنی زندگی کے حالات کو قلم بند کرے۔ خودنوشت کو انگریزی میں Autobiography کہتے ہیں۔ یہ کسی شخص کی یادوں، پرانے واقعات پر مشتمل تفصیلات ہوتی ہے یا اس کو ہم رودادِ زندگی بھی کہہ سکتے ہیں۔

خودنوشت سوانحی ادب کی ایک شکل ہے۔ یہ ایک شخص کی حالاتِ زندگی پر مشتمل ہوتی ہے، جو اس نے خود قلم بند کیے ہوں۔ یہ زندگی کے کسی ایک گوشے پر مشتمل نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں مصنف اپنی زندگی کے ہر دور کے نمائندہ واقعات کو پیش کرتا ہے۔ اس میں اس کا بچپن، جوانی، بڑھاپا اور اس کی زندگی میں آئے تمام واقعات پوری طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔ البتہ اس کی زندگی کا آخری حصہ، جس میں وہ موت کی آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے اس کے ذکر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ڈرنکر باؤن (Drinker bowen) نے لکھا ہے کہ:

''وہ سوانح حیات بہت ہی مایوس کن ہوتی ہے، جس میں موت کا منظر نہ دکھایا گیا ہو۔''19

ادب کی کسی بھی صنف میں صداقت کو سب سے پہلے ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس پر چند لوگ ہی عمل کر پاتے ہیں۔ خودنوشت یا دیگر سوانحی تحریروں میں بھی سچائی شرطِ اول ہے۔ خودنوشت میں مصنف چوں کہ خود مجرم، خود ہی گواہ اور خود ہی جج ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اس کی سچائی پر حرف آنے کا زیادہ امکان رہتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ بعض ناقدین نے خودنوشت کو ناکام صنف قرار دیا ہے۔ کیوں کہ ان کا کہنا ہے کہ اس میں جھوٹ زیادہ ہوتا ہے۔ اظہار کے نام پر گمراہ کیا جاتا ہے اور خود کو پرلے درجے کا صاف گو اور راست باز کہہ کر دھوکہ دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ:

> ''خودنوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے۔ اس کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔ ایک اچھا خاصا سوانح نگار اپنے فن کی لاج رکھنے کے لیے بہت سی ایسی باتیں بیان کر دیتا ہے جو خودنوشت کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔ سوانح نگار اپنے ہیرو کے کردار کا جج بن سکتا ہے اس کی کمزوریوں کا شمار بھی کر سکتا ہے لیکن آپ بیتی میں اپنی محبت اور دوسروں کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح فہرست پیش کر سکتا ہے نہ اپنا صحیح جج بن سکتا ہے۔''20

ڈاکٹر سید عبداللہ کی مذکورہ باتیں درست ہیں لیکن جب کوئی خودنوشت نگار ایمانداری، دیانت داری اور دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اور اپنی محبت وانا سے قطع نظر اپنی باتوں کو رقم کرتا ہے، تو وہی خودنوشت شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ اردو میں بہت سی ایسی خودنوشت موجود ہیں جو اس کا بین ثبوت ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خودنوشت کا فن بہت مشکل اور صبر آزما ہے۔ خودنوشت کو تخلیقی صورت دینا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب لکھنے والا واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے، غلط روایات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اپنے ذاتی تجربات سے دوسروں کو مستفید کرنے کا سچا جذبہ رکھتا ہو۔ ناقدین ادب نے خودنوشت کے لیے خود اظہاریت، صداقت اور جمالیاتی کیفیت کو لازمی قرار دیا ہے۔ ایک اچھی خودنوشت جہاں ذات کے حوالے سے حیات و کائنات اور حقیقت و صداقت کی بہترین عکاس ہوتی ہے وہیں تاریخ اور عہد کی پہچان کرانے میں معاون و مددگار بھی ثابت ہوتی ہے۔ اس میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ خودنوشت میں مصنف اپنی ذات کے حوالے سے اپنے عہد کو اور اپنے عہد کے حوالے سے اپنی ذات کو دریافت کرتا ہے۔ اس فن کے ساتھ وہی انصاف کر سکتا ہے جو اپنی ہر بات کا ذکر صداقت کے ساتھ کر سکتا ہو۔ ایک معنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کانٹوں پر چل کر منزل کے جانب رواں دواں رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ لیکن حقیقت نگاری کے نام پر گھناؤنے اور بے مقصد موضوعات سے گریز کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد عمر رضا:

''عام طور پر خودنوشت نگار حقیقت نگاری کے نام پر بہت سے ایسے تفریحی یا فحش واقعات بیان کرتے ہیں جس کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اپنی خودنوشت سوانح کو مقبول عام بنانے کے لیے بہت سے خودنوشت نگار اپنی جنسی بے راہ رویوں اور دیگر نا زیبا باتوں کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کرتے ہیں تا کہ قارئین ان واقعات کو پڑھ کر لطف اندوز ہوں۔''21

مذکورہ باتیں کچھ حد تک درست بھی ہیں۔لیکن اگر خودنوشت نگار کی زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوتے بھی ہیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ ان واقعات کو وہ خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرے اور اپنی خودنوشت میں اسی کو غالب کر دے۔ وہ ایسے تمام حادثات و واقعات کو اس طرح پیش کرے جس سے قارئین پر مثبت اثر پڑے، نہ کہ اس کے لیے لطف اندوزی کا سامان بن کر رہ جائے۔یا پھر خودنوشت نگار کو اپنی ایسی باتوں کے ذریعے ایسا تأثر قطعی نہیں دینا چاہیے جس سے پڑھنے والا اسے اپنے وقار سے ہم آہنگ ہو کر خودنوشت نگار کی تقلید شروع کر دے۔

بہر حال ایسی تحریر جس میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات، تجربات و مشاہدات کو ایمانداری اور غیر جانب داری سے پیش کرتا ہے اور اس میں خاص طور پر صداقت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو اسے خودنوشت کا نام دیا جاتا ہے۔جو سوانحی ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔

خودنوشت اپنی زندگی سے متعلق اعتراف بقائے نسل کی خواہش ہوتی ہے اور اس طرح اپنی ذات کے اظہار کا نام ہی خودنوشت ہے۔انسان اپنی ذات سے متعلق کوئی نقش دنیا میں چھوڑ کر جانا چاہتا ہے اور پھر اس طرح یہ فانی زندگی بقائے دوام حاصل کرتی ہے۔خودنوشت بھی اپنی ذات کا نقش ہی ہے جسے لفظوں میں پرونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے کیوں کہ اس کے اولین شرائط میں سے صداقت اور بے باکی کو سب سے اہم مانا جاتا ہے۔اس کے بغیر خودنوشت صرف من گھڑت کہانیوں کا مجموعہ معلوم پڑے گی۔تاریخ گواہ ہے کہ سچائی کے ساتھ جو خودنوشت اب تک رقم کی گئی ہے وہی بقائے دوام کو پہنچ کر اہلِ ذوق میں خوب پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔

اس کے برعکس خودنوشت لکھنا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو بیان کر دینا ہی کافی نہیں ہے۔اس کے لیے بلند تخیل اور وسیع النظر ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔اس کے ساتھ ہی مصنف کے اندر تخلیقی صلاحیت موجود ہو تو سونے پہ سہاگے جیسی بات ہوگی۔نجی زندگی کے حالات و واقعات کے ساتھ اپنے عہد، ہم عصروں کا ذکر، سیاسی و سماجی پہلوؤں پر بھی مصنف کو ضمنی طور پر بحث کرنا چاہیے۔اپنی ذات سے متعلق حالات و واقعات

کو لفظوں کا جامہ پہنانا ہماری سرشت میں داخل ہے لیکن تخلیقی صلاحیت نہ ہو تو اس کو منظّم طریقے سے اکٹھا کرنا اور پھر اس کو رقم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہر شخص اپنی خودنوشت لکھنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنی ذات کا بیان وہ مختلف صورتوں جیسے روزنامچہ، خطوط، سفرنامے وغیرہ میں کرتا رہتا ہے۔

اس سلسلے میں صبیحہ انور لکھتی ہیں کہ:

''آپ بیتی ہر ایرا غیرا نہیں لکھتا اس کا مصنف ہمیشہ نمایاں شخصیت کا مالک اور صاحب کمال ہوتا ہے۔ یہ کام ضروری نہیں کمال ادب ہو۔ سیاست، فوج، مصوری، نقاشی، کھیل کود غرض کہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ممکن ہے۔''22

یہ بات بالکل درست ہے کہ ایک ماہر تخلیق کار کے اندر خداداد صلاحیت موجود ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اس کی تحریر کو مقبولیت ملتی ہے۔ اسی طرح کوئی شخص جب خودنوشت لکھنے کا قصد کرتا ہے تو وہ اپنی نجی زندگی کو صفحۂ قرطاس پر بہتر طریقے سے تبھی بکھیر سکتا ہے جب اس کے اندر تخلیقی صلاحیت موجود ہو۔

ایک شخص کے بارے میں کسی دوسرے شخص کی لکھی ہوئی سوانح اور خود اپنی لکھی ہوئی سوانح میں نمایاں اور پہلا فرق یہی ہے کہ سوانح عمری میں ہیرو مہد سے لے کر لحد تک نظر آتا ہے یعنی سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ جس کی سوانح لکھ رہا ہے اس کی پیدائش سے لے کر زندگی کے آخر تک کے تمام حالات و واقعات ایمانداری و سچائی کے ساتھ من و عن بیان کرے۔ خودنوشت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے حالات اسی کے ذریعے لکھی گئی ہو۔

خودنوشت ایک شخص کی حالاتِ زندگی پر مشتمل ہوتی ہے، جو اس نے خود قلم بند کیے ہوں۔ یہ زندگی کے کسی ایک گوشے پر مشتمل نہیں ہوتی ہے۔ لیکن ایک خودنوشت نگار سے مکمل زندگی کو پیش کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے اس طرح دیکھا جائے تو اول کوئی بھی خودنوشت مکمل نہیں ہوتی، یعنی یہ اس حیثیت سے لکھی ہی نہیں جاتی کہ پوری زندگی کے تمام واقعات کو دکھایا جائے۔ اس لیے ایک خودنوشت نگار اپنی زندگی کا آخری حصہ، جس میں وہ موت کی پریشانیوں یا آسانیوں سے دوچار ہوتا ہے اس کے ذکر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بچپن کے حالات کو بیان کرنا بھی ایک مشکل امر ہے اور کسی انسان کے لیے بچپن کے معصوم زمانے کی باتوں کا یاد رہنا بھی ناممکن ہے۔ البتہ محض سنے سنائے واقعات ہی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح خودنوشت نگار کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا آخری سال کب ہوگا اور اپنی زندگی کی تکمیل اپنی تصنیف میں دکھا دے۔ ویسے بھی کسی کو کیا معلوم کہ زندگی کا آفتاب کب غروب ہو گا۔ صبیحہ انور لکھتی ہیں:

''خودنوشت میں شخصیت نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خودنوشت سوانح حیات عموماً بڑھاپے کی تخلیق ہوا کرتی ہے۔ پچاس، ساٹھ، ستّر اور اس سے زیادہ عمر میں لوگوں نے خودنوشت سوانح حیات لکھنے پر توجہ کی ہے۔ یہ زمانہ زیادہ پختگی کا ہوتا ہے اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کا امکان نہیں رہ جاتا ہے۔ اس کلیہ کا اطلاق صرف مستقل اور باقاعدہ تصنیف پر ہوتا ہے۔''23

عام طور پر ایک خودنوشت نگار اپنی خودنوشت زندگی کے آخری ایام میں ہی لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر یہ ضروری نہیں ہے کہ ماضی کی تمام یادیں مصنف کے ذہن میں ہوں۔ اسے یہ بھی اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کن راستوں سے چل کر منزل کے آخر تک پہنچا ہے اس لئے زندگی کی تمام راہوں پر غور کرنا اور غور کر کے تمام حقائق کو صحیح طریقے سے بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ انسان کا ذہن اگرچہ بڑا وسیع نظام رکھتا ہے، یاد رکھنے کی بڑی فضیلتیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر گزری ہوئی زندگی اور زندگی سے متعلق ہر بات کا یاد رہنا بھی کچھ ناممکن سا ہے۔ اگر سب کچھ یاد رہ بھی سکتا ہے تو انسانی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اپنے ذہن کو جھٹک کر ایسے ناپسندیدہ واقعات اور ناخوشگوار باتیں نکال دینا چاہتا ہے، جن کو یاد رکھنے میں اس کو تکلیف اور چبھن محسوس ہوتی ہے۔ جہاں انسان بھول جانے کی فطرت رکھتا ہے وہاں ذہن کی تخلیقات کو جگہ دے دی جاتی ہے یا انسان اپنے ذہن کی مدد سے بھولی ہوئی تصویروں کی جگہ اپنے تخیل کی بنیاد پر نئی نئی تصویروں کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یوں تو کسی مشہور ہستی کے حالات لکھ کر بھی ایک تسکین حاصل ہوتی ہے لیکن اپنے حالات لکھنا اور زیادہ روحانی تسکین دیتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی محبت میں آپ مبتلا رہتا ہے جو کہ انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ اسی وجہ سے اُس کو اپنی کوتاہی بھی عظمت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کو اپنی نظر میں عظیم بنا کر اپنی پوجا خود کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس پہلو سے خودنوشت تخلیق کی جاتی ہے تو خودنوشت میں اپنی ہی سرگزشت افسانوی رنگ میں نظر آتی ہے۔ انسان اپنے عیوب پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے تاکہ وہ دوسروں کی نظر میں اور اس سے بھی بڑھ چڑھ کر اپنی نظر میں سرخرو ہو سکے۔ اس کے علاوہ کچھ مصنفین اپنی خودنوشت میں اپنے ذات سے متعلق بعض غلطیوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کے اعتراف سے جو ندامت ہوتی ہے وہ گناہوں کو دھو دیتی ہے اور اس طرح اعتراف کرنے والوں کی روح پاکیزہ ہوتی ہے۔ اگر اس پہلو سے غور کریں تو خودنوشت انسان کی ندامت کا افسانہ ہے جس کی وجہ سے ایسی خودنوشتوں میں ایک گہرا عرفانی رنگ ملتا ہے، اس طرح ان دونوں رنگوں کے امتزاج سے خودنوشت میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک طرف احساس

ندامت تو دوسری طرف خود پرستی۔

اس کے علاوہ جب مصنف اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہے تو وہاں اسے اپنا قلم سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ان غلطیوں کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو یہ جرأت رکھتے ہیں کہ اپنی اچھائیوں کے ساتھ ساری برائیوں کو بھی من وعن بیان کر دیں۔ اس سلسلے میں مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ بیتی میں صفات کا لبادہ اتار کر اپنی ذات کو عریاں دیکھنا معمولی دل گردے کے آدمی کا کام نہیں۔ اپنی ذات کو اس طرح دیکھ کر کبھی رونا آتا ہے کبھی ہنسی۔ خودنوشت سوانح حیات میں آخری منزل فنا اور بقا کی ہے۔ اپنے آپ کو باقی کیسے رکھا جائے یہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ آپ بیتی اس مسئلے کا تحریری اظہار اور کبھی کبھی جواز بھی ہے۔ آپ بیتی میں بقا کا حصول اپنے کو فنا کیے بغیر ممکن نہیں۔''24

اگر خودنوشت نگار اپنے آپ کو ایک مثالی ہیرو کی طرح پیش کرتا نظر آتا ہے تو ایسی خودنوشت کو فرضی کہانی قرار دے دیا جاتا ہے کیوں کہ اس میں وہ ایک معمولی انسان نظر ہی نہیں آتا بلکہ ایسی خودنوشت بھی قاری کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ خودنوشت لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ سچائی، خلوص اور بے باکی، اس کی پہلی شرط ہے اور یہ تمام خصوصیات ایک خودنوشت میں بدرجۂ اتم موجود ہوں، ضروری نہیں ہے۔ اس کام کی دشواری کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اپنی زندگی یادوں کے سہارے از سر نو مرتب کرنا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنی زندگی کی کہانی ہو بہو پیش کر سکتے ہیں۔ کون اپنی نفس کی تہوں تک پہنچ سکتا ہے اور کون صحیح طور پر پہنچنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بہر حال سچ تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی خودنوشتیں لکھی ہیں اور اس مشکل فن سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

خودنوشت میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات بے کم وکاست بیان کرنے کے بجائے کسی مثالی شخص کی زندگی بیان کرنے بیٹھ جاتا ہے اور اس کی زندگی کے حقیقی واقعات بے نقاب ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ نجی حالات بیان کرتے وقت بعض باتیں تخیل کی مدد سے لکھتے ہیں اور بعض باتیں فرض بھی کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک کٹھ پتلی کی سرگزشت قارئین کے سامنے آتی ہے جو نہ دل کے لیے کشش رکھتی ہے اور نہ دماغ کے لئے۔ دراصل ایک خودنوشت دل کش اور جاذب تبھی ہوسکتی ہے جب مصنف اپنا خود ناقد بن کر اپنی زندگی کے تمام اچھے برے پہلوؤں کو پیش کرے۔ اگر وہ اپنی طرف سے کچھ چھُپاتا ہے تو وہ خود اپنے ساتھ ہی دھوکہ کرتا ہے۔ کیوں کہ انسان غلطیوں کا پُتلہ

ہے اور ہر انسان بہر حال انسان ہے۔ ہر کسی کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، ہر کسی کی شخصیت میں کچھ خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی موجود ہوتی ہیں وہ کوئی فرشتہ نہیں ہے جو غلطیوں سے مبرا ہوگا۔ سوائے کچھ گنے چنے لوگوں کے کون ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک ہے۔ جب کوئی مصنف صرف اپنی خوبیاں ہی پیش کرتا ہے تو وہ سپاٹ زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے، اور حقائق کی جستجو کرنے والے، زندگی پر گہری نظر رکھنے والے کو اس کی نیت پر شبہ ہو جاتا ہے اور پھر ایسی تصنیف کو وہ بالکل اہمیت نہیں دیتا۔ اس لیے ایک خودنوشت نگار کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی کے واقعات کے ساتھ، اپنے عہد، سیاسی وسماجی پہلو پر سچائی اور خلوص کے ساتھ بحث کرے تا کہ قارئین کو بھی یہ پڑھتے ہوئے احساس نہ ہو کہ وہ کسی ناول یا افسانے کے ہیرو کی سرگزشت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

خودنوشت نگار جب تمام مواد اکٹھا کر لے تو اس کی صحیح ترتیب وتدوین کرنا بھی ایک مشکل امر ہے یعنی اس کی زندگی میں جو واقعات پہلے ہوئے وہ پہلے اور جو بعد میں ہوئے وہ بعد میں پیش کرے۔ ہر بات اور واقعے کو مناسب اور زندگی کی ترتیب کے مطابق جگہ ملے۔ اس کے بعد بڑے فن کارانہ انداز میں زندگی بھر کے چھوٹے بڑے واقعات و حالات میں سے مناسب چیزیں ہی تحریر کرے۔ اگر واقعات کی ترتیب کا خیال نہ رکھا گیا تو قارئین کو پڑھتے وقت بڑی مشکل ہوتی ہے کیوں کہ وہ سمجھ نہیں پاتا کہ کون سے واقعات پہلے پیش آئے اور کون سے بعد میں۔ اس ضمن میں دیوان سنگھ، شان الحق، جتیندر بلو، حبیب تنویر وغیرہ کی خودنوشت پیش کی جاسکتی ہے جو ترتیب وار نہ ہو کر زندگی کے اہم واقعات پر مبنی ہے۔

اسی طرح اگر مدتِ حیات طویل ہے تو تمام تر باتوں کو بیان کرنے سے تصنیف بھی زندگی کی طرح طویل ہوگی اور یہ طوالت قارئین کے لئے مشکل کی حد تک پہنچ جائے گی۔ اس کے لیے نہایت فن کاری اور ہوش مندی کی ضرورت ہے۔ خودنوشت نگار کے لئے مناسب یہ ہوگا کہ وہ باتیں یا واقعات جن کا تعلق زندگی کے روزمرہ معمولات سے ہے اور جو عام طور پر ہر کسی کی زندگی میں ہوا کرتی ہیں اس سے گریز کرے۔ اس قسم کی باتوں سے کسی کی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ ساتھ ہی یہ بات بھی دھیان میں رہے کہ کوئی ضروری بات نہ چھوٹ جائے اور تمام غیر ضروری باتوں کے تذکرے سے اجتناب کیا جائے۔ یہ درجہ فنکاری اور وسیع النظری کا کام ہے کہ مصنف کو اپنی ذات سے متعلق کیا پیش کرنا ہے اور کیا نہیں۔ تا کہ تصنیف نہ تو قارئین کے لیے بار بنے اور نہ کوئی ضروری بات بیان کرنے سے رہ جائے۔

اس کے علاوہ کچھ خودنوشت نگار اپنی ذات کے بیان کے دوران کسی دوسرے شخص کا ذکر آجائے تو اس کے

ساتھ ادھر اُدھر دور تک بہک جاتے ہیں ۔ بڑی دور تک انجانے لوگوں کے ساتھ چلنے کے بعد ان کو خیال آتا ہے کہ وہ اپنے نجی حالات بیان کر رہے تھے اور ادھر ادھر کا بیان کرنا ان کا مقصد نہیں تھا، تب جا کر اپنے حالات بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس طرح قارئین کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اپنی ذات کے ذکر کے ساتھ اپنے ہم عصروں، اپنی پسند اور ذوق وشوق کا ذکر ضمنی ہونا چاہیے نہ کہ اپنے خاندان یا اور کسی کا ذکر آئے تو اس کے متعلق تحریر طولانی کر دی جائے، پھر ایسی خودنوشت آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی بن کر سامنے آتی ہے۔ جس طرح ''شہاب نامہ'' میں بھی کچھ ایسے کرداروں کے خاکے کے ساتھ قدرت اللہ شہاب نے اپنی تخلیقات پر ناقدین کی رائے اور تبصرے کو شامل کر کے خودنوشت کی ضخامت کو بڑھا دیا ہے۔

بہر حال ایسی تحریر جس میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات، تجربات ومشاہدات کو ایمانداری اور غیر جانب داری سے پیش کرتا ہے اور اس میں خاص طور پر صداقت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو اسے خودنوشت کا نام دیا جاتا ہے۔ خودنوشت کی تعریف کے سلسلے میں ناقدین کا خیال ہے کہ اب تک اس کی کوئی جامع اور مکمل تعریف وجود میں نہیں آئی ہے۔ اس صنف میں روز بروز نئی نئی جہات کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے اب تک کوئی بھی تعریف اس کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کر سکی ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ترقی پذیر صنف ہے۔ یہ ایک بت ہزار شیوہ ہے۔ جس کے ہر رنگ میں بہت سارے رنگ پنہاں ہیں۔ پھر بھی ناقدینِ مشرق ومغرب نے ادب کی اس صنف پر کافی توجہ صرف کی ہے اور اس کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانکا میں خودنوشت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ''خودنوشت سوانح نگاری کا سوانح نگاری سے بہت قریبی تعلق ہے یا یہ کہ خودنوشت سوانح نگاری سوانحی ادب کی خاص شکل ہے۔ یہ ایک شخص کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود قلم بند کیے ہوں اس لیے یہ پوری نہیں ہوتی۔'' 25

مندرجہ بالا تعریف سے خودنوشت کا ہلکا سا خاکہ ابھرتا ہے۔ اس کے مطابق خودنوشت کا تعلق سوانح نگاری سے بہت گہرا ہے۔ سوانح عمری میں کسی اہم شخص کی زندگی کے حالات وواقعات کی مکمل تفصیلات پیش کی جاتی ہے۔ کیوں کہ سوانح نگاری ہیرو کے انتقال کے بعد معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس لیے اس کا مکمل خاکہ ملتا ہے۔ لیکن خودنوشت میں مصنف چوں کہ خود اپنے متعلق لکھتا ہے۔ اس لیے اپنی زندگی کے آخری ایّام پر روشنی ڈالنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت نامکمل یعنی Unfinished ہوتی ہے۔

سوانح عمری میں مصنف کسی دوسرے کی زندگی کو اپنی تحریر کا حصہ بناتا ہے۔ جب کہ خودنوشت میں مصنف خود

اپنی زندگی اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری میں Autobiography کو "The story of one's life,written by himself" کہا گیا ہے۔

خودنوشت کی تعریف کرتے ہوئے بلیز نگ لکھتا ہے کہ:

''خودنوشت سوانح نگاری گڑے مردے اکھاڑنے کی قسم ہے۔ خودنوشت نگار کو اپنی کہانی اس وقت شروع کرنی چاہیے جہاں پر اس کی زندگی اس موڑ پر پہنچ جائے، جہاں سے آگے بڑھنے کا امکان نہ ہو گویا خودنوشت نگار اپنی خودنوشت اس وقت تحریر کرتا ہے جب اس کی زندگی ختم ہو جائے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خودنوشت میں انسان دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔''26

چوں کہ خودنوشت میں مصنف اپنی زندگی کے تمام واقعات کو صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہے۔ اس میں اس کا بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ اپنی عمر کے آخری لمحات میں بچپن، لڑکپن وغیرہ کی باتوں اور واقعات کو اوراق پر منتقل کرنا گڑے مردے اکھاڑنے کے برابر ہی ہوتا ہے۔ یہاں بلیز نگ کی یہ بات درست ہے کہ خودنوشت نگار کو اپنی خودنوشت زندگی کے آخری ایّام میں ہی لکھنا چاہیے۔ جب مصنف کو لگے کہ اس نے اپنی زندگی کو پوری طرح جی لیا ہے اور اس کو اس بات کا بخوبی احساس ہو جائے کہ اب اس کی زندگی کا آخری پڑاؤ ہے، اسے جو کچھ کرنا تھا کر لیا تب اگر اپنی خودنوشت تحریر کرتا ہے تو وہ زیادہ پر اثر ہوگی اور اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا زیادہ سے زیادہ احاطہ کر سکے گی۔

وہاج الدین علوی لکھتے ہیں کہ:

''خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فرد واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی رہین منت ہوتی ہے۔ جس کے آئینہ میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہِ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔''27

ڈاکٹر صبیحہ انور لکھتی ہیں کہ:

''خودنوشت سوانح حیات سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات میں مصور اپنی تصویر خود بناتا ہے۔ بشری تقاضے کے تحت اس کا غیر ارادی مطمح نظر یہی ہوتا ہے کہ لوگ اس کو پہچانیں۔''28

بقول پروفیسر مظہر مہدی:

''خودنوشت سوانح میں اظہار ذات، تاریخی صداقت، جمالیاتی کیف اور ادبیت کی موجودگی لازمی ہے۔ یہ ایک بیانیہ اور نیم تخلیقی صنف ادب ہے۔ اس کی زبان تخلیقی اور ادبی ہوتی ہے۔ جذبات کے اظہار کا انداز ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ اس میں مصنف کبھی حزنیہ، کبھی مزاحیہ، کبھی خطیبانہ اور کبھی سنجیدہ انداز اختیار کرتا ہے۔''29

طفیل احمد لکھتے ہیں کہ:

''مختصر لفظوں میں آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات و نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم وکاست قلم بند کر دی ہو۔ جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کو خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں۔''30

مذکورہ بالا تعریف کچھ معنوں میں خودنوشت کی مکمل تعریف پیش کرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خودنوشت میں انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، نظریات وغیرہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں اس کی زندگی کے تمام نشیب و فراز بھی شامل ہوتے ہیں۔ مگر یہاں بے کم وکاست کی شرط لازمی نہیں ہے، کیوں کہ کسی کی زندگی کو بے کم وکاست نہ تو مصنف قلم بند کر سکتا ہے اور نہ سوانح نگار۔ وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کو پوری طرح پیش کرنے سے کتراتا ہے۔ اس لیے سچائی اور حقائق پر مبنی باتیں بلا کم وکاست بیان کرنا ایک مشکل امر ہے۔ خودنوشت نگار جب طویل عرصے کے بعد لکھنے بیٹھتا ہے تو بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک کے واقعات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کا اس کے پاس کوئی مواد یا ماخذ نہیں ہوتا ہے۔ صرف اس کا حافظہ ہی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ محض یادداشت کی بنا پر واقعات کا بے کم وکاست بیان کر پانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

مظہر مہدی نے صحیح لکھا ہے کہ خودنوشت سوانح میں اپنی ذات کے اظہار میں تاریخی صداقت و ادبیت وغیرہ کی موجودگی لازمی ہے۔ خودنوشت ایک بیانیہ صنف ہے۔ اس میں مصنف اپنے حالات و واقعات کا بیان سلسلہ وار مختلف انداز میں کرتا ہے۔

ریحانہ خانم لکھتی ہیں کہ:

''آپ بیتی میں سچائی، بے باکی اور خلوص کی حد سے زیادہ ضرورت ہے۔ سچائی اور برہنہ سچائی کی ضرورت ہے۔ شخصیت کے ابھرنے کے لیے تصنیف لکھی گئی ہے اور لازمی ہے کہ

تصنیف شخصیت کو واضح صورت میں دکھلا دے۔غرض ترتیب، تسلسل، مناسب انتخاب کی ضرورت ہے اور فن کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ سادگی اور صفائی سے بیان ہو، ابلاغ میں کسی قسم کا الٹ پھیر، تصنع اور پیچیدگی نہ ہو۔'' 31

کچھ ناقدین کا ماننا ہے کہ خودنوشت سوانح کے لیے نثر زیادہ موزوں ہے۔اس لیے خودنوشت سوانح کا نثر میں ہونا بھی ایک شرط ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ ناقدین نے نثر کی قید لگانے کی مخالفت بھی کی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ خودنوشت نظم میں بھی تحریر ہوسکتی ہے۔خودنوشت نثر اور نظم دونوں ہیئت میں لکھی جاسکتی ہے۔لیکن راقمہ یوسف جمال کے درج ذیل بیان سے اتفاق کرتی ہے کہ:

'' آپ بیتی اپنے حالات کو نثر میں لکھنا ہے۔یعنی بنیادی شرائط دو ہیں اول یہ کہ مصنف اپنے حالات خود لکھے، دوسرے یہ کہ وہ حالات نثر میں ہوں۔''

خودنوشت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'' آپ بیتی اور اعترافات بقائے نسل کی خواہش کے علاوہ خود اپنی ذات کا اظہار ہے۔'' 32

آگے لکھتے ہیں:

''خودنوشت میں تنقید کے مواقع نہیں ہوتے۔یہاں تو ہم اپنے کو جیسا تصور کرتے ہیں ویسا یا اس سے بڑھ چڑھ کر ظاہر کرتے ہیں بلکہ ثابت کر دیتے ہیں۔آپ بیتی پر ایمان لانا قارئین کے لیے ضروری نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ مشاہیر کی آپ بیتیوں پر بعد کے لوگوں نے اختلافی مضامین لکھے۔'' 33

خودنوشت، سوانحی ادب کی ایک قسم ہے۔جس میں مصنف خود اپنی زندگی کی داستان قلم بند کرتا ہے۔جو خود ہیرو ہوتا ہے اور اسی کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔وہ اپنی خودنوشت میں اپنے عہد کے نمائندہ ہم عصروں، سیاسی وسماجی حالات وواقعات کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔لیکن ان سب کی حیثیت ذیلی اور ضمنی ہوتی ہے۔

خودنوشت نگار کو اپنے تجربات، مشاہدات وجذبات کی عکاسی مکمل طور پر کرنا چاہیے۔وہ اپنی زندگی کے نمائندہ واقعات مثلاً بچپن، جوانی، بڑھاپا، عروج وزوال، نشاط وغم اور خوبیوں وخامیوں غرض سبھی کچھ نہایت ہی دیانت داری، صداقت اور تخلیقیت کے ساتھ پیش کرے۔اس کے لیے مصنف کو صرف اپنی یادداشت پر ہی منحصر نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کی چھان بین اور بازیافت کر کے ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔خاص طور پر زندگی کے حالات وواقعات کو بتدریج کچھ

اس طرح پیش کرے کہ اس میں ربط و تسلسل کا احساس باقی رہے۔اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ کوئی بات یا واقعہ کو اتنا بڑھا چڑھا کر نہ پیش کیا جائے کہ پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس کرے۔اگر مصنف کی زندگی میں ایسے حالات و واقعات رونما ہوئے ہیں جو بہت طویل ہیں تو وہاں اختصار سے کام لینا چاہیے اور اس انداز میں بیان کرے کہ پورے واقعے کی وضاحت ہو جائے۔

بہر حال خودنوشت لکھتے وقت خودنوشت نگار کو صداقت و ایمان داری کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔اپنی باتوں پر پردہ ڈالنا یا کسی طرح کے غلو کو شامل کرنا فنِ خودنوشت نگاری کے خلاف ہے۔اپنی زندگی کے متعلق جو بھی بیان کرے وہ فطری ہو اور حسب حال ہو۔ایسا نہیں کہ اپنی پیدائش کا تجربہ خود اپنی زبان سے بیان کرنے لگے۔ہر حال میں حقیقت نگاری کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

تمام بحث و مباحثے کے بعد راقمہ اس نتیجے پہ پہنچی ہے کہ خودنوشت بیانیہ ہونے کے ساتھ ہی ایک مشکل فن ہے۔جس میں فرد واحد، ذاتی حالات و واقعات ،سچائی، ایمانداری، غیر جانب داری اور واقعات کی منطقی ترتیب کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔خودنوشت نگار اپنی زندگی کے تمام واقعات چاہے وہ اچھے ہوں یا برے پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ پیش کرے تا کہ قارئین کے پڑھنے کے بعد اس کے سامنے مصنف کا مکمل خاکہ ابھر کر آ جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں مصنف کا عہد، معاشرہ، سیاسی و سماجی حالات بھی جلوہ گر ہوں۔

خودنوشت کی قسمیں

ناقدین نے خودنوشت کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے۔جو مندرجہ ذیل ہیں:-

ہیئت کے اعتبار سے خودنوشت کی قسمیں:-

خودنوشت کی روایت بہت پرانی ہے۔دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں اس پر تجربے کیے گئے اور بہترین خوددنوشتیں لکھی گئی ہیں۔خودنوشت میں کسی خاص اصول وضوابط کی قید نہیں ہے۔اسی لیے کہا گیا ہے کہ یہ ایک نیم تخلیقی و نیم بیانیہ صنف ہے۔ادب میں مواد و ہیئت کا سلسلہ بہت اہم ہوتا ہے۔خودنوشت کسی ہیئت کی پابند نہیں ہے۔یہ مصنف کی ذات پر منحصر ہے کہ وہ نثر یا نظم کی کس ہیئت میں اپنی رودادِ زندگی پیش کرنا چاہتا ہے۔لیکن دنیا کی تمام زبانوں میں خودنوشت کا زیادہ تر حصہ نثر میں موجود ہے۔اردو ادب میں بھی خودنوشت کا ایک بڑا سرمایہ نثری اسلوب میں ملتا ہے۔جب کہ منظوم خودنوشت کا دور تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ منظوم خودنوشت میں شعری محاسن تو ہو

سکتے ہیں لیکن ایک بہاؤ، تسلسل اور جامعیت نہیں ہوسکتی جو نثری خودنوشت کا خاصہ ہے۔ بہر حال خودنوشت کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا نثری خودنوشت اور دوسرا منظوم خودنوشت۔

ان اقسام کے علاوہ بھی خودنوشت کی کئی قسمیں ملتی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

(1) مختصر خودنوشت:-

مختصر خودنوشت کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ اردو میں خودنوشت کی شروعات انہیں مختصر سوانحی اشاروں سے ہوئی ہے۔ ایسی خودنوشتوں میں مصنف اپنے بارے میں اہم اور بعض بنیادی معلومات درج کر دیتا ہے۔ اس میں مختصر معلومات فراہم کی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ان میں ان اشخاص کی حالات زندگی پر مکمل روشنی نہیں پڑتی۔ اختصار کی وجہ سے کسی شخصیت کی زندگی کے ان گوشوں پر بھی نظر نہیں پڑتی جو نہایت اہم ہوتے ہیں۔ مختصر خودنوشت کو سوانحی اشارے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اردو ادب میں ہر شاعر اور ادیب نے اپنی مختصر خودنوشت قلم بند کی ہے۔

(2) طویل خودنوشت:-

اردو میں مختصر خودنوشت کے ساتھ ساتھ طویل خودنوشت بھی اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ ابتدائی دور میں مختصر خودنوشت کا ہی رواج تھا۔ طویل خودنوشت بعد میں لکھی جانے لگیں اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل آپ بیتیاں منظر عام پر آئیں۔ اس میں مصنف اپنے حالات زندگی اور اس میں پیش آنے والے واقعات کو قدرے تفصیل سے بیان کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنی زندگی سے متعلق ہر گوشے کو واضح کرتا ہے۔ اس طرح کی خودنوشت سے نہ صرف مصنف کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے بلکہ بہت سے ایسے لوگوں کے بارے میں بھی نہایت اہم معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ جو اس شخص کی زندگی سے متعلق بہت اہم ہوتے ہیں۔ اس طرح طویل خودنوشت مکمل طور پر مصنف کی شخصیت اور اس کے حالات و کوائف کا پتہ دیتی ہیں۔

(3) افسانوی خودنوشت:-

وہاج الدین علوی نے اس کی تین الگ قسمیں بتائی ہیں اور اس میں سوانحی ناول، افسانوی خودنوشت اور تذکراتی خودنوشت کو شامل کیا ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(الف) سوانحی ناول:-

سوانحی ناول کا وجود سب سے پہلے انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ بعد میں اردو ادب میں بھی اس فن اور

تکنیک کو اپنایا گیا اور بہت سے سوانحی ناول لکھے گئے۔ اردو میں سوانحی ناولوں کے ابتدائی نمونے سجاد کسمنڈوی کا ناول ''نشتر'' اور مرزا ہادی رسوا کا ''امراؤ جان ادا'' ہیں جو کافی مشہور ہیں۔ باضابطہ طور پر سوانحی ناول قرۃ العین حیدر نے ''کارِ جہاں دراز ہے'' کے نام سے لکھا جس کو انہوں نے ''فیملی ساگا'' کا نام دیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خاندان کے حالات اور افراد کو ناول کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی کی تصنیف ''کاغذی ہے پیرہن'' اسی ضمن کی تخلیق ہے۔ سوانحی ناول میں واقعات اور کردار حقیقی ہوتے ہیں جس کو مصنف افسانوی تکنیک میں پیش کرتا ہے۔

(ب) افسانوی خودنوشت:-

صنف افسانہ جدید دور کی پیداوار ہے۔ اس میں ایک کامیاب تجربہ افسانوی خودنوشت کا ہے۔ مگر افسانوی خودنوشتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اردو ادب میں جگ بیتی انداز کی کہانیاں ملتی ہیں۔ ان سب کے باوجود اردو ادب میں بعض افسانوی خودنوشتیں مل جاتی ہیں۔ جیسے شاد کی کہانی شاد کی زبانی، شاہد احمد دہلوی کی ''فرحت اللہ بیگ کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' اور عبدالغفار مدھولی کی خودنوشت دو جلدوں میں ''طالب علم کی کہانی'' اور ''معلم کی کہانی'' اس نوع کی خودنوشتیں ہیں۔ ان میں واقعات کو کہانی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

(ج) تذکراتی خودنوشت:-

اردو میں جو تذکرے ملتے ہیں ان میں کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں مختصر ذکر ملتا ہے۔ اردو ادب میں بے شمار تذکرے لکھے گئے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو ان تذکروں میں کہیں نہ کہیں خودنوشت کے عنصر شامل ہیں۔ مگر ان میں وہ بنیادی چیزیں موجود نہیں ہیں جو ایک خودنوشت کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ لیکن شیخ علی کا رسالہ ''ذکر احوال بہ تذکرہ حال'' جو کہ 70 سے 75 صفحات پر محیط ہے، اس کا انداز سوانح حیات سے قریب تر ہے۔ بہر حال اردو تذکروں میں خودنوشت سوانح کے عناصر بہت کم نظر آتے ہیں۔

موضوع و مواد کے اعتبار سے خودنوشت کی قسمیں:-

موضوع و مواد کے اعتبار سے بھی خودنوشت کی کئی قسمیں ملتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:-

(1) مذہبی خودنوشت:-

مذہبی خودنوشت سوانح میں مصنف نہ صرف یہ کہ اپنی مذہبی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ اس میں مذہبی معاملات کی تشریح بھی کرتا جاتا ہے۔ مذہبی خودنوشت عام طور پر وہ لوگ لکھا کرتے ہیں جن کا مذہبی

معاملات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مذہبی خودنوشت میں مصنف اپنے روحانی تجربوں اور رموز و معارفت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ مذہبی علماء کی خودنوشتوں سے فقہی مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایسی خودنوشتوں میں اس شخص کے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور دیگر حالات کا بھی پتہ ملتا ہے لیکن یہ حالات و واقعات ضمناً ہوتے ہیں جب کہ مذہبی معاملات و مسائل اور مذہبی مقاصد حاوی ہوتے ہیں۔ ایسی خودنوشت میں عقیدت کا پہلو زیادہ غالب ہوتا ہے اس لیے اس میں ایک خاص قسم کی یکسانیت ہوتی ہے۔ وہاج الدین علوی لکھتے ہیں کہ:

''مذہبی خودنوشت میں مصنف اپنے حالاتِ زندگی مذہبی جذبہ کے تحت قلم بند کرتا ہے اور اس کا بنیادی محرک خود اظہاریت کے ساتھ تبلیغ دین اور تحدیث نعمت بھی ہوتا ہے۔''34

(2) تاریخی خودنوشت:-

خودنوشت سوانح میں تاریخی عناصر کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص تاریخی شخصیت کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے عہد کی تاریخ کو مقدم رکھ کر خودنوشت لکھتا ہے تو ایسی خودنوشت تاریخی خودنوشت کے زمرے میں آتی ہے۔ خودنوشت صرف کسی عہد کی خشک تاریخی دستاویز نہیں ہوتی بلکہ اس میں خودنوشت نگار کی ذات بھی شامل ہوتی ہے۔

جب کوئی شخص، حکمراں یا فرماں روا اپنے عہد کی سیاست، معاشرت، ثقافت اور دیگر حالات و واقعات کو اپنی ذات میں سمو کر تاریخ وار پیش کرتا ہے تو ایسی تحریریں تاریخی خودنوشت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ بقول علم الدین سالک:

''ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال تو صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں۔ مگر فروعی چیزیں ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نشاندہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں، ہمیں ان کے لیے آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا کیوں کہ ان کی مدد سے ہم ایک قوم، ایک ملت اور ایک ملک کی تہذیب کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑی ضروری اور بڑی اہم ہے۔''35

(3) سیاسی و سماجی خودنوشت:-

سیاسی و سماجی خودنوشت میں مصنف اپنی زندگی کے سیاسی اور سماجی حالات کو قلم بند کرتا ہے۔ یہ خودنوشتیں بے حد معلوماتی ہوتی ہیں۔ ان میں مصنف اپنے خاندان کے حالات، بچپن، تعلیم و تربیت پر دھیان نہیں دیتا ہے بلکہ ان

کا اجمالی تذکرہ کر کے اپنی پوری توجہ اپنے عہد کی سیاسی و سماجی تحریکوں اور ان سے وابستہ افراد پر مرکوز کرتا ہے۔ اردو میں اپنے دور کی سیاسی سرگرمیوں کی خودنوشتوں کی فہرست لمبی ہے۔ ان سب کا محور اس زمانے کی تحریکیں ہیں جن سے وہ لوگ وابستہ رہے ہیں۔ سیاسی خودنوشت میں مصنف کے سیاسی شعور اور اس کے سیاسی کارناموں کی داستان ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر سیاسی و سماجی خودنوشت سے مراد ایسی خودنوشت ہے جس میں مصنف اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا اس کے ظاہری و باطنی دونوں پہلوؤں سے اس کا تجزیہ پیش کرے جس میں اس کی ذات اور اس کا وجود پورے آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو۔

(4) ادبی و فکری خودنوشت:-

ادبی و فکری خودنوشت سوانح سے مراد وہ خودنوشتیں ہیں جن میں کوئی ادیب یا شاعر اپنی ادبی و فکری زندگی کے مختلف حالات و واقعات کو قلم بند کرتا ہے۔ ایسی خودنوشتوں میں سیاسی، سماجی و مذہبی عناصر تو موجود ہوتے ہیں لیکن یہ عناصر کمزور ہوتے ہیں اور ادبی اندازِ نظر، ادبی مسائل، افکار اور اشخاص کے اثرات غالب رہتے ہیں۔ خودنوشت میں مصنف اپنے دور کی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ اس کا دور پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے لیکن کسی بھی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دیتا ہے۔ دراصل ادبی خودنوشت، خودنوشت کے تمام لوازم کو پورا کرتی ہے۔ ایسی خودنوشتوں کے خالق شاعر، ادیب اور فن کار ہوتے ہیں۔ یہ زبان و بیان اور ادبی معلومات کے لحاظ سے بہتر ہوتی ہیں۔

ادبی خودنوشتوں سے بہت سے ادبی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ادیب یا شاعر جب میدانِ ادب کا کوئی واقعہ بیان کرتا ہے تو وہ اس کے اسباب و محرکات اور پس منظر پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جس سے ہمیں مختلف ادبی تنازعات کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ادبی خودنوشتوں سے زبان و بیان، فن، عروض و قواعد اور دیگر ادبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہر خودنوشت میں لکھنے والے کی ذات پوری طرح سے نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ادبی خودنوشت میں خودنوشت نگار کی شخصیت پوری طرح نمایاں تو ہوتی ہے وہیں اس میں اس عہد کا ادبی، ثقافتی اور سیاسی شعور بھی ضرور جھلکتا ہے۔ اس لیے اگر کسی عہد کی سچی تصویر اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دیکھنا ہو تو اس عہد کی ادبی خودنوشت کا مطالعہ نہایت مفید و معاون ثابت ہوگا۔

خودنوشت کی مذکورہ بالا تمام قسمیں ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے آسانی کے پیشِ نظر بیان کی گئی ہیں جن کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے کیوں کی ان تمام قسموں میں اہم چیز خودنوشت ہے۔ جو ایک نیم تخلیقی و نیم بیانیہ صنف ہے

جس میں مصنف کی ذات کو اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو مختلف مثلاً حزنیہ، مزاحیہ، خطیبانہ اور سنجیدہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ گویا جس طرح انسان کی زندگی میں سکھ دکھ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، اسی طرح خودنوشت میں بھی حزنیہ، مزاحیہ، خطیبانہ اور سنجیدہ انداز جاری و ساری رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں ایک خاص قسم کا اسلوب پیدا ہو جاتا ہے جو دیگر نثری اصناف کے اسالیب سے مختلف ہے۔ خودنوشت نگار کو مواد کے لیے کسی خاص ہیئت کی تلاش نہیں کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح مصنف اپنی ذات کے اظہار کے لیے مختلف ذرائع استعمال کرتا ہے اور ان کے ذریعہ اپنی حالات زندگی کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بہت سے مشہور و معروف شخصیات نے اپنی داستان زندگی کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے مختلف اصناف کا سہارا لیا ہے۔ جن میں کہیں نہ کہیں سوانحی عناصر موجود ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ ماہنامہ نقوش، آپ بیتی نمبر، جلد اول، فرید بک ڈپو، دہلی، 2014، ص: 41
2۔ ایضاً
3۔ وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت: فن اور تجزیہ، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، 1989، ص: 418
4۔ ماہنامہ نقوش، آپ بیتی نمبر، جلد اول، فرید بک ڈپو، دہلی، 2014، ص: 41
5۔ بحوالہ (مرتب گوپی چند نارنگ)، بیسویں صدی میں اردو ادب، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، 2002، ص: 336
6۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ، 1982، ص: 336
7۔ وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت: فن اور تجزیہ، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، 1989، ص: 420
8۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ، 1982، ص: 340
9۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ، 1982، ص: 36
10۔ سرسید رضا علی، اعمال نامہ ہندوستانی پبلیشر، دہلی، 1943، ص: ح
11۔ ایضاً
12۔ ایضاً
13۔ حبیب تنویر، پردہ کھلتا ہے، دہلی کتاب گھر، دہلی، 2013، ص: 10
14۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ، 1982، ص: 28
15۔ ڈاکٹر اقبال حسین، داستان میری، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، 1989، ص: 15
16۔ قاضی جلیل عباسی، کیا دن تھے، جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، 1985، ص: 6
17۔ یوسف حسین خاں، یادوں کی دنیا، معارف پریس، اعظم گڑھ، 1967، دیباچہ: ح
18۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ، 1982، ص: 129
19۔ بحوالہ ڈاکٹر محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، کتابی دنیا، دہلی، 2010 ص: 93
20۔ مشمولہ (مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری) اردو نثر کا فنی ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1994، ص: 353
21۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، کتابی دنیا، دہلی، 2010، ص: 90

22۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ، 1982، ص: 38

23۔ ایضاً، ص: 31

24۔ بحوالہ مشتاق احمد یوسفی، چراغ تلے سے آب گم تک، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 1997، ص: 188

25۔ ماہنامہ نقوش، آپ بیتی نمبر، جلد اول، فرید بک ڈپو، دہلی، 2014، ص: 61

26۔ بحوالہ ڈاکٹر محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، کتابی دنیا، دہلی، 2010، ص: 90

27۔ پروفیسر وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت: فن و تجزیہ، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، 1989، ص: 41

28۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ، 1982، ص: 18

29۔ بحوالہ (مرتب گوپی چند نارنگ) بیسویں صدی میں اردو ادب، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، 2002، ص: 336

30۔ ماہنامہ نقوش، آپ بیتی نمبر، جلد اول، فرید بک ڈپو، دہلی، 2014، ص: 302

31۔ ایضاً، ص: 41

32۔ ایضاً، ص: 80

33۔ ایضاً، ص: 81

34۔ وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت: فن و تجزیہ، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، 1989، ص: 48

35۔ ماہنامہ نقوش، آپ بیتی نمبر، جلد اول، فرید بک ڈپو، دہلی، 2014، ص: 41

﴿باب دوم﴾

تقسیم ہند کا تاریخی وسیاسی پس منظر اور اس کے اثرات

تقسیم ہند کا تاریخی وسیاسی پس منظر اور اس کے اثرات

ہندوستان کا شمار دنیا کے قدیم ترین ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس ملک کی اپنی ایک مخصوص اور شاندار تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی شناخت رہی ہے۔ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ ملک تمام تر وسائل و ذخائر سے مالا مال ہے اور وسیع و بسیط اراضی پر پھیلے ہوئے اس ملک میں جہاں اپنی ضروریات پوری کرنے کے وسائل موجود ہیں، وہیں دوسرے ملکوں کی ضروریات پورا کرنے کی بھی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں اس پر دنیا بھر کے حاکموں اور توسیع پسند بادشاہوں کی نظریں رہی ہیں۔

ہمسایہ ممالک کے حاکموں و توسیع پسندوں نے جہاں ایک طرف اس ملک کے وسائل کو لوٹنے کے لیے چڑھائی کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، وہیں یورپی ممالک نے بھی اپنے اقتصادیات و دیگر شعبوں کے استحکام کے لئے ہندوستان کا رخ کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ انہوں نے بھی اس ملک کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ کے لیے مختلف حیلے بہانے بنا کر یہاں پر اپنے قدم جمائے اور عوام و وسائل کا استحصال کیا۔ یعنی اپنے ممالک کو آباد کرنے اور ہمارے ملک کا شیرازہ بکھیرنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے رہے۔

انگریز حکمرانوں نے اپنی مکارانہ پالیسی کو بروئے کار لا کر نہ صرف اس ملک کے وسائل لوٹے بلکہ یہاں کے معاشرے کو بھی مذہب و ذات پات کی بنیادوں پر منقسم کرنے کے لیے دوغلی پالیسی کو اپنایا۔ وسائل لوٹنا ان کی پالیسی کا بنیادی محور و مقصد رہا اور جب طویل جدوجہد آزادی کے بعد انگریز یہاں سے جانے لگے تو اس سے قبل انہوں نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے اپنے منصوبے کو بھی یقینی بنایا جس سے نہ صرف ملک میں دو قومی نظریہ قائم ہوا بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کے لیے آزادی کا آفتاب جان لیوا ثابت ہوا۔

تقسیم ہند، ہندوستان کی تاریخ کا ایک المناک اور افسوس ناک باب ہے۔ سیاسی و معاشی سطح پر اس کے دوررس نتائج اب بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم کیوں ہوئی اور کیا جو کچھ ہوا وہ ناگزیر تھا؟ اس موضوع پر بہت لکھا گیا ہے اور سارے راز بھی دنیا کے سامنے آئے ہیں اور جو کچھ بھی ہوا وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب بن چکا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں تقسیم کے کئی پہلو سامنے آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وقت ہر زخم کا سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے لیکن تقسیم وہ زخم ہے جس کا بحال ہونا ناممکن ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بہت کچھ جھیلا اور آج بھی ہم جھیل رہے ہیں۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی جس کے لیے وہ لوگ ہی ذمہ دار ہیں جنہوں نے اس ملک کو کبھی اپنا ملک تسلیم ہی نہیں کیا اور

یہاں کے قومی دھارے میں ضم نہیں ہوئے جس کو واضح کرنے کی شاید ضرورت نہیں ہے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دو قومی نظریہ اچانک آیا کہاں سے؟ درحقیقت اس کا بیج یہیں کی مٹی کی نمی میں پل رہا تھا اور جیسے ہی ناخوشگوار حالات پیدا ہوئے اس میں کونپلیں پھوٹنے لگیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کئی صدیوں کی حکومت کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ ہمیشہ برقرار رہا بلکہ اس سے پہلے بھی اس ملک میں ہندو مسلمان مل کر رہتے تھے۔حاکمیت کے نشے میں کچھ لغزشیں ضرور ہوئی ہوں گی لیکن محکومیت نے کسی بھی قوم کو معدوم نہیں کیا۔لغزشوں کی مثالوں کے برخلاف دونوں قوموں میں باہم ارتباط واختلاط پیدا کرنے کی مثالیں اتنی واضح ،روشن اور زندہ ہیں کہ جدید ہندوستان کی تاریخ کا سنہری باب بن چکی ہیں۔لیکن ہماری تاریخ میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب ماضی کی کچھ حقیقتوں اور لغزشوں پر انگشت نمائی بڑے پرزور طریقے سے ہوئی اور ہماری تہذیب وتمدن کو یکسر فراموش کر دیا گیا اس طرح باہری اقتدار ہم پر غالب ہونے لگے۔ نتیجے میں ہم غلامی کی زنجیر میں ایسے جکڑے کہ تقریباً دو صدیوں کے بعد اس سے رہائی ملی تو ہمارا ملک ،تہذیب و تمدن سب کچھ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور ایک ناقابل عبور سرحد بن گئی۔ 1947 میں اس غلامی سے رہائی کے ساتھ ہی ملک تقسیم ہوا،تقسیم کے عمل اور سرحدوں کے تعین میں جس بدعقلی و بدعملی اور جس جلد بازی کا ثبوت دیا گیا اس سے واضح ہو گیا ہے کہ قومی امتیاز پر قومی تفاخر کا جذبہ غالب آچکا تھا جس کا نتیجہ مختلف فسادات کی صورت میں نمودار ہوا۔

تقسیم ہند کے تاریخی پہلو کی مزید وضاحت کے لیے برصغیر کے سیاسی و تاریخی منظر نامے کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔عہد قدیم سے ہی دنیا کے نقشے پر ہندوستان ایک ایسا ملک رہا ہے جہاں مختلف مذہب ،رنگ ونسل اور نظریۂ فکر کو ماننے والے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ بہت پرانی ہے یہ دنیا کا ایسا ملک ہے جو ابتدا سے ہی مسلسل تاریخ کی نظروں کا طالب رہا ہے،تاریخ نے اس کے دامن میں بے شمار گل کھلائے ہیں اور ساتھ ہی مختلف تہذیب وثقافت کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔اس کی گود سے پھوٹنے والی خوشبو نے عالمی سیاحوں اور تاجروں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ لوگ دریاؤں ،سمندروں اور جنگلوں کو چیرتے ہوئے ہندوستان آئے ،اس کی دھندلی ہوتی ہوئی تاریخ کو صاف کر کے دنیا والوں کو اس کے وجود کا آئینہ دکھایا۔تاریخ کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سکندر اعظم کے حملوں ، مارکو پولو کے سفر سے واسکوڈیگاما کے سفر تک ہندوستان کے یورپی ممالک سے تجارتی روابط قائم ہو چکے تھے اور انگریزوں نے اکبر اعظم کے دور اقتدار میں ہی تجارتی تعلقات کو مستحکم کرنے کی کوششیں بھی کی تھیں لیکن وہ ناکام رہے۔ ہندوستان اپنی تہذیب وتمدن اور اکھنڈتا کی وجہ سے مقبول زمانہ تھا۔اسی وجہ سے یہاں پر روز اول سے ہی مختلف مذاہب کو ماننے

والے موجود رہے ہیں جس میں کچھ مذہبوں کا ارتقا بھی اسی سرزمین پر ہوا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمانے میں یہاں ہندو مسلم بلکہ ہر مذہب کے لوگ مل جل کر رہتے آئے تھے۔ 1857ء تک مختلف رنگ و نسل اور مذہب و مشرب کے لوگوں نے اس ملک پر اپنی اپنی حکومتوں کا سکّہ جڑا۔

جہاں تک ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سوال ہے تو اس سرزمین پر اسلام اپنی ابتدا میں پہنچ گیا تھا کیوں کہ عرب اور ہندوستان کے درمیان صدیوں سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ جب عرب میں اسلام کا آفتاب جلوہ افروز ہوا تو اس کا اثر ہندوستان پر بھی ہوا۔ روایتوں کے مطابق جب کفار مکہ آپ ﷺ سے شق القمر کا معجزہ طلب کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے صرف عرب میں نہیں دیکھا گیا بلکہ دنیا کے مختلف علاقوں میں اُس منظر کو دانستہ و غیر دانستہ طور پر دیکھا گیا تھا۔ جنوب ہند میں صوبہ کیرالا کے مالابار کے بادشاہ ''چکراوتی فامس'' کو بھی وہ معجزہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ واقعہ کی تحقیق کے بعد وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ واپسی میں یمن کے علاقے میں راجہ کی موت ہوگئی آج بھی ان کی قبر وہاں موجود ہے۔ اس کے بعد مالابار میں ان کی رعایا نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کی ایک دلیل ریاست کیرالا میں واقع چیرامان جامع مسجد ہے جو 629 عیسوی میں مالک بن دینار نے بنوائی تھی، یہ ہندوستان کی پہلی جامع مسجد ہے۔ ہندوستان کے مالابار علاقے میں موپلا قوم نے ہی سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا عربوں سے ان کے کافی اچھے تعلقات تھے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آغاز نبوت سے ہی اسلام ہندوستان پہنچ گیا تھا۔ یہ کہنا کہ اسلام محمد بن قاسم یا بعد کے زمانے میں یہاں آیا تو اس واقعے کی مناسبت سے صحیح نہیں ہے۔

بہر حال بعد کے زمانوں میں بھی یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ تاجروں کی ٹولی جوق در جوق اس سرزمین کا رخ کرتی رہیں کیوں کہ ہندوستانی ساحلوں سے گزر کر ہی عرب کے لوگ چین وغیرہ کا سفر کیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہندوستان میں مسلم سلاطین کی آمد سے قبل یہاں کی سیاست کا کوئی مرکز و محور نہیں تھا۔ برصغیر کے منقسم شدہ ٹکڑوں پر ہندو مہاراجاؤں اور پنڈتوں کی حکومتیں اپنی اپنی جداگانہ شناخت رکھتی تھیں۔ جو کہ آپس میں ہی برسر پیکار رہتے تھے جس کا فائدہ بیرون ملک کے لوگوں نے اٹھایا اور یہاں وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہے۔ محمود غزنوی نے 17 بار حملے کیے اور یہاں کے خزانوں کو لوٹ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن محمد غوری نے جب حملہ کیا تو اس نے اس تفریق کو ختم کر کے ہندوستان میں مرکزی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور قطب الدین ایبک کو اپنا جانشیں قرار کر واپس لوٹ گیا۔ غلام خاندان نے 1206 میں ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی جو کہ سولہویں صدی کی دوسری دہائی تک مختلف خاندانوں نے اس سرزمین پر حکومت کی۔ اس کے بعد مغلیہ سلطنت کا وجود قائم ہوا اور اس نے تقریباً دو صدی سے زیادہ مسلسل پورے

ہندوستان پر حکمرانی کی۔ مغلیہ سلطنت نے حکومت اور مشترکہ کلچر کی بنیاد ڈالی لیکن اس حکومت کا انجام بہت برا ہوا۔ اس کے نااہل حکمرانوں کی وجہ سے انگریز ان پر غالب آ گئے اور پھر 1857 میں ہندوستان سے مغلیہ حکومت کا ہی خاتمہ ہو گیا۔

ہندوستان میں مسلمان آئے اور صدیوں تک حکومت کی، اس ملک کو انہوں نے اپنا ملک تسلیم کیا اور یہاں کے سبھی مذاہب کے ساتھ برابر کا سلوک کیا۔ لیکن کچھ تنگ نظر تاریخ دانوں نے اصل حقیقت کو مسخ کر کے مسلم حکمرانوں کو سفاک، ہندو دشمن اور ظالم بنا کر پیش کیا۔ لیکن اگر تاریخ کا صحیح مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلم حکمراں یہاں نہیں آتے تو اس سرزمین کی دلت و نچلی ذات یعنی اچھوت جن کو سماج میں کسی طرح کے حقوق حاصل نہیں تھے، ان کی زندگی جانوروں سے بدتر ہوتی کیوں کہ مسلم حکمرانوں نے اس سماجی تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی اور سماج میں ہر فرقے کو برابر کا درجہ دیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ ظلم کیا اور تلوار کے بل پر اسلام پھیلایا۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر یہاں کی آبادی مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کی کم ہوتی۔ لیکن کچھ آتش بھگوائی کے دہکتے شعلوں نے ان حکمرانوں کی تقریباً گیارہ سالہ روشن تاریخ کو سیاہ کر دیا ہے۔ دسویں صدی سے 1857 تک مختلف خانوادوں نے حکومت کی اگر وہ مسلم حکمراں سفاک و مسلم پرست ہوتے تو اتنے لمبے عرصے تک یہاں مسلمانوں کا راج ہوتا۔ بقول ہندوستانی مؤرخ بابو ناگیندر ناتھ بنرجی:

> ''اگر یہ حکمراں ظالم ہوتے اور یہاں کے ہندوؤں پر اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں جبر کیا ہوتا تو آج ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان چار گنا زیادہ ہوتے۔''1

روشن فکر لوگ بھی اس بات سے مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ مسلم حکمراں جابر نہیں تھے بلکہ ان کے عہد میں ہی ہندوستان سونے کی چڑیا بن کر پوری دنیا کی نظروں میں آیا تھا۔ جب مسلمان یہاں آئے تو اپنے ساتھ اپنا کلچر، زبان، موسیقی، فن تعمیر، رسم و رواج وغیرہ کو ساتھ لے کر آئے، اس ملک کے فنون پر اس کا اثر ڈالا اور خود یہاں کے اثرات کو قبول کیا۔ مغل بادشاہوں کے ساتھ صوفی سنتوں نے بھی ہندوستان میں مشترکہ تہذیب و تمدن کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ عقیل احمد کے مطابق:

> ''ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کو اکبر نے مستحکم کیا اس کے نورتنوں میں ہندو بھی شامل تھے اور فوج میں بھی راجپوتوں کو رکھا گیا تھا۔ حکمرانوں کے علاوہ صوفی سنتوں نے مشترکہ تہذیب کو مضبوط کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔'' 2

1600 میں ملکہ الزبتھ کے شاہی فرمان کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے تجارت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ شہنشاہ جہانگیر نے پہلے انگریز کپتان ولیم ہاکنس کی درخواست کو اگرچہ مسترد کر دیا تھا، لیکن 1623 میں شہنشاہِ برطانیہ جیمز اول کے مقرر کردہ سفیر سر ٹامس رو کی تین سال کی مسلسل کوششوں کے بعد شہنشاہ جہانگیر نے بالآخر کمپنی کو سورت میں فصیل بند کارخانہ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ 1698 میں انگریزوں نے دست درازی کرتے ہوئے سورت کے ساحل پر اورنگ زیب کے سب سے بڑے بحری جہاز، گنج سوائی کو لوٹ کر قبضہ کر لیا یہ جہاز حجّاج کو لے کر سورت آ رہا تھا۔ جب اس کی خبر اورنگ زیب کو ہوئی تو وہ بہت برہم ہوئے اور حکم دیا کہ سورت میں انگریزوں کے تمام تاجروں کو گرفتار کر لیا جائے اور تجارت کرنے کا حکم نامہ ضبط کر لیا جائے۔ بعد میں انگریزوں کے معافی مانگنے پر انہیں معاف کر دیا گیا۔ فرانس کے ایک میوزیم میں وہ پینٹنگ موجود ہے جو ایک فرانسیسی نے بنائی تھی، اس میں انگریزوں کو گھٹنے کے بل مغل بادشاہ اورنگ زیب کے سامنے معافی مانگتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ انگریزوں کے علاوہ فرانسیسی کمپنیاں بھی ہندوستان میں اپنا پیر جما رہی تھیں۔ اقتدار کے حصول کے لیے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں لڑائی ہوئی۔ ان ہی کی شہ پر دکن اور کرناٹک کے حکمرانوں، نظام کے بیٹوں اور محمد علی و چندا صاحب کے درمیان بھی جنگیں شروع ہو گئیں۔ اس خانہ جنگی میں سب سے زیادہ فائدہ انگریزوں کو ہوا۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا مکمل تسلط قائم کرنے کے لیے نئی نئی حکمت عملی وضع کی۔ ان لوگوں نے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو کمزور کرنے کی در پردہ کوششیں کیں، جس کے نتیجے میں اورنگ زیب کے بیٹوں میں تخت و تاج کے لئے لڑائیاں شروع ہوئیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد (1707) مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا بلکہ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ اورنگ زیب کی موت کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، کیوں کہ اس کے ورثا اس قدر کمزور تھے کہ اپنا حق بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مراٹھے اور سکھ بھی اپنی طاقت بڑھانے لگے۔ ملک سے باہر کچھ لوگ اس موقع کی تلاش میں تھے کہ انہیں کب یہاں کے زرخیز علاقوں میں آ کر لوٹ مار کرنے کا موقع ملے۔ سترہویں صدی کے آغاز میں اس افراتفری کے ماحول میں ایران کا بادشاہ نادر شاہ نے بھاری فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کر دیا جو یہاں ہونے والے حملوں میں سب سے تباہ کن تھا۔ اس وقت محمد شاہ رنگیلا دہلی سلطنت کا بادشاہ تھا۔ اس کی فوجیں نادر شاہ کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں اور دہلی میں لوٹ مار اور قتل عام کرتا ہوا نادر شاہ واپس ایران چلا گیا، اپنے ساتھ مغلیہ سلطنت کا کوہ نور ہیرا بھی لے گیا۔ اس واقعے کو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے بھی ہندوستان پر حملہ کر

دیا اور مراٹھوں کو شکست دی۔ ان تباہ کن حملوں نے ملک کو تباہ و برباد کر دیا۔

دوسری طرف دو بڑی طاقتیں انگلینڈ اور فرانس تجار کی حیثیت سے ہندوستان پہلے ہی آ چکی تھیں۔ انہوں نے آپسی تنازعات میں دلچسپی لینی شروع کی تا کہ اپنا ذاتی مفاد پورا کر سکیں۔ انگریز اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ہندوستان ایک متحد ملک ہے اور اس پر حکومت کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت کام کرنا شروع کیا اور یہاں کے لوگوں کو مذہب، ذات پات، رنگ و نسل، علاقہ اور تہذیب و تمدن کے نام پر بانٹنے کی بھرپور کوشش کی۔ انگریزوں نے ہندوستانی تاریخ کو عہد قدیم، عہد وسطیٰ، عہد جدید کے بجائے تین ادوار ہندو عہد، مسلم عہد، برطانوی عہد میں بانٹ دیا۔ یہ ہندوستان سے متعلق تاریخ کے فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کا آغاز تھا۔

انگریزوں نے اپنی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے تحت ہندوؤں کو یہ احساس دلانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمانوں نے مختلف طریقے سے یہاں کی تہذیب و ثقافت اور زبان پر اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان کو فوقیت دی ہے۔ دونوں کے بیچ نفرت پیدا کرنے کے لیے بار ہا یہ احساس ہندوؤں کو دلاتے رہے کہ ہندو تہذیب و ثقافت دنیا کی قدیم اور اعلیٰ تہذیب تھی اور ہندوستانی فلسفہ کا مقام بھی بہت بلند تھا۔ لیکن مسلم حاکموں کی وجہ سے یہ اپنی حقیقی حیثیت اور اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے بجائے ہندوؤں کو سرکاری نوکری دی۔ اس طرح انگریزوں کو پھوٹ ڈالنے کا اچھا موقع فراہم ہوا اور سرکاری نوکریوں سے مسلمانوں کی تعداد کم ہوتی گئی، ہندوؤں کا اضافہ ہونے لگا نتیجتاً فرقہ پرستی کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

ہندوستان پر حملہ کرنے والے تمام حملہ آواروں اور کچھ مہاراجاؤں کے علاوہ یورپی ممالک کے لوگوں نے بھی اس ملک کو اپنا ملک نہ مانتے ہوئے مقامی باشندوں کے اندر نفرت و عداوت کا بیج ڈال کر یہاں سے رخصت ہو گئے۔ نتیجتاً ملک بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور بہت سارے لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ہی ملک سے جدا ہو گئے۔ اس تقسیم کو انجام دینے میں ہندوستان کے سیاست دانوں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ کیوں کہ انگریزوں کو تو ہندوستان پر حکومت کرنی تھی جس کی وجہ سے وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہاں کی عوام آپس میں مل جل کر رہے۔ 1857 کی پہلی ناکام جنگ آزادی ہندوستانی عوام کے اندر بیداری کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس بیداری نے شروع سے ہی لوگوں میں ملک کی مکمل آزادی و خودمختاری کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ عوام میں قومی اتحاد کو دیکھ کر انگریزوں کی نیند اڑ گئی، جس کی وجہ سے انہوں نے قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ کبھی مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف تو کبھی ہندوؤں کو ہندوؤں کے خلاف بھی کھڑا کرنے کی کوشش کی یہی ان کی سیاسی چال تھی۔ آخر کار کشیدگی اور تصادم کی ایسی فضا قائم ہوئی

جس نے فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملک کو ہی بانٹ دیا۔ بقول قدوس جاوید:

''غدر 1857 ہندوستان میں قومی بیداری کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس قومی بیداری نے شروع ہی میں ملک کی مکمل آزادی و خودمختاری کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ لیکن سماجی و ثقافتی نقطۂ نظر سے متحد و منظّم اور فکری، معاشی و سیاسی اعتبار سے منتشر و بے دست و پا ہندوستانیوں کے اس قومی شعور اور جذبۂ آزادی کی بیخ کنی کے لیے برطانوی سامراج نے سیاسی، سماجی، معاشی و مذہبی سطح پر جو سازشیں کیں ان کے نتیجے میں رفتہ رفتہ قومی شعور پر فرقہ وارانہ شعور اور قومی مفادات پر فرقہ وارانہ مفادات حاوی ہوتے چلے گئے اور آخر کار فرقہ وارانہ کشیدگی اور تصادم کی ایسی فضا قائم ہوئی جس نے فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملک کی تقسیم کروا کر ہی دم لیا۔''3

یہاں تجارت کی غرض سے آئے انگریزوں نے دھیرے دھیرے اپنی طاقت میں اضافہ کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ پہلے تجارتی مفاد کے بہانے اپنی کوٹھیوں کو قلعہ بند کیا، فوجیں اکٹھا کیں اور پھر اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے ہندوستان کے آپسی اختلافات اور تنازعات کو ہوا دینا شروع کیا۔ انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے نواب سراج الدولہ کے نانا علی وردی خان نے 1751 میں باقاعدہ جنگ کی تھی جس میں انگریزوں کی ہار ہوئی۔ اس زمانے میں کلکتہ کا ڈائمنڈ ہاربر اور فورٹ ولیم انگریزوں کا مرکز تھا، علی وردی خان نے فورٹ ولیم پر حملہ کر کے وہاں سے انگریزوں کو بھگایا، جو ڈائمنڈ ہاربر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اسے پہلی مسلح اور منظّم جنگ آزادی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سراج الدولہ نے انگریزوں کی بڑھتی طاقت کو محسوس کیا اور ان کے خلاف محاذ کھول دیا۔

برطانوی حکومت نے کمپنی کے مفاد کے لیے یہاں کے نوابوں اور راجاؤں کو آپس میں لڑا کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے پیر اس وقت مضبوط ہوئے جب اس نے پلاسی (1757) کی لڑائی میں سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ جما لیا۔ سراج الدولہ نے بہت بہادری اور جواں مردی کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن میر جعفر اور اس کے جیسے انگریزوں کا ساتھ دینے والوں کی غداری سے اس کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور اس کو شہید کر دیا گیا۔ میر جعفر کو بنگال کا اقتدار دیا گیا لیکن یہ زیادہ دنوں تک نہ رہا اور بہت جلد انگریزوں نے اسے معزول کر دیا۔ اس کے بعد میر جعفر کا داماد میر قاسم برسر اقتدار آیا، وہ انگریز مخالف تھا جس کی وجہ سے اسے بھی اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ یہاں تک کہ 1764 میں بکسر کی لڑائی کے بعد انگریز بنگال، بہار، اڑیسہ اور اودھ پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے

مغل بادشاہ شاہ عالم، اودھ کے نواب کو وظیفہ خوار بنا دیا اور شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا۔ مغلوں کی حکومت بس قلعہ معلیٰ تک ہی محدود ہو گئی۔

اس کے بعد انگریزوں نے میسور کے حکمراں حیدر علی کے خلاف فوج کشی کی، اس نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ٹیپو سلطان نے اپنے والد کے انتقال کے بعد جب حکومت سنبھالی تو سب سے پہلے اپنی شجاعت و بہادری سے نظام، مرہٹوں اور انگریزوں کی مشترکہ فوج کا جم کر مقابلہ کیا اور ان سب کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان نے راجاؤں کو یہ پیغام دیا کہ 'ہندوستان صرف ہندوستانیوں کا ہے' اور انگریزوں کے خلاف 4 مئی 1799 کو متحد ہو جانے کی اپیل بھی کی۔ لیکن میر صادق اور دیگر درباریوں کی دغابازی سے میدان جنگ میں انگریزوں سے نبرد آزما رہتے ہوئے ٹیپو سلطان کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ جب جرنل جارج ہیرس کو ٹیپو سلطان کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے ان کی لعش پر پیر رکھ کر کہا تھا کہ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔''۔ اسی لیے گاندھی جی نے ٹیپو سلطان کو ہندوستان کی تحریک آزادی کا پہلا شہید قرار دیا ہے۔

انگریزوں نے بنگال اور میسور کے حکمرانوں کو پسپا کرنے کے بعد نظام اور مرہٹوں پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس کے بعد انگریزوں کی حکومت کا ظلم و ستم اتنا بڑھ گیا کہ ہندوستانی قوم ان کے خلاف آواز اٹھانے لگی۔ ان کے دلوں میں غلامی کا احساس اور آزادی کا جذبہ گھر کر گیا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک ملک آزاد نہ ہوگا ان کی زندگی ایسی ہی تاریک راہوں میں بسر ہوتی رہے گی۔ ہند کے علمائے کرام و دوسرے قوم پرست نوجوانوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ نے انگریزوں کے خلاف تحریک جہاد شروع کی۔ 1762 میں ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے والد کی تحریک کو آگے بڑھایا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا جس میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی یہ پہلی عوامی کوشش تھی۔ اسی کے زیر اثر کئی تحریکیں اور بغاوتیں وقوع پذیر ہوئیں اور وہی کوششیں اور تحریکیں آگے چل کر 1857 کی جنگ آزادی کا روپ لیتی ہیں۔

انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں ایک نیا زرعی نظام وجود میں آیا، جس کے تحت ہندوستانی پیداوار دن بدن کم ہوتی گئی۔ انہوں نے ہندوستانی مال کے انگلینڈ میں داخل ہونے پر زیادہ ٹیکس لگایا جب کہ انگریزی مال کے ہندوستان میں داخل ہونے پر کوئی ٹیکس نہیں رکھا۔ انگریزوں کے اس طریقۂ کار سے ہندوستانی صنعت کو بہت نقصان پہنچا۔ بقول ریحانہ اختر نقوی:

''انگریزی اقتدار قائم ہونے کے بعد انگریز صنعت کاروں نے اس مقابلے کو پسند نہیں کیا۔انہوں نے پارلیمنٹ پر زور دیا کہ انگلستان میں داخل ہونے والے ہندوستانی مال پر ٹیکس لگایا جائے جب کہ انگریزی مال ہندوستان میں بغیر ٹیکس کے داخل ہو۔''4

انگریزوں کی اس پالیسی نے ہندوستان کی صنعتی ترقی کو بہت متاثر کیا۔لوگوں نے شہروں سے گاؤں کی طرف رجوع کیا اور کھیتی باڑی پر روزگار کو ترجیح دی،جس کی وجہ سے بے روزگاری بھی بڑھی۔ملک کی بڑی آبادی کا دباؤ زرعی پیداوار پر بڑھ گیا جس سے ملک کی ترقی کی رفتار تھم گئی۔

بہر حال مغربی افکار کے زیر اثر ہندوستانی معاشرے میں سیاسی،سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔لیکن ان سب بدلاؤ کے پیچھے ہندوستان کی ترقی مقصد نہیں تھی بلکہ برطانوی حکومت کو مستحکم بنانا تھا۔ہندوستانیوں کو انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی سمجھ آنے لگی۔اس لیے مقامی لوگ ان تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔دن بدن انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمراں عوام کے جذبات و احساسات کو سمجھنے کے بجائے جبر و تشدد کی پالیسی پر قائم تھے۔لہٰذا ہر طبقے کے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بڑھنے سے انتشار اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ان کے خلاف مختلف صورتوں میں لوگ جہاد کرتے رہے جس میں علمائے ہند کی وہابی تحریک،لبریشن موومنٹ،ریشمی رومال کی تحریک کافی مشہور ہیں۔بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جمعیت علما ہند کا قیام عمل میں آیا۔اس تحریک کا اولین مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا تھا۔اس سے تعلق رکھنے والے علماء کرام نے ایک ایسا نصب العین اپنایا جس میں انگریزوں کے خلاف کھلی نافرمانی کی گئی،ان لوگوں نے انگریزی حکومت کا نہ صرف انکار کیا بلکہ کھلی آزادی کا نعرہ بھی لگایا اور مشترکہ کلچر کی بنیاد پر اپنا سربراہ راجہ مہندر سنگھ پرتاپ کو بنایا۔بہر کیف مقامی لوگوں کے اندر انگریزوں کے خلاف غم و غصے کا جوالا پک رہا تھا وہ 1857 میں جنگ آزادی کی صورت میں پھٹ پڑا۔

ہندوستان میں 1857 کے انقلاب کی اپنی ایک الگ ہی داستان ہے۔اس آگ کے شعلے میرٹھ سے شروع ہو کر دلی سے ہوتے ہوئے اودھ اور مشرقی حصوں تک پھیل گئے۔اس پہلی جنگ آزادی میں ہندوؤں اور مسلمانوں غرض ہر طبقے کے لوگوں نے برابر حصہ لیا لیکن بدقسمتی سے ہندوستانیوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔دراصل یہ بغاوت وقت سے پہلے 10 مئی 1857 کو ہی ہوگئی جب کہ منصوبے کے حساب سے اس کو بعد میں یعنی 31 مئی کو ہونا تھا۔امر واقعہ یہ ہے کہ میرٹھ چھاؤنی میں ہندوستانی سپاہیوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جو کارتوس استعمال میں دیے جائیں گے اس میں گائے

اور سور کی چربی لگائی گئی ہے۔ سور مسلمانوں کے لیے حرام ہے اور گائے ہندوؤں کے لیے دیوی کا ایک روپ ہوتی ہے چناں چہ مذہبی ٹھیس دونوں فرقوں کو لگی اس لیے ان فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت دھیرے دھیرے آس پاس کی چھاؤنی اور علاقوں میں پھیل گئی جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس جنگ آزادی کی قیادت آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے کی تھی ہندو ہو یا مسلمان سب ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، بے شمار تباہیوں ونقصانات کے بعد آخر کار انگریز ہندوستانیوں پر غالب آ گئے۔ اس جنگ کی ناکامی کے بعد مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے قید کر کے رنگون بھیج دیا وہیں پر ان کی وفات ہوئی۔ اس طرح مغلیہ دور کا آخری ٹمٹماتا ہوا ستارہ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ 1857 کی بغاوت کے بعد انگریزوں کا ظلم اور بڑھ گیا۔ بقول جواہر لعل نہرو:

> ''یہ بغاوت حالاں کہ بہت پوشیدہ اور منظّم طور پر کی جانے والی تھی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہ وقت سے پہلے ہی پھوٹ پڑی اور اس کے رہنماؤں کے منصوبے کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن یہ بلاشبہ پہلی جنگ آزادی تھی جس کی قیادت زیادہ تر نوابوں، جاگیرداروں اور ان کے پیرکاروں کے ہاتھ میں تھی۔''5

اس جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برطانوی حکومت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ کر دیا۔ ہندوستان کے کاروبار اور ریاستی نظم ونسق کو چلانے کے لیے سیکریٹری آف اسٹیٹ ہند کا عہدہ تخلیق کیا اور ہندوستانی حکومت کو برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت کر دیا۔ برطانیہ نے ہندوستان میں انتخابی نظام رائج کر کے جمہوری طرز سیاست کو فروغ دیا۔

یہ خیال عام ہے کہ اس جنگ آزادی کے بعد انگریز حکومت مسلمانوں کی دشمن بن گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ درست نہیں۔ اگر تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر دیکھا جائے تو انگریزوں کی دشمنی شروع سے ہی مسلمانوں سے تھی۔ اس ناکام جنگ آزادی کے وقت تک انگریزی حکومت اپنے آپ کو پوری طرح سے وسیع اور مستحکم کر چکی تھی۔ لیکن مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر ابھی بھی لال قلعے میں تخت نشیں تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریزوں کے پنشن یافتہ یا وظیفہ خوار ہو گئے تھے۔ لیکن ہندوستانی عوام کی نظر میں وہ ابھی بھی مغل اقتدار کے حاکم تھے۔ اس جنگ آزادی کی باگ ڈور ان ہی کے ہاتھ میں تھی یہ آخری مغل بادشاہ تھے اس کے بعد ہی مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ انگریزی حکومت کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنے مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتے تھے۔

انگریزوں نے بڑی چالاکی سے مسلمانوں کو 1857 کی جنگ آزادی کا ذمہ دار ٹھہرا دیا اور سزا کے طور پر بے شمار علماء کو سر عام پھانسی دی گئی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ دہلی کا کوئی ایسا پیڑ نہیں بچا تھا جس پر علماء کی لاش نہ لٹکی دکھائی دیتی

ہو۔مسلمانوں کو مجرم قرار دے کر انگریزوں کی سیاسی چال یہ تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو الگ کیا جا سکے۔انہوں نے اپنے مفاد کے لیے ہمیشہ ایک دوسرے کو آپس میں لڑا کر بانٹنے کی کوشش کی۔عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز 1857 سے ہوا جب کہ اس کے ٹھیک سو سال پہلے ہی مسلم حکمرانوں اور نوابوں نے جنگیں یا تحریکیں شروع کر دی تھیں۔جس دن سے انگریزوں نے یہاں تجارت کی غرض سے اپنے قدم رکھے اور تجارت کے نام پر سیاسی و فوجی اثر و رسوخ حاصل کر کے یہاں کے حکمرانوں کو بے دست و پا کیا، تب سے مسلمانوں کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ان کے خلاف کھڑے ہو گئے اور بڑی دلیری کے ساتھ مسلمان انگریزوں کے خلاف سو سال تک نبرد آزما رہے۔یہاں تک کہ 1857 میں جدوجہد آزادی کا دوسرا دور شروع ہوا اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم اہل وطن نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔شروع سے مسلم حکمرانوں و نوابوں نے انگریزوں کی مخالفت کی تھی، انگریزوں کی مسلم دشمنی کی یہ بھی ایک بڑی وجہ بنی۔

1857 کی جنگ آزادی میں ہندو مسلم دونوں نے متحد ہو کر انگریزوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔اس لیے انہوں نے اس اتحاد کو توڑنے کا کام سب سے پہلے کیا۔حالاں کہ ملک کی تمام بڑی تنظیمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد پر زور دیتی تھیں۔کیوں کہ اس طرح انگریزوں کو ملک سے نکالنے میں آسانی ہوتی۔1857 کے بعد ان ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تحریک ترک موالات اور خلافت تحریک میں دونوں قوموں کے اتحاد نے تاریخ رقم کر دی اور جس طرح دونوں قوموں نے انگریزوں کے خلاف مورچہ کھولا تھا ایسا لگنے لگا تھا کہ اب آزادی ملنا چند دنوں کی بات ہے۔لیکن کچھ لوگوں کی نادانیوں اور نا اہلیوں کی وجہ سے مذکورہ تحریکیں کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئیں، کیوں کہ اس نے تشدد کا روپ لے لیا تھا جس کی وجہ سے گاندھی جی نے تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد بھی ٹوٹ گیا۔اس کے بعد شدھی و سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کی تحریکوں نے اس میں گھی کا کام کیا جس کا انگریزوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

انگریزوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس بدنظمی کے ماحول میں نفاق کا بیج آسانی سے بویا جا سکتا ہے۔لہٰذا انہوں نے معاشی، اقتصادی اور سیاسی طرز عمل پر پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کو اپنایا۔1857 کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کا اقتدار اور ان کی شان و شوکت سب ختم ہو چکی تھی۔جس سے مسلمانوں کو زبردست جھٹکا لگا انہوں نے اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو کھو دیا تھا۔گویا کہ زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے ہوتے گئے۔انگریزوں نے حکومت چوں کہ مسلمانوں سے حاصل کی تھی اس لیے ان کے غصے اور عتاب کا شکار بھی مسلمان ہی ہوئے۔انگریزوں نے بڑی چالاکی سے ہاری ہوئی قوم کو ذہنی طور پر تباہی کی طرف راغب کیا ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں اور اس جنگ کا

ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ ہندوؤں کو سرکاری ملازمت پر فائز کیا تا کہ مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے اور وہ بربادی کے دہانے پر آ جائیں۔ لیکن اس مشکل دور میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے سرسید احمد خاں جیسے قد آور مفکر آگے آئے اور انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر علی گڑھ تحریک چلائی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو اس احساس کمتری سے نجات دلانا تھا اور جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ سرسید نے علی گڑھ میں محمڈن اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی، یہی کالج آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے مشہور ہوا۔ سرسید مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس سفر میں مصیبتوں کا سامنا کیا اور باغیوں کے ہاتھوں پریشان بھی ہوئے کیوں کہ باغیوں کے خلاف انہوں نے انگریزوں کی مدد بھی کی تھی۔ مسلمانوں کی بربادی کا ان کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ انگریزی تعلیم سے غفلت کی وجہ سے کس طرح مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں سے برطرف کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک قوم پرست شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا سوچنا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور اس قوم کو وہ ہندو قوم کہا کرتے تھے کیوں کہ دونوں قومیں ہندوستانی ہیں۔ بقول راجندر پرساد:

> ''1857 کے غدر میں سرسید احمد خاں نے بہت مصیبت جھیلی تھیں اور باغیوں کے ہاتھوں پریشان ہوئے تھے اور انہوں نے باغیوں کے خلاف انگریزوں کی مدد بھی کی تھی۔ ان کے دل پر اس بربادی کا بڑا اثر ہوا جو مسلمانوں کی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان انگریزی کی ناواقفیت کی بنا پر ملازمتوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ وہ ایک قوم پرور شخص تھے اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قوم ہیں اور اس قوم کو وہ ہندو قوم کہا کرتے تھے کیوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں کا وطن ہندوستان تھا۔ اس لیے اپنے ابتدائی زمانے میں ان کی تحریریں اور تقریریں ہمیشہ قوم پروانہ رہیں اور ہندو، مسلمان دونوں انہیں اپنا قومی لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ وہ بالکل جائز طور پر یہ خواہش رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی حالت میں ترقی ہو اور بالخصوص اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ مسلمانوں کے لیے تعلیمی آسانیاں مہیا کی جائیں۔ انہوں نے مختلف مقامات پر جہاں جہاں وہ ملازمت کے سلسلے میں گئے، اسکول قائم کرنے میں مدد دی اور ان میں بعض ابھی تک چل رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ انگریزی راج میں قوم کے لیے بھلائی ہے، اور اس حکومت میں جو نقائص ہیں انہیں حکام کو جتانے کی ضرورت ہے تا کہ وہ خرابیاں دور کر دی

جائیں۔ان کے اس اعتقاد میں اس زمانے کے تمام لیڈر شریک تھے حتیٰ کہ جنہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ نسل یا رنگ کی بنا پر یورپین اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں یہ تفریق نہیں برتی جانی چاہیے۔''6

ہندوستان میں دو مذہبی نظریۂ فکر کے لوگ یعنی ہندو اور مسلمان تھے۔ دونوں لوگ باہمی طور پر ایک عجیب صورت حال سے دوچار تھے۔ ہندو اکثریت کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور معاشی طور پر بھی مسلمانوں سے آسودہ حال تھے۔ جب کہ مسلمان تعداد میں کم تو تھے ہی تعلیمی اور معاشی طور پر بھی ان کے مقابلے میں پسماندہ تھے۔لیکن سیاسی اقدار کے معاملے میں انہیں گزشتہ تقریباً سات سو سال سے بالادستی حاصل تھی اور انگریزوں کی حکومت قائم ہونے تک برائے نام سبھی امور میں انہیں برتری حاصل تھی۔جس طبقے کے پاس صدیوں تک حکومت رہی ہو اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے طبقے کے پاس پہنچ جائے تو بھی وہ طبقہ ایک مخصوص احساس برتری کا شکار رہتا ہے اور خود کو دوسروں سے ممتاز سمجھتا ہے، یہی حال مسلمانوں کا بھی ہوا۔ایسے میں وہ پوری فرماں برداری سے نئے حاکموں کی وفاداری کیسے کر سکتے تھے۔ چناں چہ انگریزوں نے پورے حالات کا جائزہ لینے کے بعد بنیادی پالیسی یہ بنائی کہ ہندو طبقہ پر نظر التفات رہے اور حکومت کے کاموں میں ان کو زیادہ ترجیح دی جائے کیوں کہ یہ طبقہ کئی صدیوں سے ماتحت اور فرماں بردار رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔اس لیے انگریزوں کا خیال تھا کہ یہ مسلمانوں سے بہتر وفادار ثابت ہوں گے۔

سیاسیات ہند کے سلسلے میں مسلمانوں کی روش یہ تھی کہ وہ ملّی حیثیت سے کانگریس میں شریک نہیں تھے لیکن اس کے مخالف بھی نہیں تھے۔1857 کے بعد انگریزی حکومت ہندوؤں کو مٹھی میں لینا چاہتی تھی اور مسلمانوں سے اس کے باغیانہ اقدامات کا انتقام چاہتی تھی۔انگریزوں کی مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی سے کچھ کٹر ہندوؤں نے ایسی تنظیمیں قائم کیں جس کا مقصد صرف مسلم قوم سے نفرت کرنا اور ملک کو ہندو راشٹر بنانا تھا، آج بھی ان میں سے کچھ اپنے مقصد کے حصول کے لیے محوِ جدوجہد ہیں۔اس کے لیے یہ تنظیمیں جائز و ناجائز کام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔

حکومت کے الٹ پھیر سے ہندو زیادہ متاثر نہیں ہوئے کیوں کہ ان کے لیے یہ معاملہ ایک حکمراں سے دوسرے حکمراں کی اطاعت تک محدود تھا۔دوسری طرف ان کو اسلامی حکومت سے چھٹکارا بھی حاصل کرنا تھا۔اس مقصد میں انگریزوں نے ان کی بھرپور رہنمائی کی۔لہٰذا پرانے نظام کے ختم ہوتے ہی ہندوؤں نے نہ صرف نئے نظام کو قبول کیا بلکہ انگریزی حکومت کا ساتھ بھی دیا۔انگریزوں نے سب سے پہلے انگریزی تعلیم کو عام کیا اور ہر سرکاری عہدے پر

ہندوؤں کو فائز کیا۔ادھر مسلمان یہ سوچتے رہ گئے کہ انگریزی تعلیم حرام ہے یا حلال؟ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بہت پیچھے رہ گئے اور ہندو آگے بہت آگے بڑھ گئے۔

1857 کے بعد انگریزوں کا پورے ہندوستان پر قبضہ ہو گیا اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد کے دور کو ہی برطانوی راج کہا جاتا ہے۔انگریزی حکومت نے ہندو مسلم کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم قدیم روایات، کلچر، اخوت و بھائی چارے کو بھول کر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔مختلف اوقات میں ہندوؤں میں برہمو سماج اور آریہ سماج کی تحریکیں اور مسلمانوں میں تحریک سید احمد بریلوی اور علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا۔ان تحریکوں کا مقصد قوم کو اپنے مفاد اور حق کے لیے اجاگر کرنا اور سب کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنا تھا۔لیکن وقت کے ساتھ یہ بھی دیکھا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام رہیں۔

برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل معاشرے میں دو تحریکیں موجود تھیں جن کا ارتقا صدیوں پر محیط ہے۔ایک بھکتی تحریک اور دوسری صوفیا کی تحریک۔دونوں کا بنیادی مقصد کٹّر مذہبیت کے بجائے معتدل رویوں کا فروغ اور انسان دوستی کے ذریعہ خدا تک رسائی حاصل کرنا تھا۔لیکن انگریزوں کے آنے کے بعد یہی انسان دوستی، دشمنی میں بدلتی گئی۔ان کے ظلم وستم اور پالیسیوں کے سبب سونے کی چڑیا کہا جانے والا ملک غلام بھی بنا اور تقسیم بھی ہوا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فرقہ پرستی کی ہوا بھی تند و تیز ہونے لگی۔مسلمانوں کی پس ماندگی اور مجبوری کو دیکھتے ہوئے ہی 1930 میں الہٰ آباد (پریاگ راج) میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اقبالؔ نے صدارتی تقریر میں جس بنیاد پر شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لیے ایک ریاست کا تصور قائم کیا تھا وہی آگے چل کر پاکستان کے مطالبے کا خاص جواز بن گیا۔

مسلمانوں کا یہ ماننا تھا کہ ان کا سیاسی زوال اسلام سے بے رغبتی کا نتیجہ ہے،جس کی وجہ سے ان کے رہنما ہدایت کرتے تھے کہ وہ پھر سے پابند اسلام بن جائیں اور ان تمام رسوم کو ترک کر دیں جو ہم اتنی مدت میں اختیار کر لیے ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔وہابی تحریک نے لوگوں کے اندر پر جوش مذہبی اصلاح کی کوشش کی۔ یہ تحریک دھیرے دھیرے پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصہ میں اس نے ملک میں سیاسی ہلچل پیدا کر دی۔اس کی وجہ سے بھی مسلمان انگریزوں کا نشانہ بنے۔اس تنظیم کا نام کمیونل سیل (Communal Cell) رکھا گیا تھا جب کہ ہندوؤں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے والی تنظیم اینٹلی جنس ونگ ہندو افیئرز کہلاتی تھی۔

تحریک آزادی میں ہندوستان کے مختلف جرائد و رسائل نے بھی اہم کردار نبھایا تھا۔جس میں انگریزوں کے

ظلم وستم کے واقعات اوران سے آزادی کے لیے عوام میں جوش وخروش پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔اس دور میں ایسے اخباروں ورسالوں کی تعداد درجنوں میں تھیں۔ان صحافیوں نے اپنے اخباروں سے قوم کے جذبۂ حریت کی ترجمانی کی اورانقلاب زندہ باد کی آندھی سے طاقتور برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ان میں الہال والبلاغ، ہمدرد، زمیندار، ریاست،اردوئے معلیٰ،صدق جدید،کامریڈ،روزنامہ تیج، پرتاپ، ملاپ وغیرہ اہم اخبار تھے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانی معاشرے میں مختلف اور متنوع تحریکوں کی وجہ سے نیا سیاسی وسماجی اور عملی شعور پیدا ہو چکا تھا۔جدید تعلیمی اداروں کے قیام رسائل وصحافت کی ترقی،سیاسی کونسلوں اور تنظیموں کے فروغ نے بھی ہندوستانی عوام اور حکومت کے درمیان راہ ہموار کر دی تھی۔آزادی اور مساوات کے جدید مغربی تصورات کی ترقی نے لوگوں کا نظریۂ فکر بدل کر ترقی اور ارتقا کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔چناں چہ مختلف سیاسی تنظیموں کی بنیاد پڑی۔ 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔یہ بڑے پیمانے پر تحریک آزادی کی منظّم کوشش تھی جس میں ہر طبقے اور مذہب کے لوگ شامل تھے۔یہ پارٹی تمام ہندوستانی جماعت کے طور پر قائم کی گئی تھی۔یہ ایک کل ہند سیکولر نظریے والی سیاسی جماعت تھی جس کا مقصد تیزی سے بڑھنے والے نیشنلسٹ جذبات کو اسٹیج فراہم کرنا تھا۔اس طرح بیسویں صدی کے آغاز سے ہی قومی تحریک نے زور پکڑ لیا۔اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے جارج نیتھنیل کرزن جو لارڈ کرزن کے نام سے مشہور ہیں نے 1905 میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔اس کے بعد ہندو زمیندار اور سرمایہ دار مسلمانوں کے درمیان پھر سے ایک شورش پیدا ہوگئی جس سے سارے صوبے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے اور اس طرح لارڈ کرزن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔راجندر پرساد لکھتے ہیں کہ:

> ''لارڈ کرزن کی تحکم پسند شخصیت سے کیسے توقع ہو سکتی تھی کہ وہ بنگالیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکیں گے.....دسمبر 1903 میں انہوں نے ایک ایسی تجویز کی جھلک دکھائی کہ جس کا مقصد چاٹگام اور ڈھاکہ کو بنگال سے الگ کر کے آسام کے دامن سے وابستہ کرنا تھا۔اس کے خلاف سخت جوش پھیل گیا۔حتیٰ کہ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں نے بھی اسے 'وحشیانہ انتظام' کا لقب دیا۔لارڈ کرزن نے ہندوستان کی عام رائے سے ایک لڑائی مول لے لی۔کلکتہ یونی ورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں انہوں نے جو ایڈریس پڑھا اس میں یہ کہہ گزرے کہ مشرقی لوگ عام طور پر سچائی کا کوئی احترام نہیں کرتے۔اس تقریر کے خلاف صدائے احتجاج ہر طرف سے بلند

ہوا.....وہ ڈھاکہ گئے اور وہاں مسلمانوں سے کہا کہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے سے جہاں یہ مقصود تھا کہ بنگال کے لفٹیننٹ گورنر پر کام کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے جنہیں پورے صوبہ بنگال کا تقسیم سے پہلے انتظام کرنا پڑتا تھا وہاں دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان کے لیے ایک ایسا صوبہ پیدا کر دیا جائے کہ جس میں ان کی آواز سب پر غالب ہو۔''7

کرزن نے یہ تقسیم بہت سوچ سمجھ کر کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ برطانوی حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج بنگال میں ہی ہوگا۔ بنگال کی عوام متحد تھی، اسے توڑنے کے لیے کرزن نے تقسیم بنگال کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی پوری کوشش کی۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ اس تقسیم سے ان کا فائدہ ہے کیوں کہ مغربی بنگال اور آسام میں ان کی آبادی زیادہ ہے۔ انگریزوں کی پھوٹ ڈالنے کی اس پالیسی کے خلاف پورے بنگال میں ''بنگ بھنگ تحریک'' شروع ہوگئی۔ سریندر ناتھ بنرجی کی قیادت میں یہ تحریک پروان چڑھی۔ پہلے تو برطانوی حکومت سے التجا کی گئی کہ بنگال کی تقسیم کو روکے، لیکن برطانوی حکومت پر اس کا اثر نہ ہوتا دیکھ کر، بنگ بھنگ کی تحریک شروع ہو گئی۔ ولایتی سامانوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک پورے ملک میں پروان چڑھنے لگی۔ نئے کارخانے کھلنے لگے، سودیشی چیزوں کا پرچار کیا گیا۔ اس تحریک کو پروان چڑھانے میں اخباروں کا اہم رول رہا تھا۔ عوام پہلے سے زیادہ بیدار ہوگئی، جس کی وجہ سے ان میں ایک ملک اور ایک راشٹر پر بحث ہونے لگی۔ یہ عوامی تحریک راشٹریہ تحریک بن گئی تھی۔ اس سے کانگریس کو فائدہ ہوا۔ کانگریس عوام کی نظر میں ایک پلیٹ فارم بن کر ابھری، جس کے نتیجے میں عوام نے اس کی قیادت کو تسلیم کیا۔ لوگوں میں یہ اتحاد 1857 کے بعد پہلی مرتبہ دیکھنے کو ملا۔ بقول راجندر پرساد:

''لارڈ کرزن نے اپنے ورثے میں تقسیم بنگال کا سخت مختلف مسئلہ چھوڑا تھا۔ جس میں کہ بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں کے آدمی بھی شریک ہو گئے۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ چھوٹے دل کے آدمی جب کوئی ترکیب سوچتے ہیں تو الٹی پڑتی ہے، یہی صورت ہندوستان میں بھی رونما ہوئی.....جو تدبیر سیاسی زندگی کو دبا دینے کے لیے اختراع کی گئی تھی اسی نے جادو کا سا کام کر دیا۔ تقسیم بنگال کے خلاف پورا ملک اس طرح سے متحد ہو گیا کہ جیسا 1857 کے بعد سے اب تک کبھی نہ ہوا تھا۔''8

بنگ بھنگ تحریک نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر لا دیا تھا لیکن انگریزوں کو یہ کہاں گوارہ تھا کہ دونوں اقوام ساتھ رہیں انہوں نے اپنی پالیسیوں کے تحت دونوں میں تناؤ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جس کی

بہ نسبت مسلم رہنماؤں نے اپنے تحفظ کے لیے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو دوسری طرف ہندو مہا سبھا کا قیام عمل میں آیا۔ جب شملہ کانفرنس میں مسلم رہنماؤں نے گورنر جنرل گلبرٹ جان ایلیوٹ مرے کائن ماؤنڈ منٹو المعروف لارڈ منٹو سے مل کر مسلمانوں کے لیے الگ انتخابی علاقے کی مانگ کی تو انگریزوں نے فوراً حامی بھر لی۔ اب مسلم ممبران کو صرف مسلمان ہی منتخب کر سکتے تھے۔ 1937 کے اسمبلی الیکشن میں مسلمانوں کو توقع سے زیادہ سیٹیں ملیں جس کی وجہ سے کانگریس فکر مند ہوئی۔ ابتدا میں دونوں پارٹی مل کر انگریزوں کے خلاف برسر پیکار رہیں۔ کیوں کہ دونوں کا نصب العین ایک تھا لیکن بعد میں دونوں میں دوریاں بڑھتی گئیں۔ تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے بیچ خلیج قائم کرنے میں کانگریس کا ہاتھ زیادہ تھا۔ اس میں کچھ کٹر لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے کسی بھی ایک خطے پر مسلم لیگ کی حکومت قائم ہو۔ ایسے لوگوں نے اپنی اسی ضد اور انا کے چکر میں ملک کو داؤ پر لگا دیا۔ مذکورہ الیکشن کے بعد مسلم لیگ ایک بڑی پارٹی بن کر ابھری اور اس نے کئی مقامات پر اپنی جیت کے سبب حکومت بنائی، حالاں کہ کانگریس کی بہ نسبت مسلم لیگ دوسرے نمبر پر ہی تھی لیکن مسلم لیگ کی اس جیت سے کانگریسی کو اطمینان نہیں ہوا کانگریس کے رویے سے مسلم لیگ مشتعل ہوئی اور ملک کے بٹوارے پر بضد ہوئی۔ اس سلسلے میں تاریخ پر روشنی ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کانگریس نے ساتھ دیا ہوتا تو آج ہندوستان متحد ہوتا۔ چناں چہ مولانا ندیم الواجدی لکھتے ہیں:

> ''اگر حکومت سازی کے سلسلے میں یہ دونوں پارٹیاں اشتراک عمل کرتیں تو بہت ممکن تھا کہ حالات درست رہتے اور تقسیم ملک کی نوبت نہ آتی۔ لیکن کانگریس میں شامل بعض سخت گیر اور متشدد قسم کے افراد نے مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے کے بجائے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا جس سے مسلم لیگ مشتعل ہوگئی اور اس نے اپنی پوری طاقت کانگریس کی مخالفت میں لگا دی۔''9

برطانوی حکومت نے بھی فرقہ پرستی کو فروغ دیا۔ اس ضابطے کے تحت مسلمان، سکھ اور ان ہی کے جیسے دوسرے اقلیتی فرقوں کے لیے الگ انتخابی حلقے بنائے گئے۔ فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے والی غیر مساوی سیٹوں کی تقسیم سے کانگریس کا ناراض ہونا فطری تھا۔ لارڈ منٹو کی اصلاح پسندی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی خلیج میں اور اضافہ کر دیا۔ اسی طرح کانگریس کا رویہ بھی کبھی کبھی بدلتا رہا جس نے فرقہ پرستی کو جنم دیا۔ کانگریس میں ہندو مہا سبھائی کے نظریہ سے موافقت رکھنے والے افراد کا غلبہ ہو گیا تھا۔ کبھی شیواجی جینتی تو کبھی گنیش پوجا تو کبھی گنگا میں ڈبکی کو تحریک آزادی سے جوڑا گیا جس کو مسلمان پسند نہیں کرتے تھے اور اس طرح فرقہ پرستی کو ہوا ملی۔

تقسیم بنگال کے بعد ہندوستانی عوام کو اتنا احساس ہو گیا تھا کہ اب انگریزوں سے منت سماجت کر کے آزادی کبھی حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو عملی جدوجہد سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس احساس نے آزادی کی تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی۔ لوگوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا اور ایک ایسا انتہا پسند طبقہ وجود میں آیا جس نے انگریزوں سے التجائیں کرنے کے بجائے عملی جدوجہد کو اپنایا۔ اس طبقے کے رہنما بال گنگا دھر تلک تھے۔ جنہوں نے ہندوستان کی سیاسی تحریک کو اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے دائرے سے نکال کر اسے عوامی تحریک بنا دیا، ان کا نعرہ تھا کہ ''سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا''۔ اس انتہا پسند گروپ نے برطانوی راج کی حقیقی نوعیت کو بے نقاب کیا جو ہندوستانی معیشت کے ڈھانچے کو کھا رہا تھا۔ تلک نے 'کیسری' اور 'مراٹھا' جیسے اخبارات میں اپنی تحریروں کے ذریعے برطانوی حکومت کی حقیقی تصویر پیش کی اور اعتدال پسندوں (نرم دل) کے نام نہاد نظریے کو بے نقاب کیا جو یہ مانتے تھے کہ ہندوستانیوں کی ترقی انگریزوں کی روادارانہ رہنمائی میں ہی مضمر ہے۔ تلک اور ان کے رفقا جن میں لالہ لاج پت رائے، بپن چندر پال اہم تھے ان لوگوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے عوام کو بے خوفی سے بھر دیا اور ان میں اتنی ہمت پیدا کی کہ وہ برطانوی سامراج کے خلاف چٹان بن کر سامنے آئے، ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں اور انگریزوں کو یقین آ گیا کہ اب ہندوستان میں رہنا ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

کانگریس کے انتہا پسند گروپ کے وجود میں آنے کے بعد وہ دو طبقوں میں بٹ گئی دوسرا طبقہ اپنی پرانی روش پر قائم تھا جس کے رہنما گوپال کرشنا گوکھلے تھے۔ جو اصلاح اور صلح مشورہ کی پالیسی پر یقین رکھتے تھے۔ کانگریس کے قیام سے تقریباً 1905 تک اعتدال پسندوں کا ہی بول بالا تھا جن میں گوکھلے کے علاوہ دادا بھائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، فیروز شاہ مہتا، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کو وقت آنے پر مقامی حکومت دے دیں گے۔ ان لوگوں نے انگریزوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً دیے گئے وعدوں پر بھروسہ کیا۔ علاوہ ازیں ان کے شعور عدل، اچھی کارکردگی، ایمانداری اور امانت داری پر بھی اعتدال گروپ یقین رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آئینی ذرائع اختیار کر کے منظّم طریقے سے بات چیت کر کے آزادی حاصل کرنے پر یقین رکھتے تھے لیکن کانگریس کا دوسرا گروپ یعنی گرم دل والوں کا ماننا تھا کہ انگریزوں سے آزادی بات چیت کے ذریعہ حاصل نہیں کی جا سکتی اس کے لیے سیدھا میدان میں اترنا ہوگا۔ بعد ازاں یہی طبقہ غالب بھی آتا ہے اور ان ہی کے زیر اثر مختلف بغاوتیں و تحریکیں وجود میں آئیں۔ لیکن انگریزوں نے ان تحریکوں اور بغاوتوں کو کچلنے اور مقامی باشندوں کو بغیر وارنٹ کی گرفتاری کے لیے ایک قانون پاس کیا جسے ''رولٹ بل'' کا نام دیا گیا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں برصغیر میں کچھ ایسے واقعے رونما ہوئے جو آگے کی صورتحال کی بنیاد بن گئے۔انگریزوں نے ہندوؤں کو اعلیٰ مقام پر فائز کیا اور اپنی پالیسی کے تحت گورنر یوپی نے ہندی کو عدالتی زبان کا درجہ دیا۔جس سے مسلمانوں کے جذبات کو مزید ٹھیس پہنچی۔1905 میں تقسیم بنگال کے بعد براہ راست فائدہ مسلمانوں کو ہوا اور مشرقی بنگال میں ان کی اکثریت ہونے کی وجہ سے سیاسی و معاشی سطح پر ان کے ترقی کے امکان بڑھ گئے۔یہ بات ہندوؤں کے لئے نا قابل قبول تھی،لہٰذا انہوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا لیکن انگریزٹس سے مس نہ ہوئے اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے میں انگریز کامیاب ہوگئے۔حالاں کہ یہ فیصلہ زیادہ دیر تک نہ رہا1911 میں انگریزوں نے تقسیم کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔یہ سنتے ہی مسلمانوں میں شورش پیدا ہوگئی اور ہندو سامراج خوش ہو گئے۔تقسیم بنگال کے وقت کانگریس نے بھی ہندوؤں کا ساتھ دیا۔اگرچہ اس پارٹی کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ ہے۔بنگال کی تقسیم کا اعلان 1905 میں ہوا اس وقت ہندو مسلم کئی فسادات ہوئے۔دونوں فرقوں میں دوریاں بڑھتی گئیں۔آخر کار مسلمانوں میں ذمہ دار اور سنجیدہ اصحاب نے طے کیا کہ مسلمانوں کی بھی ایک سیاسی جماعت قائم ہونی چاہیے،جو ان کے حقوق کی حفاظت کر سکے،اور مسلمانوں کے مطالبات کو حکومت کے روبرو پیش کر سکے۔چناں چہ نواب سلیم اللہ خاں کی قیادت میں ایک جلسہ ہوا جس میں سر علی محمد خاں،راجہ محمود آباد،مسٹر عزیز مرزا،سر آغا خاں،مولانا محمد علی،نواب وقار الملک وغیرہ شامل تھے۔

جس میں طے ہوا کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت مسلم لیگ کے نام سے قائم کی جائے،یہ واقعہ 1906 کا ہے۔چناں چہ مسلمانوں نے اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے ایک سیاسی تنظیم کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے بالآخر 1906 میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کا قیام عمل میں لایا۔یعنی تقسیم بنگال کے ایک سال بعد مسلم لیگ وجود میں آئی لیکن یہ لیگ اُس وقت کے فسادات کو روکنے میں کچھ خاص کام نہ کر سکی۔پھر بھی اس کے قیام سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمانوں کو بھی ایک سیاسی پلیٹ فارم مل گیا اور یہ پلیٹ فارم ان کی اپنی آواز کو حکومت تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خلافتِ عثمانیہ پر سامراجی طاقتوں کی یورش،کانپور مسجد کا سانحہ،کانگریس کے دونوں نرم دل اور گرم دل کے درمیان تناؤ نے قومی سیاست کو گرما دیا۔لیکن 1915 میں گوکھلے کی موت کے بعد گرم دل اقتدار میں آ گیا اور بال گنگا دھر تلک کی خود مختار حکومت کی مانگ تحریک آزادی کا مرکز بن گئی۔سارا ملک ہوم رول کے نعروں سے گونج اٹھا۔اس طرح انقلابی تحریک زور پکڑنے لگی۔

انگریز حکومت جو مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنا چاہتی تھی اب وہ کانگریس کے مدمقابل لانے کے لیے اپنا

پورا زور لگا رہی تھی تا کہ فرقہ واریت کی آڑ میں اپنے مخالفوں کو روک سکے اور کانگریس کی بڑھتی طاقتوں کو کمزور کر سکے۔ عقیل احمد کے مطابق:

> ''برطانیہ سرکار کو یہ امید تھی کہ فرقہ پرستی کی بنیاد پر ووٹوں کے بٹوارے کے ساتھ ساتھ اگر مسلمانوں کی ایک الگ سیاسی پارٹی قائم ہو جائے تو قومی تحریک اور کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا جا سکتا ہے۔''10

چناں چہ مسلم لیگ کے قیام کے بعد انگریزوں نے اس پارٹی کو کانگریس کے مدمقابل لانے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ ابتدا میں مسلم لیگ میں اعلیٰ طبقہ کے مسلمان زمیندار شامل تھے لیکن کانگریس کی طرح جلد ہی مسلم لیگ بھی قومی تحریک میں حصہ لینے لگی۔ مسلم لیگ 1906 میں قائم ہوئی لیکن محمد علی جناح 1912 تک اس لیگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ دراصل وہ کسی فرقہ پرور جماعت کے قائل ہی نہیں تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر ہندوستان کو آزاد کرانے میں مدد کریں۔ لیکن بعض فرقہ پرست لوگوں کی فرقہ پرستی دیکھ کر انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ایسی سیاسی تنظیم کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کے حقوق کے لیے لڑ سکے۔ آخر کار انہوں نے مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن کی وساطت سے 1913 میں مسلم لیگ کو جوائن کیا جب کہ اس وقت وہ کانگریس کے صف اول کے لیڈر تھے۔

مسلم لیگ کے بہت سے بانیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جماعت کانگریس کی حریف کی حیثیت سے کام کرے گی لیکن محمد علی جناح نے لیگ میں شرکت کرتے ہی یہ نقطۂ نظر بدل دیا۔ وہ مسلم لیگ کے اس لیے حامل تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو اور کانگریس کے اس لیے وفادار تھے کہ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دے کر آزادی ہند کا نعرہ بلند کریں لیکن ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔ اسی مقصد کے تحت 1915 میں جب کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہو رہا تھا تو جناح نے کوشش کی کہ مسلم لیگ کا جلسہ بھی وہیں رکھا جائے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ ہندو مسلمان مل کر کام کریں تبھی انگریزوں سے آزادی مل سکتی ہے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ہمیں آزادی کبھی نہیں مل سکتی جب تک ہندو مسلم متحد نہ ہو جائیں۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ اگر ان دونوں قوموں میں علیحدگی اور دوری بنی رہے گی تو غلامی کی زنجیریں بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں گی۔ دونوں قوموں کو متحد کرنے کے مقصد میں وہ کچھ دیر تک کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی اور کچھ شر پسند مقامی لوگوں کی وجہ سے ان کی یہ کامیابی زیادہ دیر تک نہ ٹک سکی۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

> ''آغاز کار سے ہی جناح کی یہ کوشش رہی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو جائے۔ یہ

دونوں مل کر آزادئ جنگ میں حصہ لیں اور شانہ بہ شانہ جہاد حریت کی منزلیں طے کریں
لیکن ان کی یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔'' 11

انگریزوں نے برصغیر میں اپنے ظلم وستم کی انتہا ہر طرح سے اور ہر میدان میں جاری رکھی تھی۔ ان لوگوں نے مختلف مسالوں کے ساتھ نیل کی تجارت میں کافی دلچسپی لی کیوں کہ اس سے انہیں بہت فائدہ ہوتا تھا۔ چناں چہ انہوں نے اس سلسلے میں کام شروع کیا اور ملک کے مختلف حصوں میں نیل کی کھیتی کے لیے موزوں زمین کا پتہ لگوایا، ان جگہوں میں اپنی کوٹھیاں بھی قائم کیں اور نیل کی زراعت کو فروغ دیا، ان میں بہار کا چمپارن ضلع بھی شامل تھا جہاں نیل کی زراعت کافی تعداد میں کی جاتی تھی۔ ان کھیتوں کے مالک انگریز ہی تھے، انہوں نے ظلم وستم کی انتہا کر دی، نیل کی کھیتی کے لیے کسانوں کو مجبور کیا، ان پر بے شمار ٹیکس لگائے اور تین کٹھیا جیسے معاہدے ان پر تھوپے گئے۔ نیل کی کھیتی کے بعد وہ زمین دوسری قسم کی زراعت کے لیے بے کار ہو جاتی تھی اس لیے مقامی کسان ہچکچاتے تھے، اس پر طرہ یہ کہ ان کو زراعت کا محض ایک تہائی حصہ ہی ملتا تھا جس میں بے شمار ٹیکس لگا دیے گئے۔

انگریزوں کے ظلم کی انتہا یہیں تک محدود نہیں تھی بلکہ غریب کسانوں اور مزدوروں کی کنواری اور نو بیاہتا لڑکیاں ان کی ہوس کا نشانہ بھی بنتی تھیں۔ چمپارن میں انگریزوں کے مظالم کے خلاف سب سے پہلے شیخ گلاب، پیر محمد مونس، راج کمار شکلا اور ان کے رفقا آگے آئے، بعد ازاں 1916 کے لکھنؤ سیشن میں شامل راج کمار شکلا کی سفارش پر گاندھی جی اپریل 1917 میں مظفر پور ہوتے ہوئے چمپارن پہنچے۔ گاندھی جی نے کسانوں پر ہو رہے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی اس سے انگریز افسران خوف زدہ ہو گئے۔ اس وقت گاندھی جی افریقہ میں اپنی کارکردگیوں کی وجہ سے مشہور ہو چکے تھے اور ہندوستان واپس لوٹنے کے بعد ہی ظلم کے خلاف ڈٹ گئے، انہوں نے 1916 کے اواخر میں گجرات میں سابرمتی آشرم قائم کیا، ملک کا دورہ کر کے لوگوں کے حالات دریافت کیے اور انگریزوں کے ظلم کے خلاف لوگوں کو متحد کرنا شروع کیا، اس لیے انگریزوں کو گمان ہوا کہ اگر گاندھی جی اسی طرح عوام کے ساتھ کھڑے رہے تو بہت جلد پورے ملک کی عوام ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

نیل فیکٹری منیجروں کے لیڈر اس وقت مسٹر ڈبلیو ایس اِروِن تھے، جو اپنی سفاکانہ اور ظالمانہ شخصیت کے لیے بدنام زمانہ تھے۔ جب اسے گاندھی جی کے چمپارن آمد کا پتہ چلا تو اس نے گاندھی جی کو مارنے کا پلان بنایا۔ اس پر عمل کرنے کے لیے اروِن نے گاندھی جی کو اپنی کوٹھی پر مدعو کیا، اس نے اپنے خانسامہ بطخ میاں انصاری (بخت انصاری) سے کھانے میں زہر دے کر پیش کرنے کا مطالبہ کیا اور اس کے بدلے بے شمار پیسے اور زمین کا لالچ دیا۔ گاندھی جی،

راجندر پرساد اور دیگر لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچے تو بطخ انصاری نے گاندھی جی کو کھانا پیش کرتے ہوئے انگریزوں کی سازش کا خلاصہ کر دیا جس سے گاندھی جی نے کھانے سے انکار کر دیا اس طرح اس عظیم مجاہد کی وجہ سے گاندھی جی کی زندگی تو بچ گئی لیکن ارون نے بطخ انصاری پر بے شمار تشدد کیے، ان کو بے گھر کیا، انہیں آخر کار جلا وطن ہونا پڑا۔ بطخ میاں انصاری نے اگر اس دن گاندھی جی کی جان نہ بچائی ہوتی تو گاندھی جی ہندوستان کی فعال سیاست کے افق پر کبھی بھی مہاتما بن کر نہ ابھرتے اور نہ ہی چمپارن ستیہ گرہ کی شکل میں تحریک آزادی کی بنیاد پڑتی۔ کیوں کہ بعد میں گاندھی جی کی قیادت میں ہی چمپارن کے کسانوں اور مزدوروں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی اور چمپارن تحریک جو کہ پہلی عوامی سطح کی کامیاب تحریک تھی، وجود میں آئی، جس سے انگریزوں کی طرف سے عائد غیر قانونی ٹیکس کا خاتمہ ہوا۔

اس تحریک کے بعد ہی ملک کے دوسرے خطوں میں بھی انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی گئی، اسی تحریک نے ہندوستان کو آزادی کی راہ دکھائی اور گاندھی جی کو لوگوں نے مہاتما کا نام دیا۔ لیکن افسوس کہ بطخ میاں انصاری جیسے مجاہد آزادی کو نہ صرف فراموش کیا گیا بلکہ نئی نسل ان کے متعلق شاید ہی آشنا ہو۔ اگر سابق صدر ہند راجندر پرساد نے ایک تقریب میں اس واقعے کا خلاصہ نہ کیا ہوتا تو شاید ہم بھی اس واقعے سے نابلد رہتے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی نے اپنی کسی تحریر میں یا پھر راجندر پرساد کی چمپارن ستیہ گرہ پر مشتمل کتاب، اور ان کی خودنوشت میں کہیں اس واقعے کا ذکر نہیں ملتا۔ معروف برطانوی اخبار 'دی انڈپینڈنٹ' کی اردو سروس میں صحافی ظہور حسین کی رپورٹ جو کہ 30 جنوری 2022 کو شائع ہوئی، سے اس واقعے پر روشنی پڑتی ہے، علاوہ ازیں چھتیس گڑھ کے سابق پولیس سربراہ ایم ڈبلیو انصاری کی کتاب ''بطخ میاں انصاری کی انوکھی کہانی'' اور سید نصیر احمد کی کتاب ''گاندھی جی کی جان بچانے والے بطخ میاں انصاری'' میں بھی مذکورہ واقعے کی تفصیل موجود ہے۔

کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ نے بھی اپنا مقصد تحریک آزادی کو بنایا اور 1916 میں لکھنؤ پیکٹ کے لیے دونوں تنظیموں کے عہدے داروں نے باہمی اتفاق سے دستخط کر دیے، اس میں دونوں کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی اجازت ملی تھی اور مسلم لیگ کو کابینہ کا ایک تہائی حصہ ملنا تھا۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ''رولٹ بل'' ایک انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ مارچ 1919 میں رولٹ بل قانون ساز مجلس میں پیش ہوا۔ اس بل کے تحت سیاسی تحریک کو کچلنے، سیاسی رہنماؤں کو کالا پانی بھیجنے اور پھانسی دینے کا حق سرکار کو حاصل ہو گیا تھا۔ اس بل کے پاس ہونے کے بعد میڈیا پر بھی دباؤ بڑھ گیا، مقدمے کے بغیر غیر معینہ مدت تک حراست کا اختیار حکومت کو مل گیا۔ یہاں تک ملزم کو وجہ جاننے کا بھی حق نہیں تھا، علاوہ ازیں گرفتار شدہ لوگ رہائی کے بعد کسی بھی عملی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔

اس بل کے تحت پولیس کو یہ اختیار تھا کہ وہ کسی بھی جگہ کی تلاشی لے سکتی تھی، بغیر وارنٹ کے کسی کو بھی گرفتار کر سکتی تھی اور اس حالت میں کوئی دلیل، اپیل، وکیل کام نہیں آتے تھے۔ رولٹ بل کے پاس ہوتے ہی پورے ملک میں غم و غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ کانگریس نے انگریزی حکومت کا کھل کر احتجاج کیا۔ گاندھی جی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور ستیہ گرہ کی بنیاد ڈالی۔ لیکن سرکار پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لوگوں نے رولٹ بل کو کالا قانون قرار دیا تھا اس بل کا نام کمیٹی کے صدر سر سڈنی رولٹ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ مختلف لیڈروں نے اس بل کی سخت مخالفت کی ان کا کہنا تھا کہ سیاسی جرائم کے لیے بغیر ثبوت کے ہر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ محمد علی جناح نے اپنی ایک تقریر میں انگریز حکومت سے کہا تھا کہ:

> ''اگر تم نے اسے ایک قانون کی شکل دے دی تو سارے ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ایک آگ لگ جائے گی۔''12

رولٹ بل کے پاس ہوتے ہی مسٹر جناح کی بات سچ ثابت ہوئی واقعی سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ سب سے پہلے دہلی میں اس کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا، پھر ہنگامہ ہوا اور فوج نے نہتے مجمع پر گولیاں چلائیں جس میں بہت سارے لوگ مارے گئے۔ اس حادثے کے بعد گاندھی جی کے حسب ہدایت پورے ملک میں یوم دعا اور بھوک ہڑتال ہوئی۔ اس آگ کی لپیٹ دہلی سے باہر پنجاب سے لاہور تک پہنچ گئی۔ پنجاب جاتے ہوئے پلول اسٹیشن پر حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد ان کے رضا کار گلی کوچوں میں گھوم گھوم کر انگریزوں کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے۔ اپریل 1919 میں دو ہندوستانی لیڈر ستیہ رام اور صیف الدین کچلو کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا ان کی رہائی کے لیے جلیاں والا باغ میں زبردست احتجاج کیا گیا جس میں ہزاروں لوگ شامل تھے۔ 12 اپریل کو جنرل ریجینالڈ ایڈورڈ ہیری ڈائر اپنی مصلح فوج کے ساتھ امرتسر پہنچ گیا۔ کسی سے مشورہ کیے بغیر اس نے جلیاں والا باغ میں نہتّے ہندوستانیوں پر گولیاں چلوا دیں، بھاگنے کے تمام راستے بند تھے جس کے نتیجے میں سینکڑوں بے گناہوں کی موت ہو گئی اور ہزاروں مجروح ہو گئے۔

اس سانحہ کے بعد امرتسر میں دو مہینے تک کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ پانی و بجلی کی سپلائی بند کر دی گئی عوام پر انگریزوں کی بربریت اور ظلم و زیادتی کھل کر سامنے آئی۔ ظلم کو دیکھتے ہوئے جا بجا ہڑتالیں، میٹنگیں ہونے لگیں اور ولایتی مال کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اب عوام کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس حادثے نے پورے ملک میں شورش اور بے چینی پیدا کر دی تھی۔ حکومت کے خلاف نعرے بازی ہونے لگی اور سرکاری چیزوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ گورنر جنرل سر

مائیکل فرانسس اوڈوائر نے کچھ علاقوں میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ جن محلوں میں انگریزوں پر تشدد ہوا تھا وہاں بڑے بڑے شریف اور معزز شہریوں کو پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا اور ان سے یہ بھی زبردستی کی گئی کہ وہ انگریزوں کو سلامی دیں اور اپنی مجبوریوں کا اعتراف کریں۔ امرتسر کے حادثے نے ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ احمد آباد میں ہنگامے ہوئے پولیس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ گولیاں چلائیں۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کی لڑائی میں مزید شدت آ گئی۔ رہائی کے بعد گاندھی جی کی قیادت میں مختلف تحریکیں وجود میں آئیں۔ بہر حال ان مسلسل احتجاجوں اور فساد نے حکومت کو رولٹ بل واپس لینے پر مجبور کیا اور آخر کار 1922 میں اس بل کو ختم کر دیا گیا۔ انگریزی حکومت نے اپنی ضد اور خودسری سے کام لے کر اس قانون کو منظور تو کر لیا تھا لیکن اس میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ اسے نافذ العمل کرے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ قانون نافذ تو ہو گیا لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی میعاد کے تین برس میں ایک مرتبہ بھی اس سے کام نہیں لیا گیا حالاں کہ تین سال کا زمانہ امن وسکون سے نہیں گزرا بلکہ 1857 کے غدر کے بعد سب سے زیادہ شورش کا زمانہ تھا۔ غرض حکومت نے عام مخالفت کے باوجود ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس سے اس نے کبھی کوئی کام نہ لیا اور خوامخواہ چھیڑ کر شورش پیدا کر دی اگر یہ خیال ہو تو بجا نہیں کہ شاید اس قانون کا مقصد ہی ہنگامہ پیدا کرنا تھا۔''13

پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے انگریزوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ ترکی کی جنگ میں شمولیت سے ہندوستان کے مسلمان پریشان ہوئے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر انگریز کامیاب ہو گئے تو وہ لوگ ترکی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ جب انگریزوں نے ہندوستانیوں سے جنگ میں حصہ لینے کی مانگ کی تو مسلمانوں نے یہ شرط رکھی کہ جنگ کے دوران مسلمانوں کے مقدس مقامات کی بے حرمتی نہ کی جائے اور جنگ کے بعد مسلمانوں کی خلافت محفوظ رہنی چاہیے۔ انگریزوں نے وعدہ تو کر لیا لیکن افسوس جنگ میں کامیابی کے بعد اپنا وعدہ بھول گئے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد برطانیہ اور اس کے اتحادیوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے اپنی فوجیں بصرہ اور جدہ میں داخل کر دیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے انگریزوں کو اپنے وعدے یاد دلانے اور خلافت کے تحفظ کے لیے ایک تحریک شروع کی جسے تحریک خلافت کا نام دیا گیا۔ 5 جولائی 1919 کو ''آل انڈیا خلافت کمیٹی'' بمبئی میں قائم کر دی گئی۔ اس کا مقصد ترکی کی خلافت کو برقرار رکھنا تھا، مقدس مقامات ترکی کی تحویل میں رہیں اور ترکی کی سلطنت کو تقسیم نہ کیا جائے۔ اس کا پہلا

اجلاس نومبر 1919 میں دہلی میں ہوا۔ جس میں فیصلہ ہوا کہ مسلمان، انگریزوں کے جشنِ فتح میں شامل نہیں ہوں گے اور اگر ان کے مطالبات کو منظور نہیں کیا گیا تو وہ انگریز حکومت سے عدم تعاون کریں گے۔

آل انڈیا کانگریس نے پہلے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک گیر مہم شروع کر رکھی تھی۔ دسمبر 1919 میں آل انڈیا کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے۔ جہاں گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ 1920 میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان، اٹلی اور فرانس کے دورے پر روانہ ہوا تا کہ وزیر اعظم برطانیہ اور اتحادیوں کو ان کے وعدے یاد دلائے لیکن وہاں ان کو ناکامی ہاتھ لگی۔ اس ناکامی کے بعد خلافت کمیٹی نے 1920 میں تحریک ترک موالات کا فیصلہ کیا اور گاندھی جی کو اس تحریک کا رہنما بنایا گیا۔ مسلمانوں نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کے نتیجے میں وہ تشدد کا نشانہ بنے، چناں چہ مالابار کے موپلا مسلمانوں نے تنگ آ کر 1921 میں بغاوت کر دی جسے موپلا بغاوت کا نام دیا گیا۔ حکومت نے اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا اور ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

> ''تحریک خلافت ایک ہولناک اور لرزہ خیز طوفان کی طرح ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ کفن سر سے باندھ کر میدان جہاد میں اتر چکے تھے۔ جیل جانا ایک کھیل بن گیا تھا، سینہ پر گولیاں کھانا روزمرہ کا واقعہ تھا۔''14

5 فروری 1922 کو ترک موالات اور تحریک خلافت کی حمایت میں مشتعل ہو کر کچھ لوگوں نے اتر پردیش کے ایک گاؤں چوری چورا میں ایک تھانے کو آگ لگا دی جس میں 22 سپاہی جل مرے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ یہ تحریک عدم تشدد پر کاربند نہ رہی اس لیے اسے ختم کیا جاتا ہے۔ اسی سال آل انڈیا ہندو مہاسبھا کی بنیاد رکھی گئی کانگریس نے بھی اس کے سامنے سپر ڈال دی۔ اس نے وسیع پیمانے پر شدھی اور سنگٹھن (تنظیم) کا کام مسلمانوں کے خلاف اور مسلمان تبلیغ کا کام ہندوؤں کے خلاف شروع کر دیا۔ اس طرح ہندو مسلم اتحاد جو قائم کیا گیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

برطانوی حکومت نے 1927 میں سائمن کمیشن پاس کیا۔ یہ سات اراکین پر مشتمل کمیشن تھا اور سر جان سائمن اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کمیشن میں کسی بھی ہندوستانی کو جگہ نہیں دی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی حکومت ہند کو دعوت دی جائے کہ وہ اپنی رائے پیش کریں۔ ہندوستانیوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اس کمیشن کا

بائیکاٹ کر دیا۔اس میں کانگریس کے ساتھ خلافت کمیٹی اور دوسرے مسلم اور ہندو تنظیموں نے متحد ہو کر حصہ لیا۔ بائیکاٹ کے بعد بھی اس نے ہندوستان کا دورہ کیا۔اس سلسلے میں رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

''1927 میں سائمن کمیشن کے چرچے نے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک تموّج پیدا کر دیا تھا،ٹوٹے ہوئے دل پھر جڑنے لگے،شکستہ تعلقات پھر استوار ہونے لگے،مشترک معاملات میں متحدہ محاذ پھر بن گیا، ہندوؤں سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ مسلمانوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا،مشترک جلوسوں اور جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔''15

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے بعد کانگریس نے ہندوستان کا دستور اساسی تیار کرنے کے لیے موتی لعل نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی تیار کی۔اس میں طے ہوا کہ ایک دستور اساسی بنایا جائے اور ہندوستان کے مطالبہ کی صورت میں حکومت کے سامنے اسے پیش کر دیا جائے۔اس کمیٹی میں غیر کانگریسی سیاستداں بھی ممبر بنائے گئے۔ کمیٹی نے ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کا اتحاد عمل میں لانے کی کوشش کی،تمام سیاسی جماعتوں کا نقطہ معلوم کرنا چاہا، اور ان کے معقول ومناسب مطالبات تسلیم کر لینے کا اعلان ہوا۔مجلس خلافت کی طرف سے اس کمیٹی میں مسٹر شعیب قریشی نمائندگی کر رہے تھے۔لیکن جب کام شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک ایسا دستور وضع کیا جا رہا ہے جس میں ہندو اکثریت کو سب کچھ مل جائے گا اور مسلم اقلیت بالکل محروم رہ جائے گی۔

محمد علی جناح نے جو چودہ نکات پیش کیے تھے جسے کانگریس سے منظوری بھی مل گئی تھی اسے اس کمیٹی میں نظر انداز کر دیا گیا۔گویا کمیٹی نے خود کانگریس کی طے شدہ پالیسی پر پانی پھیر دیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر شعیب قریشی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ رپورٹ ''نہرو رپورٹ'' کے نام سے جانی جاتی ہے جب یہ آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ میں پیش ہوئی تو مجلس خلافت کی طرف سے مولانا شوکت علی نے اس کی مخالفت کی اور یہ اعلان کیا کہ مسلمان اس رپورٹ کو منظور نہیں کر سکتے کیوں کہ اس میں کوئی بھی اہم مطالبہ مسلمانوں کا منظور نہیں کیا گیا تھا۔رپورٹ کے بعض حصوں سے خلافت کمیٹی،جمعیۃ العلماء ہند،مسلم لیگ اور سکھ لیگ کے لیڈروں نے شدید اختلاف ظاہر کیا اور انہیں مسلمانوں اور سکھوں کے لیے تباہ کن قرار دیا۔جس کی وجہ سے یہ لوگ کانگریس سے الگ ہو گئے۔رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

''مولانا محمد علی بغرض علاج یورپ گئے ہوئے تھے،مسٹر جناح بھی ہندوستان سے باہر تھے صرف مولانا شوکت علی تھے جو مسلمانوں کے پشت پناہ لڑ رہے تھے، کچھ عرصہ کے بعد مولانا محمد علی آئے ،انہوں نے کوشش کی کہ پنڈت موتی لعل نہرو اپنی غلطی کی تلافی کر لیں

لیکن کامیاب نہ ہوئے، آخر وہ بھی مخالفین کی صف میں شریک ہو گئے۔علی برادران کا استدلال یہ تھا کہ یہ کوئی ہنگامہ اور وقتی مسئلہ نہیں ہے، جس پر مسلمان سکوت اختیار کر لیں اور اپنی عارضی حق تلفی برداشت کر کے اسے منظور کر لیں۔ یہ ہندوستان کا نظام حکومت ہے اس وقت اگر مسلمان خاموش رہے تو آئندہ کس بنیاد پر اپنے حقوق کے لیے لڑیں گے؟ کیا ان سے یہ نہیں کہہ دیا جائے گا اب شور وشرابا کیوں کر رہے ہو، دستور سازی کے وقت تم کیوں خاموش تھے؟''16

ان کا یہ خدشہ درست بھی تھا کیوں کہ انہوں نے اس وقت کے حالات کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا جیسے آج یہ اپنی من مانی کر رہے ہیں، ہمیشہ کریں گے۔کانگریس نے نہرو رپورٹ کی شکل میں برطانوی گورنمنٹ کو ہندوستان کے مستقبل کا آئین پیش کیا۔جس میں علاحدہ حلقۂ انتخاب اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے ایک تہائی سیٹوں کا جو ریزرویشن لکھنؤ پیکٹ میں دیا گیا تھا اسے نہرو رپورٹ میں ختم کر دیا گیا۔جس سے مسلمانوں کو بڑا جھٹکا لگا۔یہی نہیں کانگریس نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے پیش نظر ساری تجویزیں رد کر دی تھیں۔جس سے مسلم لیگ کے لیڈروں کے دل میں کانگریس سے متعلق شبہات پیدا ہو گئے۔نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی اس کے تحت مسلمانوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کی فکر ہوئی۔ یہ سب ناانصافی دیکھ کر مسلم لیگ نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کو ہی اپنا مقصد بنایا۔ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

''1938 میں کانگریس کے صوبوں میں وزارتیں سنبھالنے کے بعد خود قوم پرور مسلمانوں کو یہ شکایت ہوئی کہ ان کو بہت کم جگہیں ملیں۔اس سے زیادہ اہم مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ کانگریس حکومت نے ان کے تہذیبی حقوق پامال کر ڈالے۔''17

اس کے برعکس ہندو مہاسبھا اور آریہ مہاسبھا کا قیام عمل میں آیا جنھوں نے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کو ہی ہندوستانی کلچر مانا۔اس کے بعد اسمبلیوں کی کارروائیاں 'وندے ماترم' سے شروع کی جانے لگیں اور سرکاری دفاتر پر کانگریسی جھنڈے لہرائے جانے لگے۔کانگریسی حکومتوں نے، کانگریس کی اُس پالیسی پر جس کا وہ باضابطہ اعلان کر چکی تھی کہ ہندوستانی زبان کو دیوناگری اور فارسی دونوں خطوں کے ساتھ قومی زبان بنایا جائے گا لیکن کئی صوبوں میں اس پر عمل نہیں کیا گیا اور عام طور پر اردو کو دبانے کی کوشش کی گئی۔اتر پردیش کے سرکاری اسکولوں میں اردو کے بجائے ہندی کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا گیا یہ بھی ان وجوہات میں شامل تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس کی طرف سے بدزنی

پھیل گئی اور مسلم لیگ کی مقبولیت کے ساتھ فرقہ وارانہ تفریق بھی ان میں بڑھنے لگی جو بعد میں تقسیم ہند کی شکل میں سامنے آئی۔ ہندو مہاسبھا کے متعلق جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں:

> ''ہندو مہاسبھا معمولی قسم کے رجعت پسندوں کا ایک ٹولہ ہے۔ جو ہندوستان کے ہندوؤں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتا ہے لیکن حقیقت میں اس جماعت کا ہندوؤں کی نمائندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ آر یہ کمار سبھا نے جو غالباً ہندو مہاسبھا کی ایک شاخ ہے اپنی پالیسی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندوستان سے نکالنے اور ہندو راج کے قیام کا اعلان کر کے ہندو مہاسبھا سے بھی سبقت لے لی ہے۔ یہ پالیسی ہندوستانی جذبۂ قومیت سے متعلق ہندو مہاسبھا کے دعووں کو بے نقاب کرتی ہے۔'' 18

اس قسم کی پارٹیوں نے سیاست کو ہندو مذہب میں ڈھالنے اور ہندو دھرم کو عسکری رنگ دینے کا نعرہ دیا۔ اسی طرح مسلم لیگ نے بھی یہ کہا کہ مسلم مذہب، اس کی تاریخ و روایات الگ ہے اس کی زبان الگ ہے۔ لیگ نے اردو کو سرکاری زبان بنانے پر زور دیا اور ہندو مہاسبھا نے سنسکرت کو۔ اس سے لسانی مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ ہندو مسلم تفریق کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئی اور مسلمانوں نے خود کو محفوظ نہ دیکھ کر ہی الگ ملک کی مانگ کی۔

ان ساری وجوہات پر نظر ثانی کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو مسلم دونوں قومیں کس طرح ایک دوسرے سے دور ہوتی جا رہی تھیں دونوں قوموں کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی تھی جو تمام تر کوششوں کے باوجود بھی پُر نہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت نے بھی دونوں قوموں میں پھوٹ ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کے زیر اثر وجود میں آئی تھی۔ ابتدا میں کانگریس اور مسلم لیگ متحد ہو کر کام کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن کچھ مفاد پرست اور کٹّر پن لوگوں کی وجہ سے یہ اتحاد بھی قائم نہ رہ سکا۔ انگریزوں کی پالیسیوں کی بہ نسبت یہ دوریاں اور بڑھتی گئیں۔ اس عہد کی سیاسی سرگرمیوں اور فرقہ پرستی دیکھ کر ہی دسمبر 1930 میں علامہ اقبالؔ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ایک مسلم ملک کی مانگ کی تھی کیوں کہ انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ گذر اوقات کرنا ناممکن ہے۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں بڑی تفصیل اور فصاحت کے ساتھ یہ حقیقت منکشف کر دی تھی۔ اقبالؔ نے ہندوؤں کی ذہنیت، مسلمانوں کی نفسیات، گذشتہ اور موجودہ حالات و کیفیات، فرقہ وارانہ فسادات، کانگریس کی متعصّبانہ اور خالص ہندوانہ روش اور رویہ پر اپنے صدارتی خطبے میں سیر حاصل بحث کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

''جہاں تک میں نے مسلم افکار کا مطالعہ کیا ہے میں اس بنا پر بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اگر یہ اصول فرقہ واری کے مستقل فیصلہ کی اساس قرار دیا جائے کہ ہندی مسلمانوں کو پورا پورا حق ہے کہ وہ اپنے ہندی علاقوں میں اپنی ثقافت و روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پورے طور پر آزادانہ ترقی کرنے کا مستحق ہے۔ تو مسلمان ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنی عزیز ترین متاع بھی قربان کرنے کے لیے بے قرار ہے۔ یہ اصول فرقہ واری پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ واریاں بھی کئی قسم کی ہیں وہ قوم جو دوسری قوموں پر نگاہ بد رکھے اور بد نیتی جس کے خمیر میں ہو تو وہ قوم ذلیل ہے..... جب کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں بھی پورے طور پر یک رنگی نہیں پائی جاتی۔ تو فرقہ وارانہ طبقات کو تسلیم کئے بغیر ہندوستان میں فرنگی جمہوریت کا نفاذ درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مسلمانوں کا اسلامی ہند کی تشکیل کا مطالبہ کاملاً صحیح ہے۔ میری تمنا ہے کہ پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے۔ حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ملے یا اس سے باہر۔ ہندی مسلمانوں کے لیے مذکورہ بالا متحدہ سلطنت کی تعمیر مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے۔..... اس نظریہ سے ہندوؤں یا انگریزوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامک ملک ہے اس تقسیم سے مسلمانوں کا احساسِ ذمہ داری اور حب الوطنی مزید ترقی کرے گی۔..... میں انہیں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان صرف آزادانہ ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ جو کہ وحدانی طرز حکومت کے ماتحت تقریباً ناممکن ہے۔''19

18 اگست 1942 کو کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک شروع کی۔ برطانوی حکومت نے اسے غیر قانونی قرار دیا اور اگلے ہی دن گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد، راجندر پرساد اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دیگر رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ جس کا نتیجہ بڑے پیمانے پر برطانوی مخالف پر تشدد مظاہروں کی شکل میں نکلا اور سارے ملک کا امن و امان درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ بے شمار گرفتاریاں ہوئیں، نہ جانے کتنی جانیں گئیں، لاکھوں کا نقصان ہوا، اس تحریک کو انگریزوں نے اپنی طاقت سے کچل دیا۔

1930 کی دہائی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان بداعتمادی بڑھنا شروع ہوئی۔ 1935 کے آئین

کے تحت منتخب شدہ کانگریسی اکثریتوں نے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر گورنمنٹ بنانے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ اس کے دو نمائندے کابینہ میں لیے جائیں لیکن کانگریس اپنی پارٹی سے ایک مسلم اور لیگ سے ایک نمائندہ لینا چاہتی تھی۔ لیکن مسلم لیگ اپنے فیصلے پر بضد تھی۔ آخر میں کانگریس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اپنی پارٹی کی کابینہ بنائے گی جس میں مسلم لیگ کے نمائندے کو اس شرط پر شامل کیا جائے گا کہ وہ اس کے معاہدے پر دستخط کرے۔ جس سے لیگ کو اپنی ذلت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد وہ کانگریس کی مخالف پارٹی بن گئی۔ مسلم لیگ نے عوام میں اپنی مقبولیت بڑھانی شروع کی اور دیگر مسلم پارٹیوں کو اپنے میں ضم کیا۔ 22 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں محمد علی جناح کی نمائندگی میں لیگ نے تقسیم اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنانے کا خیال پیش کیا۔ اس نظریہ نے پورے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا۔ رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں کہ:

> ''اس تجویز نے ہندوستان میں قیامت صغریٰ کا منظر قائم کر دیا سارے ہندو پریس میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ 1857 کے غدر کے بعد ہندو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اب وہ سارے ہندوستان پر بادشاہت کریں گے۔ مغربی جمہوریت کو وہ اپنے لیے ایک نعمت عظمیٰ سمجھ رہے تھے۔ مسلمانوں کو غلام رکھنے کی صرف یہی ایک تدبیر تھی کہ ہندوستان پر جمہوریت یعنی ہندو اکثریت کی حکومت ہو۔ اب یہ آس ٹوٹتی نظر آ رہی تھی..... یہ اتنا بڑا سانحہ تھا جس نے بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ جس چیز کا گمان بھی نہیں تھا وہ پیش آ رہی تھی اور پوری ہولنا کی اور دہشت انگیزی کے ساتھ نمودار ہو رہی تھی۔''20

گاندھی جی نے بھی اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے تقسیم کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا لیکن اپنی دور اندیشی سے وہ اتنا جان گئے تھے کہ مسلمان اب پاکستان لیے بنا چپ نہیں رہ سکتے۔ چناں چہ ہندوستان ٹائمز دہلی نے جو ان کے صاحبزادہ دیوی داس گاندھی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ 5 مئی 1940 کی اشاعت میں ان کا ایک انٹرویو شائع کیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:

> ''اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان فی الواقع اس اسکیم کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس خطۂ ارضی پر کوئی ایسی طاقت نہیں جو انہیں روک سکے۔ خواہ کتنا ہی تشدد آمیز یا عدم تشدد کے ذریعہ اس کی مخالفت کی جائے۔''21

1942 کے درمیان تک کانگریس اور مسلم لیگ میں تو تقسیم ہند کے سلسلے میں برابر رسّہ کشی ہوتی رہی۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے ساتھ دوسری کئی تنظیمیں بھی مسلم لیگ کے خلاف سامنے آئیں۔لہٰذا مسلم لیگ نے خود کو ہندوستان میں محفوظ نہ سمجھتے ہوئے پاکستان کی مانگ کی۔ یہ تجویز سب سے پہلے چودھری رحمت علی نے پیش کی جس کے تحت ہندوستان کے پانچ مسلم اکثریت والے صوبوں کو ملا کر پاکستان بنانے پر اسرار کیا گیا تھا۔لیکن جن علاقوں کو پاکستان میں شامل کیا گیا تھا وہ اقتصادی اعتبار سے کافی پچھڑے ہوئے تھے جو کہ ایک نئے ملک کے لیے بہت بڑا مسئلہ تھا۔

1946 کے الیکشن میں 533 سیٹوں میں سے 460 سیٹوں پر مسلم لیگ نے جیت حاصل کی۔اس انتخابات میں مسلم لیگ کی جیت سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں میں تقسیم کا مطالبہ کس قدر شدت اختیار کر گیا تھا۔مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی،اس نئی حکومت نے زمینداری کے نظام کو ختم کر دیا۔اس سے ہندو مسلم زمیندار کانگریس کے خلاف ہو گئے اور ہندو زمینداروں نے ہندو مہاسبھا کو منظّم کیا اور مسلم زمینداروں نے مسلم لیگ میں شرکت کر لی۔ملک کی سیاسی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔اس کے علاوہ مختلف ہندو تنظیموں نے بھی فرقہ واریت کو بڑھاوا دیا جس سے مسلمانوں کے تحفظ کا خطرہ لاحق ہوا۔ملک کی حالت اس وقت دگرگوں تھی۔ان سب حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے برطانوی حکومت نے ایک کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا جس میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ اور دیگر دوسری پارٹیوں کو کابینہ میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی، مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اس مشن پر اپنی منظوری دے دی۔

لیکن بعد میں پنڈت نہرو نے اس مشن کی تجاویز کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور اعلان کیا کہ کیبنٹ مشن کے پلان میں ترمیم کے لیے کانگریس آزاد ہوگی۔جس کی انگریزوں نے بھی حمایت کی۔اس وجہ سے مسلم لیگ نے مشن سے اپنی منظوری واپس لے لی۔تقسیم ہند کو روکنے کی یہ آخری کوشش آپسی اختلاف کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔مسلم لیگ نے مشن سے الگ ہونے کے بعد ڈائریکٹ ایکشن ڈے کا اعلان کر دیا اور 16 اگست 1946 کو ایکشن ڈے منایا گیا۔ملک کی تقسیم طے تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹنی بھی طے تھی۔بہر کیف 16 اگست کا دن ملک بھر میں امن و شانتی سے گزر گیا لیکن کلکتہ میں بھیانک فساد برپا ہو گیا۔تاریخی اوراق کو پلٹ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ 1946 کے فسادات بڑے منظّم ڈھنگ سے کرائے گئے تھے۔

16 اگست 1946 کو کلکتے میں یہ افواہ پھیلی کہ مسلم لیگ کانگریسیوں پر حملہ کرے گی اور کانگریس کی املاک لوٹ لے گی۔مزید دہشت اس وقت پھیل گئی جب حکومت بنگال نے اس دن تعطیل کا اعلان کر دیا۔جب مسلمان

ایکشن ڈے کے جلسے سے واپس ہو رہے تھے تو گلی کوچوں میں چھپے مسلّح بلوائیوں نے اُس جھوٹی افواہ کی بنا پر حملہ کر دیا، مسلمانوں کو اس اچانک حملے کی بالکل توقع نہیں تھی، اس حملے میں ہزاروں شہید ہوئے۔ مولانا آزاد اس وقت کلکتہ میں ہی تھے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان کی تاریخ میں 16 اگست ایک یوم سیاہ تھا۔ عام تشدد نے جس کی کوئی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی، کلکتہ کے عظیم الشان شہر کو خون ریزی، قتل اور دہشت کے ایک طوفان میں جھونک دیا۔ سیکڑوں جانیں ضائع گئیں، ہزاروں گھائل ہوئے اور کروڑوں روپے کی املاک تباہ کر دی گئی۔ لیگ کی طرف سے جلوس نکالے گئے جنہوں نے لوٹ مار اور آتش زنی شروع کر دی۔ جلد ہی پورا شہر دونوں فرقوں کے غنڈوں کی گرفت میں آ گیا۔''

آگے لکھتے ہیں کہ:

''16 اگست 1946ء صرف کلکتے کے لیے ہی یوم سیاہ نہیں تھا، پورے ہندوستان کے لیے تھا۔ واقعات نے جو موڑ اختیار کیا تھا۔ اس نے کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین کسی پر امن حل کی توقع کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا..... یہ ہندوستانی تاریخ کے عظیم ترین المیوں میں سے ایک تھا اور مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان واقعات کی ذمہ داری کا ایک بڑا حصہ جواہر لعل نہرو کے سر جاتا ہے۔ ان کے اس بد بختانہ بیان نے کہ کانگریس کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کے لیے آزاد ہوگی، سیاسی اور فرقہ وارانہ سمجھوتے کے پورے سوال کو پھر سے کھول دیا۔ مسٹر جناح نے ان کی اس غلطی کا پورا فائدہ اٹھایا اور کیبنٹ مشن کو قبول کرنے کے اپنے پرانے فیصلے سے خود کو نکال دیا۔''22

کلکتہ میں فساد کے بعد نواکھلی میں فساد شروع ہوا اس کے بعد بہار، یوپی، پنجاب، غرض کہ پورا ہندوستان اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے برطانوی حکومت بھی خستہ حال تھی، انگریز ہندوستان کو آزاد کر کے جلد سے جلد جانا چاہتے تھے۔ 1946 میں ہی ممبئی میں بحری جہازوں کے ملازموں نے انگریزوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ہڑتال شروع کی جو جلد ہی بغاوت کا روپ اختیار کر گئی۔ ان ملازموں کی حمایت میں ملک بھر کے مزدور طبقے کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی، اور تمام بڑے بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا، انگریزوں کی حالت پہلے ہی خستہ تھی۔

فسادات نے انہیں مزید پریشان کیا، سیاسی حالات بھی ان کے بس میں نہ تھے۔

کلکتہ فساد کے بعد گورنر جنرل فیلڈ مارشل آرچیبالڈ پرسیول ویول المعروف لارڈ ویول نے وہاں کا دورہ کیا تھا، وہاں کی تباہی دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا اگر مسلمانوں کے جائز حقوق نہ دیے گئے تو یہ سرزمین خانہ جنگی میں بدل جائے گی۔ چناں چہ اس نے کانگریس سے مشورہ کیے بغیر مسلم لیگ کو کابینہ میں شامل ہونے کی اجازت دے دی جس کی کانگریس نے شدید مخالفت کی اور لارڈ ویول کے خلاف برطانوی حکومت کو لکھا کہ اس کی جگہ نیا وائسرائے منتخب کیا جائے۔ ایک طرف لوگ آزادی کے حصول کے لیے بے صبر ہو رہے تھے دوسری طرف بدنصیبی یہ تھی کہ سیاسی مسئلوں کے ساتھ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل پا رہا تھا۔ بہار فساد کی تباہی دیکھنے کے بعد گاندھی جی کا متحد ہندوستان کا خواب ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں کی تباہی دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی بہتری نئے ملک میں ہی مضمر ہے۔ فسادات اور سیاسی تناؤ کے واحد حل کی پیشکش کیبنٹ مشن پلان نے کی تھی لیکن آپسی اختلافات کی وجہ سے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ آزادی کے خواہش مند سب تھے لیکن کسی کو اس کا صحیح مفہوم تک معلوم نہ تھا۔ جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم بے سوچے سمجھے زور و شور سے بڑھے چلے جا رہے تھے مگر منزل مقصود کا کوئی واضح تصور ہمارے سامنے نہیں تھا۔ ہم سب سوراج سوراج پکارتے تھے لیکن اس لفظ کا مفہوم ہر شخص اپنے خیال کے مطابق الگ الگ سمجھتا تھا۔ اکثر نوجوانوں کے نزدیک اس کا مفہوم کامل سیاسی آزادی اور جمہوری طرز حکومت تھا اور ہم میں سے بہت سے یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس سے لازمی طور پر اس بوجھ میں کمی ہو جائے گی جو کسانوں اور مزدوروں کو کچلتا ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر سوراج کا مفہوم مکمل آزادی سے بہت کم سمجھتے تھے۔ گاندھی جی خود اس معاملہ میں بڑے مزے کی گول مول باتیں کیا کرتے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس پر وضاحت سے غور کیا جائے۔ مگر ان کی مبہم گفتگو سے بھی یہ خاص طور پر ظاہر تھا کہ وہ غریبوں کے حامی ہیں اور اس بات سے ہم میں سے اکثر کو بڑی تسکین ہوتی تھی۔ اگرچہ اس کے ساتھ وہ امیروں کو بھی بہت اطمینان دلاتے تھے۔'' 23

1940 کی دہائی میں جاری فرقہ وارانہ تشدد کے درمیان برطانوی راج اپنی ساکھ کھونے لگا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی رسہ کشی اور فسادات سے تنگ آ کر ہی لارڈ ویول نے برطانوی حکومت کو پیغام بھیجا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے

ہندوستان کا اقتدار مقامی لوگوں کو سونپ کر برطانیہ کو یہاں سے خیر باد کہہ دینا چاہیے۔ چناں چہ وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت 1948 میں ہندوستان کو آزاد کر دے گی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نیا وائسرائے بنا کر بھیجنے کا بھی اعلان کیا جس کا کانگریس نے پرزور استقبال کیا۔

مارچ 1947 میں ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن کی آمد کا مقصد یہی تھا کہ جلد از جلد اقتدار کی منتقلی ہو سکے۔ وہ اسی ارادے سے انڈیا آئے تھے کہ ایک سال کے اندر اندر برطانوی راج ہندوستان کو الوداع کہہ دے۔ اقلیتیوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ملک میں امن اور یک جہتی قائم رکھنے کی برطانوی حکومت کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ جون 1947 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے رہنماؤں محمد علی جناح اور جواہر لعل نہرو نے اس منصوبے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ جو کام ایک سال بعد ہونا طے پایا تھا وہ محض چند مہینوں میں بڑی جلد بازی میں انجام دیا گیا جس کی وجہ سے پورا برصغیر خون میں رنگ گیا اور نتیجہ بڑا بھیانک نکلا۔

برطانوی جج سریل ریڈکلف کو انڈیا اور پاکستان کے درمیان لکیر کھینچنے کے لیے بلایا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں ہندوستان کے دو سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ آبادی والے صوبوں پنجاب اور بنگال کو تقسیم کرنا تھا۔ ریڈ کلف اس سے پہلے نہ کبھی ہندوستان آئے تھے اور نہ کبھی واپس لوٹے۔ جو سرحدیں انہوں نے طے کیں اس سے لاکھوں ہندو، مسلمان اور سکھ ناراض ہوئے۔ جلدی میں کی گئی اس تقسیم کے آنے والے دنوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ریڈکلف نے مسلم اکثریت والے علاقے کو ہندوستان اور ایسے علاقے جہاں ہندوؤں کی بھی آبادی تھی اسے پاکستان کو دے دیا اس وجہ سے بھی فرقہ وارانہ فساد کو بڑھاوا ملا۔

تقسیم ہند کو قبولیت ملنے کے بعد پورے ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چاروں طرف قتل عام، عورتوں کی عصمت دری، مارکاٹ غرض کی تباہی اپنے عروج پر تھی۔ ایسے میں اس قتل عام کو روکنے کی کوشش مشترکہ کلچر کے حامی مولانا ابوالکلام آزاد کر رہے تھے۔ وہ ملک کی تقسیم کسی حالت میں نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے جواہر لعل نہرو کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کی کہ تقسیم کے عمل پر تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ لیکن پنڈت نہرو اور ماؤنٹ بیٹن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بقول مولانا آزاد:

> ''میں نے جواہر لعل کو متنبہ کیا کہ اگر ہم تقسیم پر رضامند ہو گئے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ فیصلہ یہ کیا جائے گا کہ ہندوستان کو مسلم لیگ نے نہیں، بلکہ کانگریس نے

تقسیم کیا تھا۔'' 24

تقسیم ہند کی حمایت زمینداروں اور سرمایہ داروں نے بھی کی تھی۔ مولانا آزاد آخر تک اپنی سی تمام کوشش کرتے رہے کسی بھی طرح ملک کی تقسیم کو روکا جا سکے۔ اس لیے وہ پنڈت نہرو، ماؤنٹ بیٹن اور گاندھی جی سے بات چیت کے ساتھ سردار ولبھ بھائی پٹیل جو اس وقت ہوم منسٹر تھے ان سے بھی مشورہ کیا۔ یہاں بھی ان کو ناکامی ملی۔ کانگریسیوں میں تقسیم کے سب سے بڑے حامی سردار پٹیل تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے تعجب ہوا کہ اب پٹیل بھی دوقومی نظریے کے مبلغ جناح سے بڑھ کر ہیں۔ جناح نے اگر تقسیم کا جھنڈا اٹھانا چاہا لیکن ابھی حقیقی طور پر جھنڈا پٹیل کے ہاتھوں میں ہے۔''

آگے لکھتے ہیں کہ:

''اب جب کہ سردار پٹیل اور یہاں تک کہ جواہر لعل بھی تقسیم کے حامی بن چکے تھے۔ گاندھی جی ہی میری تنہا امید رہ گئے تھے..... میں ان سے ملنے گیا ان کا پہلا فقرہ تھا 'تقسیم اب ایک خطرہ بن چکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ولبھ بھائی اور یہاں تک کہ جواہر لال نے بھی ہتھیار ڈال دیے ہیں..... اب آپ کیا کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں؟'

میں نے جواب دیا 'میں تقسیم کے خلاف تھا اور اب بھی ہوں۔ تقسیم کے لیے میری مخالفت جتنی شدید آج ہے اتنی کبھی نہیں رہی..... میری تنہا امید آپ ہیں، اگر آپ تقسیم کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے، تو ہم اب بھی صورت حال کو سنبھال سکتے ہیں۔'' 25

گاندھی جی پاکستان کے سخت ترین مخالفتوں میں سے ایک تھے۔ گاندھی جی نے مولانا آزاد سے کہا تھا کہ ملک کی تقسیم ان کی لاش پر ہوگی جب تک وہ زندہ ہیں ہندوستان کی تقسیم کبھی نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی ماؤنٹ بیٹن سے ملنے اور پھر سردار پٹیل کے ساتھ دو گھنٹہ خفیہ ملاقات کے بعد بدل گئے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ:

''اس میٹنگ میں کیا ہوا میں نہیں جانتا لیکن جب میں دوبارہ گاندھی جی سے ملا تو مجھے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا کہ وہ بھی بدل گئے تھے..... اس سے بھی حیران اور افسردہ مجھے جس بات نے کیا یہ تھی کہ وہ انہی دلیلوں کو دہرا رہے تھے جن کا استعمال سردار پٹیل پہلے کر چکے تھے دو گھنٹہ سے زیادہ میں نے ان سے بحث کی، لیکن میں ان پر کوئی اثر نہ ڈال

سکا۔ مایوس ہو کر میں نے کہا اگر آپ بھی ان خیالات کو اختیار کر چکے ہیں تو مجھے ہندوستان کو تباہی سے بچانے کی کوئی امید دکھائی نہیں دیتی۔''26

1942 کے بعد پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات زوروں پر ہو رہے تھے۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کی دشمن ہو گئی تھیں۔ شورش اور بے چینی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے 1946 میں کیبنٹ مشن بھی بھیجا۔ جس نے شملہ کانگریس منعقد کی اور فروری 1947 میں یہ فیصلہ سنایا کہ جون 1948 سے پہلے حکومت برطانیہ ہندوستانی ہاتھوں میں اقتدار کو منتقل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے اور اسے یہ سوچنا ہوگا کہ ہندوستان کے مرکزی اختیارات مقررہ تاریخ کو کس کو سونپے جائیں جو ہندوستانیوں کے لیے مفید ہو۔ لیکن مشن کو کامیابی نہیں ہوئی۔

ملک کے بڑھتے ہوئے انتشار کو دیکھ کر وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے مقررہ وقت سے پہلے 14 اگست 1947 کو خود مختار ملک پاکستان قائم کر دیا۔ یہ مسلم اکثریتی ملک مشرقی اور مغربی پاکستان سے مل کر بنا۔ جن کے درمیان 1500km سے زیادہ طویل ہندوستانی خطہ تھا۔ محمد علی جناح نئے ملک کے پہلے گورنر جنرل بنے جن سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے پہلے دارالحکومت کراچی میں حلف لیا۔ 14 اور 15 اگست 1947 کی درمیانی شب ہندوستان کی تقسیم پر سرکاری مہر لگ گئی اور ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی موجودگی میں جواہر لعل نہرو نے جب ہندو اکثریت والے ملک بھارت کے پہلے وزیر اعظم کے طور پر حلف اٹھایا تو لاکھوں لوگوں نے جشن منایا۔ لیکن کچھ علاقوں میں یہ جشن خون کی ہولی کے ساتھ بڑے شرمناک طریقے سے منایا گیا، قدرت اللہ شہاب نے اپنی خودنوشت ''شہاب نامہ'' میں امرتسر میں اس دن کے جشن کا ذکر کیا ہے جس میں جان کونیل کے ایک اقتباس کو کوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''15 اگست کو جب بھارت پر آزادی کی دیوی کا نزول ہوا تو امرتسر شہر نے اس روز سعید کو عجیب طور پر منایا۔ جان کونیل نے اپنی کتاب 'آ کنلیک' میں لکھا ہے کہ اس روز سکھوں کے ہجوم نے مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ پھر سارے جلوس کی عصمت دری کی گئی۔ اس کے بعد کچھ عورتوں کو کرپانوں سے ذبح کر دیا گیا۔ باقی کو زندہ جلا دیا گیا۔''27

اسی طرح دیوان سنگھ نے بھی کئی ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سکھ اور

ہندو مسلم عورتوں کی عصمت دری کرنا اور مسلمانوں کے مال و متاع کو لوٹنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھ رہے تھے۔ صرف مذہب کے نام پر آزادی کے دوسرے دن جو ننگا ناچ کھیلا گیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ متحدہ ہندوستان کے حامی مہاتما گاندھی آزادی کے جشن میں شامل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے یہ دن کلکتہ میں مسلمانوں کے ساتھ گزارا۔ لیکن ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ ذہنیت نے جشن آزادی کی فضا کو غم ناک بنا دیا۔ چاروں طرف خون کی ہولی کھیلی جانے لگی لوگوں نے بھاری تعداد میں ہجرت کی۔

آزادی کی خوشی مشکل سے اڑتالیس گھنٹے باقی رہی اس کے دوسرے ہی دن سے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی خبریں راجدھانی دہلی پر گہری تاریکی پھیلانے لگی۔ سب سے پہلے مشرقی پنجاب میں ہندو اور سکھ مسلم گاؤں پر حملہ آور ہوئے۔ وہ گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور بے گناہ بچوں اور عورتوں، مردوں کو قتل کر رہے تھے۔ اسی طرح مغربی پنجاب میں مسلمانوں نے بغیر کسی تفریق کے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کیا۔ پورا پنجاب موت کا میدان بن گیا تھا اس کے بعد پورے ملک میں فساد برپا ہو گیا۔ تقسیم کے کچھ دنوں بعد ہی آزادی کی دو اہم ہستیاں یعنی محمد علی جناح اور گاندھی جی اس دنیا سے چل بسے۔

تقسیم ہند کے بعد بالکل فوری نتیجہ پنجاب، سندھ، دہلی، اتر پردیش، بمبئی اور دیگر علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں سامنے آیا جو جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گیا۔ جب کہ فرقہ وارانہ فسادات تقسیم سے پہلے ہی بہار اور بنگال میں بڑی تباہی مچا چکے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ملک کے دوسرے حصوں میں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر فساد ہو رہے تھے۔ مگر تقسیم ہند کا اعلان ہوتے ہی دونوں فرقوں میں کھلبلی مچ گئی اور بڑے پیمانے پر فسادات ہونے لگے۔ دونوں فرقوں کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈے سے ملک کا ہر گوشہ متاثر ہوا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ شدید ہو گیا، کیوں کہ یہاں کے ہندوؤں کا ماننا تھا کہ ان کو ایک الگ ملک مل گیا ہے اس لیے اب انہیں اس ملک میں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں نے وقتی اور ہنگامی اسباب کی بنا پر ایک جذباتی فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے مسئلوں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔

یہ بات واضح رہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور سب کی منتقلی ممکن ہی نہیں تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں نے جن مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کا مطالبہ کیا تھا وہاں ہندو فرقہ کے لوگ بھی زیادہ تھے۔ دراصل پاکستان کی تحریک سے عام لوگوں کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ وہ ملک مسلمانوں کا مذہبی ملک ہوگا جہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے۔ حالاں کہ محمد علی جناح نے ایک دو بار یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان ایک سیکولر ملک ہوگا۔

مگر حالات نے نئی کروٹ لی اور جب مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہوا تو مغربی پنجاب ہندوؤں سے خالی ہو گیا۔ دوسری جانب ہندوؤں میں یہ ڈر بھی تھا کہ اسلامی ملک میں ان کا کوئی مستقبل نہ ہوگا، ہندوستان میں مسلمانوں کی تباہی کا سن سن کر بھی انہیں خوف تھا کہ یہاں پر ان کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔خوف اور جان و مال کے ڈر سے دونوں طرف سے بھاری تعداد میں لوگوں نے ہجرت کی۔ بقول عقیل احمد:

> ''ہندوستان تقسیم ہو گیا، پاکستان سے ہندو، ہندوستان آنے لگے۔مسلمان بڑی تعداد میں پاکستان چلے گئے پھر بھی ایک تہائی مسلمان ہندوستان میں ہی رہ گئے۔ان میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جن کے گھروں کے کچھ افراد پاکستان چلے گئے اور کچھ ہندوستان میں رہ گئے۔اس تقسیم نے ملک کی حد بندی ہی نہیں کی بلکہ اس تقسیم سے خاندان کی تقسیم ہو گئی، ایک کلچر منقسم ہو گیا، ایک تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا۔'' 28

جیسے ہی پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں سے اپنے ملک کو نجات دلانے کی مہم چلائی۔اسی طرح پاکستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں سے اپنے ملک کو پاک کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔دونوں فرقوں نے یکساں حیوانیت اور بربریت کا مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے کو اپنے ہی وطن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ان کا اپنا گھر، ملک سب کچھ یکا یک اجنبی بن گیا ان کے قریبی پڑوسی جو محبت اور شفقت کے ضامن تھے ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے۔کس نے کتنا ظلم کیا یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے۔فسادات کے اس ہنگامہ خیزی میں انسانی رشتے پامال ہوئے اور اخلاقی نظام درہم برہم ہو گیا۔ پورا معاشرہ انتشار کا شکار ہوا اور متاثرین کو شدید ذہنی جھٹکے لگے۔ایک عرصے تک موت کا ننگا ناچ ہوتا رہا اور زندگی رائیگاں ہوتی رہیں۔ساجدہ زیدی، دیوان سنگھ مفتوں، گوپال متل، قدرت اللہ شہاب، اختر حسین رائے پوری جیسے کئی لوگوں نے اپنی خودنوشت میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا ہے۔لیکن امر واقعہ یہ بھی ہے کہ دونوں قوموں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا اور سرحد کے دونوں ہی جانب انسانیت کراہ رہی تھی۔

سرحد کے ایک طرف لاکھوں مسلم اور دوسری طرف ہندو اور سکھ اچانک اپنی ہی سرزمین پر پرائے ہو گئے۔ دونوں ملکوں کی نئی حکومتیں اتنی جلدی اور اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی ہجرت کو سنبھالنے کی حالت میں نہیں تھیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں لوگ بے گھر اور ہزاروں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس وقت کل کتنے لوگ ہلاک ہوئے۔مورخین کا خیال ہے کہ پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے، ہزاروں خواتین کی عصمت دری

کی گئی یا انہیں اغوا کر لیا گیا۔ اگست 1947 سے مئی 1948 تک تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ ہندو مسلمان اور سکھوں کو اپنے گھروں سے بے گھر ہونا پڑا۔ چھ لاکھ آدمی مارے گئے اور ایک لاکھ لڑکیاں اغوا کی گئیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کو آزادی بہت جلدی میں دی گئی۔ آزادی کے فوراً بعد سرحد کے دونوں طرف جو خون خرابہ ہوا اس میں اس جلد بازی کا بھی دخل ہے۔ خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن تقسیم ہند کے متعلق لکھتا ہے:

> ''برما کو ہندوستان سے علیحدہ کرنے میں تین سال لگے تھے، بمبئی کو سندھ سے علیحدہ کرنے میں دو سال اور اڑیسہ کی بہار سے علیحدگی میں دو سال۔ اس کے برخلاف ایک اتنے بڑے ملک کی یعنی ہندوستان کی تقسیم میں صرف ڈھائی مہینے لگے۔''29

فسادات کی گرم بازاری میں ہجرت کا عمل شروع ہوا اور اس ہجرت کا سب سے الم ناک پہلو یہ تھا کہ لوگ بخوشی اپنا وطن نہیں چھوڑ رہے تھے بلکہ وہ دربدری کے لیے مجبور کر دیے گئے تھے۔ حالاں کہ اس میں کچھ ایسے بھی تھے جو مذہبی جذبے کی بنا پر نئے ملک میں جا رہے تھے۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جو حالات پیدا ہوئے اس سے مسلمان نہ صرف مایوس اور خوف زدہ تھے بلکہ حالات کو دیکھتے ہوئے اپنے مستقبل کے لیے فکر مند بھی۔ چناں چہ نئی مملکت کے وجود میں آنے کے بعد لوگ جوق در جوق ہندوستان سے ہجرت کر رہے تھے خصوصاً شمالی ہندوستان میں کافی افرا تفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ وہاں کے مسلمان کہیں بھی اور کسی صورت میں خود کو محفوظ نہ سمجھتے ہوئے عدم تحفظ، مجبوری اور کشت وخون سے گھبرا کر جان بچانے کی خاطر سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے۔

ایسے حالات میں ان کا حوصلہ اور ہمت بڑھانے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد آگے آئے جو تقسیم ہند کے سخت مخالفوں میں سے ایک تھے، بالکل اسی طرح جب غدر کے بعد مسلمانوں کے رہنما بن کر سرسید احمد خاں سامنے آئے تھے اور ان کی تحریک نے مسلمانوں کو سنبھالا تھا۔ مولانا آزاد نے وطن کے سانحہ اور زبردست فرقہ وارانہ فسادات سے بدحال مسلمانان ہند میں جوش وجذبہ اور حوصلہ دلانے کے لیے دہلی کی شاہجہانی جامعہ مسجد کی سیڑھیوں سے 24 اکتوبر 1947 کو وہ تاریخی خطاب کیا تھا جس میں مسلمانوں کے شاندار تاریخ کی یاد دہانی کرا کر اس کے پس پردہ مسلمانوں سے ہندوستان میں رکنے کی اپیل کی گئی تھی، ان کے تحفظ کے لیے یقین دہانی کرائی تھی۔ ساتھ ہی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کے کردار اور تقسیم ہند کے بعد وطن کے حالات پر روشنی ڈالی، مسلمانوں کی سیاسی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کے مستقبل کے لائحہ عمل کو بھی پیش کیا۔ ان کا خطاب کافی طویل ہے، راشٹریہ سہارا کی خصوصی پیش کش ''آزادی نمبر'' جو کہ 15 اگست 2006 میں شائع ہوئی تھی، اس میں مولانا آزاد

کی پوری تقریر موجود ہے، یہ رسالہ راقمہ کے زیر مطالعہ رہا، مولانا کے خطاب کا آخری حصہ ملاحظہ ہوں جس میں مسلمانوں سے ہندوستان نہ چھوڑنے کی بات کی گئی:

> ''یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟..... جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا۔ انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے اور ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔''30

مولانا آزاد نے مظلوم، مایوس اور قتل و غارت گیری سے گھرے مسلمانوں کو نہ صرف اپنے ہاں گھر پر پناہ دی بلکہ ان کی حفاظت اور دل جوئی بھی کرتے رہے۔ اس کا اندازہ مشہور شاعرہ و ادیبہ اور ماہر تعلیم ساجدہ زیدی کی خودنوشت ''نوائے زندگی'' سے ہوتا ہے۔ مصنفہ خود ان کے گھر پناہ گزین تھیں انہوں نے بڑی تفصیل سے مولانا آزاد کا پناہ گزینوں کے تئیں نظم و نسق کو بیان کیا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی مشہور کتاب انڈیا ونس فریڈم میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مسلمانوں کی اتنی تعداد میں ہجرت بھی خیر کی علامت نہ تھی وہاں نئے ملک میں ان کی باز آبادکاری میں کافی مشکلات تھیں اور اتنی تعداد میں ایک ساتھ تمام کی پریشانیوں کو ختم کرنا آسان نہ تھا۔ انیس قدوائی اپنی خودنوشت ''آزادی کی چھاؤں میں'' اس تعلق سے بڑی تفصیل سے لکھتی ہیں ان کی یہ کتاب اس وقت کی پناہ گزینوں کے حالات اور تباہی و بربادی کو پیش کرتی ہے۔ وہ اور ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگ سمجھاتے رہے کہ ''اتنی تعداد میں اگر پاکستان پہنچو گے تو وہاں بھی بھوکوں مرو گے، ریل میں کٹو گے۔۔۔'' لیکن افسوس ہے کہ کوئی بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھا اور ہندوستان سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مجبور ہو کر ہجرت کر گئی۔ ملک کی تباہی و بربادی دیکھ کر سب سے زیادہ پریشان گاندھی جی ہوئے۔ انہوں نے اس تباہی کو روکنے اور بقیہ معاملات کو سلجھانے کے لیے 13 جنوری 1948 سے برت رکھا جو پانچ دن کے بعد مولانا آزاد کے پیش کردہ سنترے کے جوس سے گاندھی جی نے اپنا برت توڑا۔ انہوں نے اپنے برت توڑنے کے لیے کچھ شرائط رکھی تھیں جن میں سب سے اولین شرط یہی تھی کہ جو بھی مسلمان پاکستان چلے گئے ہیں ان کو

واپس بلایا جائے، ہندو مسلم میں پھر سے اتحاد قائم کیا جائے۔تمام شرائط اور گاندھی جی کے برت سے متعلق مولانا آزاد نے ''انڈیا ونس فریڈم'' میں تفصیل سے لکھا ہے۔

شاید اس وقت ہجرت کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ دونوں ممالک پر دو الگ الگ مذاہب اور قومیت کی مہر لگ گئی تھی۔ ہجرت کرنے والوں میں لاکھوں لوگوں نے بیک وقت نئی سرزمین پر دھاوا بول دیا تھا جن کو فوری طور پر روزگار کا ملنا دشوار تھا۔ چناں چہ جو لوگ ہندوستان سے پاکستان گئے ان کو بڑی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا اور ایک عرصے تک ان کی حالت بڑی خراب رہی، دو روٹی کے لالے پڑ گئے۔لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنہیں ان کے سچے عزائم نے توڑنے نہیں دیا وہ نئے ملک کی بقا اور ترقی کے لیے جان و مال سے ساتھ دے کر جی توڑ محنت کر رہے تھے۔

ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان سے جو ہندوستان آئے وہ شرنارتھی کہلائے اور جو مسلمان بڑی تعداد میں پاکستان گئے انہیں مہاجر کہا گیا۔مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد پاکستان جانے کے بعد بھی ایک تہائی مسلمان ہندوستان میں بچ گئے۔ان میں سے کئی ایسے لوگ بھی تھے جن کے خاندان کے کچھ افراد پاکستان چلے گئے اور کچھ ہندوستان میں رہ گئے۔اس تقسیم نے صرف ملک کی حد بندی نہیں کی بلکہ اس نے خون کے رشتے، خاندان اور کلچر کو بھی تقسیم کر دیا۔آزادی کی نئی صبح ایک طرف خوشیوں کی سوغات لے کر آئی تو دوسری طرف فسادات، ہجرت اور خوں ریزی کا خوفناک منظر بھی پیش کیا۔ملک میں انتشار اور بے چینی پھیلنے سے آزادی کی خوشیاں پھیکی پڑ گئیں۔فیض احمد فیضؔ نے اسی تباہی و بربادی کو دیکھ کر کہا تھا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ہندوستان کی تقسیم اچانک عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ اس کے لیے پہلے سے ہی فضا بن رہی تھی۔انگریزوں نے مختلف فرقوں میں نفرت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔جس سے ملک میں فرقہ پرست جماعتیں وجود میں آئیں اور دو قومی نظریے کی بنیاد پر آخر کار ملک کو تقسیم کر دیا گیا۔یہ سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا جس میں ملک کو آزادی تو ملی لیکن آزادی کی خوشیاں نصیب نہیں ہوئی۔کل تک جو ایک دوسرے کا سہارا بنے تھے وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن بیٹھے تھے۔ملک کی تقسیم کے ساتھ جو آزادی ملی اس نے صرف وحشت اور بربریت کا ثبوت دیا، جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں نے فساد کی صورت میں جس نفرت اور دشمنی، قتل و غارت گیری کا مظاہرہ کیا تھا اس نے انسان و حیوان میں فرق ختم کر دیا تھا۔

تقسیم ہند نے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی سطح پر کئی مسائل کو جنم دیا۔ ملک کی سیاسی صورت حال یکسر بدل گئی۔ سیاسی مسائل وہ نہیں رہے جو غلامی کے دور میں تھے۔ نئے ملک میں نئی حکومت آئی، مہاجروں و شرنارتھیوں کی بڑی تعداد کو دوبارہ بسانے کے لیے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد پیدا شدہ بحران نے معیشت کو درہم برہم کر دیا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے، کئی گھروں کے چراغ بجھ گئے، گھروں کو چلانے والے ہزاروں افراد نہیں رہے، کاروبار بھی تقسیم ہو گیا، کھیتی باڑی کی زمینیں چھین گئیں، آمدنی کے زرائع ختم ہو گئے۔ بہت سارے لوگوں کے ساتھ یہاں تک ہوا کہ جسم پر کپڑے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا اور وہ لوگ آخر کار پناہ گزیں کیمپوں کے محتاج ہو گئے۔ ان کو پھر سے آباد کرنا اور روزگار دینا دونوں ملکوں کے لیے سیاسی سے زیادہ سماجی اور معاشی مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ''بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے۔'' ڈاکٹر نکہت جہاں لکھتی ہیں:

> ''ملک کی تقسیم کا سب سے زیادہ اثر پنجاب اور بنگال پر پڑا جن کے دو حصے کر دیے گئے ایک حصہ ہندوستان میں رہ گیا تو دوسرا پاکستان کا ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسے بسائے گھر راتوں رات اجڑ گئے ہندو اور مسلمان جو ایک دوسرے کے غم گسار تھے وہ تقسیم کا اعلان ہوتے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ جس کی وجہ ان کی وہ نفسیاتی کشمکش تھی جو رجعت پسند سیاسی جماعتوں کی پیدا کردہ تھی۔ مسلم لیگ پاکستان میں غیر مسلموں کو دیکھنے کی روادار نہیں تھی اور راشٹریہ سیوک سنگھ اور ہندو مہا سبھا ہندوستان کو صرف ہندو راشٹر بنانا چاہتے تھے۔''31

آزادی کے بعد اس کا ایک اقتصادی پہلو یہ بھی تھا کہ جوش میں آ کر جن صوبوں کو پاکستان میں شامل کیا گیا تھا ان میں مسلمانوں کی اکثریت زیادہ تھی لیکن معاشی و اقتصادی سطح پر ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بنگال کا وہ خطہ جو صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ تھا یعنی مغربی بنگال ہندو اکثریت کا علاقہ تھا جس میں 1936 کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستانی علاقے میں کپڑے کی صرف 9 ملیں تھیں جب کہ دوسرے علاقے میں ان کی تعداد 33 تھیں۔ جوٹ کی مِل پاکستانی علاقے میں نہیں تھی جب کہ دوسرے علاقے میں ان کی تعداد 103 تھیں۔ چینی مِل پاکستانی علاقے میں 9 تھی اور دوسری جگہ 238 تھیں۔ اس طرح جن صوبوں کو پاکستان میں شامل کیا گیا وہ اقتصادی و معاشی اعتبار سے کافی پیچھے تھے۔

پاکستان کے قیام کے بعد سب سے زیادہ مشکلات اس کے سامنے ہی تھیں کیوں کہ ملک کو از سر نو بسانا، معاشی

اعتبار سے دوسرے ممالک کے برابر لانا، سرکاری دفاتر، بینک، کارخانے، تعلیمی ادارے وغیرہ غرض کہ اسے زندگی کے جملہ شعبوں میں آگے بڑھنے کے لیے وسائل حاصل کرنے تھے۔اس کے برخلاف ہندوستان کو تقسیم کے بعد اتنا زیادہ فرق نہیں ہوا کیوں کہ یہاں بنے بنائے دفاتر، بڑے بڑے تعلیمی ادارے، کارخانے، یہاں تک کہ راجدھانی تک موجود تھی لیکن مذکورہ مسئلوں پر غور صرف نئے ملک یعنی پاکستان کو کرنا تھا۔تقسیم کے وقت پاکستان کے پاس نہ کوئی نقد رقم موجود تھی اور نہ ہی دیگر کوئی وسائل۔لیکن وہاں کے لوگ اور سرکاری ملازم ہر مشکل سے نبرد آزما ہوئے اور ملک کی ترقی میں جی توڑ محنت کی۔

تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہت ساری چیزوں کے ساتھ سرکاری فائلیں، مرکزی کتب خانوں کی کتابیں، فوجی سامان وغیرہ کی تقسیم بھی ہونا طے ہوئی تھی۔یہ تمام چیزیں بعد میں ریل گاڑی کے ذریعے پاکستان بھیجی گئیں لیکن افسوس کہ دہلی سے روانہ ہونے کے بعد ان گاڑیوں کو لوٹ کر نظر آتش کر دیا گیا جس سے سارا سامان خاکستر ہو گیا، بعد ازاں جو چیزیں بچ گئیں اس کی منتقلی ہوائی جہازوں سے کی گئی۔اس کے علاوہ ہندوستان کے پاس جو نقدی رقم موجود تھی اس میں سے 75 کروڑ پاکستان کو دینا طے ہوا تھا جسے ہندوستانی حکومت نے ایک کشت دینے کے بعد بقیہ رقم دینے سے انکار کر دیا۔یہ رقوم اس نئے ملک کی معاشی حالت کو بحال کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی لیکن جب حکومت نے ہاتھ روک لیا تو گاندھی جی نے برت رکھا اور اس کی مخالفت کی۔ان کی مخالفت کی بنا پر ہندوستان نے باقی رقوم کی بھی ادائیگی کر دی لیکن افسوس کہ گاندھی جی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔اگر تاریخ کے اوراق پلٹ کر حقائق کو تلاش کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس نے شروع سے ہی پاکستان کی ترقی اور اس کی کامیابی میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تھی۔ بہت ساری باتیں اور حقائق ہیں جو تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو گئے ہیں یا پھر صحیح حالات و واقعات کو جان بوجھ کر مسخ کر کے نئی نسل کو گمراہ کر کے فرقہ واریت کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔کیوں کہ آزادی کے بعد بھی کسی بھی مسئلے کا حل اب تک نہ ہو سکا، تب سے نہ جانے کتنے فساد ہوئے اور نہ جانے کتنے مسلمانوں کو مذہبی تعصب کی بنیاد پر تہ تیغ کیا گیا۔

تقسیم ہند اور فسادات کے فوراً بعد دونوں ممالک میں دو بڑے مسائل درپیش تھے۔ایک خالص معاشی و اقتصادی مسئلہ تھا اور دوسرا مسئلہ معاشرتی و اخلاقی تھا۔معاشی و اقتصادی کے تحت مہاجروں کی فوری ضرورتوں کو پورا کرنا اور پھر سے ان کو آباد کر کے روزگار دینا تھا۔ان کے فوری انتظام کے لیے کیمپ بنائے گئے لیکن ان کیمپوں میں دن بڑی مشکل سے گزر رہے تھے۔بدسلوکی، لوٹ مار، چوری، بے ضابطگی، بھوک اور بے کاری عام تھی۔معاشرتی و اخلاقی

مسائل کے تحت ترک وطن کرنے والوں میں بیشتر دیہاتوں کو خالی کر گئے تھے، مگر ہجرت کے بعد وہ شہروں میں ہی بسنا چاہتے تھے کیوں کہ ان کو وہاں کوئی نہ کوئی روزگار مل جاتا۔ اس لیے مہاجر کیمپ شہروں کے آس پاس ہی بنے اور مہاجروں کی آبادکاری بھی بیشتر شہروں میں ہوئی جس کے نتیجے میں شہروں پر اقتصادی بوجھ اچانک بڑھ گیا۔ شہروں میں زبردست آبادی کا اضافہ ہوا۔ مہنگائی بڑھ گئی اور غذائی اشیاء کی قلت کے سبب بدعنوانی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

مغویہ عورتوں کی بازیافت اور اپنے گھروں پر ان کی واپسی کا مسئلہ ہندوستان کے لیے بہت سنگین تھا۔ ہندوؤں نے اپنے عقیدت اور تہمات کے بنا پر اغوا شدہ عورتوں کو دوبارہ اپنے گھروں میں بسانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح بے گناہ اور معصوم عورتوں کو واقعی گنہگار سمجھ لیا گیا۔ اس انکار سے ایک بار پھر انسانیت اور اخلاقیت کو زبردست دھکہ لگا۔ اسی طرح مسلم خواتین کے ساتھ ہوا، ان میں سے بہت سی عورتوں کو غیر اخلاقی کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کچھ نے خودکشی کر لی اور بہت سی ایسی تھیں جو قدرت کا فیصلہ سمجھ کر اسی گھر میں رہ گئیں جہاں وہ اغوا کر کے لائی گئی تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تقسیم ہند اور فسادات کے ہنگاموں میں عورتوں کو سب سے زیادہ جذباتی صدمے برداشت کرنے پڑے تھے، تو بجا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر ظفر سعید لکھتے ہیں کہ:

> ''تقسیم اور فسادات کے ہنگامے میں عورتوں کو سب سے زیادہ جذباتی صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ عورتوں کو اپنی عزت اور ہری بھری گود سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، اس موقع پر سرِ بازار ان کی عصمت لوٹی گئی، برہنہ عورتوں کے جلوس نکالے گئے، بچوں کو ان سے چھین کر تہ تیغ کیا گیا۔ ترک وطن میں بہت سے بچے گم ہو گئے اور پھر اغوا شدہ بدنصیب عورتیں واپس اپنے گھروں کو لائی گئیں تو سبھوں نے ان کی طرف سے اپنی نظریں پھیر لیں اس سے فساد زدہ علاقوں میں ایک بڑا معاشرتی خلفشار پیدا ہو گیا۔''32

جب حکومت کو مہاجرین کی بازآبادکاری سے کچھ سکون ملا تو کانگریس پارٹی کو اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنا تھا۔ کروڑوں غریب کسانوں کو راحت دینے کے لیے زمینداری کا خاتمہ ضروری تھا۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے ریاستوں نے قانون بنانے شروع کیے۔ خاتمہ زمینداری تقریباً ۸۳ فیصد آبادی کے لیے مسرت کی بات تھی۔ یہ لوگ زمینداروں کی اراضی پر اپنا خون پسینہ بہا کر اور دن رات محنت کر کے جو کھیتی باڑی کرتے تھے وہ انہیں دو وقت کی روٹی بھی فراہم نہ کرتی تھی۔ کیوں کہ اس کی آمدنی پر زمینداروں کا حق ہوتا تھا۔ زمینداری کے خاتمے کے لیے جو قانون پاس ہوا اس سے کسان اس زمین کے مالک قرار دیے گئے لیکن دوسری جانب چھوٹے چھوٹے یا متوسط طبقہ کے زمینداروں

کے لیے اس کی وجہ سے ان گنت مسائل پیدا ہو گئے۔ ہزاروں لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا۔ کئی خاندان جو سکون اور شان و شوکت کی زندگی بسر کر رہے تھے کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

تقسیم کے بعد جو تباہ کن صورت حال پیدا ہوئی اس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ایسا دور تھا جب پورے ملک میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ عصمت و عفت کے محافظ محض مذہب کی بنیاد پر اسے داغدار کر رہے تھے۔ کل تک جو ایک ساتھ متحد ہو کر تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لے رہے تھے آج ایک دوسرے کے جانی دشمن بن بیٹھے تھے اور حیوانیت و بربریت کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

وہ لوگ جو صبحِ آزادی کا انتظار اور ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے ان کا خیال تھا کہ آزادی کے بعد غریبی، بھوک، افلاس، استحصال اور ظلم سے نجات مل جائے گی۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد جو فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی، اس میں محض بے گناہ لوگ جل کر راکھ ہوئے۔ ہندوستان اور پاکستان سے لاکھوں لوگوں نے ہجرت کی۔ راستے میں ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے، ریل گاڑیوں کو لوٹا گیا، پورے کے پورے قافلے کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس وقت انسان ایک درندہ بن گیا تھا اور انسانی قدریں ختم ہو چکی تھیں۔ لوٹ، قتل و غارت اور عصمت دری کا جو سلسلہ شروع ہوا اسے دیکھ کر شیطان کا سر بھی ندامت سے جھک گیا۔

تقسیم کے بعد ہزاروں خاندان الگ ہو گئے خصوصاً مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ بہت اہم بن گیا۔ والدین ہندوستان میں رہ گئے تو بچے پاکستان چلے گئے اور ساتھ ہی اپنی تہذیب و معاشرت ہندوستان میں چھوڑ گئے۔ پاکستان پہنچے تو وہاں کے نئے لوگ، نئی بول چال کی زبان بھی مقامی لوگوں سے الگ تھی، رہن سہن بھی الگ تھے۔ وہاں کی آبادی بھی مہاجرین کے پہنچنے سے اپنی معاشرت اور اپنی معیشت کے لیے خطرہ محسوس کر رہی تھی، تقریباً یہی حال ہندوستان میں بھی تھا۔ ان تمام مسائل سے یہاں کی عوام بھی دو چار تھی۔ یہ ممکن ہے کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں نے وقتی اور ہنگامی اسباب کی بنا پر ایک جذباتی فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس کے نتائج پر کبھی غور نہیں کیا۔

فسادات کے ان ہنگاموں میں سارے رشتے، ساری محبتیں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ تمام روایتیں جو برسوں سے چلی آ رہی تھیں روند ڈالی گئیں۔ اس سے لوگوں کو شدید ذہنی جھٹکے لگے۔ پورے معاشرے میں بے چینی اور مایوسی پھیل چکی تھی۔ خوف و دہشت نے مستقل طور پر لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اقتصادی بدحالی پہلے ہی ہندوستان میں تھی فسادات نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ چوں کہ رقبے کے اعتبار سے پاکستان ایک چھوٹا ملک ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لیے اس نئے ملک میں تمام مسلمانوں کی منتقلی ممکن نہیں تھی۔ اس کے علاوہ خود

ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کٹّر قوم پرست کی تھی جو تقسیم ملک کے سخت خلاف تھی۔ لہٰذا ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے مقابلے ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اور اس طرح ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی یہیں رہ گئی۔

لیکن تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی لہر بہت تیز ہوگئی اور فرقہ وارانہ ذہن نے دونوں فرقوں کے درمیان ایک بڑی خلیج قائم کردی اور یہ خلیج وقت اور زمانے کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ حالاں کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں فرقہ پرست تنظیموں اور گروہوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات جو آزادی سے پہلے شروع ہوئے تھے وہ آج بھی جاری ہے۔ آزادی کے بعد چھوٹے بڑے لاتعداد فسادات ہوئے ہیں جن میں ہزاروں لوگوں کی جانیں تلف ہوئی ہیں اور کروڑوں کا اثاثہ تباہ ہوگیا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہاں کے مسلمانوں میں خوف و دہشت کا خاتمہ اب بھی نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر ظفر سعید لکھتے ہیں:

> ''مسلمان مسلسل عدم تحفظ کے احساس سے دبے ہوئے ہیں اس کی وجہ سے مسلمانوں میں تنہائی، لاتعلقی اور بیگانگی کا احساس بڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلمان نہ تو قومی دھارے میں پوری طرح شامل ہو سکے ہیں اور نہ ہی ان کی خاطر خواہ ترقی ہوسکی ہے۔ ان کے ذہن میں اب بھی دھند چھائی ہوئی ہے اور انہیں کوئی واضح راہ دکھائی نہیں دیتی۔''33

مسلمانوں کی حیثیت ہندوستان میں مستقل طور پر مشکوک ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں۔ جب کہ یہ بعید از حقیقت ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ خود اپنے ملک یعنی ہندوستان میں ان کی حیثیت غیر یقینی ہوگئی۔ یہاں جو مسلمان رہ گئے تھے انہیں اپنی زمین اور مٹی سے بے حد لگاؤ تھا۔ جن لوگوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو وہ وہی لوگ تھے جو مذہبی جذبے کے تحت وہاں چلے گئے، اس کے علاوہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جنھوں نے اس وقت کے حالات اور فرقہ وارانہ فسادات سے گھبرا کر ترک وطن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چوں کہ پاکستان کا قیام دو قومی نظریے اور مذہب کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا اس لیے وہاں کے لوگ، غیر مسلم کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے یہاں مذہب اور ذات و نسل کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں ہے، لیکن افسوس یہ سیکولرازم اب ہندوستان میں بالکل ختم ہوتی نظر آرہی ہے۔ مسلمانوں کو طرح طرح سے اور بے جا قانون نافذ کر کے پریشان کیا جارہا ہے۔ پاکستان سے ہندوستان ہجرت

کرنے والے یہاں پر پوری طرح ضم ہو گئے۔لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ہندوستان میں شرنارتھی کا تصور ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گیا ہے لیکن پاکستان میں مہاجر آج بھی زندہ ہیں۔

تقسیم کے بعد قومی پیمانے پر ایک عجیب تر صورت یہ بھی پیدا ہو گئی کہ دونوں قریب ترین پڑوسیوں میں آپسی تناؤ آج بھی ہے اور دونوں کے درمیان مسلسل چشمک جاری ہے۔کبھی یہ سرد جنگ کی صورت میں پروان چڑھتی ہے، کبھی یہ دونوں آپس میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے غرّاتے ہیں۔دونوں ملکوں کے درمیان اب تک تین بڑی جنگیں ہو چکی ہیں اور ہر ایسے موقعے پر ہندوستانی مسلمانوں کو شدید ذہنی و جذباتی صدمہ اٹھانا پڑتا ہے کیوں کہ ان پر اٹھنے والی مشکوک نگاہیں ایسے مواقع پر زیادہ خشمگیں اور گراں بار ہو جاتی ہیں۔حالاں کہ دونوں ممالک کے مسلمان یہی چاہتے ہیں کہ دونوں قریب ترین پڑوسیوں میں خوشگوار اور دوستانہ تعلق قائم ہو جائے تا کہ دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شامل ہو سکیں لیکن سیاست کی چال تو ہمیشہ الٹی ہی ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں ہندوستانی مسلمان آج بھی اپنے ملک میں اجنبی ہیں،ان کو شک وشبہات کی بنا پر دہشت گرد کا نام دیا جاتا ہے۔پاکستان بنانے والے اگر واقعی مسلمانوں کی بہتری چاہتے تھے تو یہاں رہنے والے مسلمانوں کے بارے میں ان کو ایک بار ضرور سوچنا چاہیے تھا کہ اس کے بعد ان کا کیا ہوگا۔جن میں حب الوطنی کا جذبہ مؤجزن تھا انہوں نے اپنے ملک میں تمام خطرات کو دیکھتے ہوئے بھی یہیں رہنے کو ترجیح دی،لیکن افسوس کہ آج ان سے ہی ان کی حب الوطنی پر سوال ہوتا ہے۔ہندو ہو یا مسلمان اس ملک کی روشن تاریخ دونوں قوموں کے مشترکہ تہذیب وتمدن سے ہے۔جس سے انکار ممکن نہیں،اسی طرح ملک وملت کی ترقی بھی دونوں قوموں کے اتحاد سے ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کچھ شر پسندوں کی وجہ سے یہ اتحاد قائم ہونے کے بجائے ٹوٹتا جا رہا ہے۔مختلف حیلوں اور بہانوں سے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔یہی نہیں سماج کے نچلے طبقے کا بھی قافیہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ملک کے معماروں نے ملک کے تحفظ اور سب کے جائز حقوق کے لیے دستور بنائے لیکن کچھ مفاد پرست لوگوں نے دستوری تحفظ کو برباد کر کے رکھ دیا۔اس سلسلے میں مولانا ندیم الواجدی لکھتے ہیں:

> ''اس ملک کے معماروں نے ہندوستان کو سیکولر جمہوریہ بنانے والوں نے تو ملک کے ہر شہری کو دستور کا تحفظ دیا، برابری دی، آزادی دی، حقوق دیے، حصولِ انصاف، حصولِ تعلیم اور حصولِ معاش کے لیے یکساں مواقع دیے۔لیکن حکومتوں نے اپنی بد نیتی سے، اپنے حقیر مقاصد کی خاطر اس دستوری تحفظ کو برباد کر کے رکھ دیا، آج ہمارا ملک جن حالات سے

گزر رہا ہے وہ سب کے سامنے ہیں اور جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے وہ بھی
کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔''34

اس کے علاوہ ہندوستان میں جمہوریت کے چاروں ستون یعنی مقنّنہ، انتظامیہ، عدلیہ اور ذرائع ابلاغ، ان کی بھی حالت کیسی ہے، کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ خاص کر آخر الذکر دو تو اپنی اصلیت کھوتی جا رہی ہیں۔ عام جنتا اپنی بات کہے تو کس سے کہے، امید لگائے بھی تو کس سے۔ بہر حال آزادی کی جد وجہد میں باشندگانِ ہند نے ایک جسم ہو کر برطانوی حکومت کی جڑ اکھاڑنے کا جو عزم کیا اس کے لیے انہیں بے پناہ قربانیوں، خطیر رقوم اور اثاثے منجمد کرنے پڑے۔ تب جا کر 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوا، اور اس کے ساتھ ایک نیا ملک پاکستان کے نام سے دنیاوی نقشے پر نمودار ہوا۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد برطانوی قانون ہی جاری رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی قیادت میں ہندوستان کے طبقات و مذاہب کی رعایت سے ایک قانون بنایا گیا، جسے 26 جنوری 1950 کو نافذ کر دیا گیا۔ اسی خوشی میں ہر سال یوم جمہوریہ منایا جاتا ہے۔ جو قانون وضع کیا گیا اس میں رنگ و نسل، مذہب و ذات، جنس اور سکونت کی بنیاد پر تقسیم کو منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہر باشندے کا اخلاقی فرض ہی نہیں بلکہ قانونی فریضہ ہے کہ وہ جمہوریت کے تمام اصولوں کی پابندی کرے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ بحوالہ رمیض احمد تقی، کہانی اپنے ہندوستان کی، مرکزی پبلی کیشنز، دیوبند، 2018، ص: 33
2۔ عقیل احمد، اردو ناول اور تقسیم ہند، نعمانی آفسیٹ پریس، دہلی، 1987، ص: 57
3۔ قدوس جاوید، ادب اور سماجیات، کتاب محل، الہ آباد، 1984، ص: 47
4۔ ریحانہ اختر نقوی، اردو کے نمائندہ ناولوں میں نسوانی کردار، نیشنل آرٹ پرنٹرس، الہ آباد، 1987، ص: 316
5۔ بحوالہ، ایضاً، ص: 349
6۔ راجیند ر پرساد، ہندوستان کا مستقبل، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1946، ص: 177
7۔ ایضاً، ص: 219
8۔ ایضاً، ص: 220
9۔ مولانا ندیم الواجدی، آزادی سے جمہوریت تک، دارالکتاب، دیوبند، 2017، ص: 57
10۔ عقیل احمد، اردو ناول اور تقسیم ہند، نعمانی آفسیٹ پریس، دہلی، 1987، ص: 18
11۔ رئیس احمد جعفری، حیات محمد علی جناح، شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس، ممبئی، ص: 45
12۔ ایضاً، ص: 49
13۔ بحوالہ، ایضاً، ص: 97
14۔ ایضاً، ص: 158
15۔ ایضاً، ص: 171
16۔ ایضاً، ص: 177
17۔ بحوالہ ڈاکٹر نکہت جہاں، اردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات، 2006، ص: 22
18۔ عقیل احمد، اردو ناول اور تقسیم ہند، نعمانی آفسیٹ پریس، دہلی، 1987، ص: 23
19۔ رئیس احمد جعفری، حیات محمد علی جناح، شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس، ممبئی، ص: 332
20۔ ایضاً، ص: 346

21۔ بحوالہ، ایضاً، ص: 390

22۔ مولانا ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم مترجم ہمایوں کبیر، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2013، ص: 209,210

23۔ بحوالہ رئیس احمد جعفری، حیات محمد علی جناح، شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس ممبئی، ص: 349

24۔ مولانا ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم مترجم ہمایوں کبیر، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2013، ص:245

25۔ ایضاً، ص: 246,247

26۔ ایضاً، ص: 248

27۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2018، ص: 303

28۔ عقیل احمد، اردو ناول اور تقسیم ہند، نعمانی آفسیٹ پریس، دہلی، 1987، ص: 28

29۔ بحوالہ ڈاکٹر نکہت جہاں، اردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات، 2006، ص: 26

30۔ آزادی نمبر، روزنامہ راشتریہ سہارا، دہلی، 15 اگست 2006، ص: 98

31۔ ڈاکٹر نکہت جہاں، اردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات، 2006، ص: 30

32۔ ڈاکٹر ظفر سعید، تقسیم ہند اور اردو افسانہ، کراؤن آفسیٹ، پٹنہ، 2000، ص: 15

33۔ ایضاً، ص: 18

34۔ مولانا ندیم الواجدی، آزادی سے جمہوریت تک، دارالکتاب، دیوبند، 2017، ص: 67

﴿باب سوم﴾

اردو خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات

اردو خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔خصوصاً یہاں کی تہذیب وتمدن، تعلیم وتربیت، کاروبار وغیرہ پر کافی اثر پڑا، انگریز رفتہ رفتہ ہر ایک چیز یہاں تک کہ کھیل کود میں بھی اپنا سکہ جمانے لگے۔ مقامی باشندوں نے بھی دھیرے دھیرے اپنی طرز معاشرت کو ترک کر کے مغربی تہذیب کو اپنانا شروع کیا۔نتیجتاً یہاں کے معاشرتی واخلاقی اقدار تباہ ہونے لگے اور انگریز حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔

انگریزوں نے پہلے تجارت کی غرض سے ہندوستان کا رخ کیا تھا لیکن بعد میں اپنی پالیسیوں و چالاکیوں سے آہستہ آہستہ پورے ملک کو غلام بنا دیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ جب ہندوستانیوں پر ان کے ظلم وستم بڑھنے شروع ہوئے تو یہاں آزادی کے جانبازوں نے ملک کو آزاد کرانے کا تہیہ کر لیا اور تحریکِ آزادی کا بگل بجا دیا۔ بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد ہندوستان آزاد ہوا۔لیکن انگریز جاتے جاتے یہاں کے لوگوں کے دلوں پر ایک گہرا زخم ملک کی تقسیم اور فسادات کی صورت میں لگا بیٹھے۔آزادی کا جشن دوسرے دن ہی اُس وقت مدھم پڑ گیا جب سرحد کے دونوں پار سے فسادات کی دل سوز خبریں آنے لگیں، مذہبی شناخت کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگے اور یوں انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا۔

لہٰذا برصغیر ہندو پاک کے لیے 1947 محض ایک سن کا نام نہیں ہے بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے گوناگوں تجربات ومشاہدات کی علامت ہے جس کے اجتماعی زندگی پر گہرے نقوش ثبت ہوئے۔فطری طور پر ہمارا ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چناں چہ ادب کی تمام اصناف میں تقسیم ہند اور اس کے اثرات کا ذکر مل جاتا ہے۔ ہندو پاک میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس موضوع پر نظم ونثر کی صورت میں اپنے تجربات کو پیش کیا ہے۔خودنوشت بھی تخلیقی ادب کی ایک صنف ہے اسی وجہ سے اس پر بھی تقسیم ہند کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چوں کہ خودنوشت میں اپنی حیات وذات کا بیان ہوتا ہے اس لیے مصنف کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا ذکر بھی خودنوشت میں آ ہی جاتا ہے۔ اردو میں بے شمار خودنوشتیں لکھی گئی ہیں لیکن 1947 اور اس کے بعد جو خودنوشتیں شائع ہوئی ہیں، کم وبیش تمام میں تقسیم ہند کے حالات وواقعات اپنے آپ ہی سرایت کر گئے ہیں۔ان خودنوشتوں میں کہیں ضمنی طور پر تو کہیں تفصیل سے اس موضوع پر مصنفین نے اظہار خیال کیا ہے۔جن قلم کاروں کا تحریک آزادی اور اس کے بعد کے حالات سے سامنا ہوا اور جنھوں نے اپنی آنکھوں سے فسادات کے خوں ریز مناظر کا مشاہدہ

کیا تھا انہوں نے اپنی خودنوشتوں میں اُس وقت کے حالات کا بڑے دل سوز انداز میں بیان کیا ہے۔

آزادی سے قبل بھی اردو خودنوشتوں میں انگریزی حکومت اور ان کے ظلم وستم کی داستان شامل ہے، لیکن ایسی خودنوشتوں کی تعداد گنتی کی ہیں۔ حالاں کہ اردو خودنوشت کی ابتدا ہی انگریزی حکومت کی بربریت کی کہانی سے ہوئی ہے۔ لیکن بعد کی خودنوشتوں میں اس وقت کے سیاسی حالات کا ذکر کم ہی لوگوں نے کیا ہے۔

اردو میں دستیاب ہونے والی پہلی مطبوعہ تصنیف جو خودنوشت کی صفت رکھتی ہے اور مصنف کی زندگی کا تقریباً پورا احاطہ کرتی ہے، وہ جعفر تھانیسری کی تصنیف ''تواریخ عجیب (کالا پانی)'' ہے۔ انگریز سرکار کے خلاف جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے نتیجے میں مولانا جعفر تھانیسری کو کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ وہ جدو جہد آزادی کے ایک نامور مجاہد تھے۔ اس زمانے میں انگریز کے خلاف بات کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ہر کوئی خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھتا تھا۔ لیکن سزا کاٹنے کے بعد جعفر تھانیسری نے اپنی خاموشی کو توڑا اور اپنی قید کے حالات و واقعات قلم بند کیے۔ اس خودنوشت میں جزائر انڈمان کے باشندوں کے رسم و رواج، مذہبی عقائد اور مختلف تہواروں کے حالات بھی ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خودنوشت میں ایک طرف انگریزوں کے ظلم و بربریت کی داستان بیان کی گئی ہے، تو دوسری طرف وہابی تحریک کے کارنامے بھی ملتے ہیں۔ ان کی خودنوشت کے تانے بانے میں احیائے دین اور آزادی وطن کے عناصر ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو ان کا قلم انگریزوں کے ظلم وستم کے خلاف خوب چلتا ہے، تو دوسری طرف ان کی تحریر میں مختلف موقعوں پر تبلیغ دین اور احکام خداوندی پر چلنے کی تلقین بھی ملتی ہے۔ یہ خودنوشت اس لیے بھی اہم ہے کیوں کہ اس میں اس عہد کے جبر وظلم کی تاریخ رقم کی گئی ہے، جب ہر کوئی خاموشی میں ہی اپنی خیر سمجھتا تھا۔ اس پر آشوب دور میں اس مرد مجاہد نے اس کتاب کے ذریعہ ایک ایسا نقش چھوڑا ہے جو آنے والوں کے لیے مشعل راہ بن گیا ہے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی خودنوشت ''داستانِ غدر'' لکھی، جو 1910 میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، 1857 کے ہنگامے میں دہلی کی بربادی اور خصوصاً بادشاہ نیز امراء و شرفا کی بدحالی کی داستان قلم بند کی گئی ہے۔ اس خودنوشت میں ظہیر دہلوی نے لال قلعے کے زوال اور دہلی کی تہذیب کی خوبصورت منظر نگاری بھی کی ہے۔ داستان غدر جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی ایک اہم اور قابل قدر خودنوشت ہے۔ جس کا شمار اردو کی ابتدائی خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔ ظہیر دہلوی آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بحیثیت داروغہ تعینات تھے۔ ظہیر دہلوی 1857 کی جنگ آزادی کے حالات و واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ خودنوشت تاریخی

صداقت پر مبنی اہمیت کی حامل ہے۔

''اعمال نامہ'' سرسید رضا علی کی داستانِ حیات ہے جو 1942 میں زیورطبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ مصنف ایک کہنہ مشق وکیل اور ہندوستانی سیاست کے ایک فعال کردار تھے۔ بطور وکیل اور سیاستداں ان کی زندگی ہزاروں واقعات اپنی آغوش میں سموئے ہوئے ہے۔ یہ آپ بیتی چودہ ابواب پر محیط ہے اور اس میں ہندوستان کے سیاسی حالات اور اس عہد کے ادبی رجحانات پر بیک وقت روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص کر ملک کے لسانی جھگڑے اور علی گڑھ یونی ورسٹی کو ایک سیاسی تحریک کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ انہوں نے ان تحریکوں کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے جو ہندوستانی سیاست میں اہمیت رکھتی ہیں اور جس نے انگریزی حکومت کی چولیں ہلا دی تھیں۔ مثلاً خلافت تحریک و ترک موالات، 1942 کی بھارت چھوڑو تحریک کا ذکر سرسری طور پر کیا ہے۔ مصنف نے ماضی بعید کے حالات و واقعات کو کافی تفصیل سے لکھا ہے لیکن ماضی قریب اور زمانہ حال کی طرف کم ہی توجہ دی ہے۔ حالاں کہ بیسویں صدی یعنی اعمال نامہ کی اشاعت تک کا زمانہ ہندوستان میں کافی انتشار اور بے چینی والا تھا۔ بہر کیف یہ خودنوشت اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اس میں فن خودنوشت نگاری کو کافی حد تک ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

سیاسی خودنوشتوں میں حسرتؔ موہانی کی خودنوشت ''قید فرہنگ'' کا بھی شمار ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی حکومت کے خلاف ان کا ایک مضمون ''اردوئے معلیٰ'' میں شائع ہوا تھا۔ جس کی پاداش میں انہیں ایک سال کی قید بامشقت کی سزا ملی تھی۔ اس خودنوشت میں حسرت موہانی نے اسی قید و بند کی داستان قلم بند کی ہے۔ اس عہد میں قیدیوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور جیل کے اندرونی حالات کو خودنوشت میں کافی پر اثر انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف کے قید و بند کی صعوبتوں کے حالات کے ساتھ ان کا وہ زندانی کلام بھی ہے جو انہوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ تخلیق کی تھی۔ اس آپ بیتی سے حسرتؔ کی سیاسی جدوجہد، بے باکانہ صحافت نگاری کے ساتھ آزادی حاصل کرنے کے لیے اس دور کے مسلم قائدین اور مخلص کارکنوں کو کس طرح کٹھن اور مشکل حالات کا سامنا کرنا ہوتا تھا اس کا بھی بیان شامل ہے۔ خودنوشت میں سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون ''حسرتؔ کی سیاسی زندگی'' کے نام سے شامل ہے جو سوانحی لحاظ سے کافی اہم ہے۔

چودھری افضل حق کی خودنوشت ''میرا افسانہ'' بھی سیاسی نوعیت کی خونوشت ہے جو 1943 میں شائع ہوئی۔ مصنف نہ صرف مجلس احرار کے اہم رکن تھے بلکہ انشاء پردازی میں بھی انہیں ایک مقام حاصل تھا۔ وہ تحریک خلافت شروع ہونے کے بعد ملازمت چھوڑ کر مجلس احرار سے جڑ گئے اور ہندوستان کی سیاست میں شامل ہوئے۔ ابتدا میں

انہیں اور ان کے ساتھیوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تحریک خلافت، ترک موالات کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے۔ کئی بار انگریز دشمنی کے سبب جیل جانا پڑا۔ آپ بیتی میں اس دور کے حالات کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ جیل کی زندگی کے مسائل اور سیاسی قیدیوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کو اس میں خاصی جگہ دی گئی۔ اس کتاب سے افضل حق کی سیاسی جدوجہد اور انگریزوں کے خلاف قوم میں بغاوت پیدا کرنے کی کاوشوں کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

ان سب کے علاوہ ماقبل آزادی کی خودنوشتوں میں سیاسی حالات کا ذکر کم ہی ہوا ہے البتہ اس وقت کی تہذیب و تمدن اور آپسی بھائی چارے کا ذکر کم وبیش سبھی نے کیا ہے۔ ساتھ ہی پرانی روایتوں اور اقدار کے ٹوٹنے کا ماتم بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ آزادی کے بعد کی خودنوشتوں میں جدوجہد آزادی اور تقسیم کے محرکات کا ذکر جس طرح تفصیل کے ساتھ موجود ہے وہ آزادی سے پہلے کی خودنوشتوں میں نہیں ہے۔ چناں چہ موضوع کی مناسبت سے اس باب میں آزادی کے بعد شائع ہونے والی ان ہی خودنوشتوں کو شامل کیا گیا ہے جس میں انگریزوں کے ظلم وستم، آزادی کی جدوجہد، تقسیم ہند اور اس کے اثرات کا ذکر ہوا ہے۔

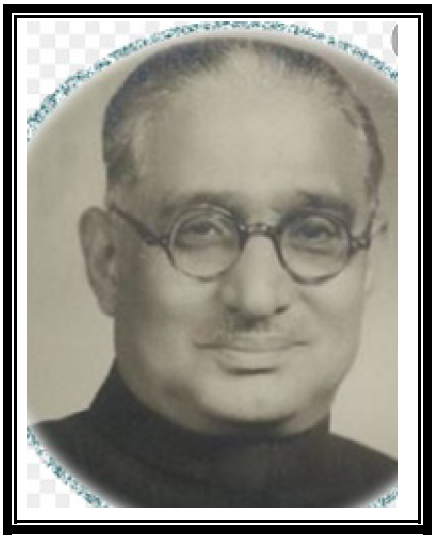

عبدالمجید سالک: سرگزشت

سنہ اشاعت: 1954

سرگزشت (عبدالمجید سالکؔ)

عبدالمجید سالکؔ اردو کے نامور صحافی، شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار تھے۔ اس کے علاوہ بطور مترجم انہوں نے متعدد کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ وہ 13 دسمبر 1894 کو بٹالہ ضلع گورداس پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بٹالہ، پٹھان کوٹ اور اینگلو عربک کالج، دہلی سے مکمل کی۔ بطور صحافی انہوں نے 1914 میں پٹھان کوٹ سے رسالہ ''فانوس خیال'' نکالا جو دس ماہ کے بعد مالی پریشانیوں کے سبب بند ہو گیا۔ اس رسالے میں ملک کے نامور ادیبوں کی نگارشات شائع ہوتے تھے۔ 1915 کے اواخر میں ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے نائب مدیر ہوئے۔ 1920 میں مولانا ظفر علی خاں نے سالکؔ کو اپنے اخبار ''زمیندار'' کا ایڈیٹر بنا دیا۔ انہوں نے اپنی علمی صلاحیت کی بنا پر اس اخبار کو جو شہرت دی وہ تاریخِ اردو میں سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی اخبار میں سامراج دشمن اداریہ لکھنے کے باعث انہیں گرفتار بھی کیا گیا۔ رہائی کے بعد دوبارہ اسی اخبار سے منسلک ہو گئے۔ یہیں پر ان کی ملاقات غلام رسول مہرؔ سے ہوئی جن سے تاحیات تعلق قائم رہا۔

1927 میں غلام رسول مہرؔ کے اشتراک سے مشہور اخبار ''انقلاب'' جاری کیا۔ اس میں سالکؔ ''افکار و حوادث'' کے نام سے ایک کالم لکھتے تھے اور یہی کالم ان کی پہچان بن گیا۔ سالکؔ خوش گو شاعر اور بڑے عمدہ مزاح نگار تھے۔ انہوں نے اصلاحی شاعری، اردو فارسی غزلیں اور قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اگرچہ ان کا شعری ترکہ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے وہ اردو ادب کا لافانی گہر ہے۔ مزاح نگار کے طور پر ان کا کالم ''افکار و حوادث'' نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ یہ کالم 27 سال تک بلا ناغہ چھپتا رہا اور اس کا مطلع ہمیشہ تاباں و درخشاں رہا یہ ان کا بہت بڑا کمال تھا۔ اس کالم کے زیرِ عنوان لکھے گئے مضامین نہ صرف صحافتی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں بلکہ لطف بیان کے اعتبار سے یہ مضامین اردو ادب میں بھی بلند مقام کے حق دار ہیں۔ انہوں نے بزمِ اقبال، ادارہ ثقافت اسلامیہ اور مجلس ترقی ادب کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ متعدد انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ کیا۔ انسائیکلو پیڈیا کے لیے مضامین لکھے۔ ان کی تصانیف میں میراث اسلام، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ذکرِ اقبال، یارانِ کہن، چمپا و دیگر افسانے وغیرہ ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام راہ و رسم منزلہا کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی خودنوشت ''سرگزشت'' کے نام سے تحریر کی ہے۔ عبدالمجید سالک نے 27 ستمبر 1959 کو لاہور، پاکستان میں داعی عجل کو لبیک کہا۔

''سرگزشت'' عبدالمجید سالکؔ کی آپ بیتی ہونے کے ساتھ ساتھ چالیس برسوں پر محیط ان ہنگامہ خیز دنوں کی کہانی ہے جب ہندوستان کی عوام فرنگی راج کے خلاف برسرِ پیکار تھی۔ اس میں علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرقع ملتا

ہے۔ حالاں کہ یہ کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے بلکہ مصنف کے اپنے ذاتی تاثرات ہیں۔ انہوں نے جو تحریکیں اور اس دور کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا، جن محفلوں میں اٹھے بیٹھے ان تمام کو بڑے سیدھے سادے انداز میں من وعن پیش کر دیا ہے۔ اشاروں اور کنایوں سے مبرّا جو کچھ لکھنا چاہا بڑی بے تکلفی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ چراغ حسن حسرت لکھتے ہیں:

> ''سالک صاحب کا انداز تحریر آورد اور تصنع سے پاک اور بڑا سادہ بے تکلف ہے اور یہی سادگی و بے تکلفی ان کی تحریر کا زیور ہے یوں کہنا چاہیے کہ آبِ صافی کا ایک چشمہ ہے جو اپنی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔''1

اس خودنوشت کا مقدمہ چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے۔ اس کی دوسری طباعت پر غلام رسول مہر نے پیش لفظ لکھا ان کا کہنا ہے کہ ''اگر حسرت زندہ ہوتے تو یقیناً اس بار بھی مقدمہ وہی لکھتے'' کیوں کہ مذکورہ کتاب کی ترتیب وتسوید کے لیے خاص تحریک انہیں کی طرف سے ہوئی تھی۔ چراغ حسن حسرت کے اصرار پر سالک نے خودنوشت لکھنے کا قصد کیا اور سب سے پہلے رسالہ ''امروز'' میں 25 قسطیں شائع ہوئیں اور بقیہ حصہ ''نوائے پاکستان'' جو ان دنوں ''ادارۂ نوائے وقت'' کے زیر اہتمام نکلتا تھا، میں شائع ہوا۔ یہ خودنوشت مکمل کتابی صورت میں پہلی بار 1954 میں قومی کتب خانہ، لاہور سے شائع ہوئی۔ راقمہ کے پاس اس خودنوشت کا دوسرا ایڈیشن موجود ہے جسے محمد فیصل نے زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر اگست 1993 میں شائع کرائی تھی۔ سالک نے خودنوشت کی ابتداء اقبال کے چند فارسی اشعار سے کی ہے، اس کتاب کا انتساب احمد شاہ بخاری کے نام ہے۔

غلام رسول مہر نے پیش لفظ میں ''سرگزشت'' کی چند خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے، جن سے راقم السطور اتفاق کرتی ہے۔ مثلاً سالک اپنے تاثرات کو الفاظ کے ذریعہ قاری کے دل میں ہو بہو اتارنے کا فن جانتے تھے، مذکورہ خودنوشت اُن خصوصیتوں کا جامع مرقع ہے۔ بلاشبہ اس میں گوناگوں سیاسی حالات، علمی و ادبی گفتگو تفصیل سے کہیں نہیں آئی ہیں، مصنف نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ تفصیلات کا متقاضی نہیں تھا۔ انہوں نے لطیف و سبک انداز میں معلومات و تاثرات کے امتزاج سے ایک دل کش داستان مرتب کر دی جو معنویت و مطالب کے اعتبار سے علمی، ادبی و سیاسی اور حسن بیان کی بنا پر افسانے کی طرح دل پذیر ہوگئی ہے۔ اس لحاظ سے سرگزشت محض ایک معیاری کتاب ہی نہیں بلکہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ وسیع عرصے پر محیط حالات و واقعات اتنے اختصار و ایجاز اور لطیف و جاذب اسلوب تحریر میں بیان ہوئے ہیں کہ ایسی مثال شاذ و نادر ہی کسی دوسری خودنوشت میں موجود ہوں۔ سالک نے

اس خودنوشت میں مختلف عنوانات کے تحت چھوٹے چھوٹے اقتباسات میں بڑے مختصر انداز میں کسی بھی واقعات یا حالات کے متعلق اپنی رائے قارئین کے روبرو رکھی ہے، جس کی وجہ سے کتاب مزید دلکش ہوگئی ہے۔

انہوں نے اس دور میں آنکھیں کھولیں جب انگریزوں کا ظلم پورے ہندوستان میں برپا تھا۔ دنیا پہلی جنگ عظیم کے دہانے پر کھڑی تھی۔ چناں چہ جب سالکؔ نے اپنی خودنوشت لکھنا شروع کی تو اُس پُر آشوب زمانے کا ذکر کیے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں پائے۔ خود انہوں نے جیل کی ہوا کھائی، فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اُس دور کے ہندوستان کے سیاسی حالات کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا اس لیے اپنی آپ بیتی میں تمام واقعات کا ذکر من وعن پیش کر دیا ہے۔ اپنے حالات زندگی کے بیان کے ساتھ سماجی، ادبی وسیاسی حالات کا ذکر بھی کیا ہے۔ بیسویں صدی میں ہندوستانی سیاست کے متعلق جتنی بھی تبدیلیاں آئیں یا جو حالات وواقعات رونما ہوئے، مذکورہ خودنوشت میں ان کا تذکرہ جا بجا ہوا ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں گاندھی جی ہندوستانی سیاست میں نمودار ہوئے اور تحریک آزادی کا ایک خاص کردار بن گئے۔ حالاں کہ اس سے پہلے افریقہ میں رہ کر انگریزوں کے خلاف آواز بلند کر چکے تھے۔ لیکن ہندوستان واپس آکر جب انہوں نے ذات پات اور انگریزوں کے ظلم وستم کے خلاف تحریک شروع کی، تو ان کی قابلیت، سیاسی اہلیت اور سادگی سے متاثر ہوکر بہت جلد برصغیر کا ایک بڑا طبقہ ان کی طرف مائل ہوگیا۔ ان کی قیادت میں چمپارن تحریک اور گجرات ستیہ گرہ میں کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ 1918 میں ہی ملک میں وبائی زکام (انفلوئینزا) کی وبا پھیل گئی جس نے بڑی تباہی مچائی۔ ان حالات میں بھی گاندھی جی مہاتما بن کر سامنے آئے اور لوگوں کی تکلیفیں دور کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ بیسویں صدی کے حالات، ہندوستانی سیاست میں گاندھی جی کی شمولیت اور ان کی کارکردگیوں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے سالکؔ لکھتے ہیں:

> ''1918 سے عجیب مصیبتوں کا زمانہ شروع ہوا۔ جنگ عظیم تو ختم ہوگئی لیکن انفلوئینزا کی وبا اس زور شور سے پھیلی کہ ساری دنیا الامان الامان پکار اٹھی۔ لاہور میں چار چار سو پانچ پانچ سو اموات روزانہ ہونے لگیں۔ اس زمانے میں یہ معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی بیرسٹر موہن داس کرم چند گاندھی جو جنوبی افریقہ میں گوروں کے خلاف سول نافرمانی کیا کرتے تھے۔ اب ہندوستان آگئے ہیں اور صوبہ بہار کے علاقہ موتی ہاری اور چمپارن میں کسانوں کو منظّم کر کے لگان بندی کی تحریک چلا رہے ہیں، کھدر پہنتے ہیں، درویش قسم کے آدمی ہیں ان کی بے نفسی کی وجہ سے ہزاروں لوگ ان کو مہاتما مانتے ہیں۔''2

یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تھی اور پوری دنیا بحرانی حالت کا شکار تھی۔ ان حالات میں وبا نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ دوسری جانب ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم بڑھتے جا رہے تھے۔ آزادی کے لیے ہندوستانیوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بغیر کسی بھید بھاؤ کے ان کے ساتھ کھڑا رہے، ان کو صحیح راہ دکھائے۔ اسی وجہ سے جب ہندوستانی سیاست کے اُفق پر گاندھی جی ابھر کر سامنے آئے اور اپنی سوچ و تحریک سے لوگوں کو آگاہ کیا تو لوگ جوق در جوق گاندھی جی کا ساتھ دینے کے لیے آگے آنے لگے۔ بہت جلد ان کی سادگی اور پالیسیوں سے متاثر ہو کر انہیں ''مہاتما'' کا لقب دے دیا گیا۔

اسی دوران یعنی 1919 میں ایک ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس ایکٹ کو رولٹ کمیٹی کی سفارشات کی بنا پر نافذ کیا گیا۔ اس کمیٹی کے صدر سر سڈنی رولٹ تھے اس لیے اس کو رولٹ ایکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کے بنا پر انگریزی حکومت ہندوستانی باشندے کو محض شک و شبہ کی بنیاد پر گرفتار کر کے بغیر عدالتی مداخلت کے دو سال تک جیل میں رکھ سکتی تھی۔ اس ایکٹ نے تمام معاملات کا پورا اختیار امپیریل اتھارٹی کو دے دیا تھا۔ اس کے بعد میڈیا پر بھی حکومت کا دباؤ بڑھ گیا۔ بغیر وارنٹ کے گرفتاری اور بغیر مقدمے کے غیر معینہ مدت تک حراست کا اختیار حکومت کو تھا۔ یہاں تک کہ ملزم کو وجہ جاننے کا بھی حق نہیں تھا۔ اس کے علاوہ گرفتار شدہ شخص کو رہائی کے بعد سیکیورٹی جمع کروانی پڑتی تھی، اسے کسی بھی طرح کی سرگرمی میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ ہندوستانی عوام نے اسے کالا قانون کا نام دیا۔ رولٹ ایکٹ کے ذریعے پولیس کو بھی بہت سارے اختیارات مل گئے تھے جن کی رو سے پولیس کسی بھی جگہ کی تلاشی لے سکتی تھی۔ اس ایکٹ نے گاندھی جی کے ساتھ کئی اہم لیڈروں اور عوام کو مشتعل کر دیا تھا۔ گاندھی جی نے 30 مارچ اور 6 اپریل کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ اپنا سارا کام چھوڑ کر اس قانون کے خلاف بغیر تشدد کے بھوک ہڑتال کریں، دعائیں کریں اور عوامی جلسے منعقد کریں۔ اس انعقاد کو ''تحریک عدم تعاون'' کا نام دیا گیا۔ رولٹ ایکٹ اور عوام کے ردعمل کے متعلق سالک لکھتے ہیں:

> ''امپیریل کونسل میں جن دنوں یہ بل پیش تھا ہندوستانی اخباروں اور سیاسی جماعتوں نے اس کے خلاف بہتیرا شور مچایا اور کونسل کے تمام ہندوستانی ممبروں نے اس کے خلاف ووٹ دیے لیکن حکومت نے سرکاری اور نامزد عنصر کی مدد سے اس بل کو پاس کر کے رولٹ ایکٹ بنا دیا۔ تمام ملک میں شدید ناراضگی کی لہر دوڑ گئی اور اس ناراضی کے اظہار کے لیے ایک خاص کمیٹی بنائی گئی جس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی مقرر کیے گئے ..... فی الحال

پروگرام یہی تھا کہ ملک بھر میں ناراضی کے اظہار کے لیے ہڑتال کی جائے اور ہر جگہ اس قانون کے خلاف جلسے کیے جائیں۔ اس ہڑتال کے لیے پہلا دن 30 مارچ 1919 اور دوسرا دن 6 اپریل مقرر تھا۔ پہلے دن تمام ہندوستان کے گوشے گوشے میں مکمل ہڑتال ہوئی ایسی ہڑتال کہ جس کی مثال اس سے قبل ملک کی تاریخ میں موجود نہ تھی..... ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کے جو مناظر اس تحریک میں نظر آئے ان سے ہر ایک کو توقع ہو گئی تھی کہ اب یہ ملک جلد سے جلد اغیار کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔''3

دہلی میں مذکورہ ہڑتال کو کامیابی ملی مگر کچھ صوبہ میں شدید کشیدگی پھیل گئی۔ صوبہ پنجاب اور دوسرے صوبہ جات میں فسادات ہوئے۔ گاندھی جی کو پنجاب جاتے وقت حکومت نے پلول اسٹیشن پر گرفتار کر کے پنجاب جانے سے روک دیا۔ پورے صوبہ میں شور مچ گیا۔ ستیہ گوہی یعنی گاندھی کی کمیٹی کے رضا کار احتجاج کے طور پر ہڑتال شروع کر دی۔ امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے مقامات میں حالات کافی سنگین ہو گئے تھے۔

خصوصاً امرتسر میں جہاں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال نے عوام کے جذبات کو اپنی تقاریر سے سخت برانگیختہ کر رکھا تھا حکومت نے ان دونوں کو خفیہ طور پر گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ حکام کی بے تدبیری کے باعث عوام کے جذبات بھڑک اٹھے۔ انہوں نے کچھ انگریزوں کو قتل کر ڈالا اور بعض بینکوں اور سرکاری عمارتوں کو لوٹ مار اور آتش زنی کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد گورنر جنرل سر مائیکل فرانسس اوڈوائر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لاہور اور امرتسر دونوں شہروں میں مارشل لا نافذ کرا دیا۔ جلیاں والا باغ، امرتسر میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ رولٹ ایکٹ اور انگریزی حکومت کے خلاف جلسے کے لیے جمع ہوئے تھے وہاں جنرل ریجینالڈ ایڈورڈ ہیری ڈائر کے حکم سے ایک فوجی دستے نے احتجاجیوں پر اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ جن میں بے شمار ہندو مسلمان اور سکھ ہلاک، اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ مارشل لا کی وجہ سے رات بھر مقتولین کی لاشیں پڑی رہیں، زخمی افراد تڑپتے رہے۔ دونوں شہروں میں بے شمار گرفتاریاں ہوئیں۔ عوام پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ اپنی خودنوشت میں ان مظالم کا ذکر کرتے ہوئے سالک لکھتے ہیں:

''چھ ہفتے تک لاہور اور امرتسر میں انتہائی دہشت طاری رہی، اور فوج نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل بیان کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ امرتسر کے ایک کوچے میں ہر آیندہ روند کو پیٹ کے بل رینگ کر چلنے پر مجبور کیا گیا۔ لاہوری کالجوں کے طلبا کو حکم دیا گیا کہ شدید دھوپ

میں اپنے اپنے ہوسٹلوں سے اپنے بستر سروں پر اٹھا کر چلیں۔ پنجاب کلب پہنچ کر کرنل فرینک جانسن کو سلامی دیں اور چلے جائیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ یہ سلامی دن میں چار دفعہ ہوتی تھی.....شہر کے مختلف حصوں سے تمام موٹر کاریں، تمام بائیسکل، تمام دوسری سواریاں زبردستی فوج کے لیے چھین لی گئیں۔''5

سالکؔ نے اپنی خودنوشت میں اُن مظالم، ملک میں ہونے والے فسادات اور تحریکوں کا ذکر قدرِ تفصیل سے کیا ہے۔ اقتباس کی طوالت کے خدشے کی وجہ سے یہاں اُن مظالم کا خاکہ مختصراً پیش کیا ہے کہ کس طرح انگریز نئے نئے ڈھنگ سے ہندوستانیوں پر ظلم کر رہے تھے۔ مارشل لاء کے خلاف ہر جگہ احتجاج ہوا، ملک کے تمام بڑے لیڈروں نے مذمت کی۔ سر چیتور سنکرن نائر نے وائسرائے کی کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کر دیا۔ گاندھی جی بھی اپنی روش سے احتجاج اور پروپیگنڈہ میں مصروف تھے۔ بلآخر بڑی مشکل اور بے شمار مصیبتوں کو اٹھانے کے بعد مارشل لا موقوف کرا دیا گیا۔ بہت سے معززین کو اس وقت عمر قید کی سزا دے دی گئی تھی ان میں سے بیشتر کی سزائیں کم کی گئیں اور کچھ رہا کر دیے گئے۔ لیکن رولٹ بل بدستور جاری تھا اور احتجاج بھی ہو رہا تھا۔ دیوان سنگھ نے بھی اپنی خودنوشت ''ناقابل فراموش'' میں مارشل لا اور انگریزوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔

کافی احتجاج کے بعد آخر کار حکومت نے 1922 میں رولٹ ایکٹ کے ساتھ دوسرے 22 ایکٹ کو ختم کر دیا۔ دیکھا جائے تو اس بل سے سوائے کسی فائدے کے نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہوا بلکہ مذکورہ ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد کبھی اس پر عمل بھی نہیں کیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ انگریزوں کا مقصد اس ایکٹ کو پاس کر کے محض ہندوستانیوں کو تکالیف میں مبتلا کرنا تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی اپنی خودنوشت ''میری کہانی'' میں کچھ اسی طرح کا خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ قانون تو نافذ کیا گیا لیکن اس پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ لگتا ہے کہ محض انتشار پھیلانا ہی انگریزوں کا مقصد تھا۔ مذکورہ ایکٹ ختم تو کر دیا گیا تھا لیکن ہزاروں لوگ شہید ہوئے، فسادات ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے میں بھی انگریز کامیاب ہوئے ورنہ اس بل کے خلاف پہلی ہڑتال میں جو اتحاد دیکھنے کو ملا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔ ویسے بھی انگریزوں کی پالیسی بھی یہی تھی کہ پھوٹ ڈالو اور راج کرو۔ اپنی اس پالیسی کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے۔

جب یہ سختی کا دور ختم ہوا تو ملک بھر سے جلیاں والا باغ کے حادثے اور دوسرے مظالم کے ذمہ دار افسران کی سزا کی مانگ شروع ہوئی۔ آل انڈیا کانگریس نے پہلے ہی رولٹ بل کے خلاف مہم شروع کر دی تھی۔ جولائی 1919 میں

آل انڈیا خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور خلافت تحریک شروع ہوئی۔اس تحریک کا مقصد خلافت عثمانیہ کو برقرار رکھنا تھا۔1920 میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان، فرانس اور اٹلی اپنی مانگ کو پورا کرنے کے لیے روانہ ہوا لیکن انہیں ہر جگہ مایوسی ہوئی۔ یہ وفد ابھی انگلستان میں ہی تھا کہ ترکی پر ''معاہدہ سیورے'' مسلط کر دیا گیا۔جس کے نتیجے میں تمام بیرونی مقبوضات ترکی سے چھین لیے گئے اور ترکی پر فضائی فوج رکھنے کی پابندی لگا دی گئی۔ اس معاہدے نے مسلمانوں کو چراغ پا کر رکھا تھا۔ انگلستان میں وفد کی ناکامی نے جلتی آگ میں تیل کا کام کیا۔ بقول سالکؔ:

> ''مولانا محمد علی ایک وفد خلافت مرتب کر کے یورپ تشریف لے گئے تھے۔تاکہ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں سے عرضِ معروض کر کے ترکوں سے انصاف پر آمادہ کریں لیکن انہیں ہر جگہ مایوسی ہوئی اور وزیر اعظم برطانیہ نہایت تبختر اور فرعونیت سے پیش آیا جس کا اثر یہ ہوا کہ مولانا کی واپسی پر تحریک میں نئی جان پڑ گئی۔مولانا نے آتے ہی ممبئی میں تقریر کی کہ موجودہ تحریک خلافت اور جلیاں والا باغ کے مسائل کی بنا پر شروع کی گئی تھی لیکن اس کو انہی مسئلوں تک محدود رکھنا بے کار ہے۔اصل تحریک آزادئ وطن ہونی چاہیے کیوں کہ جب تک ہم آزاد نہ ہوں گے خلافت اور جلیاں والا باغ جیسی ناانصافیاں برابر جاری رہیں گی اب ملک آزادی کی تحریک کے لیے تیار ہو چکا ہے اس لیے سوراج اس تحریک کا نصب العین ہوگا۔''6

دسمبر 1919 میں یہ فیصلہ ہوا کہ کرسمس کے دنوں میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوں گے چناں چہ ملک کے تمام بڑے لیڈر امرتسر میں جمع ہونے لگے۔ان تینوں کا اجلاس بہ حسن خوبی انجام پایا۔گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد پر کافی زور دیا۔ان اجلاس کا واحد مقصد ایک ہی تھا انگریزوں سے آزادی۔ سالکؔ نے اپنی خودنوشت میں ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ملک بھر میں انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔مارشل لا کی ہولناک واقعات اور انگریزوں کے ذریعے کیے گئے مظالم نے لوگوں کے دلوں میں گہرے زخم پیدا کر دیے تھے۔خلافت عثمانیہ، جنگ میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا چکی تھی۔ وہ معاہدہ جس نے ترکوں کو ایک طرح سے برطانوی شہری بنا دیا تھا۔اس نے مسلمانوں کو آپے سے باہر کر رکھا تھا غرض کی ہر طرف انگریزوں کا بول بالا تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں درد رسیدہ تھے۔

1920 کے ان ہی ہنگامی حالات میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور عطاء اللہ بخاری سمیت کچھ علماء نے برعظیم کو دارالحرب قرار دے کر یہاں سے ہجرت کرنے کا فتویٰ دے دیا۔ چناں چہ لوگوں میں یہ جذبہ عام ہو گیا کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آزاد علاقوں میں جا کر جنگ کی تیاری کر کے انگریزوں سے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس سے سندھ اور پنجاب کے ہزاروں مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان کی راہ لی۔ یہ ہجرت کچھ مہینوں کے بعد حکومت افغانستان کے عدم تعاون سے ناکام ہو گئی جس سے مسلمانوں کو کافی جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ بقول سالکؔ:

> ''امیر امان اللہ خاں نے ایک تقریر میں کہہ دیا کہ ہندوستان سے جو مسلمان بھائی ہجرت کر کے آئیں گے، افغانستان حتی الوسع ان سے برادرانہ سلوک کرے گا۔ بس پھر کیا تھا سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے ہزار ہا مسلمانوں نے اپنی جائدادیں اونے پونے بیچ کر قافلے بنا لیے اور سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے۔''7

جذبے اور جوش میں آ کر سندھ کے شیخ جان محمد ایک اسپیشل ٹرین سے سندھی مہاجر کو ساتھ لے کر افغانستان روانہ ہو گئے۔ جذباتِ انسانی کی کیفیت بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ مسلمان انتہائی جوش و جذبے کے عالم میں اپنا سب کچھ ترک کر کے ایک دینی حکم پر عمل کرتے ہوئے ہجرت کر رہے تھے۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں اس لشکر کی آبادکاری سے عاجز آ کر امیر امان اللہ خاں کی حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا تو ان مہاجروں کی اکثریت لوٹ پاٹ کر واپس ہندوستان آ گئیں۔ یہ تحریک ہنگامی جذبات پر مبنی تھی جس کا صرف ایک ہی مقصد تھا ہندوستان کی آزادی، لیکن اس کا انجام بہت برا ہوا۔

مہاتما گاندھی نے اسہیوگ (عدم تعاون) اور اہنسا (عدم تشدد) کی تجویز پیش کی جسے بیشتر لیڈروں نے تو قبول کر لیا لیکن کانگریس پارٹی کے گرم دل کے لیڈروں کا ماننا تھا کہ اہنسا کے ذریعے انگریزوں سے آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ وہ لوگ ہتھیار اٹھانے میں یقین رکھتے تھے۔ لیکن گاندھی جی اور دوسرے لیڈر جن میں کانگریس کا دوسرا حصہ نرم دل بھی شامل تھا وہ اہنسا کے حق میں تھی۔ چناں چہ عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور لوگوں نے ودیشی مال کو ترک کر دیا۔ اس کے متعلق سالکؔ لکھتے ہیں:

> ''جب تمام لیڈروں کا اتفاق عدم تعاون پر ہو گیا تو یکم اگست 1920 کو الہ آباد میں سب جمع ہوئے اور تحریک کا پروگرام اہل ہند کے سامنے پیش کیا۔ کھدّر پہنو، خطابات کو چھوڑ دو،

کونسلوں کی ممبری چھوڑ دو، اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دو، فوج اور پولس کی نوکری حرام ہے۔ حتی الوسع سب سرکاری ملازمتیں چھوڑ دو اور اگر اس تحریک کے دوران میں لیڈروں کی طرف سے کوئی ہدایت ہو تو ہر قسم کے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دو۔''8

ہندو، مسلم، سکھ سب مل کر اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔ سالکؔ نے عدم تعاون سے متعلق ہونے والے واقعات اور اس کے نتائج کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مسلمانوں نے عدم تعاون کو ترک موالات کا نام دیا تھا اس تحریک کے بعد کئی مسلم لیڈروں کو گرفتار کیا گیا جس کے خلاف احتجاج شروع ہوا، متعدد جلسے ہوئے۔ سالکؔ نے لاہور کے ایک جلسے کا ذکر کیا ہے جس میں گاندھی جی کے ساتھ پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو سی آر داس، مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادران (مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی) نے شرکت کی تھی۔ مذکورہ جلسے میں اپنے چہیتے لیڈروں کی قدم آوری پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ عوام کے جذبے اور ہندو مسلم اتحاد کے متعلق خودنوشت کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''آزادی کی خواہش سے سب کے دل سرشار تھے، فرقہ پرستی کا جذبہ کوسوں دور تھا۔ سکھ مولانا ابوالکلام کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے، ہندو مولانا محمد علی کے چَرنوں کی دھول آنکھوں میں لگاتے تھے اور مسلمان گاندھی جی کی پذیرائی یوں کرتے تھے گویا کسی خدا رسیدہ ولی نے لاہور کو اپنے قدوم سے مشرف فرمایا ہے۔ بہت شاندار تقریریں ہوئیں اور اہل لاہور کو یقین ہو گیا کہ اب خلافت کی بحالی اور ملک کی آزادی کوئی دن کی بات ہے۔''9

ترک موالات کے تحت مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ کی انتظامیہ سے سرکاری امداد نہ لینے کی اپیل کی لیکن کالج کی انتظامیہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں مولانا نے کچھ طلبا کو ساتھ لے کر علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی یہ ادارہ 1925 میں دہلی منتقل ہو گیا۔ صوبہ کیرالا کے مالابار علاقے میں موپلہ کے مسلمانوں نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جس کے نتیجے میں انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ چناں چہ انہوں نے تنگ آ کر 1925 میں بغاوت کر دی۔ انگریزی حکومت نے اس بغاوت کو سختی کے ساتھ کچل دیا۔ ہزاروں موپلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تحریک خلافت کی وجہ سے اس بغاوت کا رنگ و روغن اسلامک تھا اس لیے بعض ہندو بھی مخالفت میں بغاوت کو کچلنے میں حکومت کی حمایت کی تھی۔ اس واقعے کا ذکر راجندر پرساد کی خودنوشت ''اپنی کہانی'' میں تفصیل

سے موجود ہے۔

4 نومبر 1921 کو حکومت کے خلاف اداریہ لکھنے کی وجہ سے عبدالمجید سالکؔ کو گرفتار کیا گیا انہوں نے اپنی گرفتاری کے دوران کی روداد اور جیل میں اپنے ساتھیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک سال کے بعد رہا ہو کر گھر آئے، تب تک خلافت تحریک اور ترک موالات کا زور ختم ہو چکا تھا کیوں کہ ان تحریکوں کے اہم لیڈروں کو حکومت نے گرفتار کر لیا تھا دوسری جانب خلافت تحریک بظاہر اسلامک تھی لیکن اس کے پس پشت انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا بھی ایک اہم مقصد تھا لیکن کچھ شر پسند تعصب کی بنیاد پر اس کے خلاف تھے، لیڈروں کی عدم موجودگی اور مخالفت کی وجہ سے بھی عوام پست ہو رہی تھی۔ فروری 1922 میں تحریک خلافت کی حمایت میں لوگوں نے مشتعل ہو کر اتر پردیش کے ایک گاؤں چوری چورا میں ایک تھانے کو آگ لگا دی جس میں 22 سپاہی جل مرے۔ اس واقعے کو بنیاد بنا کر منافقین نے گاندھی جی کے کان بھرنے شروع کیے۔ جس کے بعد گاندھی جی نے اعلان کیا کہ یہ تحریک عدم تشدد پر کاربند نہیں رہی اس لیے اسے ختم کیا جاتا ہے۔ دراصل خلافت تحریک کے ساتھ ہی عدم تشدد کی تحریک بھی وجود میں آئی تھی، ہندو مسلم سب نے مل کر ان میں حصہ لیا تھا، لیکن گاندھی جی کے اعلان کے بعد مذکورہ تحریکیں اور ہندو مسلم اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ حالاں کہ گاندھی جی کے اس فیصلے سے عوام کے ساتھ کانگریس کے اہم لیڈروں نے احتجاج بھی کیا تھا کیوں کہ یہ تحریکیں اس وقت روک دی گئیں جب یہ اپنے عروج پر تھیں۔ گاندھی جی کے مذکورہ فیصلے کے متعلق سالکؔ لکھتے ہیں:

> ''رہا ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ چوری چورا کے مقام پر عوام اور پولیس میں تصادم ہو گیا تھا اور لوگوں نے پولیس کے آدمیوں کو نہایت بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا اس پر گاندھی جی بے حد پریشان ہوئے۔ کانگریس میں جو منافقین تھے انہوں نے اور پنڈت مالوی نے گاندھی جی کو سمجھایا کہ آپ تو بلا شبہ اہنسا (عدم تشدد) کے اوتار ہیں۔ لیکن عوام ابھی عدم تشدد کی اہمیت کو نہیں سمجھتی۔ اس لیے یہ تحریک تشدد سے پاک نہیں رہ سکتی اور اگر ملک بھر میں تشدد کا ذوق عام ہو گیا تو حکومت اپنی فوجی قوت سے ملک کو ایسا دبائے گی کہ ہم سو سال تک آزادی کی تحریک کا نام بھی لینے کے قابل نہیں رہیں گے۔ چناں چہ بردولی کے مقام پر گاندھی جی نے فیصلہ صادر کر دیا کہ تحریک روک دی جائے ان کے حکم کے بعد ترک موالات کی تمام سرگرمیاں بند ہو گئیں۔''10

اس کے بعد ملتان اور کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہوئے جس سے ہندوؤں میں بے حد اضطراب پھیل گیا۔

دونوں قوموں کا جو اتحاد تھا وہ سطحی، جذباتی اور وقتی تھا۔ دونوں کو حکومت کے خلاف نفرت نے عارضی طور پر اکٹھا کیا تھا لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے جلد ہی اس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس سے بھی تحریک خلافت کمزور ہونا شروع ہوئی۔ مسلمانوں کی یہ تحریک سیاسی فائدے کے بجائے مذہبی جوش وخروش پر مبنی تھی۔ اس کے برعکس ہندو اس سے سیاسی فائدے کی تلاش میں تھے اور اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو ہندو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ بقول سالکؔ:

> ''پنڈت مالوی مدت سے تاک لگائے بیٹھے تھے انہیں ترک موالات اور تحریک خلافت کے دوران یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ مسلمان اپنی قربانی اور اولوالعزمی سے سارے ہندوستان کی سیاست پر چھا جائیں گے اور گاندھی جی کا عدم تشدد ہندوؤں کو کمزور کر دے گا۔ اس لیے اس تحریک کا جلد از جلد خاتمہ چاہتے تھے۔ چوری چورا کے حادثے سے تحریک ختم ہو چکی تھی لیکن ان کا نفوذ اب تک باقی تھا۔''11

پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنے شاگردوں اور جاننے والوں کو ملا کر سب سے پہلے آل انڈیا ہندو مہا سبھا قائم کی اور ہندو سنگھٹن کا پیغام دینے کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا اور نیم مسلم ہندو کو سوامی شردھانند کی مدد سے شدھ کرنا شروع کیا۔ دونوں فرقوں کے درمیان نفرت کی بنیاد یہیں سے شروع ہوئی۔ اس واقعے کا ذکر اکثر خودنوشت نگاروں نے کیا ہے۔ ملک بھر کی رجعت پسند ہندو جماعتیں جن میں آریہ سماج پیش پیش تھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہندوؤں سے کہا گیا کہ تم اپنے تفرقوں اور کمزوریوں کی وجہ سے مسلمانوں کا شکار ہو رہے ہو اس لیے سنگھٹت ہو جاؤ۔ سنگھٹن کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہندوؤں کو ایک منچ پر لایا جائے بلکہ ورزشِ جسمانی کے لیے اکھاڑے بنائے گئے۔ اسی طرح شدھی کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے نومسلم لوگوں کو از سر نو ہندو مذہب میں تبدیل کیا جائے۔ تاکہ ملک میں اکثریت ہندوؤں کی ہو جائے۔

ہندوؤں کی ان تحریکوں کے جواب میں مسلمانوں نے بھی تبلیغ و تنظیم قائم کی۔ سیف الدین کچلو نے آل انڈیا تنظیم بنائی جو کہ ہر شہر اور قصبے میں جا کر مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ غرض مسلمانوں کے ہر فرقے نے آگے بڑھ کر حصہ لیا لیکن بہت جلد یہ آپس میں ہی لڑنے لگے اور ایک دوسرے کے خلاف فتوے جاری کرنے لگے۔ اس طرح مسلمان متحد ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے ہی مخالف ہو گئے اور ان کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اس کے بر خلاف ہندوؤں کی طاقت بڑھتی ہی گئی۔

اس وقت ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ آزادی کا خیال کہیں دب کر رہ گیا تھا۔ شدھی، سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کی وجہ سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن بنتے جا رہے تھے۔ سالکؔ کو اس کے نتائج کا اندازہ تھا

اس لیے ''زمیندار'' اخبار میں لیڈروں کو باخبر کرنے کی بارہا کوشش کی لیکن سب بے سود۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''میں نے زمیندار میں پے در پے مقالات لکھے جن میں لیڈروں کو نہایت دردمندی سے پکارا کہ گاندھی جی کا سارا کیا دھرا برباد ہو رہا ہے۔ ملک کی حفاظت کرو ورنہ وہ قیامت مچے گی کہ سارا ہندوستان خونِ بے گناہی سے لالہ زار ہو جائے گا۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ کانگریس کے ہندو اور مسلمان لیڈر خود آگے بڑھیں اور سنگھٹن اور تنظیم کی تحریکوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ شر پسند اور فتنہ پرور لوگ قیادت پر قبضہ نہ کرنے پائیں۔ ساری قوم صرف قوم پرست لیڈروں سے وابستہ رہے۔ جب یہ فتنہ کا دور گزر جائے گا تو یہی لیڈر قوموں کو دوبارہ متحد کر سکیں گے۔ لیکن کانگریس کے ہندو لیڈروں پر خوف اور جمود طاری ہو چکا تھا اور وہ مالوی جی کے ہاتھ میں میدان چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔''12

تحریک ترک موالات کے خاتمے کے بعد کئی ہندو اخبار جاری ہوئے جن میں مہاشے کرشن کا ''پرتاپ'' اور خوشحال چند کا ''ملاپ'' وہ اخبار تھا جن میں فرقہ پرست مضامین شائع ہوتے تھے۔ روزانہ ان اخباروں میں مسلمانوں کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ یہ دونوں اخبار مالوی جی اور شردھانند کی حمایت کرتے تھے۔ اسی طرح یہ شدھی اور سنگھٹن کے زبردست مبلغ تھے۔ انہی دونوں پرچوں نے سب سے پہلے دوقومی نظریہ کو عملاً پیش کیا تھا۔ سالک ان دونوں پرچوں کو پاکستان کے قیام کی بنیاد میں بڑا حصہ مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ پاکستان کے قیام کی بنیاد کب رکھی گئی تھی تو میں بلاخوفِ تردید کہوں گا کہ جس دن ملاپ اور پرتاپ لاہور میں جاری ہوئے۔''13

1927 میں ایک کمیشن پاس کیا گیا جس کا مقصد مستقبل میں ہندوستانی حکومت کے ڈھانچے اور طرز کا تعین کرنا تھا۔ چوں کہ اس کمیشن کے تمام اراکین انگریز ہی تھے اس لیے ہندوستان میں اس کی خوب مخالفت ہوئی۔ مذکورہ کمیشن کے چیئرمین سر جان سائمن تھے اس لیے اسے عام طور پر سائمن کمیشن کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ اس موقع پر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی پہلا گروہ جناح لیگ دراصل اس کمیشن سے بائیکاٹ کے حق میں تھی جب کہ شفیع لیگ کمیشن کے ساتھ تعاون کرنا چاہتی تھی۔ شدید مخالفت کے باوجود 1928 میں اس کمیشن نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ہر جگہ ہندوستانیوں نے کالی جھنڈیوں اور احتجاجی نعروں سے اس کے سامنے مظاہرہ کیا۔

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے بعد 19 مئی 1928 کو مقامی سیاسی پارٹیوں نے ایک کانفرنس منعقد کی۔ موتی لعل نہرو کی سربراہی میں ایک رپورٹ تیار کی گئی جس کا مقصد ہندوستان کے لیے ہندوستانیوں کے ہی ذریعہ ایک ایسے آئینی ڈھانچے کو تشکیل دینا تھا جو ہر مذہب کے لیے قابل قبول ہو۔ اس رپورٹ میں مسلمانوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس رپورٹ کے جواب میں مسٹر جناح نے مسلمانوں کی حمایت میں 14 نکات پیش کیے جس کے ذریعے مسلمانوں کے مطالبات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ سالکؔ نے اپنی خودنوشت میں ان دونوں نکات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ نہرو رپورٹ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''نہرو رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ ملک بھر کے گوشے گوشے میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ مسلمانوں کے نزدیک کئی وجوہ سے اس رپورٹ کی سفارشیں نا قابل قبول تھیں.....اس کی مرکزی مجلس میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں بھی نہ دی گئی تھیں.....اس لیے تعلیم یافتہ اور سیاست دان مسلمانوں نے متفقہ طور پر اس رپورٹ کو رد کر دیا۔''14

عبدالمجید سالک نے بیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی افق پر ہونے والی تبدیلیوں کو بڑے حسن خوبی سے پیش کیا ہے۔ ان اجلاس کا بھی ذکر کیا ہے جس میں مسلم لیگی رہنما نے پھر سے ایک ہو کر مسلمانوں کے مسائل کو حکومت کے سامنے رکھتے ہوئے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ ساتھ ہی برطانیہ میں ہندوستانی مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے ہونے والی گول میز کانفرنس کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانیوں پر انگریزوں کے ظلم وستم جاری تھے۔ ان کی بھی تفصیلات ملتی ہے۔ ملک کی سیاست پر مسلم لیگ اور مسٹر جناح چھائے ہوئے تھے۔

1940 میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا۔ تب تک پاکستان کے قیام پر مسلمانوں کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اس لیے اس اجلاس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ کئی دن پہلے سے تیاریاں شروع ہو گئی تھیں لیکن جلسے کے دو تین دن پہلے خاکساروں اور پولیس کے درمیان تصادم ہو گیا۔ جن میں ایک پولس اور 25 خاکسار مارے گئے۔ بہر حال مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، ہندوستان بھر کے نمائندہ مسلمان جمع ہوئے اور یہ اجلاس نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ اسی اجلاس میں اس قرارداد کو بھی منظوری ملی جس کو قرارداد پاکستان کہتے ہیں۔ بقول سالکؔ:

> ''قائداعظم اب تک لفظ پاکستان سے مانوس نہ ہوئے تھے اور سر سکندر تو ہم سے کہا کرتے تھے کہ سیاسی الفاظ میں سکیم ہی ایسی پیش کرنی چاہیے جس کا نتیجہ مسلمانوں کی حکومت ہو۔

پاکستان کے لفظ سے ہندو اور انگریز سخت بدکتے ہیں ہمیں اپنے مقصد سے کام ہے الفاظ سے کیا کام؟..... چناں چہ قرارداد لاہور میں پاکستان کا لفظ تو استعمال نہ کیا گیا البتہ مطالبہ کی شکل وہی رکھی گئی جس سے پاکستان کے سوا کچھ اور مقصود نہ تھا۔''15

انڈین نیشنل کانگریس نے 1942 میں ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' کا آغاز کیا جس کا مقصد سول نافرمانی کر کے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کرنا تھا۔ مہاتما گاندھی نے 8 اگست 1942 کو اپنے خطاب میں کرو یا مرو کا نعرہ دیا اور تحریک کو عدم تشدد پر کاربند رکھنے کے لیے عوام سے گزارش بھی کی۔ اس کے بعد کانگریس نے احتجاجی ریلیاں نکالیں اور انگریزوں سے ہندوستان چھوڑنے کا مطالبہ کیا۔ اس تعلق سے سالکؔ لکھتے ہیں:

''کانگریس کی یہ تحریک بے تشدد نہ تھی بلکہ کانگریسیوں نے جا بجا مار دھاڑ شروع کر دی، بعض سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی، کہیں ریل پٹریاں اکھاڑ ڈالیں اور کہیں سرکاری دفتروں کو لوٹ لیا۔ بمبئی، واردھا، ناگپور، دہلی، پونا میں سخت ہنگامے برپا ہوئے۔ آخر حکومت نے کانگریس کو خلافتِ قانون جماعت قرار دیا اور گاندھی جی، سروجنی دیوی، پٹیل، جواہر لعل اور دوسرے لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔''16

مسلم لیگ نے اس تحریک کی کوئی حمایت نہیں کی اور نہ ہی کانگریس کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں کی مانگ یہ تھی کہ اگر کانگریس پاکستان کو قبول کر لے گی تو ہم بھی اس تحریک میں حصہ لیں گے۔ لیکن کانگریس اس شرط کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس تحریک کے دوران پورے ملک میں متعدد فساد ہوئے، حکومت نے تمام بڑے لیڈروں کو قید کر لیا تھا۔ جن کی رہائی 1943 کے بعد ہوئی۔ یہ ایک ناکام تحریک تھی اور اس کی ناکامی کی وجہ چوطرفہ دباؤ، کمزور باہمی ہم آہنگی اور واضح حکمت عملیوں کی کمی تھی، جس کی طرف ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی خودنوشت میں اشارہ کیا ہے۔ لیکن برطانیہ کو احساس ہو گیا تھا کہ جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں اب حکومت کرنا دشوار ہے۔ جنگ کے بعد ان کو یہ سوچنا تھا کہ کیسے پرامن طریقے سے ہندوستان کو خیرآباد کیا جائے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران یعنی 1943 میں بنگال میں شدید قحط پڑا جس کی وجہ خراب فصل نہ تھی بلکہ انگریز سارا غلہ دوسرے ممالک میں اپنے برسرپیکاروں کو بھیج رہے تھے جس کی وجہ سے غلے کی قلت ہو گئی۔ اس کے علاوہ انگریزوں کو یہ خطرہ تھا کہ جاپان برما کے راستے ہندوستان میں داخل نہ ہو جائے۔ اس لیے انہوں نے بنگال کا سارا اناج برآمد کر لیا تاکہ جاپانی فوج کو غلہ نہ مل سکے۔ اس قحط میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ مشرقی کمان کو فوج کے لیے چاولوں کی

نہایت کثیر تعداد مطلوب تھی اور ہند کی حکومت کے محکمۂ خوراک نے خاطر خواہ انتظام نہ کیا تھا اس لیے فوجی حکام نے بنگال سے اندھا دھند بہت زیادہ نرخوں پر چاول خریدنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہفتوں کے اندر بنگال میں چاول کے نرخ پندرہ روپے من سے بڑھ کر ایک سو بیس روپے من ہو گئے۔ جس سے دیہات میں چاول کا ایک دانہ نہ رہا اور لاکھوں لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ اس قحط اور اس سے ہونے والی تباہیوں کا ذکر سالکؔ نے کیا ہے۔

ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے 1946 کا سال بے حد ہنگامہ خیز تھا۔ کیبنٹ مشن کی ناکامی کے بعد مسلم لیگ نے بمبئی میں 29 جولائی 1946 کو اپنے سالانہ اجلاس میں اعلان کیا کہ 16 اگست کو مطالبہ پاکستان کے حق میں ملک گیر مظاہرے ہوں گے۔ حالاں کہ راست اقدام کا اعلان کرتے ہوئے مسٹر جناح نے پر امن مظاہرے کی مانگ کی تھی۔ لیکن راست اقدام کا نام سنتے ہی ہندو بھڑک گئے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کمر کس لی۔ یوم راست اقدام سے شروع ہونے والی چنگاری نے پورے بھارت کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بہار، کلکتہ، بمبئی، پنجاب، کوئٹہ، الہ آباد میں زبردست فسادات ہوئے۔ بہار میں مذہب کے نام پر مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا ذکر بھی انسانیت کی توہین کے زمرے میں آتا ہے۔ بقول سالکؔ:

> ''راست اقدام کا نام سنتے ہی ہندوؤں کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے لنگر لنگوٹے کس لیے۔ چناں چہ 16 اگست کو کلکتہ میں ہولناک فساد ہوا جس میں ہزاروں ہلاک اور ہزاروں مجروح ہوئے۔ پھر ممبئی، کوئٹہ، الہ آباد وغیرہ میں فسادات ہوئے۔ نواکھلی (مشرقی بنگال) اور صوبہ بہار میں جو ہولناک خونریزیاں ہوئیں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں شرمناک تھیں، ان میں ہزارہا جانوں کا نقصان ہوا کروڑوں کی جائداد تباہ کر دی گئی۔ غرض حالات اس مقام پر پہنچ گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یک جا زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہو گیا اور پاکستان کا قیام اس برصغیر کی سب سے بڑی شرطِ حیات پا گیا۔''17

مسلم لیگ پاکستان کی مانگ پر بضد تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت پوری طرح کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اسے اپنا ملک چلانا محال تھا مقبوضہ ملک کو کیسے سنبھال سکتا تھا۔ چناں چہ انگریزوں نے اعلان کیا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی۔ پاکستان کے نام پر پورے ملک میں خونریزی جاری تھی، حالات بے قابو ہو رہے تھے۔ اس لیے انگریز حکومت نے بڑی جلد بازی میں ملک کی تقسیم کے ساتھ ہندوستان کو آزاد کر

دیا اور ساتھ ہی دونوں قوموں میں ایک خلیج قائم کر دی جو آج تک بدستور جاری ہے۔ 1946 میں جو فساد پھوٹا تھا وہ آزادی یعنی 15 اگست 1947 تک چلتا رہا۔ ملک کا پورا نظام درہم برہم تھا، معیشت پوری طرح سے چوپٹ ہو گئی تھی۔ اس وقت کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگست کے پہلے دو ہفتے قیامت کے تھے، فسادات اور آتش زنی کا دور دورہ تھا۔ امرتسر اور لاہور دونوں شہروں میں امن و قانون ختم ہو چکا تھا، لاہور سے ہندو آبادی بھاگ رہی تھی۔ یہاں تک شاہ عالمی دروازے کے اندرونی حصے کو آگ لگی اور ہندوؤں کے حوصلے بالکل ہی ٹوٹ گئے۔ وہ لاکھوں کی تعداد میں یہاں سے امرتسر کی طرف جانے لگے اور امرتسر کے مسلمان چار پانچ مہینے ہندوؤں اور سکھوں کی متحدہ یلغار کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بعد جب ملٹری زدوخورد کی تاب نہ لا سکے تو انہوں نے بھی لاہور کا رخ کیا اور ریلوے اسٹیشن سے لے کر میو ہسپتال تک ہر متروکہ مکان اور دکان پر جبراً قابض ہو گئے۔ کیوں کہ امرتسر میں ان کی جائدادوں پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ایام میں نے اور مہر صاحب نے چپ چاپ مسلم ٹاؤن میں بسر کیے۔ فسادات کی آگ فرو ہوئی اور ہم اپنے دفتر گئے تو شہر کی صورت بالکل بدلی ہوئی تھی۔''18

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے جو مہاجر پاکستان گئے ان کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی۔ نہ جانے کتنے لوگ اپنا سب کچھ لٹ لٹا کر پاکستان پہنچے تھے۔ مشرقی پنجاب میں جو مسلمانوں پر بیتی اس کو بیان کرنا بھی دشوار ہے۔ دونوں طرف سے نہ جانے کتنے لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دونوں طرف کی حکومتیں پناہ گزینوں کی بازآبادکاری میں مصروف تھیں۔ سالک نے اپنی خودنوشت میں ان تمام واقعات کا ذکر کیا ہے انہوں نے ''سرگزشت'' کا اختتام خاتمہ سخن کے عنوان سے کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''آج سرگزشت ختم ہوتی ہے 14 اگست کو پاکستان قائم ہو گیا اس وقت کے بعد کی سرگزشت لکھنا بے حد دشوار ہے۔ میں ابھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا، سُنا اور بساطِ سیاست پر شاطرین نے جو چالیں چلیں ان کو قلم بند کر سکوں۔ شاید اس سرگزشت کو فاش انداز سے لکھنا مصلحت بھی نہیں۔''19

مختصر یہ کہ سالک کی مذکورہ خودنوشت میں نہ صرف مصنف کی روداد زندگی ملتی ہے بلکہ اختصار کے ساتھ

ہندوستان کے سیاسی احوال کا خاکہ بھی ملتا ہے جس میں تقسیم ہند کے محرکات کے ساتھ اثرات کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

حوالہ جات

1۔ عبدالمجید سالکؔ، سرگزشت، 1993 زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ص: 11
2۔ ایضاً، ص: 59
3۔ ایضاً، ص: 60,61
4۔ ایضاً، ص: 62
5۔ ایضاً، ص: 125
6۔ ایضاً، ص: 111
7۔ ایضاً، ص: 113
8۔ ایضاً، ص: 120
9۔ ایضاً، ص: 170,171
10۔ ایضاً، ص: 184
11۔ ایضاً، ص: 185
12۔ ایضاً، ص: 188
13۔ ایضاً، ص: 231
14۔ ایضاً، ص: 421
15۔ ایضاً، ص: 444
16۔ ایضاً، ص: 456
17۔ ایضاً، ص: 486
18۔ ایضاً، ص: 499
19۔ ایضاً، ص: 500

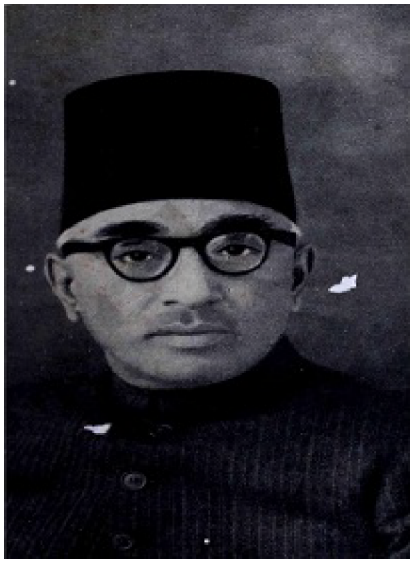

ہوش بلگرامی: مشاہدات

سنہ اشاعت: 1955

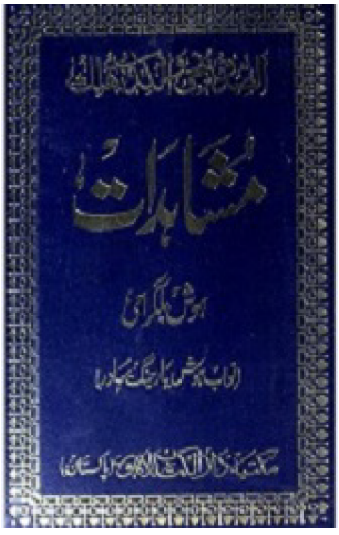

مشاہدات (ہوشؔ بلگرامی)

ناظر الحسن المعروف ہوشؔ بلگرامی حیدرآباد دکن کے آصف جاہی سلطنت کے آخری فرمانروا میر عثمان علی خان بہادر کے مصاحب خاص تھے جن کو دربار کی طرف سے نواب ہوش یار جنگ کے لقب سے نوازا گیا۔ اس کے بعد اصل نام تو کہیں گم ہو گیا اور ہوش یار جنگ کے نام سے ہی مشہور و معروف ہوئے۔ اتر پردیش میں ضلع ہردوئی کے شہر بلگرام میں 1948 میں پیدا ہوئے۔ ملازمت و دیگر مصروفیات کے سبب مختلف شہروں میں رہے لیکن ان کو اپنے آبائی شہر جہاں ابتدائی تعلیم اور بچپن گزرا تھا، کبھی فراموش نہ کر سکے۔ شاید اسی سبب انہوں نے اپنے نام، جو کہ ان کا تخلص بھی تھا ہوشؔ کے ساتھ بلگرامی کا استعمال اس طرح کیا کہ ادبی دنیا میں ہوشؔ بلگرامی کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔

پندرہ سال کی عمر میں ملازمت کی غرض سے پہلا سفر قنوج کا کیا، بعد میں کانپور پہنچے جہاں ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی، لیکن وہاں دل نہ لگا اور بلگرام واپس آ کر سید بلگرامی کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوی کے ساتھ حیدرآباد پہنچے۔ اپنی علمی و ادبی صلاحیت کی بنا پر نظام کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ ہوشؔ نے ایک بھرپور زندگی گزاری، جس میں انتظامی و گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ اردو ادب کی بھی خدمت کرتے رہے۔ ان سرگرمیوں کے علاوہ صحافت میں بھی نمایاں کردار ادا کیا، رسالہ ''زخیرہ'' نکالا جو اپنے وقت میں کافی مشہور تھا۔ عربی، فارسی و انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے، خوش گفتاری میں کمال حاصل تھا جن کی وجہ سے ہر محفل میں چھا جاتے۔ ان کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر دکن کے آخری نظام میر عثمان علی خاں نے اپنا مصاحب خاص بھی مقرر کر دیا۔ اس حیثیت سے ہوشؔ نظام کے کافی قریب ہو گئے، ریاستی عمور کے لیے ان کے ساتھ سفر بھی کرتے رہے۔

ہوشؔ پہلی بار 1911 میں حیدرآباد پہنچے تھے۔ 1918 میں ان کے ایک مضمون، جو کہ ''زخیرہ'' میں شائع ہوا تھا، کی مخالفت ہونے کے سبب حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد ہوشؔ بھوپال، جے پور، آگرہ ہوتے ہوئے رام پور پہنچے۔ جہاں نواب سید حامد علی کے دربار میں حاضر ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر بہت جلد ان کے دل میں جگہ بنالی۔ ہوشؔ رامپور میں دس سال قیام پذیر رہے۔ نواب ان پر مہربان تھے، دربار سے وابستگی کی بنا پر انہوں نے اپنی خودنوشت میں دربار کی چمک دھمک اور نواب کی شخصیت کا ذکر کیا ہے۔

دس سال بعد نظام دکن نے ہوشؔ کو دوبارہ حیدرآباد بلا لیا، ملازمت بھی بحال کر دی گئی۔ ہوشؔ پہلے سیونگ بینک کی انسپکٹری، پھر مہتمی، بعد میں ترقی کرتے ہوئے وزارت تعمیرات کے سیکریٹری ہو گئے۔ سر مرزا اسماعیل کے صدارت

سے مستعفی ہونے کے بعد اتحاد المسلمین کی ریشہ دوانیوں اور دربار کے سازشی ماحول سے تنگ آ کر جنوری 1948 میں اپنے عہدے سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ہوشؔ ان مصروفیات کے علاوہ اردو ادب میں بھی اپنے کارنامے انجام دیتے رہے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''سرود غم'' کے علاوہ طوفان محبت (مثنوی)، عروس ادب (مضامین)، مشاہدات (خودنوشت) ان کے تخلیقی سرمایے ہیں۔ عروس ادب میں شامل مضامین وہی ہیں جو ان کے رسالہ ''زخیرہ'' میں گاہے بگاہے شائع ہوتے رہے۔

ہوشؔ بلگرامی کی خودنوشت ''مشاہدات'' کا شمار ان چند کتابوں میں ہوتا ہے جن پر پابندی لگائی گئی۔ مذکورہ کتاب، داستانِ حیات سے زیادہ دربار و سیاست سے متعلق ان حالات و واقعات کی کہانی ہے جن کے مصنف شاہد تھے۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز برصغیر میں ایک خلفشار پھیلا کر یہاں سے جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ساتھ ہی حیدرآباد دکن میں آصف جاہی سلطنت بھی زوال پذیر تھی اور ریاست کا وجود بھی۔ خودنوشت ''مشاہدات'' 1955 میں شائع ہوئی جس میں مصنف کے شب و روز سے زیادہ برصغیر کی سیاست، حیدرآباد دکن و رامپور کی ریاستوں کے نوابوں، ان کی شاہی زندگیوں، ان ریاستوں کے اتار چڑھاؤ کا ذکر کافی تفصیل سے کیا گیا ہے، علاوہ ازیں حیدرآباد کے بعض عمائدین کے خلاف اندرون خانہ، ان کی نجی زندگیوں کے انکشافات اور ان کی سازشیں بھی شاملِ کتاب ہیں۔ جس کی وجہ سے مذکورہ کتاب کے شائع ہوتے ہی سخت مخالفت کی گئی۔ لوگ کافی مشتعل ہوئے، اختلافی ردعمل کے سامنے آنے کے بعد مصنف نے کتاب سے بیشتر صفحات کو نکال کر اس کی جگہ نئے اوراق چھپوا کر لگوایا۔ جابجا سطروں کی سطریں حذف کرنی پڑیں اور ان پر نئی عبارتیں چٹوں کی شکل میں چسپا کروائیں۔ اس ردوبدل کی وجہ سے یہ کتاب اپنی نوعیت کی واحد کتاب بن گئی۔ تاہم ان اقدامات کے بعد بھی مقتدر حلقے مطمئن نہیں ہوئے اور مخالفت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ بالآخر اس خودنوشت پر دکن میں پابندی لگا دی گئی اور پہلے سے شائع ہوئی کتاب ضبط کر لی گئیں۔ ان ساری پیش رفت میں ہوشؔ کو شدید دھچکا پہنچا اور کچھ ہی دنوں کے بعد 1955 میں ہی انتقال کر گئے۔

ہوشؔ بلگرامی دو ریاستوں کے دربار سے وابستہ رہے، آسائشیں بھی دیکھیں، پریشانیاں بھی اٹھائیں۔ ان کی خودنوشت اسی اتار چڑھاؤ کی داستان ہے۔ جو کہ حیدرآباد دکن کی تاریخ بھی ہے اور مصنف کے حالات زندگی کا مرقع بھی۔ اس کا ایک بڑا حصہ سقوط حیدرآباد کے آخری ایام، اس کے سیاسی ابتلا اور مصنف کے تاثرات و نظریات کے بیان پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں مذہب خصوصاً اسلام میں پھیلی بدامنیوں و بدعتوں اور سیاست میں ہونے والی بدعنوانیوں پر بھی بحث ملتی ہے۔ مذکورہ خودنوشت پابندی کے بعد سالوں تک ناپید رہی۔ مشاہدات کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے

مصنف کی داستان حیات ہے جو سیاسی ابتلا کے دوران حاکم وقت کا مصاحب خاص رہا اور کم از کم اقتدار کے اندرونی حالات و واقعات کا چشم دید گواہ بھی۔ چناں چہ ایسی نایاب و گم گشتہ تصنیف کی افادیت کا فہم رکھتے ہوئے پاکستان کی نوجوان نسل میں اردو کی بے لوث خدمت کرنے والے راشد اشرف نے مرتب کر کے مکتبہ دارالکتاب لاہور (پاکستان) سے 2019 میں شائع کرایا۔ حالاں کہ اردو کی مشہور ویب سائٹ ریختہ ڈاٹ کام پر اس ایڈیشن کے علاوہ، وہ نسخہ بھی موجود ہے جس میں جا بجا اسٹیکر لگا کر لائنوں کو حذف کیا گیا ہے۔ بہر حال 550 سے زائد صفحات کی اس کتاب کو مختلف عنوانات دے کر ابواب قائم کیے گئے ہیں ۔ آخر الذکر ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا۔ خودنوشت کا پیش لفظ کے۔ ایم۔ منشی نے انگریزی میں لکھا ہے جس کا اردو ترجمہ بھی شاملِ کتاب ہے۔ کے ایم منشی حکومت ہند کی طرف سے 1948 میں بحیثیت ایجنٹ جنرل حیدر باد پہنچے۔ جہاں ان کی ملاقات نواب ہوشؔ یار جنگ سے ہوئی۔ وہ مصنف کی شخصیت سے متاثر تھے۔ انہوں نے پیش لفظ میں ہوشؔ کی شخصیت کے ساتھ خودنوشت پر بھی اپنی رائے پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مصنف نے اس کتاب میں اپنی سوانح زندگی قلم بند کی ہے جس کے بعض حصے انہوں نے مجھے پڑھ کر سنائے۔ اس میں حیدر آباد کے جو واقعات سنہ 1948 کے لکھے گئے ہیں وہ ان کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں اور یہ کتاب ان حالات پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہے۔ جس کی وجہ سے انڈین یونین نے ستمبر 1948 میں پولیس ایکشن کرنے پر مجبور ہوئی۔ ان امور سے قطع نظر یہ کتاب یوں بھی رنگین اردو، انشا پردازی اور دلکش طرز ادا کے لحاظ سے بڑے لطف کی چیز ہے۔۔۔''[1]

ہوشؔ بلگرامی نے تقریباً 15 صفحات کا دیباچہ بھی تحریر کیا ہے جس میں خودنوشت کی خصوصیت کے ساتھ کتاب سے متعلق خامہ فرسائی کی ہے۔ اس دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کو مکمل کرنے میں مصنف کو ایک سال سے زیادہ کا وقت لگا۔ مسلسل دس سے بارہ گھنٹے اس تعلق سے کام کرتے اور عمر رفتہ کے اعمال کا جائزہ لینے میں مصروف رہتے تھے۔ اگر اتنے انہماک سے کام نہ کرتے تو اتنی ضخیم کتاب ہمارے سامنے نہ ہوتی۔ بہر کیف وہ خودنوشت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''میری زندگی کے اس ادبی تحفے میں ایسے حقائق پوشیدہ ہیں اور 'مشاہدات' کے ایسے ناقابل انکار مناظر پھیلے ہوئے ہیں جن کے مطالعے سے ممکن ہے کہ ناظرین بہت جلد ان

تجربات پر عبور حاصل کر لیں جن کے لیے میں نے مصائب برداشت کیے ہیں اور روحانی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ میں نے چوں کہ کسی قدر صاف بیانی سے کام لیا ہے اس لیے یہ خیال نہ کیا جائے کہ صرف انسانی عیبوں پر ہی نظر رکھی ہے۔نہیں بلکہ جہاں صفات ملی ہیں ان کے بیان کرنے میں قلم کو روکا نہیں گیا ہے۔ میں نے دوسروں کے عیب گنوانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی غلطیاں اور اپنے عیوب بیان کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا ہے۔''2

خودنوشت کی ابتدا مصنف نے بچپن کی یادوں اور اپنے آبائی وطن بلگرام کے خوشگوار ماحول سے کی ہے۔ وہاں کی قدیم روایتوں اور عظیم شخصیتوں کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔ ہوشؔ نے ایسے وقت میں آنکھیں کھولیں جب پورا ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا، اپنی بدنصیبی پر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ برصغیر میں کسانوں وغریبوں کی ابتر حالت، دن بدن بڑھتی فرقہ واریت کے تذکرے پر جہاں افسوس کا اظہار کیا ہے وہیں ہندو مسلم بھائی چارگی، بے فکری اور انسان دوستی کا ذکر بڑی حسرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مذہب ہو یا سیاست، معاشرہ ہو یا پھر تہذیب وتمدن، غرض کہ ہر طرف پھیلی بدامنیوں پر، ساتھ ہی پرانی اقدار کے ٹوٹنے کا ماتم بھی کرتے ہیں۔خودنوشت میں ہوشؔ نے اپنی ذاتی زندگی کو موجودہ حالات و واقعات کے تناظر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے والدین، بھائی بہن اور دوسرے خاندان کے افراد کا ذکر ناپید ہے۔اس کتاب سے مصنف کی پوری زندگی پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ دراصل انہوں نے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ اس سرگزشت کا مقصد آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی بنا کر پیش کرنا ہے۔ چناں چہ انہوں نے اسی خیال کے زیر اثر کتاب کو تحریر کیا ہے جس میں حاکمِ وقت کی تفصیلات، سیاست، مذہب، معیشت، ہر پہلو پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ وہ تمام واقعات جن کے ہوشؔ از خود شاہد ہیں بلاکم وکاست بیان کر دیا ہے۔

برصغیر میں انگریزوں کے آنے کے بعد کس طرح فضا مقدور ہوتی ہے، کیسے انسانی رشتے طاق نسیاں پر رکھ کر لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنتے ہیں، سیاست میں اپنا سکہ جمانے کے لیے کس طرح انگریزوں نے چالبازیاں کیں، اور ملک کو غلام بنایا، ان تمام موضوعات پر ہوشؔ نے قلم کا اٹھایا ہے۔ مذکورہ کتاب میں مصنف ہندو مسلم دونوں قوموں میں بڑھتی نفرتوں پر رنجیدہ نظر آتے ہیں اور اپنے دکھ کا اظہار جا بجا کرتے ہیں۔ دینی معاملے ہوں یا دنیوی دونوں قومیں کس طرح مل کر رہتی تھیں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شوالوں میں سنکھ بجتے تھے تو مسلمان اس کی صَوت میں یگانگت کی صدائیں سنتے تھے،

مسجدوں میں اذانیں ہوتی تھیں تو ہندو اس کی خوش الحانیوں میں اللہ کی بڑائی کا اقرار کرتے تھے، محرم میں ہندو مسلمان شانہ سے شانہ ملا کر نوحے مرثیے پڑھتے تھے، نہ باجوں کی جھنکار پر جھگڑا ہوتا تھا، نہ پیپل کے درخت پر دنگا مچتا تھا اور نہ قربانی پر جانوروں کی طرح انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ غرض کہ وہ دنیوی معاملات ہوں یا دینی سب میں سیر و شکر بنے رہتے تھے، شانتی اور سکون کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ تھا ہندو مسلم ملاپ اور یہ تھا وہ انسانی برتاؤ، جس میں میری طفلی گزری۔۔۔''3

ہندوستان میں مختلف تنظیموں و جماعتوں کے ساتھ شر پسندوں کی وجہ سے جب فرقہ واریت بڑھتی ہے تو مصنف بے چین ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ بے چینی خودنوشت کے ابتدا سے ہی محسوس کی جا سکتی ہے۔ بڑھتی نفرتوں کے خاتمے کے خواہاں نظر آتے ہیں اور اس سطح پر عملی کام بھی کرتے ہیں۔ ہوشؔ نے خودنوشت میں ان وجوہات پر بھی اظہار خیال کیا ہے جس کی وجہ سے صدیوں سے چلی آ رہی روایتیں ٹوٹ گئیں اور دونوں قومیں ایک دوسرے کی خون کی پیاسی ہو گئیں۔ اس سلسلے میں اس وقت برصغیر میں انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی پالیسی نے جلتی میں آگ کا کام کیا اور شر پسندوں کی بھڑکاؤ تقاریر نے لوگوں کے دماغ کو مفلوج کر دیا تھا۔ اس پر سے طرہ یہ کہ شدھی اور سنگھٹن کی تنظیمیں بھی قائم ہو گئیں، ہندو کٹر وادیوں کی جماعتیں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ و ہندو مہا سبھا نے بھی اس سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بہر کیف نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کے مابین ایسی خلیج قائم ہوئی کہ مہاتما گاندھی کی انسان دوستی بھی ہندو مسلم کو بھائی بھائی نہ بنا سکی۔ دو قومی نظریہ نے اتنا طول پکڑا کہ سارے پرانے اقدار کو پس پشت ڈال کر ملک کے ہی ٹکڑے کر ڈالے گئے اور اس کی زمین کو لہولہان کر دیا گیا۔ ہوشؔ نے ان تفرقات کی سب سے بڑی وجہ انگریزی حکومت کو ہی مانا ہے۔ کیوں کہ انگریزوں ہی کی پالیسیوں سے ہزاروں سال سے چلی آ رہی روایتیں ختم ہو گئیں، بھائی چارہ پارہ پارہ ہو گیا، ورنہ ان کی آمد سے قبل برصغیر میں امن و سکون قائم تھا۔ اس سلسلے میں خودنوشت کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''اُس وقت منافرت پھیلانے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔ جب نہ انگریز تھے نہ ان کی پھوٹ ڈالنے والی حکومت، نہ سبھائیں تھیں اور نہ لیگیں۔ دو قومیں ضرور آباد تھیں مگر دو قومی نظریہ کا جدائی ڈالنے والا احساس نہ تھا۔ نہ ہندوؤں کے راج میں ایسی چپقلش ہوئی نہ مسلمانوں کے عہد میں یہ خون آشامیاں ہوئیں۔''4

ہوشؔ نے خودنوشت کے باب ''میرا سیاسی مسلک'' میں تفصیل کے ساتھ سیاست موضوعات اور برصغیر کے

سیاسی حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ انگریزوں کی آمد، ہندوستان پر اپنا تسلط جمانے کی خاطر اپنائی گئی ان کی پالیسیاں، اتنے بڑے کرۂ عرض کے غلام ہونے کے اسباب پر ان کا قلم خوب چلتا ہے۔ پہلی و دوسری جنگ عظیم کی تباہی و نتائج، خصوصاً دوسری جنگ کے بعد ہندوستان میں بڑھتی مہنگائی، پھیلتے انتشار کا بیان بھی کتاب میں موجود ہے۔ 1940 کے بعد برصغیر میں بدلتے حالات اور دونوں قوموں کے درمیان بڑھتی دوریاں، مسلم لیگ کی الگ ملک کی مانگ تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک مضمون ''ہندوستان کی تقسیم ہو جائے'' کے عنوان سے لکھا تھا جو 29 اکتوبر 1945 کو روز نامہ ''پیام'' میں شائع ہوا۔ برصغیر کی سیاست سے متعلق اپنے نظریے اور مشاہدے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں ہندوستان کی سیاست کا برسوں سے غائر مطالعہ کرتا رہا ہوں، کانگریس اور لیگ کے خیالات کا تجزیہ کرتا رہا ہوں، جناح کی سیاسی کروٹیں دیکھتا رہا ہوں، مہاتما گاندھی کی صلح جویانہ سیاست کو بھی پڑھتا رہا ہوں اور دوقومی نظریہ کی قوت کا بھی امتحان لیتا رہا ہوں اور اس نظریے کی جدا کر دینے والی مجبوریوں کو بھی برطانیہ کی سیاست کے مدوجزر میں دیکھتا رہا ہوں۔ جس نے اس کے دو ٹکڑے کر کے ہندو مسلمانوں کی دشمنی کو مستقل بنا دیا۔''5

ہوشؔ بلگرامی نے اپنے مذکورہ مضمون کو خودنوشت میں بھی شامل کیا ہے۔ جس میں مسلم لیگ کی پاکستان کی مانگ اور اس جماعت سے وابستہ رہنماؤں کی نااہلی کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے قطع نظر ان تمام وجوہات کو بھی پیش کیا ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو الگ ملک دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس ملک کی لیگ مانگ کر رہی تھی اس کا کوئی واضح نقشہ عوام کے سامنے نہیں تھا اور نہ کوئی قابل احترام عمل مسلم لیگ کے سیاستداں بتا پا رہے تھے جس کی بنیاد پر حل نکالا جا سکے، اور ہندوستان بھر کے تمام مسلمانوں کو اس ملک میں منتقلی کی جا سکے۔ مسلم لیگ کا کوئی واضح نظریہ سامنے نہیں آ رہا تھا بس وہ لوگ مذہبی عقائد کے نظریے سے اپنی ولولہ انگیز تقاریر سے لوگوں کے جذبات کو بھڑکا رہے تھے۔ نتیجے کی پروا کیے بغیر سب کے سب ایک رو میں بہہ رہے تھے۔ ہوشؔ جانتے تھے کہ تقسیم کے بعد یا ایک مسلم ملک کی بنا پر برصغیر کے تمام مسلمانوں کی منتقلی ضروری تھی ورنہ جو لوگ یہاں رہ جائیں گے ان کو ہمیشہ شبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کیوں کہ جس پاکستان کا وجود سامنے آنے والا تھا اس میں تمام مسلم آبادی سما نہیں سکتی تھی، بہر کیف ہوا وہی جس کا مصنف کو ڈر تھا مسلمانوں کی کثیر آبادی ہندوستان میں ہی رہ گئی، جن کو آج تک اپنی حب الوطنی کا ثبوت دینا پڑ رہا ہے۔

ہوشؔ نے اپنے مذکورہ مضمون میں ہی یہ بھی واضح کیا ہے کہ کس طرح برصغیر میں فرقہ واریت بڑھ رہی تھی اور ہندو مسلم ایک دوسرے کے دشمن بنتے جا رہے تھے، اب ان کا ایک ساتھ ایک ملک میں رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ انہوں نے

ان تمام پہلوؤں اور اسباب کا ذکر کیا ہے جو تقسیم ہند کا محرک بنیں۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم کچھ اس طرح ہو کہ تمام مسائل کا حل اسی میں مضمر رہے نہ کہ یہ بٹوارہ تمام عالم انسان کے لیے ایک معمہ بن کر رہ جائے۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا اور تقسیم ہند مسائل کو حل کرنے کے بجائے نت نئی مشکلات کو سامنے لائی اور اس معاملے کی گتھی اتنی الجھ گئی ہے کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے سخت حریف بن کر سامنے آئے۔ علاوہ ازیں ہوشؔ کا ایک اور مضمون اسی تعلق سے بعنوان ''سیاسی کروٹیں'' 13 اگست 1947 کو شائع ہوا تھا، یہ بھی خودنوشت میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے جو تقسیم پر مہر لگنے کے بعد کشت وخون کے روپ میں دنیا نے دیکھے۔ ملک کی تقسیم اور سرحدوں کے تعین میں جو جانی و مالی نقصان ہوا اس پر بھی افسوس کیا ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ملک کی تقسیم اور سرحدوں کی تعین سے جو ہلاکت خیزیاں ہندوستان میں ہوئیں، اس نے اس ملک کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے اور اس کو اب تک پنپنے کا موقع نہ مل سکا اور کیوں کر مل سکتا ہے جب کہ تقسیم کے بعد بھی ہندو مسلم جھڑپیں، راشٹریہ سیوک سنگھ کے انقلاب آفریں ہنگامے، ارباب حل وعقد کی خودغرضیاں اور اہل ملک کی بے چینیاں، سیاست کی گہرائی میں ڈوب کر اس پر نہ سنجیدگی سے غور کر سکتی ہیں اور نہ اس پر اطمینان سے گامزن ہونے کا موقع دے سکتی ہیں۔''6

ہوشؔ بلگرامی نے ''مشاہدات'' میں انگریزوں کی آمد، ان کی پالیسیاں، ظلم وستم اور فرقہ وارانہ فسادات پر اظہار خیال کیا ہے۔ خودنوشت کے سیاسی باب میں ہی ذیلی عنوان ''آپ خوش عالم دنگ'' کے تحت مصنف نے اس بات کا خلاصہ کیا ہے کہ آزادی کیسے ملی؟ پھر اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ آزادی صرف کانگریس کی کوششوں سے نہیں ملی بلکہ بے شمار لوگوں کی قربانیوں اور ہندوستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے نتائج سے ملی جس نے انگریزی حکومت کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی حکومت کھوکھلی ہو چکی تھی اور برصغیر کے بگڑتے حالات پر قابو پانا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا، بگڑتے حالات اور کانگریس و مسلم لیگ کے درمیان رسہ کشی نے آزادی کو آسان بنایا۔ ان ہی حالات کی وجہ سے تنگ آ کر گورنر جنرل لارڈ ویول نے برطانوی حکومت سے اپیل کی تھی کہ جلد از جلد ہندوستان کی قیادت مقامی لوگوں کو سونپ کر ہمیں خیر باد کر دینا چاہیے۔

ہوشؔ 1946 میں ہونے والے ملک گیر فسادات، بحری سپاہیوں کی بغاوت اور دیگر تحریکات کو ہی آزادی کی

اصل وجہ بتاتے ہیں۔اس موضوع پر تفصیلی بحث کر کے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کہا یہ جاتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کانگریس کی زندانی قربانیوں سے ملی۔قلم کے زور نے تاریخ میں پاکستان کے ایک جدید باب کا اضافہ کر دیا۔امریکہ کی 'قارونی دولت' نے برطانیہ کو آمادہ کیا اور روس کی تاتاری عسکریت نے برطانیہ کو مجبور کیا۔ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو، مگر میں تو یہ کہوں گا کہ نواکھالی کا کشت وخون رنگ لایا، بمبئی کے چُھروں نے آزادی پر غور کرنے کا موقع دیا، گڈھ مکتیشر کے میلہ نے ارباب حل وعقد کو بیدار کیا اور بہار کی انسانیت سوز قتل وغارت گیری نے 15 اگست کی تاریخ مقرر کرادی۔''7

اسباب جو بھی ہوں، آزادی ملنے کی صورت جو بھی ہو، اس وقت برصغیر میں ایسے تشویش ناک حالات پیدا ہو گئے اور انگریزوں کو ایسی خطرناک کشمکش سے دوچار ہونا پڑا کہ ان کو ہندوستان آزاد کرنے اور نئے ملک کی بنیاد رکھنے کے سوا کوئی دوسرا حل نظر نہیں آیا۔چناں چہ ہندوستان آزاد ہوا، پاکستان عالم وجود میں آیا اور دولت مشترکہ کے سایے میں دونوں ملکوں کے لوگوں کی زندگیوں کا اعلان ہوا۔لیکن سیاسی جماعتوں میں لوگوں کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ آزادی کے دوسرے ہی دن حالات اتنے خراب ہو جائیں گے جس پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔سچ تو یہ ہے کہ ان زخموں کی ٹیس آج تک ختم نہ ہوئی۔

مشاہدات میں مصنف نے جدوجہد آزادی کے لیے کی گئی بغاوتوں، مختلف تحریکوں، مجاہدوں کی شہادتوں غرض جو بھی ہندوستانیوں نے آزادی کی خاطر قربانیاں دی تھیں ان تمام کو تاریخی اعتبار سے بڑے اختصار کے ساتھ ہوشؔ نے پیش کیا ہے۔یہ ان کا ہی خاصہ ہے کہ تقریباً دوسو سال کے تاریخی واقعات کو محض چند صفحات میں پرو دیا۔اس کے ساتھ ہی خودنوشت میں تقسیم ہند کے بعد ہونے والے خونی کھیل اور اس کے نتائج کو بھی بڑے دل سوز انداز میں بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''لیڈران قوم کے دعوے تھے، برطانیہ کی دیوالیہ سیاست کو یقین تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے امن وامان کی ضمانت دی جا سکے گی۔مگر پنجاب اب تک اپنی جان پر کھیل رہا ہے..... مہاتما گاندھی جی کی کوششوں کو پہلی مرتبہ بنگال میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا.....نہیں کہا جا سکتا کہ راوی کا یہ طوفان ابھی کتنی قربانیوں کے بعد تھم سکے گا اور کوئٹہ کو کیوں قرار آئے گا۔ نہ نشتر سے کوئی سمجھتا ہے، نہ قائداعظم کی اپیلوں پر کوئی غور کرتا ہے، نہ پنڈت جی کی کشمیری

آواز کو کوئی سنتا ہے اور نہ مہاتما جی کے صلح کل مشرب پر کوئی ایمان لاتا ہے.....کوئی جے کا نعرہ لگا کر مسلمان کے خون سے اپنی پیاس بجھاتا ہے اور کوئی اللہ اکبر کا اعلان کر کے ہندو پر حملہ کرتا ہے۔۔۔''8

درج بالا اقتباس سے تقسیم ہند کے بعد ہونے والے نتائج کا پورا خاکہ ہوشؔ نے علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ فسادات تو آج بھی ہو رہے ہیں، دونوں قوموں کے درمیان رنجشیں ختم ہونے کے بجائے اور بڑھ رہی ہیں۔ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف کو افسوس ہوتا ہے اور حکومت ہند و پاک سے سوال بھی کرتے ہیں کہ، جو لوگ کہتے تھے آزادی اور تقسیم کے بعد امن قائم ہو جائے گا اور عوام اپنے گھروں میں چین کی نیند سو سکیں گے وہ قائدین کہاں گئے؟ نہ لوگ سکون سے ہیں اور نہ فسادات تھم رہے ہیں، اور نہ ہی آپسی دشمنی ختم ہو رہی ہے تو مجھے کوئی جواب دے کہ پھر ہم کس کی قیادت قبول کریں اور کس پر بھروسہ کریں؟ اس بات نے بھی مصنف کو پریشان کیا کہ جس آزادی کے لوگ خواہش مند تھے وہ مل چکی ہے تو ہنسی خوشی رہنے کے بجائے لوگ ایک دوسرے کے دشمن کیوں بن بیٹھے، کانگریس اور مسلم لیگ جو چاہتے تھے وہ پورا ہوا پھر یہ جان لیوا جھگڑے آئے دن کیوں ہوتے ہیں۔ ہوشؔ اپنے سارے خدشات خود ہی دور کرتے ہیں اور اُن سوالوں کا جواب بھی دیتے ہیں۔ ہندو مسلم تنازعے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

''آئے دن کے یہ جھگڑے بتا رہے ہیں کہ انگریز اس آسانی سے نہیں جا سکے گا۔ تقسیم میں جو صورت اختیار کی گئی، حد بندی میں جس تخریبی سیاست سے کام لیا گیا، وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ انگریزوں نے برادر کشی اور غارت گری کا جو مستقل بیج دونوں قوموں کے دلوں کی کھیتی میں بویا تھا وہ دبے گا نہیں بلکہ نشو نما پاتا ہی رہے گا اور دنیا ہمارے اس غیر انسانی مشغلہ کا تماشا دیکھتی رہے گی اور دنگ ہوتی رہے گی۔ غرض آزادی کی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی اور تقسیم جن اصولوں پر کی گئی ہے وہ نہ معلوم کس کس قسم کے خمیازے بھگتنے پر مجبور کرتی رہے گی۔ اس کے باوجود آزادی و تقسیم سے آپ خوش ہیں اور عالم دنگ ہے۔''9

اس کے علاوہ ہوشؔ نے اپنی خودنوشت میں آصف جاہی فرمانرواؤں کی تفصیلات اور ان کے مشاغل کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ خاص کر میر عثمان علی خاں کا ذکر، ان کے دور میں ہونے والی سیاسی ہلچل کا بیان خوب ملتا ہے۔

آزادی کے بعد نظام کا احوال اور حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے نام پر ہونے والے ظلم وستم کا پورا خاکہ بھی مصنف نے کھینچا ہے۔ اُس ایکشن کی وجوہات، نتائج اور دنیائے اسلام کا دکن کی اسلامی مملکت کے تئیں بے رخی پر بھی بحث کی ہے۔ اتنا ہی نہیں ہوشؔ، غدر کے بعد برصغیر میں مسلمانوں پر ہورہی بربریت اور کشت وخون پر آنسو بھی بہاتے ہیں۔ مسلمانوں کی بے بسی اور ان کے قتل عام پر پوری دنیا کے حکام خاص کر اسلامی ممالک کی خاموشی پر سخت افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کس طرح مختلف اسلامی ممالک جیسے ترکی، افغانستان، عراق اور ایران پر جب مصیبت آئی تو ہندوستان کے مسلمان مدد کے لیے آگے آئے۔ لیکن جب ان پر مصیبت آئی تو سب کے سب تماشائی بنے رہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''ایک ہزار برس سے ہندی مسلمان جہاں آباد ہیں، ان پر ارضی وسماوی بھی آفتیں آئیں۔ 1857 کے غدر میں بھی انگریزوں نے صلیبی انتقام لیے۔ 1947 میں تقسیم ہند پر بھی یہ بھینٹ چڑھے۔ مگر نہ کسی اسلامی ملک کی رگِ اسلامی پھڑکی، نہ دشمنوں کے مقابلہ میں کسی کی تلواریں بے نیام ہوئیں، نہ کسی اسلامی ملک نے اپنے سیاسی تعلقات سے کوئی کام لیا۔ صرف اسلامی ممالک کے چند اخباروں نے اپنی اخباری مقبولیت کے لیے کچھ لکھ دیا اور چند قطرہ سیاہی کے صرف کر کے اپنے نزدیک اسلامی فرض ادا کر دیا۔ مرنے والے مر گئے اور تباہ ہونے والے تباہ ہو گئے۔ اگر اخوت اسلامی کا مفہوم بھی زندہ رہتا تو آج دنیائے اسلام کے اخوتی دبدبہ سے دوسرے ممالک اگر کانپتے نہیں تو اپنے قدم تو ضرور احتیاط سے اُٹھاتے۔''10

تقسیم ہند کے بعد ریاستوں کے الحاق کے تئیں حکومت کی پیش رفت شروع ہوئی تو ہوشؔ بلگرامی چاہتے تھے کہ نواب عثمان علی خان، انڈین یونین کے ساتھ مفاہمت کر لے کیوں کہ اسی میں نظام اور ان کے خاندان کی بقا تھی۔ لیکن دوسرے درباریوں کی پالیسیوں اور مسلم لیگی ذہنیت کے لوگوں کی وجہ سے نواب کو یہ بات سمجھ نہ آئی کہ کیا کرنا چاہیے، جب کہ مصنف حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے سمجھ گئے تھے کہ اگر نظام نے گھٹنے نہیں ٹیکے تو دوسری صورت میں حکومت ہند ایکشن لے گی، جس میں بے قصور مارے جائیں گے اور نہ جانے کتنا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ہوشؔ کا شک 1948 میں پولیس ایکشن کے روپ میں سچ ثابت ہوا۔ انہوں نے دربار کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے سبب ہی پولیس ایکشن سے قبل ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی کیوں کہ نظام حکومت کا زوال ان کے لیے بے حد تکلیف کی بات تھی۔

خیر ان کے الگ ہونے کے بعد نظام باقی لوگوں کی باتوں میں آ گئے۔ دربار سے تعلق رکھنے والوں میں میر عثمان علی خاں کے بے حد قریبی دین یار جنگ اور ہوشؔ ان کے ساتھ دن رات رہا کرتے تھے لیکن دونوں کا ہی عمل و نظریہ یکسر مختلف تھا۔ اول الذکر حیدرآباد کی آزادی کے حق میں تھے اور آخر الذکر کا کہنا تھا کہ حیدرآباد کو بھارت کے آگے گھٹنے ٹیک دینا چاہیے، کیوں کہ اس کی آزادی ممکن نہیں اور دوسری صورت میں حکومت ہند خاموش نہیں بیٹھتی۔ اس تعلق سے ہوشؔ نے خودنوشت میں تفصیل سے لکھا ہے۔ باب ''بہ ہوش باش کہ ہنگاب انقلاب آمد'' کے بعد باقی ابواب میں ان ہنگامی حالات و واقعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے بڑے بے باک انداز میں ان اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے نظام اور حیدرآباد کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ ان کی نظر میں اس انقلاب کا ذمہ دار کون تھا خود ان کے ہی الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

> ''حیدرآباد کو انقلاب میں پھنسانے والے نہ ملکی ہندو تھے اور نہ انڈیا یونین۔ اس میں مبتلا کرنے والی تو لائق علی اینڈ کمپنی کی بزعم خود ایسی 'وفادار جماعت' تھی اور مجاہد اعظم اور ان کے پیرووں کی ایسی مسلم کش کی ٹولی تھی جس نے حیدرآباد کو ہتھیار ڈالنے والا دن دکھایا۔''11

''مشاہدات'' میں ہوشؔ نے تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے حالات، ان کی مایوسیاں اور ہر میدان میں پیچھے رہنے کی وجوہات کے بیان کے ساتھ حل بھی پیش کیے ہیں۔ خودنوشت میں ہندوستان کے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ تم اپنے بل بوتے پر خود محنت کرو، زمانے سے قدم ملا کر چلنے کی ہمت کرو، مصنف مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے امید دلاتے ہیں کہ مایوس ہو کر نہ بیٹھو یا تقدیر پر کف افسوس ملنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا اس لیے آگے بڑھو، تمہیں ہر مشکل میں اپنی مدد آپ ہی کرنی ہے کیوں کہ تمہاری مدد کے لیے کوئی آگے نہیں آنے والا اور نہ ہی کسی دوسرے ملک سے مدد کی توقع رکھنا۔ تم میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جس سے تم باقی اقوام کی طرح کامیاب ہو سکتے ہو۔ مسلمانوں پر پہلے بھی مصیبتیں آئیں لیکن سب نے دیکھا کہ کس طرح پوری دنیا خاموش تماشائی بنی رہی۔ ان تمام پہلوؤں کے علاوہ ہندوستان میں ہونے والے فسادات اور اونچ نیچ پر بھی بحث کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اسی طرح یہاں کی قوم آپس میں لڑتی رہی تو بہت جلد ہندوستان کے نہ جانے اور کتنے ٹکڑے ہوں گے۔ مذہب کی بنیاد پر پاکستان بنایا گیا لیکن اس کے بعد ہندوستان میں جس طرح لسانی جھگڑے سامنے آئے ہیں یوں لگتا ہے کہ اب لسانی اعتبار سے بھی تقسیم ہوگی۔ اس تعلق سے ہوشؔ بلگرامی لکھتے ہیں:

''پاکستان اس لیے بنا کہ ایک مذہب دوسرے مذہب کے ساتھ مساویانہ طریقہ سے نہ رہ سکتا تھا۔مگر اب تو لسانی صوبے بھی بننے والے ہیں مختلف زبانیں بھی ،مختلف مذاہب کی طرح ایک دوسرے کو گوارہ نہیں کر رہی ہیں۔تلنگی مرہٹی کو، بنگالی گجراتی کو، پنجابی گورمکھی کو، ہندی اردو کو اپنے اپنے حدود میں آنے دینا نہیں چاہتیں۔ناگواری اور ناپسندیدگی کا اگر یہی جذبہ کارفرما رہا تو ہندوستان کے دو ہی ٹکڑوں پر اکتفا نہیں کیا جائے گا بلکہ زبانوں کی تعداد اس کے اتنے ٹکڑے کر دے گی کہ جن کا جوڑنا اگر حکومت کے لیے ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جائے گا۔''12

ہوشؔ بلگرامی نے خودنوشت کے آخری ابواب میں تقسیم کے بعد حیدرآباد اور باقی پورے ملک میں پھیلنے والے انتشار،نت نئی لڑائیوں،مختلف مقامات پر ہونے والے فسادات کے علاوہ ملک کی تیزی سے ہونے والی ترقی پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ہوشؔ بلگرامی کی خودنوشت ''مشاہدات'' ایک منفرد کتاب ہے جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ان کی شگفتہ بیانی اور زبان کی روانی نے اس کتاب کو کافی دلکش بنا دیا ہے۔لیکن خودنوشت میں مصنف کا کردار یا ان کی ذاتی زندگی پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آتی۔انہوں نے حیدرآباد اور رام پور ریاستوں کے اتار چڑھاؤ خصوصاً حیدرآبادی نظام کے حالات و واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو کہ خودنوشت کے آدھے حصے پر مشتمل ہے۔اسی طرح مصنف نے جس موضوع پر بھی لکھنا شروع کیا اس پر اپنے اظہار خیال کرنے میں صفحہ کے صفحہ سیاہ کر دیے ہیں چاہے وہ مسئلہ سیاست کا ہو یا مذہب کا،تہذیب وتمدن کا ہو یا پھر معاشی حالات کا،اپنی رائے دیتے ہوئے دور تک چلے جاتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ واقعات کی کڑی جوڑنے میں اس قدر مہارت دکھائی ہے کہ تسلسل میں فرق نہیں پڑتا۔اپنے ہم عصروں کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن اپنے خاندان، بھائی بہن یا والدین کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔بہرکیف اس کی طوالت یا واقعات کے بیان میں مصنف کی رائے قارئین کو بوجھل نہیں کرتی۔کیوں کہ انہوں نے اتنی خوبصورتی کے ساتھ تسلسل برقرار رکھا ہے اور عبارت کو ایسا شاعرانہ رنگ دیا ہے کہ کبھی کبھی کتاب کی بعض سطروں شاعری کا گمان ہوتا ہے۔علاوہ ازیں یہ کتاب ایک تاریخی مرقع بھی ہے کیوں کہ اس میں حیدرآباد نظام اور دربار سے جڑے کچھ لوگوں کے ایسے حقائق بھی سامنے آئے ہیں جس کی تفصیل شاید ہی کہیں دوسری جگہ ملے۔یہ کتاب ایک آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ثابت ہوئی ہے لیکن اپنی تمام خوبیوں وخامیوں کے ساتھ یقیناً یہ خودنوشت ادبی سرمایے میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

حوالہ جات

1۔ ہوشؔ بلگرامی، مشاہدات، انقلاب پریس، حیدرآباد، 1955ء، ص: 3
2۔ ایضاً، دیباچہ، ص: 9
3۔ ایضاً، ص: 5
4۔ ایضاً، ص: 6
5۔ ایضاً، ص: 38
6۔ ایضاً
7۔ ایضاً، ص: 52
8۔ ایضاً، ص: 54
9۔ ایضاً، ص: 56
10۔ ایضاً، ص: 247,248
11۔ ایضاً، ص: 317
12۔ ایضاً، ص: 538,539

دیوان سنگھ مفتوں: ناقابل فراموش

سنہ اشاعت: 1957

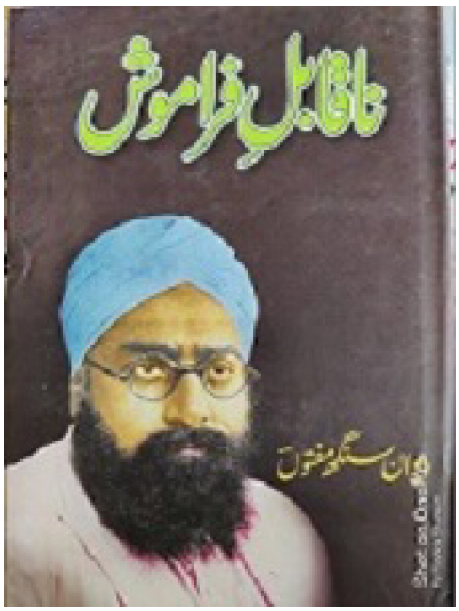

ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتوں)

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو صحافت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان صحافیوں نے اپنے اخباروں سے قوم کے جذبۂ حریت کی ترجمانی کی اور 'انقلاب زندہ باد' کی آندھی سے طاقتور برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ آزادی کی تحریک میں اردو کے جن صحافیوں کے نام سرفہرست ہیں ان میں مولانا آزاد (الہلال والبلاغ)، مولانا حسرت موہانی (اردوئے معلیٰ)، مولانا ظفر علی خاں (زمیندار)، مولانا محمد علی جوہر (ہمدرد)، عبدالماجد دریابادی (صدق جدید) وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ جس شخصیت کا نام اپنی عوامی مقبولیت، حب الوطنی، انسان دوستی، جرأت و ہمت، حق گوئی و بے باکی اور اردو کی تمام آنے والی نسلوں کے لیے ناقابل فراموش ہے وہ تاریخ ساز اردو کے ہفت روزہ ''ریاست'' کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتوں کا ہے۔ ان کا اخبار 'ریاست' نہ صرف قوم پرست تھا بلکہ والیان ریاست کے اس گروہ کے خلاف جہاد کر رہا تھا جو انگریزی حکومت کے غلام تھے۔ یہ لوگ اپنے کرتوتوں اور جرم کو چھپانے کے لیے کسی بھی حد تک جاتے تھے اور اپنی دولت و رسوخ کی بدولت سب کچھ کر گزرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ جب دیوان سنگھ نے اپنے اخبار میں ان کی کالی کرتوتوں کی پول کھولنا شروع کی تو ایڈیٹر پر کئی حملے کیے گئے۔ لیکن تمام پریشانیوں و تکالیف کے باوجود دیوان سنگھ کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ ان کا اخبار ''ریاست'' کچھ ہی دنوں میں نوابوں، جاگیرداروں اور مہاراجوں کی نیندیں اڑانے کا سبب بن گیا تھا۔ دیوان سنگھ کو پیسوں و ملازمت کا لالچ بھی دیا گیا لیکن وہ اپنی سچائی و مقصد پر ڈٹے رہے۔

1924 میں دیوان سنگھ نے دہلی سے اپنا باتصویر ہفتہ وار اخبار ''ریاست'' نکالنا شروع کیا تھا۔ جو اپنے مواد، ہیئت، صورت و سیرت کے لحاظ سے اپنے دور کا کافی معیاری اخبار تھا۔ یہ اخبار مظلوموں کی پناہ گاہ تھا جو کہ سالہا سال نکلتا رہا۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں قصبہ حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ (موجودہ پاکستان) کے ایک معزز کھتری سکھ خاندان میں 1900 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ ان کے پیدا ہونے کے کچھ دن بعد ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے والد کافی روپیہ اور جائداد اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے لیکن رشتہ داروں نے تمام جائداد پر قبضہ کر لیا۔ دیوان سنگھ سے بڑے ایک بھائی اور چار بہنوں کی تعلیم و تربیت پر ان کی ماں نے بہت پیسہ خرچ کیا لیکن کب تک۔ آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ جب دیوان سنگھ 12 سال کے ہوئے تو ان کے گھر فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔ چناں چہ انہوں نے پانچویں جماعت میں ہی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور ایک دکان پر پانچ روپیہ ماہوار ملازمت شروع کر دی۔ اس کے بعد اپنی کوششوں و صلاحیتوں کی بنا پر فیروز پور کے ایک اسپتال میں کمپاؤنڈر ہو گئے۔

بعد ازاں مختلف اسپتالوں میں کمپاؤڈری کرتے کرتے انہوں نے مانسہ میں خود اپنی میڈیکل پریکٹس شروع کر دی اور آنکھوں کا علاج کرنے لگے۔ لیکن ان تمام مصروفیات کے درمیان مطالعے کا شوق بھی جاری رہا۔ مختلف اخبار و رسائل منگا کر پڑھا کرتے تھے اگر خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تو کسی سے مانگ کر پڑھ لیا کرتے تھے۔ مانسہ ہی میں تھے کہ ایشر سنگھ فیروز پوری کے نام سے ان کے کئی مضامین لاہور کے اردو ہفتہ وار ''خالصہ اخبار'' سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد 'خالصہ اخبار' کے مینیجر ڈاکٹر مول سنگھ نے اپنے اخبار میں ملازمت پیش کی تو اپنا بنا بنایا کاروبار ترک کر کے لاہور چلے گئے، یہ ان کے علم و ادب سے محبت کا ثبوت ہے۔ یہیں سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا، اور وہ تاعمر اسی پیشے سے جڑے رہے۔ بعد ازاں دہلی سے اپنا خود کا اخبار ''ریاست'' کے نام سے جاری کیا، جو کہ بہت جلد اپنے منفرد لب ولہجہ و مواد کے سبب مقبول عام ہو گیا۔

''ریاست'' کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت دیوان سنگھ کی وہ تحریریں تھیں جو نا قابل فراموش کے عنوان سے کالم کے روپ میں شائع ہوتی تھیں۔ جس میں نوابوں، راجاؤں، زمینداروں کی بے راہ روی اور انگریزوں کی غلامی کا دم بھرنے والے بدعنوان افسران کے خلاف بڑی جرأت مندی کے ساتھ لکھتے رہے۔ نتیجے میں ان کے دشمن زیادہ بن گئے اور ان پر جھوٹے مقدمات تھوپ دیے گئے لیکن یہ سب مشکلات بھی ان کو سچ بولنے سے باز نہ رکھ سکی۔ ان کی شخصیت میں اعلیٰ ظرفی، منکسر المزاجی، عاجزی، انسان دوستی، رحمدلی، سچائی تمام چیزیں ایک ساتھ پنہاں ہو گئی تھیں۔ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ہی شاعر انقلاب جوشؔ لکھتے ہیں:

> ''میرے مخلص ترین دوست سردار دیوان سنگھ مفتوں ہماری قدیم وضع داری، ہماری قدیم شرافت، ہماری قدیم دریا دلی اور اخلاقی جرأت کی ایک ایسی عظیم یادگار ہیں کہ اگر ہماری قوم اندھی نہ ہو چکی ہوتی تو ان کو اسی احتیاط کے ساتھ رکھا جاتا جس احتیاط کے ساتھ حکومتیں اپنے آثار قدیمہ کو برقرار رکھتی ہیں۔''1

دیوان سنگھ کو اردو سے لگاؤ تھا لیکن اپنی کمزور اردو پر ہمیشہ افسوس کرتے رہے۔ انہوں نے اردو میں اپنی خودنوشت ''نا قابل فراموش'' اور ''جذبات مشرق'' دو کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں۔ آخر الذکر میں ہندوستان کے عظیم صوفیوں، سنتوں اور شعرائے قدیم کی تخلیقات کا تراجم کا انتخاب بھی شامل کیا ہے۔ یہ شہہ پارے بھی ریاست میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں دیوان سنگھ دہلی کے پرشور ماحول سے اکتا کر دہرہ دون کے قریب راجپورہ میں کئی کئی ہفتے قیام کرتے تھے۔ ان کا انتقال 26 جنوری 1957 کی شب دہلی میں ہوا اور 27 جنوری کو دہلی

کے قدیم نگم بودھ گھاٹ پر آخری رسومات ادا کی گئیں۔

جب دیوان سنگھ نواب بھوپال کیس کے تحت 3 ماہ کے لیے ناگپور جیل میں تھے تب وہاں اپنے اخبار ریاست کے لیے مستقل کالم ''جذبات مشرق'' کے لیے ہندی کے بہترین شعرا کے کلام کا ترجمہ کرلیا اور رہائی کے بعد اس نئے اور مستقل کالم کو شروع کر دیا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنے جیل کے ایام کو بھی خالی جانے نہیں دیا اور کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے۔ اسی طرح انبالہ و فیروز پور جیل میں رہتے ہوئے اپنی زندگی کے گزشتہ اہم واقعات کے نوٹس بنا لیے اور رہا ہونے کے بعد مستقل عنوان ''ناقابل فراموش'' قائم کر کے ہر ہفتہ ایک مضمون لکھنا شروع کیا۔ اپنی خودنوشت کا مسودہ انہوں نے جیل میں ہی تیار کیا تھا چناں چہ وہ خودنوشت کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اگر میں جیل نہ جاتا تو یہ کالم شاید کبھی بھی جاری نہ ہوسکتا تھا کیوں کہ جیل سے باہر پچھلے واقعات کو یاد کر کے ان کے متعلق نوٹس لینے کی فرصت ہی نہ تھی۔''2

ناقابل فراموش کے مضامین 3 اپریل 1943 سے ''ریاست'' میں بصورت کالم شائع ہوتے ہی عوام میں بے حد مقبول ہونے لگا۔ اس کی مقبولیت کے بعد 1957 میں دیوان سنگھ نے کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کر دیا۔ یہ کتاب منظر عام پر آنے کے بعد بہت پسند کی گئی۔ اس کتاب پر بڑے سے بڑے ادیبوں نے اپنے بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جب اس کتاب کا نیا ایڈیشن 2015 میں شائع کیا گیا تو ان تمام ادیبوں کے مضامین کو بھی شامل کیا گیا جو مذکورہ خودنوشت اور دیوان سنگھ کے متعلق لکھے گئے تھے۔ راقمہ کے پاس بھی مذکورہ نیا ایڈیشن موجود ہے، جو کہ ایم آر پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا تھا۔ 688 صفحات کی اس خودنوشت میں مختلف مضامین کے چھوٹے چھوٹے عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن سے اس مضمون کے سیاق وسباق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر مضمون کے اختتام پر اس سے حاصل ہونے والا اخلاقی سبق بھی تحریر کیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت اور خودنوشت کے متعلق نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''سردار دیوان سنگھ بڑا سچا دوست، بڑا خطرناک دشمن، نہایت بے باک صحافی، بے خوف و نڈر انسان ہیں اور کم ہی ایسے انسان دیکھے ہیں جو دیوان سنگھ کی طرح صابر وضابط اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے شیر کا سا دل رکھتا ہو۔ یہ کتاب اسی ناقابل فراموش ہستی کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے اور اس قدر دلچسپ ہے کہ کم از کم اس کے مطالعے میں مجھے اتنا ہی لطف آتا ہے جتنا غوث علی شاہ کے 'تذکرہ غوثیہ' کے مطالعے میں۔''3

بقول مولوی عبدالحق:

''ناقابل فراموش ایک ایسی کتاب ہے جس میں ایک ایسے شخص کے تجربوں اور مشاہدوں اور تاثرات کا بیان ہے جو عمر بھر حق کی حمایت میں باطل سے دلیرانہ مقابلہ کرتا رہا اور اس کی بدولت اس نے طرح طرح کی مصیبتیں اور عقوبتیں سہیں۔ اس پر چوری و جعل سازی سازش، کوکین بیچنے، نوٹ بنانے کے عجیب الزامات لگائے گئے، جھوٹے مقدمات چلائے گئے اور اس کی پاداش میں اسے بارہا جیل خانے کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے ایسے ایسے والیان ریاست کا مقابلہ کیا جن کی قوت اور دولت بے حساب تھی اور جنھوں نے بڑوں بڑوں کو نیچا دکھایا تھا۔''4

سردار دیوان سنگھ نہ کبھی کالج گئے، نہ کبھی یونی ورسٹی۔ صرف پانچ جماعت ہی پڑھ پائے تھے کہ حالات سے مجبور ہو کر تعلیم چھوڑ دی۔ لیکن اپنے شوق اور شب و روز کے مطالعہ سے ایسی لیاقت حاصل کی کہ وہ صحافت کے میدان میں صف اول کی فہرست میں آ گئے اور ان کا اخبار اپنی بے لاگ تنقید، آزادئ رائے اور زور بیان کے اعتبار کی وجہ سے ہندوستان کے اہم اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ یہ کامیابی ان کی بے پناہ محنت، کام کی لگن و استقلال کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اپنی خودنوشت میں قارئین سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:

''اردو میری مادری زبان نہیں چناں چہ اس کتاب کے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ زبان کی خامیوں کو نظر انداز کر کے میرے مقصد کو پیش نظر رکھیں..... یہ نہ دیکھئے کہ کس نے لکھا ہے یہ پڑھیے کہ کیا لکھا ہے اور کیا کہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے 'عزت کی قربانی' (جو مرحوم دیوان دیا رام گدومل کے متعلق ہے) وغیرہ مضامین نہ صرف پڑھیں بلکہ ایسی قابل احترام شخصیتوں کے بلند کیریکٹر کی پیروی کی بھی کوشش کریں۔''5

مذکورہ خودنوشت کو اس انداز سے لکھا گی ہے جیسے کسی دوسرے شخص کی زندگی کے شب و روز کو بیان کیا جا رہا ہے یعنی کہ دیوان سنگھ کہیں بھی خود کو براہ راست پیش نہ کر کے ہر جگہ خود کو ایڈیٹر ریاست کے نام سے پیش کیا ہے۔ یہ انداز بھی اس خودنوشت کو منفرد بناتی ہے۔

دیوان سنگھ نے اپنی خودنوشت میں نہ صرف انگریزوں کی غلامی کرنے والے نوابوں، راجاؤں، زمینداروں کا ہی ذکر کیا ہے بلکہ ان کے اور انگریزوں کے ذریعہ عوام پر کیے گئے ظلم وستم کو بھی پیش کیا ہے۔ مختلف مضامین کی صورت میں ان کی خودنوشت میں ایسے بے شمار واقعات ہیں لیکن ان تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ راقمہ نے ان مضامین کو موضوع بحث بنایا ہے، جو مصنف کی شخصیت سے تعلق رکھتا ہو یا جن کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے ''ریاست'' کے ذریعہ جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

1918 میں ہندوستانی سیاست پر گاندھی جی کے آنے کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ جگ ظاہر ہیں۔ گاندھی جی نے مظلوم ہندوستانیوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں کے خلاف آزادی کی آواز بلند کی۔ لوگ ان کی تحریک، سوچ، سادگی وجذبے کو دیکھ کر ساتھ دینے کے لیے آگے آئے۔ 1919 میں ایک ایکٹ پاس کیا گیا جسے رولٹ ایکٹ کا نام دیا گیا اس ایکٹ کے تحت کسی بھی ہندوستانی کو صرف شک وشبہہ کی بنیاد پر گرفتار کیا جا سکتا تھا اور بنا عدالتی مداخلت کے جیل میں رکھنے کا حق حکومت کو تھا، اس ایکٹ کی شدید مخالفت کی گئی۔ گاندھی جی نے عوام سے ملک گیر ہڑتال کرنے اور ہر جگہ بغیر تشدد کے مخالفت میں جلسے منعقد کرنے کا مطالبہ کیا۔ کچھ علاقوں میں یہ ہڑتال کامیاب رہی لیکن پنجاب اور اس کے آس پاس علاقوں میں فسادات شروع ہو گئے۔

گاندھی جی پنجاب میں امن قائم کرنے کے لیے روانہ ہوئے لیکن انہیں راستے میں دہلی کے نزدیک پلول اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری کا علم ہوتے ہی لوگوں میں غصہ بڑھتا گیا، حالات سنورنے کے بجائے اور بگڑ گئے۔ اس کے بعد گاندھی جی کے رضا کار گلی گلی پھرنے لگے جو گاندھی جی زندہ باد کے نارے لگاتے۔ امرتسر، گوجرانوالہ، لاہور وغیرہ بعض دوسرے مقامات میں مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ حکام کی اس بے تدبیری کے سبب عوام کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے۔

ان دنوں دیوان سنگھ لاہور میں مختلف اخباروں کے لیے کام کرتے تھے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد لاہور کے تمام کاروبار ٹھپ پڑ گئے تھے، لوگ اپنی دکانیں بند کر کے جلوس کی شکل میں سڑکوں پر نکل آئے جو گاندھی زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ لاہور کی شاہی مسجد میں گاندھی جی کی گرفتاری کے خلاف جلسہ ہوا تھا جس میں تمام لیڈروں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا، گاندھی جی کی حمایت میں تقریریں کی گئیں اور آزادی کے لیے لوگوں کے جذبوں کو بے دار کیا۔ دیوان سنگھ نے اس جلسے میں بحیثیت رپورٹر شرکت کی تھی۔ عوام اتنی مشتعل تھی کہ جلسے کے دوران ایک رپورٹر کو صرف شک کی بنیاد پر مارنا شروع کر دیا تھا۔ لوگوں کو لگا تھا کہ یہ حکام کا آدمی ہے۔ دیوان سنگھ اس شخص کو جب بچانے کے لیے آگے آئے تو

لوگ ان پر ہی ٹوٹ پڑے، انہوں نے مشکل سے لوگوں کے غصے کو قابو کیا۔ اسی جلسے میں ایک فوجی نما وردی پہنے شخص کو عوام اس لیے گود میں اٹھا کے نعرے لگا رہی تھی کیوں کہ اس نے پاس کی چھاؤنی میں دس سے گیارہ انگریزوں کا قتل کر دیا تھا۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے دیوان سنگھ لکھتے ہیں:

''لوگ دور سے ایک فوجی وردی پہنے ہوئے شخص کو اٹھائے لا رہے ہیں اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں، مجمع میں شور پیدا ہو گیا۔ دریافت کیا گیا کہ کیا معاملہ ہے تو لوگوں نے بتایا کہ جالندھر چھاؤنی کی فوج میں بغاوت ہو گئی ہے اور یہ فوجی نوجوان وہاں سے دس بارہ گوروں کو قتل کر کے بھاگ آیا ہے۔ اس خوشی میں لوگوں نے اسے اٹھا لیا ہے اور نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ تقریریں کرنے والے بعض لیڈر پریشان تھے کہ کہاں مہاتما گاندھی کا عدم تشدد اور کہاں عوام کی یہ سپرٹ، ملک کا کیا حال ہوگا۔ مگر ان لیڈروں کی کون سنتا تھا، لوگ بے قابو ہو رہے تھے۔''6

لاہور میں جلسے سے نکل کر لوگ چوک تک پہنچے جہاں ایک انگریز انسپیکٹر کے روکنے کے بعد بھی لوگ جمع رہے اور نعرے بازی کرتے رہے۔ تب اس انگریز کے حکم سے پولیس نے گولی چلا دی جس میں بے شمار زخمی ہوئے اور دو تین لوگ بلا وجہ مارے گئے۔ دیوان سنگھ اس وقت وہیں موجود تھے، ان تمام واقعات کا آنکھوں دیکھا حال اپنی خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد عوام نے غصے میں آ کر سرکاری عمارتوں اور بینکوں میں لوٹ مار کر آگ لگا دی۔ حالات کو بے قابو ہوتے دیکھ جنرل اوڈوائر نے لاہور اور امرتسر میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ مارشل لا کے بعد لیڈروں کے ساتھ ان لوگوں کو بھی گرفتار کیا گیا جو لاہور کی شاہی مسجد کے جلسے میں شریک تھے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے جن اڑھائی سو اشخاص کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے تھے ان میں دیوان سنگھ کا نام بھی تھا۔ جب ان کو علم ہوا تو انہوں نے دوستوں کے مشورے پر لاہور شہر سے چھپ چھپا کر بڑی مشکل سے اپنے شہر حافظ آباد پہنچے۔ اس مشکل سفر کی روداد کو بھی صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ راستے میں جن لوگوں نے ان کی مدد کی وہ بھی شاملِ کتاب ہیں۔ مارشل لا ختم ہو چکا تھا، کچھ دن حافظ آباد میں رہنے کے بعد دیوان سنگھ لاہور واپس آئے۔ سر مائیکل اوڈوائر کی جگہ کوئی نیا گورنر مقرر ہو گیا تھا۔ مائیکل نے جو ظلم عوام پر کیے تھے اس پر حکومت نادم تھی۔ مارشل لا لگانا بھی وقت کی مجبوری تھی کیوں کہ تباہی و فسادات بڑھتے جا رہے تھے۔ دیوان سنگھ لکھتے ہیں:

''مارشل لا کے اعلان سے پہلے پنجاب کے ہر شہر اور قصبہ میں سیاسی ہیجان و جوش پیدا ہو رہا

تھا، کہیں ریلوے کے تار کاٹے جا رہے ہیں، کہیں سرکاری عمارتیں جل رہی ہیں، کہیں بینک لوٹے جا رہے ہیں اور کہیں انگریزوں و سرکاری ملازموں پر حملے ہو رہے ہیں۔۔۔''7

مارشل لا سے پہلے تباہیوں اور اس کے بعد حکومت کے ذریعہ کیے گئے ظلم کا ذکر عبدالمجید سالک نے بھی اپنی خودنوشت ''سرگزشت'' میں کیا ہے۔ مارشل لا کے بعد لاہور و پنجاب میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں، نہ جانے کتنے لوگوں کو پھانسی کی سزا بھی دی گئی۔ ان گرفتار ہونے والے بے گناہ لوگوں میں دیوان سنگھ کا ایک رشتہ دار بھی تھا جو بغیر کسی جرم کی پاداش میں قید تھا۔ حکومت کی ان سفاکیوں و ظلم کے خلاف لوگوں کا ایک بڑا مجمع امرتسر کے جلیاں والا باغ میں اکٹھا ہوا تھا جہاں جنرل ڈائر نے نہتے لوگوں پر گولیاں چلوا دی تھیں۔ یہ تمام واقعات خودنوشت ''ناقابل فراموش'' میں ملتے ہیں۔

یوں تو دیوان سنگھ کئی بار جیل گئے اور جتنی بار جیل گئے وہاں کے حالات و واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن جب 1942 میں قید ہوئے تو اس وقت بھارت چھوڑو تحریک کے زیر اثر ملک کے بڑے بڑے سیاستدانوں کے ساتھ عام لوگوں کی بھی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ اس وقت دیوان سنگھ دہلی سے گرفتار ہوئے وہاں سے ملتان جیل منتقل کر دیے گئے جہاں سیاسی رہنماؤں سے واسطہ پڑا، اس دوران اپنے جیل کے شب و روز کو بیان کیا ہے۔ وہاں سب ایک ساتھ مل کر نعرے بازی کرتے مثلاً انگریزو بھارت چھوڑو، جیل خانے کو توڑ دو، بغاوت کرو، ہمیں آزاد کرو وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی مختلف جرائم پیشہ قیدیوں کے ذکر کے ساتھ بے گناہ قیدیوں کی بھی روداد پیش کی ہے۔ پورے ملک میں بھارت چھوڑو تحریک کے زیر اثر توڑ پھوڑ جاری تھی، نہ جانے کتنی جانیں قربان ہو گئیں۔ گاندھی جی کے ساتھ تمام بڑے لیڈر رقید کر لیے گئے تھے چناں چہ انگریزوں نے قوم پرست نوجوانوں کو گرفتار کر کے اس تحریک کو کچلنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

اس دوران پاکستان کی مانگ بھی تیز ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ہندو مسلم فساد بھی شروع ہوا اور دونوں قوموں میں دوریاں بڑھتی گئیں۔ اس نے بھی انگریزوں کی کامیابی اور ان کے سالہا سال ہندوستان میں راج کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ بلکہ انہوں نے اپنے ابتدائی دور سے اسی پالیسی کو اپنایا تھا کہ پھوٹ ڈالو اور راج کرو۔ دیوان سنگھ نے ناقابل فراموش میں اپنے کچھ خواب اور اس کی تعبیر کا ذکر کیا ہے جن کا واسطہ حقیقی زندگی سے ہے۔ ایک ایسے ہی خواب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ شمشان بھومی (مردے جلانے کی جگہ) میں ہزار ہا لاشیں پڑی ہیں اور مردے جلائے جا رہے ہیں۔ میں جب جاگا تو اس وحشت ناک خواب کا ذہن پر بہت برا اثر تھا۔ میں نے دفتر میں ایک دو اصحاب سے کہا کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ چناں چہ اس خواب کے دو تین روز بعد ہی دہلی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور لوگ قتل کیے گئے۔''8

پاکستان پر مہر لگنے کے بعد جو نفرت اور غصے کی آگ بھڑک گئی اور اس آگ کے شعلے نے جس طرح لوگوں کو خاکستر کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ دیوان سنگھ نے متعدد ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے فسادات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دہلی میں جب فسادات شروع ہوئے اور دونوں قوموں کے درمیان کشیدگی بڑھی تو ہندوؤں کے علاقوں میں جو مسلم گھرانے تھے اور جن کی تعداد نہ کے برابر تھی، ان کو محفوظ مسلم علاقوں میں پہنچانے کی مہم شروع ہوئی۔ تاکہ کم از کم اُن لوگوں کی جان ہی بچائی جا سکے۔ دیوان سنگھ کے دفتر کے آس پاس ہندوؤں کے مقابلے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ فسادات بڑھنے کے بعد پولیس کے دو کانسٹبل کی نگرانی میں تمام مسلمانوں کو وہاں سے نکال کر محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا۔ ان مسلمانوں کو محض 5 تا 10 منٹ وقت دیا گیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو خالی کر کے ہمارے ساتھ چلیں۔ اندازہ لگائیے کہ اتنے کم وقت میں وہ لوگ اپنے گھروں سے سوائے اپنی جان کے اور کیا لے جا سکتے تھے۔ چناں چہ بہت سے لوگ صرف اس امید پر اپنے گھر کے صدر دروازے پر تالا لگا کر چلے گئے کہ دو چار دن میں واپس آ جائیں گے لیکن وہ کبھی واپس نہیں آ سکے۔ ان جانے والوں میں سے کچھ لوگ اپنے گھروں کی ذمہ داری اور کنجیاں دیوان سنگھ کو دے کر چلے گئے تھے۔

مسلمانوں کے جانے کے دو چار دن بعد اس محلے میں لوٹ مار اور توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ کچھ شر پسند اسی محلے کی ایک مسجد کے سامان کے ساتھ اس کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جن کو دیوان سنگھ نے ڈانٹ پھٹکار کے بھگایا اور مسجد کا سامان جو باہر پڑا تھا اسے اندر رکھ کر تالا لگا دیا۔ پاس میں ہی ایک شرنارتھی یہ سب دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور دیوان سنگھ پر چڑھ آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تم کیسے سکھ ہو وہاں پاکستان میں گرودوارے کو توڑا جا رہا ہے اور آپ یہاں ایک مسجد کو بچا رہے ہیں۔ جس کا جواب انہوں نے یہ کہتے ہوئے دیا کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے جرم کوئی اور کرے اور سزا کسی دوسرے کو دی جائے۔ انہوں نے اسی طرح مسلمانوں کے گھروں کو لٹیروں سے بھی بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ بہر حال اس معاملے نے کافی تول پکڑا لوگ جمع ہو گئے لیکن سب کا سامنا انہوں نے ڈٹ کر کیا۔ لکھتے ہیں:

''اس مسجد سے متعلق میری ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ محلّہ کی کہار کلاس اور دوسرے ادنیٰ قسم کے لوگوں کو جو لوٹ مار پر آمادہ تھے (میرا تجربہ ہے کہ لوٹ مار کرنے والوں میں 90 فیصد لوگ ادنیٰ قسم کے مزدور پیشہ تھے اور دس فیصد دہلی کی بابو کلاس) ان کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ گلی میں میرے موجود ہوتے ہوئے مسلمانوں کے مکانوں کو لوٹتے۔ ویسے وہ دانت پیستے رہتے کہ ان کو لوٹنے کا موقع نہیں مل رہا اور یہ لوگ جب بھی مجھے دیکھتے بڑی ترچھی نظروں سے گویا کہ میں ہندو جاتی کا غدار یا کوئی بڑا مجرم ہوں۔''9

دیوان سنگھ نے اپنے محلے کے ایک فقیر اور معذور بوڑھے کا بھی ذکر کیا جن کو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس محلے میں لوگ مسلمانوں کے گھروں کو لوٹنے سے ڈرتے تھے کیوں کہ ان کو ڈر تھا کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو ایڈیٹر ریاست ہمیں گرفتار کرا دے گا۔ چناں چہ دیوان سنگھ کو قتل اور ان کے دفتر کو آگ لگانے کی کوشش بھی کی گئی مگر پولیس کی مداخلت سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ بعد میں ان کو رام کرنے کے لیے محلے کے بڑے بوڑھوں نے ایک پنچایت بلائی جس میں ان سے درخواست کی گئی کہ آپ سادھو مہاتما بن جایئے یعنی آنکھیں بند رکھیے، جو ہو رہا ہے ہونے دیجیے کسی کو کچھ نہ کہیے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے بطور مخلص اور خیر خواہ کے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں لوٹنے والوں کو نہ روکوں۔ میں نے ان کی اس نصیحت کے بعد ان سے کہا کہ لوٹنا کانگریس اور مہاتما گاندھی کی سپرٹ اور شرافت کے خلاف ہے جس کا جواب انہوں نے یہی دیا کہ لوگ نہ اب مہاتما گاندھی کو جانتے ہیں، نہ کانگریس کو، نہ شرافت کو۔ اب تو ہر شخص آزاد ہے۔ یہ لوگ اس کے بعد چلے گئے اور میں سوچتا رہا کہ جس صورت میں پبلک لوٹ کو ثواب سمجھتی ہے، قتل اور خونریزی دھرم کا ایک حصہ بن چکی ہے، پولیس اپنے فرائض چھوڑ چکی ہے، میں کیا راہ اختیار کروں اور میں کسی کے لیے کیا مفید ہو سکتا ہوں۔ میں دن بھر اس ذہنی کوفت میں مبتلا رہا اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔''10

اس واقعے کے اگلے روز ہی مسلمانوں کے گھروں کے دروازے ٹوٹ رہے تھے، اور لوگ ان کا قیمتی سامان لوٹ کر لے جا رہے تھے۔ کچھ پولیس کے دستے باری باری چکر لگا لیتے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کے گھروں کی

حفاظت کے بجائے ان لٹیروں کا ساتھ دے رہے تھے۔اس پر سے طرہ یہ کہ پولیس والے خود لوٹ کے سامان سے اپنا حصہ لے جا رہے تھے۔دو دن کے اندر تمام گھر لوٹ لیے گئے سوائے ان کے جن کی حفاظت دیوان سنگھ کر رہے تھے۔یہ تمام واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے اور وہ کچھ نہ کر سکے۔لکھتے ہیں:

''اس لوٹ نے دو تین دن کے اندر گلی کے تمام مسلمانوں کے گھر سوائے ان تین مکانوں کے جن کا ایڈیٹر ریاست 'آنریری کسٹوڈین' تھا اور جن کا رات کو پہرا دیا جاتا اور دن کو لوٹنے سے باز رکھنے کے لیے لوٹنے والوں سے بک بک کی جاتی ،صاف کر دیے۔چناں چہ یہ نا قابل فراموش واقعات جب کبھی یاد آ جاتے ہیں،تو سوچتا ہوں کہ میری موجودگی میں محلّہ کے لوگوں کو لوٹ لیا جانا میری بزدلی تھی یا بے بسی۔مہاتما گاندھی کو تمام حالات بتا کر پوچھا جاتا تو یقیناً اسے بزدلی قرار دیتے مگر میں اپنے ذہن کو دھوکہ دینے کے لیے اسے اپنی بے بسی ہی سمجھتا ہوں۔''11

انہوں نے کئی ایسے واقعات پیش کیے ہیں جس میں صرف مذہب کے نام پر لوگوں کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔مذہبی تعصب لوگوں میں اتنا گھر کر گیا تھا کہ جو مسلمان پاکستان کے خلاف تھا اور کانگریس کا ساتھ دے رہا تھا اسے بھی نہیں بخشا جا رہا تھا۔اگر کوئی غیر مسلم اسے یہ کہہ کر بچانے کی کوشش کرتا کہ یہ کانگریسی ہے تو لوگ اسی پر چڑھ دوڑتے تھے اور اسے ہی لعن طعن کرتے تھے۔مذہبی تعصب کے متعلق بھی متعدد واقعات مذکورہ خودنوشت میں شامل ہیں۔جب فسادات تھوڑے کم ہوئے تو کچھ مسلمان اپنے گھروں کو واپس آئے لیکن ان تمام مکانوں کو لوٹ لیا گیا تھا اور وہاں شرنارتھی آ کر بس گئے تھے۔اب ان علاقوں میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا۔دونوں قومیں ایک دوسرے کے محلے میں جانے سے پرہیز کرتی تھیں۔اپنے جان پہچان سے ملنے کی بھی ہمت لوگوں میں نہیں تھی۔دیوان سنگھ بھی اپنے مسلم دوستوں سے ملنے کے لیے پاس کے تھانے میں چلے جاتے اور وہیں اپنے دوستوں کو بلا کر ملاقات کر لیتے کیوں کہ لوگ وہاں محفوظ رہتے تھے۔وہ لکھتے ہیں کہ پورے شہر میں اس سے محفوظ مقام اور کوئی نہیں تھا۔

انہوں نے نہ صرف دونوں قوموں کی دشمنی کو پیش کیا ہے بلکہ کچھ ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جس میں کچھ غیر مسلم نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے مسلم دوست اور ان کے خاندان کو بچایا تھا۔خود دیوان سنگھ اپنے ہی محلے میں تین چار مسلم گھروں کو لوٹ سے بچایا،مسجد کو توڑنے سے روکا،اور نہ جانے کتنے لوگ ان کی مدد سے محفوظ مقام پر پہنچے۔ان ہی واقعات اور اشخاص میں سے اسکول ماسٹر ناہر سنگھ کا ذکر کیا ہے جو کہ کافی سبق آموز ہے۔ناہر سنگھ اپنے گاؤں میں

مسلمانوں کو قتل کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے لیکن اپنے ایک مسلم شاگرد کی بے بسی دیکھ کر ان کا ذہن بدل گیا اور اپنے ارادہ ترک کر دیا۔ اس لڑکے کی جان بچانے کی خاطر اپنے گاؤں والوں سے لڑ پڑے۔ پھر جب اس لڑکے کو مسلم کیمپ میں چھوڑنے گئے تو وہاں کے حالات اور عورتوں و مردوں کی آہ و بقا کو دیکھ کر بہت مغموم ہوئے۔ ماتم کرنے والے مسلمانوں کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا ان کے گھر کے افراد کا بہیمانہ قتل کیا گیا تھا۔ ماسٹر ناہر سنگھ یہ سب دیکھنے کے بعد وہیں تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے گاؤں اور اس کے آس پاس کے دیہات سے مسلمانوں کو بحفاظت کیمپ میں پہنچائیں گے، انہوں نے یہ کام اپنی جان جوکھم میں ڈال کر کیا۔ جب وہ کیمپ پاکستان جانے لگا تو ناہر سنگھ ان سے ملنے بھی گئے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے دیوان سنگھ لکھتے ہیں:

> ''گاؤں کے لوگوں میں ماسٹر ناہر سنگھ کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پیدا ہو گئے کہ انہوں نے ایک مسلمان لڑکے کو پناہ دی ہے۔ آپ نے اپنی کرپان (تلوار) کو میان سے نکال لیا اور گاؤں کے لوگوں کو للکار کر کہا کہ جو شخص اس بچہ پر ہاتھ اٹھائے گا اس تلوار سے اس کو ختم کر دیا جائے گا اور یہ بچہ اگر قتل ہوا تو گاؤں کا ایک بھی شخص زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ ناہر سنگھ کا یہ چیلنج سن کر تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ وہ جب مسلمانوں کے کیمپ پہنچے تو وہاں آپ نے دیکھا کہ مسلمان بہت مغموم ہیں، ان کے عزیز و اقارب قتل کر دیے گئے۔ ان کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ کوئی سامان۔ عورتیں اور بچے ایک قیامت میں مبتلا ہیں اس منظر کو دیکھ کر ناہر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو، آپ دیہات سے مسلمانوں کو نکال کر بچائیں گے۔ آپ نے اس طرح دو ہزار کے قریب مسلمانوں کو اکالیوں کے ہاتھوں سے بچا کر کیمپوں میں پہنچایا۔''12

'ناقابل فراموش' سے پتہ چلتا ہے کہ 1947 میں سکھوں نے ہزارہا مسلمانوں کا قتل کیا تھا۔ کچھ ان میں سے جان لینے کے بجائے مسلمانوں کو محفوظ مقام پر پہنچانے میں اپنی جان کی بازی بھی لگا دی تھی۔ جو شرنارتھی ہندوستان آ رہے تھے ان میں زیادہ تر یہی چاہتے تھے کہ انہیں دہلی میں رہنے کی جگہ مل جائے کیوں کہ دہلی کے تجارتی مرکز ہونے کے باعث مغربی پنجاب کے تاجروں کے لیے دہلی میں کافی کشش تھی۔ یہاں وہ اپنے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تلاش کر سکتے تھے۔ لیکن حکومت کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تمام لوگوں کو دہلی میں منتقل کر دے۔

ناقابل فراموش میں کچھ ایسے شرنارتھیوں کا ذکر ملتا ہے جو مصنف کے پڑوس کے مسلم گھروں میں آ کر آباد ہو گئے

تھے۔ وہ اپنے ساتھ پاکستان سے نقد و زیور بھی لے آئے تھے لیکن جب حکومت کی طرف سے شرنارتھیوں کی مدد کے لیے پیش رفت کی گئی اور ان شرنارتھیوں سے سوال ہوا کہ پاکستان میں کتنی جائداد ہے یا تم اپنے ساتھ کیا لائے تو ان کا یہی جواب ہوتا کہ بدن پر کپڑے کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ جب کہ دیوان سنگھ نے کئی ایسے شرنارتھیوں کے نام گنوائے ہیں جن کے پاس ڈھیروں نقد کے ساتھ زیورات بھی تھے۔ بلکہ ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش کیا ہے، ان کے کوئی رشتہ دار اپنے ساتھ نہ صرف روپے پیسے پاکستان سے لائے بلکہ آم کے اچار کا ایک بڑا ڈبہ بھی ساتھ لے آئے تھے جو کافی عرصے تک کھاتے رہے۔ دیوان سنگھ ان واقعات کو پیش کر کے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ کس طرح لوگ بے حس بھی ہو چکے تھے اور جھوٹ بولنا تو ان دنوں معمولی بات تھی۔

پنجاب یا دوسرے علاقوں سے جو مسلمان ہجرت کر رہے تھے ان کی لڑکیوں کو اغوا کر لیا جاتا یا ان کے گھر والوں کے سامنے ہی زنا بالجبر کیا جاتا، صرف یہی نہیں بلکہ قتل کرنا، ان کے گھروں کو لوٹنا اور آگ لگا دینا ایک عام بات تھی۔ یہ بربرتا ہندو ہو یا مسلمان دونوں نے یکساں کی تھی۔ عصمت ریزی، لوٹ مار، تشدد، ناحق خون بہانا وغیرہ فخریہ کیا جاتا۔ لوگوں کے دلوں میں نفرت کتنی گھر کر گئی تھی اس کا اندازہ خودنوشت کا ایک مضمون ''1947 کا بیت المال'' سے ہوتی ہے کہ کیسے لوگوں کے اندر سے انسانیت اٹھ گئی تھی۔ دیوان سنگھ کا ایک نوکر رن سنگھ جو کہ انبالہ کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، کافی عرصے سے کام کرتا تھا، وہ نیک و شریف اور اپنا کام بڑی دلجمعی کے ساتھ کرتا تھا۔ 1947 کے فسادات چاروں طرف ہو رہے تھے، ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی، ہر کوئی ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ رن سنگھ بھی ان دنوں اپنا کام ٹھیک سے نہیں کرتا تھا، جب دیوان سنگھ نے وجہ پوچھی تو اس نے ایک خط دے دیا جو کہ اس کے گھر سے آیا تھا۔ دیوان سنگھ لکھتے ہیں:

> ''اس نے ایک خط میرے سامنے رکھ دیا جو اس کو اپنے گھر سے پہنچا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ اب تم کو ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً اپنے گھر واپس چلے آؤ۔ مسلمانوں سے لوٹا ہوا مال ہم نے بہت کافی حاصل کر لیا ہے اور بہت کافی تعداد میں خوبصورت سے خوبصورت مسلمان عورتیں بھی موجود ہیں، جتنا مال تم چاہو لے لینا اور اگر عورت کی ضرورت ہوگی تو عورت بھی لے لینا، تم فوراً اپنے گاؤں پہنچ جاؤ۔''13

دیوان سنگھ نے اپنے نوکر کو بہتیرا سمجھایا کہ یہ غلط ہے لیکن وہ نہیں مانا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔ مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح مذہب کے نام پر لوگوں میں نفرت گھر کر گئی تھی، غلط کو بھی صحیح سمجھا جا رہا تھا، دوسروں

کے مال واسباب اور عورتوں پر اپنا حق سمجھنا یہ ان دنوں معمولی بات تھی۔ دیوان سنگھ نے کئی ایسے لوگوں کا نام لیا ہے جنھوں نے تقسیم کے بعد مسلمانوں کے گھروں کو لوٹنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان میں سے تو کچھ ان کے جاننے والے تھے اور جب وہ اس غلط کام کے لیے منع کرتے تو لوگ ان کی بات ماننے کے بجائے ان پر ہی پِل پڑتے۔

اس خودنوشت میں کچھ نہایت دلچسپ، سچے، عنوان کی مناسبت سے ناقابل فراموش واقعات درج ہیں۔ خاص کر والیان ریاست کا اپنی رعایا کے ساتھ دھوکہ دھڑی اور انگریزوں کی غلامی کے قصے ہیں جن کی وجہ سے ان کو کئی بار جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ اس کے علاوہ تقسیم ہند کے بعد انسانیت کا خاتمہ جیسی چیزوں کو مختلف واقعات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ غرض کہ ان کی خودنوشت میں نہ صرف دیوان سنگھ کی شخصیت سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ ان کے عہد کے سیاسی حالات کی بھی جانکاری ملتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ دیوان سنگھ، ناقابل فراموش، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2015ء، ص: 12
2۔ ایضاً، ص: 9
3۔ ایضاً، ص: 17
4۔ ایضاً، ص: 25
5۔ ایضاً، ص: 11
6۔ ایضاً، ص: 210
7۔ ایضاً، ص: 214
8۔ ایضاً، ص: 434
9۔ ایضاً، ص: 460
10۔ ایضاً، ص: 463
11۔ ایضاً، ص: 463
12۔ ایضاً، ص: 501
13۔ ایضاً، ص: 553

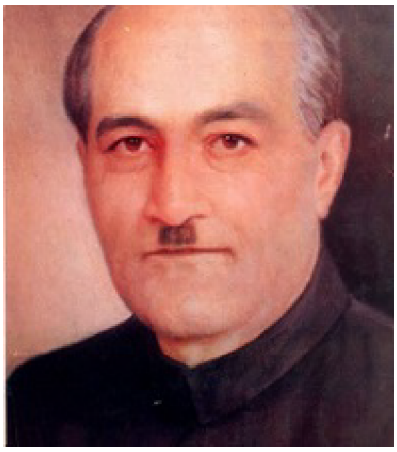

جوشؔ ملیح آبادی: یادوں کی برات

سنہ اشاعت: 1970

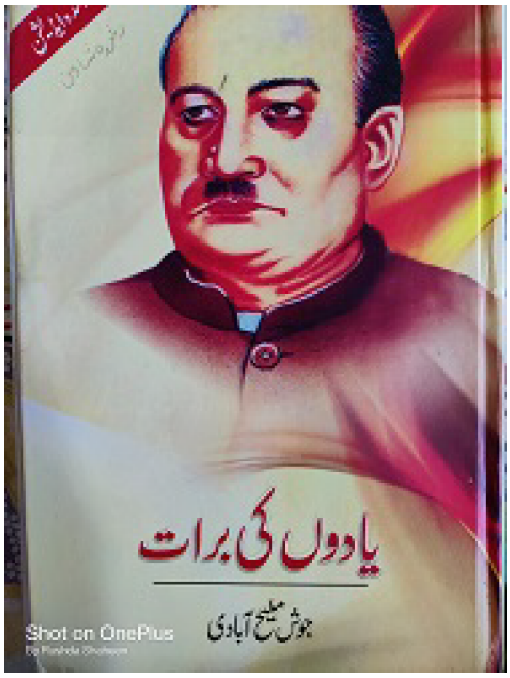

یادوں کی برات (جوشؔ ملیح آبادی)

شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی 5 دسمبر 1896 کو ملیح آباد (اُتر پردیش) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی سنہ پیدائش 1898 بھی بتائی جاتی ہے۔ جوشؔ خود اپنی خودنوشت ''یادوں کی برات'' میں لکھتے ہیں ''میری دادی جان نے جو خاندان کی مورخ تھیں مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سنِ عیسوی کے حساب سے 1896 تھا یا 1898 یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے، اس لیے آپ یہ سمجھ لیں میں 1896 میں پیدا ہوا تھا۔'' کچھ لوگوں نے ان کی تاریخ پیدائش 1898 بھی لکھی ہے۔ لیکن میں یہاں 1896 اس لیے درج کر رہی ہوں کیونکہ مصنف نے خود اسی سال کا اعتراف کیا ہے۔ یہ اردو ادب کے نامور اور قادرالکلام شاعر تھے۔ اصل نام غلام شبیر پھر انہوں نے شبیر احمد خاں رکھ لیا جو بعد میں شبیر حسن خاں ہو گیا، تخلص جوشؔ تھا۔ انہوں نے ایک ایسے خانوادے میں آنکھ کھولی تھی جہاں شاعری کا بول بالا تھا ان کے پر دادا نواب فقیر محمد خاں دیوان شاعر تھے، دادا اور والد بھی شاعری کرتے تھے۔

ان کے خانوادے میں سے کچھ افراد مثلاً ان کے دادا نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ اس طرح ان کو شاعری اور حب الوطنی ورثے میں ملی۔ لیکن جوشؔ صرف اچھے شاعر ہی نہ تھے بلکہ نثر میں بھی مہارت رکھتے تھے ان کی نثر اپنی مثال آپ ہے۔ وہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ میں دس سال تک ملازم رہے۔ لیکن نظام دکن کے خلاف نظم لکھنے کے سبب ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ اس کے بعد دہلی سے رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ بعد ازاں 1948 میں رسالہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر منتخب ہوئے جہاں 1955 تک کام کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے ہجرت کر کے پاکستان کی راہ لی۔ وہاں اردو ترقیاتی بورڈ (کراچی) کے مشیر خاص مقرر ہوئے۔ جوشؔ نے فلمی دنیا میں بھی قدم رکھا تھا جہاں متعدد فلموں کے لیے نغمے لکھے۔ 22 فروری 1982 کو اس عظیم شاعر کا اسلام آباد پاکستان میں انتقال ہو گیا۔

جوشؔ ملیح آبادی متعدد خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ بہ یک وقت شاعر، نثر نگار، صحافی اور مجاہد آزادی تھے۔ ان کے شعری مجموعوں میں روح ادب، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، جنون و حکمت، فرش و عرش، سیف و سبو، الہام و افکار، سموم و سبا وغیرہ ہیں ان کا کچھ کلام غیر مطبوعہ بھی ہے۔ اقبالؔ کے بعد نظم میں جوشؔ کا ہی نام لیا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں تحریک آزادی کا جوش اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کارفرما ہے۔ ان کے نثری کارناموں میں رسالہ 'کلیم' کے مضامین کے علاوہ روح ادب کے حصہ نثر میں شامل انشائیے ان کی نثر نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ ''مقالات زریں، اوراق سحر اور مضامین کا مجموعہ ''اشارات'' بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کی ادبی کارکردگی پر بھارت سرکار نے انہیں

1954 میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا تھا۔

شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی ایک ایسا نام ہے جس نے اپنے قلم کے ذریعے ہندوستانی عوام کے ذہنوں کو جلا بخشی اور آزادیٔ ہند کی لڑائی میں خوابیدہ لوگوں کو بیدار کیا، تاہم خود بھی آزادی کی لڑائی میں پیش پیش رہے۔ جوش کے دادا نے 1857 کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ ان کا خاندان انگریزوں کی غلامی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا جوشؔ میں بھی یہ خودداری پائی جاتی تھی۔ ''یادوں کی برات'' جوشؔ کی خودنوشت ہے یہ ایسی کتاب ہے جس کی اشاعت نے پورے برصغیر میں تہلکہ مچادیا تھا کیوں کہ اس میں کچھ ایسے حقائق کھل کر سامنے آئے تھے جو کچھ لوگوں کو بہت گراں گزرا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس خودنوشت کی وجہ سے جوشؔ کو بہت شہرت ملی تھی لیکن وہیں متنازع واقعات کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بھی بنے۔ یادوں کی برات 1970 میں کراچی، پاکستان سے شائع ہوئی تھی اور ان کا انتقال 1982 میں ہوا یعنی بارہ برسوں تک تنازعات کے شکار رہے۔ جس کی وجہ سے انہیں بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، حکومت کے عتاب کے بھی شکار ہوئے جس کی تفصیل خودنوشت میں ملتی ہے۔ لیکن خودنوشت کے مطالعے کے بعد اس کی خصوصیت اور جاذبیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ شروع تا آخر قاری کھو کر رہ جاتا ہے۔

جوشؔ کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' اپنے انداز بیان کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں شوخی اتنی بڑھ گئی ہے کہ غلو کا شبہ ہوتا ہے۔ اس خودنوشت میں اپنے عہد کی سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی رنگ بہت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں وادی گنگ وجمن اور سرزمین دکن کے قدیم معاشرے کی خوشنما جھلکیاں ملتی ہیں۔ یادوں کی برات جوشؔ کے ستّر سالوں کے تجربے و مشاہدے کی برات ہے۔ بلاشبہ یہ اردو کی بہترین خودنوشتوں میں سے ایک ہے۔ راقمہ کے پاس اس خودنوشت کا اضافہ شدہ ایڈیشن موجود ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے 2018 میں شائع ہوا تھا۔ تقریباً 780 صفحات کی مذکورہ خودنوشت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصے میں مختلف عنوانات کے تحت ذیلی ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کا راج قائم ہو گیا تھا ان کے ظلم وستم بھی بڑھ گئے تھے۔ سب سے زیادہ ان کی نفرت کا شکار مسلم قوم تھی کیوں کہ اس وقت دہلی میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت تھی اور انہوں نے ہی بغاوت کی رہنمائی کی تھی۔ اگرچہ مغل حکومت اپنا دم توڑ چکی تھی اور وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رحم وکرم پر تھی لیکن ہندوستانی عوام اپنے بادشاہ کی عزت کرتے تھے اور ان کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے پر راضی

تھے۔لیکن انگریزوں نے بڑی بے دردی سے اس جنگ آزادی کو کچل کر، غدر کا نام دے دیا۔ ملک کا نظام ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہٹا کر سیدھے برطانوی حکومت سے جوڑ دیا گیا۔

ہندوستان کا کچا مال کم داموں میں وصول کر برطانیہ لے جایا جاتا، جس سے ہندوستان میں غریبی بڑھتی گئی، لوگ بھوکوں مرنے لگے، یہاں کی عوام غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ایسے حالات میں ملک کی عوام انگریزوں کے خلاف ہوتی گئی اور یہ نفرت ختم ہونے کے بجائے بچے بچے کے دلوں میں گھر کر گئی۔اس پر طرّہ یہ کہ انگریزوں نے ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی پالیسی کے تحت ہندو مسلم دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا۔تمام واقعات کا تذکرہ اختصار کے ساتھ اشاروں و کنایوں میں خودنوشت میں موجود ہے۔

جوشؔ کی پیدائش سے قبل ہی انڈین نیشنل کانگریس (1885) وجود میں آ چکی تھی۔ یہ پارٹی اپنے قیام کے بعد ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف جدو جہد کرنا شروع کر دی تھی۔عوام اس پارٹی کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے اور اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔۔جوشؔ ملیح آبادی نے بھی اپنی خودنوشت میں کئی ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے انگریزوں کے لیے ان کی نفرت صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، اسی واقعے نے ان کے دل میں انگریزوں سے نفرت گھر کر گئی تھی۔اپنی بڑی بی کے ساتھ بالائی منزل پر بیٹھے تھے کہ اچانک نیچے سے تڑاق تڑاق کی آواز آئی، بڑی بی نے دیکھا تو ایک انگریز گھوڑے کو چابک سے بے تحاشا مار رہا تھا، اس طرح بے زبان پر ظلم ہوتے دیکھ بڑی بی رونے لگیں جوشؔ کے وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا تو کم سن جوشؔ پر اس کا گہرا اثر ہوا۔وہ کہتے ہیں کہ ''بڑی بی کی بات سن کر مجھے فرنگیوں سے نفرت ہوگئی اور یہی نفرت آگے چل کر میری سیاسی نظموں کے روپ میں سامنے آئیں۔''

انگریز ہندوستان آنے کے بعد یہاں کی تہذیب وتمدن پر حاوی ہونے لگے۔ بہت تیزی سے لوگوں نے ان کی نقل کرنی شروع کر دی۔اپنے گھروں کو مغربی طرز سے سجانا شروع کیا، کھانے کے اقسام بدلنے لگے، پہننے اوڑھنے کا مشرقی ڈھنگ بھی دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا۔غرض کہ انگریز پوری طرح ہندوستان اور ہندوستانیوں پر قابض ہوتے گئے۔ جوشؔ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی خودنوشت میں اس پر بحث کی ہے۔علاوہ ازیں انگریزوں نے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر فرقہ واریت کو بڑھاوا دیا۔اس کے خلاف ہندوستانیوں نے جدو جہد کی لیکن ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔مگر جب گاندھی جی نے ہندوستان کی سیاست میں قدم رکھا تو انگریزوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ برصغیر کی عوام کو یقین ہو گیا تھا کہ اب آزادی دور نہیں ہے۔گاندھی جی عوام کو متحد کرنے میں جی جان سے جٹ گئے اور آزادی کے

لیے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا شروع کیا۔ جوشؔ لکھتے ہیں:

''گاندھی کی آندھی نے حکومت کے اوسان اُڑا دیے۔ حکومت یہ سوچ کر ہاتھ ملنے لگی کہ ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور ہندوؤں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے، پھر بحیثیت مجموعی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا وہ بے کار گیا اور سارے ہندو اور مسلمان مل کر آج ہمارے مقابلے کے واسطے آ گئے۔''1

دراصل گاندھی جی کی کوششوں سے دونوں اقوام نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر آزادی حاصل کرنا ہے تو ہمیں مل کر رہنا ہوگا۔ یہ انگریزوں کے لیے اچھی علامت نہیں تھی۔ پھر اس نے اپنا حربہ استعمال کرنا شروع کیا۔ جن راجاؤں، نوابوں، رئیسوں، زمینداروں، جاگیرداروں وغیرہ کو حکومت پال رہی تھی یعنی کہ جو لوگ انگریز حکومت کے رحم و کرم پر تھے ان کو انگریزوں نے اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا اس طرح وہ لوگ انگریزوں کا ساتھ دینے میں اپنی عافیت جانی۔ محبانِ وطن کو انگریزوں نے گرفتار کرنا شروع کیا، عوام پر ان کے ظلم بڑھنے لگے جس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ جوشؔ ان مظالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اب کیا تھا؟ ہر طرف پکڑ دھکڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جیلیں بھری جانے لگیں، سولیاں کھڑی کر دی گئیں اور ہر جانب سے غُلغُلے بلند ہونے لگے کہ خاک میں ملا کر رکھ دو انگریز بہادر کے غدّاروں کو۔ یہاں تک کہ آگے چل کر جلیاں والے باغ کی زمین خون میں ڈوب گئی اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہونے لگی لاشیں محبانِ وطن کی اور آسمان سے آنے لگیں صدائیں۔۔۔۔''2

1918 میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں جوشؔ نے شرکت کی تھی۔ محمد مستقیم نے ان کو گاندھی جی اور تحریک آزادی کی اہمیت سے آگاہ کیا تھا جس سے متاثر ہو کر انہوں نے احمد آباد جا کر اجلاس میں شرکت کی۔ جہاں ان کی ملاقات کانگریس کے قد آور لیڈروں سے ہوئی۔ وہیں گاندھی جی کو بھی پہلی بار دیکھا تھا ان سے ملاقات کے بعد ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اس اجلاس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا جو اتحاد انہوں نے دیکھا اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

جوشؔ ''کلیم'' میں انگریزوں کے خلاف لکھتے تھے اور اس رسالے کے آخری دور میں انہوں نے پاکستان کی

زبردست حمایت کرنا شروع کر دی تھی، انہوں نے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال کی چھت کے نیچے پاکستان کی حمایت میں ایک نظم پڑھی تھی جس کی وجہ سے ان کے کچھ کانگریسی دوستوں کو بہت شکایت ہوئی، اس طرح ان کے مخالفین کی تعداد بڑھنے لگی۔ ان کو گمنام ناموں سے قتل کی دھمکی بھرے خط ملا کرتے تھے۔ خفیہ پولیس ان کا پیچھا کرتی تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کو سمجھایا کہ انگریزوں کی موافقت میں لکھنا شروع کر دیں تو آپ کو انگریزوں کی طرف سے انعام واعزازات سے نوازا جائے گا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ انہوں نے ایک نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' کے نام سے لکھی تھی جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے جس کی وجہ سے انہوں نے پوری نظم خودنوشت میں شامل کی ہے۔ اس میں جس جوش وخروش اور گھن گرج کے ساتھ انگریزوں کو للکارا گیا ہے وہ قابل دید ہے۔ اس نظم کی تخلیق کا سبب وہ تقریر ہے جس میں حکومت نے اہل ہند سے اپیل کی تھی کہ وہ انسانیت کو بچانے کے لیے جرمنی کے خلاف برطانیہ کا ساتھ دیں۔ یہ سن کر جوشؔ انتہائی غیض وغضب کے عالم میں صرف پندرہ منٹ میں یہ طویل نظم کہہ ڈالی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو ظلم ڈھائے تھے اس کو نظم کے پیرائے میں ڈھالتے ہوئے جوشؔ نے انگریزوں سے سوال کیا ہے کہ تم انسانیت کی بات کر رہے ہو جب ہم پر ظلم کر رہے تھے تو انسانیت کہاں گئی تھی؟ ان کو سوداگروں کے نام سے پکارا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا بھی وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے تم، جب کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے، گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر، موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی؟ تمہارے ہات کی لائی ہوئی

اس نظم کے چھپتے ہی ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عوام الناس جلوس بنا بنا کر گلی گلی اس نظم کو گاتے ہوئے پھرنے لگے۔ جن لوگوں نے بھی یہ نظمیں پڑھیں وہ گرفتار کر لیے گئے لیکن جوشؔ کو گرفتار نہیں کیا گیا کیوں کہ اگر ان کی گرفتاری ہوتی تو وہ سیاست کے میدان میں عملی طور پر شامل ہو کر انقلاب برپا کر دیتے۔ بہرحال یہ برلن ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی تھی۔

اس کے بعد جوشؔ کی نگرانی ہونے لگی۔ان کے گھر کے بغل میں ہی ایک سی آئی ڈی انسپکٹر نگرانی کے واسطے آ کر رہنے لگا تھا۔کچھ دن بعد ایک ہندو انسپکٹر کی نگرانی میں کئی کانسٹیبل ان کے گھر تلاشی کے لیے آ گئے لیکن اس انسپکٹر نے جوشؔ سے کہا کہ ہم بس خانہ پُری کے لیے آئے ہیں آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لیں گے، بلکہ ایسی عمدہ نظم کے لیے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔جوشؔ نے اس مسلم کانسٹیبل کا بھی ذکر کیا ہے جس نے انسپکٹر کی نظریں بچا کر ٹیبل پر رکھی ٹائم پیس اٹھا کر چپکے سے اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔حکومت کی طرف سے اس کارروائی کے بعد جوشؔ نے اس پر بھی ایک نظم کہہ ڈالی۔اس کے بعد انہوں نے ''حسین اور انقلاب'' کے نام سے ایک مسدس لکھی تھی جس میں حسینؑ کے کردار پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی تھی،ان کے ایثار و قربانی کو مدنظر رکھا گیا تھا۔غرض کہ اسی طرح وہ انقلابی نظمیں کہتے رہے اور ہر خاص و عام کے دل میں گھر کرتے رہے۔بلآخر کافی جدو جہد اور مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی اور ملک کو تقسیم کر دیا گیا۔ہندوستان کی آزادی کے بعد گاندھی جی کی جان کو خطرہ بڑھ گیا تھا۔جب گاندھی جی کا قتل ہوا اس وقت جوش ممبئی میں مقیم تھے۔کس طرح پورے ملک میں سراسیمگی پھیل گئی تھی اس کا بھی ذکر کیا ہے۔اسی ممبئی میں رہتے ہوئے انہوں نے آزادی کی خبر بھی سنی اور سڑکوں پر دوستوں کے ساتھ خوشیاں منائی تھی،اور وہیں رہتے ہوئے گاندھی جی کے قتل کی خبر پر ماتم بھی کیا تھا۔لکھتے ہیں:

> ''میں ایک روز شام کے وقت شغل کر رہا تھا کہ بازار میں یکا یک ایک قیامت کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور ہر طرف مارو، مارو، مارو کی آوازیں آنے لگیں۔میں برآمدے میں جا کر جھانکنے لگا کہ دیکھوں معاملہ کیا ہے کہ اتنے میں کسی نے زور زور سے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔میں نے دروازہ کھول دیا،دروازہ کھلتے ہی ایک صورت آشنا ہندو پڑوسی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ کہا،مسٹر جوش! آپ فوراً یہاں سے کسی مسلم محلے میں چلے جائیں۔کسی نے مہاتما گاندھی کو گولی مار دی ہے۔ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے اس لیے فوراً یہاں سے چلے جایئے۔میں اپنے بال بچوں کو لے کر اپنی بیٹی کی سہیلی رفعت کے مکان میں، جو بھنڈی بازار میں تھا، چلا گیا۔وہاں پہنچا تو ریڈیو پر جواہر لعل کا یہ اعلان سُنا کہ مہاتما جی کو ایک ہندو مرہٹے گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔اس اعلان نے مسلمانوں کو قتلِ عام سے بچا لیا۔اگر جواہر اس اعلان میں پانچ منٹ بھی تاخیر کر دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کو تہ و تیغ کر دیا جاتا۔''3

واقعی میں اگر یہ اعلان کرنے میں ذرا بھی تاخیر کی جاتی تو ملک میں فساد برپا ہو جاتا، مسلم دشمنان کو اپنی نفرت کو ظاہر کرنے کا ایک موقع مل جاتا۔ لیکن شکر ہے کہ یہ قتل مسلمان نے نہیں ایک ہندو نے کیا تھا ورنہ ملک سے وفاداری پر جس شک میں آج بھی مسلمان گھرے ہوئے ہیں وہ یقین میں بدل جاتا۔ پاکستان قیام کے بعد جوشؔ کو خیال آتا تھا کہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو وہاں کی حکومت نے ایک ایک کر کے کیوں نہیں بلایا۔ کم سے کم انہیں یہاں اپنی وفاداری کا ثبوت تو نہیں دینا پڑتا۔ ملک کی تقسیم کے بعد مہاجروں اور شرنارتھیوں کو امید تھی کہ ایک دن آئے گا جب نفرت کی ہوا محبت میں بدل جائے گی اور ہم سب اپنے اپنے وطن واپس لوٹ جائیں گے۔ جوشؔ کا بھی یہی خیال تھا کہ نفرت کی عمر زیادہ نہیں ہوتی، چار دن میں یہ تعصّبات ختم ہو جائیں گے اور سوشلسٹ حکومت آ جائے گی پھر ساری تفریقیں فنا ہو کر رہ جائیں گی اور دینی برادری ختم ہو کر انسانی برادری کے دور کا آغاز ہو جائے گا۔ لیکن صد افسوس ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ نفرت کی آگ دن پر دن بھڑکتی جا رہی ہے اور اہلِ سیاست فرقہ پرستی کے نام پر سیاسی روٹیاں سینک رہے ہیں۔

1955 میں جوشؔ پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ اپنے پاکستان جانے کی روداد کو بڑے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے دوست سید ابو طالب نقوی (چیف کمشنر کراچی) کے اسرار پر پاکستان جانے کا قصد کیا تھا۔ اسی سال وہ ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کی غرض سے پاکستان گئے تھے اور تب ہی انہوں نے پاکستان ہجرت کے لیے ہامی بھری تھی۔ دراصل ہندوستان میں پنڈت نہرو ان کے اچھے دوست تھے۔ نقوی صاحب نے جوشؔ کو بتایا کہ پنڈت نہرو کے بعد ہندوستان میں کون ہے جو آپ کی عزت کرے گا۔ آپ ان کی ہی بدولت نوکری کر رہے ہیں اگر وہ نہیں رہے تو نوکری بھی چلی جائے گی۔ اس کے علاوہ اہم مسئلہ آپ کے بچوں کی پرورش کا ہے، وہ اردو سے ایک سرے سے نا بلد ہو جائیں گے۔ جوش پنڈتؔ نہرو کے رہتے پاکستان جانا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے بچوں کی پرورش اور تہذیب و تمدن نے ان کو پاکستان جانے پر مجبور کیا۔ اپنی خودنوشت میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں نے کہا جب تک پنڈت جواہر لعل نہرو زندہ ہیں، میں پاکستان کیوں کر آ سکتا ہوں۔ انہوں نے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا اور نہرو کے بعد کیا ہوگا کبھی سوچا ہے؟.....اگر نہرو صاحب آپ کی زندگی میں ہی سدھار گئے تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا؟ آپ کی یہ نوکری، آپ کی یہ فراغت و عزت کیا ان کے بعد ختم نہیں ہو جائے گی؟ اور تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی فرض کر لیجیے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے رکھے گا، لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ خدانخواستہ آپ کے بعد وہاں آپ

کے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟..... جوش صاحب آپ کے بچے اردو بھول جائیں گے، ہندی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگی۔ وہ آپ کے کلام کا ترجمہ ہندی میں پڑیں گے اور تہذیبی، روایتی اور ثقافتی اعتبار سے آپ کی پوری نسل میں اس قدر زبردست وعبرت ناک تبدیلی پیدا ہو جائے گی کہ آپ سے کسی نوعیت کا بھی تعلق باقی نہیں رہ جائے گا۔''4

نقوی صاحب کی یہ باتیں سن کر جوشؔ بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے کیوں کہ وہ جانتے تھے پنڈت نہرو کبھی ہجرت کی اجازت نہیں دیں گے۔ بہرحال انہوں نے حامی بھرلی، نقوی صاحب نے جہانگیر روڈ پر خالی پڑے پلاٹ کو جوشؔ کے نام کرادیا اور دوسری جگہ پچاس ایکڑ زمین باغ کے لیے ان کے نام کروائی۔ جب تمام کاغذات مکمل ہو گئے تو ہندوستان واپس آکر مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی مشورہ کیا۔ جب جوشؔ کی پریشانیوں اور خدشوں کو سُنا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ آپ پاکستان چلے جائیں۔ چناں چہ جوشؔ نے جواہر لعل نہرو سے بھی رابطہ کیا لیکن انہوں نے کہا کہ آپ اپنے بال بچوں کو پاکستان بھیج دیں اور خود ہندوستان میں رہیں۔ ہر سال آپ چار ماہ کے لیے پاکستان جاسکتے ہیں حکومت خود اس کا خرچ اٹھائے گی۔ جوشؔ یہ تجویز سن کر بہت خوش ہوئے لیکن یہ کہاں ممکن تھا کہ وہ ہندستان میں رہیں اور باقی اہل خانہ پاکستان میں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ پاکستان میں جو زمین جائداد ان کے نام کی گئی تھی وہ سب ان کی شہرت اور عزت کی بدولت کی گئی تھی جب وہی نہیں جاتے تو وہ زمین جائداد کیوں کر حصے میں آتی۔ جوشؔ کافی مشکل میں آگئے اس لیے انہوں نے خود پاکستان جانے کا قصد کرلیا اور وہاں جاکر مقیم ہوگئے۔ لیکن پاکستان جانے کے بعد ان کو کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرے پاکستانی بنتے ہی، یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی، ایک قیامت کا غُلغُلہ برپا ہوگیا، پورے پاکستان میں اور شہر کراچی تو اس قدر بلبلا اٹھا گویا صورِ قیامت پھونک دیا گیا۔ تمام چھوٹے بڑے اردو اور انگیزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک ٹھونک کر میدان جنگ میں آگئے۔ تمام ادباء، شعرا اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹونوں کی بھرمار کردی۔''5

ان کو اعتراض تھا کہ نقوی صاحب نے جوشؔ کو پاکستان میں ایک بڑا حصہ دے دیا جس کی ضرورت نہیں تھی اس طرح ہر کوئی ان کا مخالف ہوگیا۔ جوشؔ کا کہنا ہے کہ میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے۔ بہرحال ان تمام ہنگاموں کی خبر پاکستانی حکومت کے کانوں تک پہنچی تو نقوی صاحب سے

جواب مانگا گیا۔اس زمانے میں چودھری محمد علی وزیر اعظم تھے اور نقوی سے ان کی کھٹ پٹ تھی اس معاملے کے بعد ان کی کمشنری ختم کر دی گئی۔ جوشؔ نے دیکھا کہ نقوی ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں تو انہوں نے باغ اور دوسرے پلاٹ واپس کر دیے اور اس طرح وہ کہیں کے نہیں رہے۔ پریشانیوں کے سبب وہ ہندوستان واپس ہونے کی سوچنے لگے تھے لیکن ان کی غیرت نے اجازی نہیں دی۔

مذکورہ خودنوشت میں انہوں نے پاکستان میں اپنی ناکامیوں کی ایک پوری فہرست دی ہے۔مثلاً ان کے ہاتھ سے پلاٹ لے لیے گئے، تجارت کے لیے آرڈر منسوخ کر دیا گیا، نوکری کرنی چاہی وہ بھی نہیں ملی، کتابوں کی اشاعت کرانی چاہی پر کوئی ناشر تیار نہیں ہوا غرض کہ پاکستان جانا ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا جس کا بڑے تفصیل کے ساتھ انہوں نے خودنوشت میں ذکر کیا ہے۔کافی مشقت کے بعد انہیں انجمن ترقی اردو میں نوکری مل گئی تھی، وہاں شان الحق اور مولوی عبدالحق سے اپنے درمیان تلخیوں کا بھی ذکر کیا ہے، 1967 میں اس نوکری سے بھی برطرف کر دیے گئے ان کا پاسپورٹ لے لیا گیا، سیمنٹ کی ایجنسی بھی ہاتھ سے نکل گئی، ہندوستان میں ان کے جو آموں کے باغ تھے اس سے ملنے والی رقم ریزرو بینک میں جمع تھی جو وہاں نہیں مل سکتی تھی، وہ لکھتے ہیں کہ یہ میرا پانچواں معاشی بحران ہے جس سے گزر رہا ہوں لیکن ناامید نہیں ہوں، ان تمام امر کا تفصیلاً جائزہ لیا ہے۔

انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے سرکاری ملازمت نہیں کریں گے۔ 1967 کے اواخر میں ان کو پاکستان دشمن کا بے بنیاد الزام لگایا گیا تھا۔اس کا ذکر کرتے ہوئے الزام لگانے والوں سے سوالات کیے ہیں، ملاحظہ ہوں:

> ''1967 کے آخر میں میرے خلاف ارادی غلط گوئی یا شدید غلط فہمی کی بنا پر، جو یہ پروپیگنڈہ فرمایا گیا تھا کہ میں پاکستان کا دشمن یا صدر پاکستان کا مخالف ہوں۔ قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تھا۔ حیرت ہے کہ اس موٹی سی بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ میں پاکستان کا دشمن ہوتا تو اپنی دولت، اپنی عزت، اپنی فراغت، اپنے احباب، اپنی بزرگوں کی ہڈیوں سے منھ موڑ کر، اور اپنے ناز برادر جواہر لعل نہرو کا دل توڑ کر یہاں آتا کیوں؟ اگر اس موقع پر کوئی زبوں حال صاحب یہ فرمائیں کہ مجھے دولت کی طمع یہاں کھینچ لے آئی تھی، تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میرے واسطے کس چیز کی کمی تھی کہ میں اس کمی کو پورا کرنے یہاں آتا۔۔۔تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجھ کو طمع کھینچ کر لائی تھی، لیکن

جب نقوی اور سکندر مرزا کے زوال کے بعد، مجھ پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا اور میری
پریشانیوں کا حال سن کر، جب پنڈت جی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پاکستان کو ترک کر کے
ہندوستان آ جاؤں تو اس وقت میں نے ہندوستان جانے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟''6

غرض کہ پاکستان جانے کے بعد جوشؔ زیادہ تر مصائبوں میں گھرے رہے جس پر اپنی خودنوشت میں کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ آخر میں وہ یہی کہتے ہیں کہ میں اس ملک کو اپنا ملک اور ہر اچھے برے انسان کو اپنا سمجھتا ہوں۔ دیکھا جائے تو اتنے بڑے انقلابی شاعر، انگریز دشمن اور ہندوستان کی آزادی کی دلی خواہش رکھنے والے، جس نے آزادی کے بعد اپنی تہذیب وتمدن اور زبان کو بچانے کی غرض سے پاکستان کا رُخ کیا تھا ان کی حالت کیا سے کیا ہو گئی تھی ،وہ بقول جوش کے ''میں کہیں کا نہیں رہا نہ اِدھر کا، نا اُدھر کا۔''

پاکستان کی بنیاد جن اصولوں پر ڈالی گئی تھی اس سے دوری اور مغربی طرز کی طرف بھاگتے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے کہ لوگ اپنے شاندار ماضی کو بھول کر اپنی تہذیب وتمدن کو بالائے طاق رکھ کر مغربی زندگی کو اپنا رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش میں تبدیل ہونا ساتھ ہی پاکستان کی معاشی حالت کا بھی ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ جوشؔ نے اپنی خودنوشت میں اپنی زندگی سے متعلق حالات وواقعات کے ساتھ سماجی وسیاسی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ انگریزوں سے نفرت کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ آزادی کے لیے لوگوں میں انقلاب لانے کے لیے ان کے ذہنوں کو اپنی نظموں کے ذریعے جھنجھوڑا ہے۔ بلاشبہ ان کی خودنوشت ایک نصف عہد کا مرقع ہے۔

حوالہ جات

1۔ جوشؔ ملیح آبادی، یادوں کی برات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2018، ص: 189

2۔ ایضاً، ص: 190

3۔ ایضاً، ص: 268

4۔ ایضاً، ص: 277

5۔ ایضاً، ص: 282

6۔ ایضاً، ص: 298

گوپال متل: لاہور کا جو ذکر کیا

سنہ اشاعت: 1971

لاہور کا جو ذکر کیا (گوپال متل)

گوپال متل کی شناخت شاعر، نقاد، مضمون نگار اور ایک قابل مدیر کی ہے۔ وہ 7 جون 1906 کو مالیر کوٹلہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ جب کہ 11 اگست، 11 جون کو بھی ان کی پیدائش کی تاریخ بتائی گئی ہے۔ محمد عبدالحکیم نے اپنی کتاب ''گوپال متل: ایک مطالعہ'' میں 7 جون 1907 لکھا ہے لیکن 7 جون 1906 ان کی اصل تاریخ پیدائش ہے۔ اس سلسلے میں گوپال متل کے بیٹے پریم متل اپنی مرتب کردہ کتاب ''گوپال متل: ذات وصفات'' میں لکھتے ہیں:

> ''گوپال متل کی ولادت کی تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے جو ان کے لاابالی مزاج کا پیدا کردہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ذہن کسی اہتمام کا تابع نہ تھا اور جب جیسا چاہا یاد آیا وہی لکھ دیا۔ خاندان کے بزرگوں سے بڑی کھوج بین کے بعد جو تاریخ مجھے معتبر تر معلوم ہوئی میں نے وہی نوٹ کر لیا اور کلیات میں اسے درج کر دیا لہٰذا یہی تاریخ معتبر مانی جائے، یہ تاریخ 7 جون 1906 ہے۔''[1]

گوپال متل کے والد لالہ ولایتی رام تجارت پیشہ تھے ان کا خاندان ساہوکاروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ بڑے بھائی نے خاندانی روایت کے مطابق تجارت کو اہمیت دی لیکن گوپال متل کو تعلیم کا شوق تھا اس لیے والد نے بھی ساتھ دیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ سے ہی حاصل کی۔ اس کے بعد نویں جماعت میں تھے کہ لاہور کا رخ کیا۔ متلون مزاجی نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور کچھ عرصے کے بعد دوبارہ مالیر واپس آ گئے۔ جہاں سے ایف اے کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے پھر سے لاہور گئے اور بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد فکر معاش کی تلاش میں لدھیانہ گئے اور وہاں سے ''صبح امید'' کے نام سے ایک ادبی رسالے کی بنیاد رکھی۔ اس رسالے کا ایک ہی شمارہ نکل پایا تھا کہ کچھ وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا۔ اس کے بعد لاہور واپس آ گئے۔ جہاں مولانا تاجور نجیب آبادی کے ادبی پرچے ''شاہکار'' کے بحیثیت مدیر مقرر ہوئے۔ ساتھ ہی ایک فلمی میگزین ''جگت لکشمی'' کے لیے بھی لکھتے رہے۔

تقسیم ہند کے بعد گوپال متل دہلی آ گئے۔ جہاں ''ملاپ'' اور ''تیج'' نامی روزنامہ اخبارات میں بطور صحافی لکھتے رہے۔ 1953 میں انہوں نے اپنا ادبی جریدہ ''تحریک'' جاری کیا جس کی ادارت انہوں نے خود کی۔ ان کی ادارت میں اس رسالے نے اردو کی ادبی صحافت میں اہم کردار ادا کیا۔ رسالہ تحریک کے علاوہ انہوں نے نیشنل اکیڈمی کے نام سے ایک اشاعت گھر بھی قائم کیا تھا۔ جہاں سے ملک اور بیرون ملک کے مصنفین کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ خود کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی لکھا، ساتھ ہی مختلف کلاسیکی ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ بھی

کیا۔شعری مجموعوں میں دوراہا،صحرا میں اذان،شرارنغمہ، سچے بول اور ادب میں ترقی پسندی (تنقیدی کتاب)، پھول اور کانٹے (افسانوی مجموعہ)،لاہور کا جو ذکر کیا (خودنوشت) ان کے قلم کی شاہد ہیں۔گوپال متل 87 سال کی عمر میں 15 اپریل 1993 کو دہلی میں فوت ہو گئے۔

گوپال متل نے شاعری کے ساتھ اچھی تنقید بھی لکھی ہے۔ان کی تحریروں نے نئے نظریاتی مباحث کو قائم کرنے اور پرانے مباحث کو صحیح سیاق میں سمجھنے میں معاون کردار ادا کیا۔ان کو ادبی اور تنقیدی خدمات کے لیے غالب ایوارڈ اور بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔مطالعہ وسیع ہونے کے سبب سماجی وسیاسی علوم کے ساتھ تاریخ پر بھی گہری نظر تھی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا تھا۔ادب کے علاوہ اس شعبے میں بھی امتیازی کامیابی حاصل کی۔وہ ہندوستان کے ان صحافیوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جنہوں نے جنگ آزادی کے دوران اردو صحافت کے ذریعہ عوام کی بیداری میں اہم رول ادا کیا۔وہ 1932 میں صحافت سے منسلک ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب محمد علی جوہر نے اپنے روزنامہ ''ہمدرد'' اور مولانا آزاد نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''الہلال'' کے ذریعے عوام میں عام بیداری کی لہر دوڑا دی تھی۔وہ اشتراکیت کے شدید مخالف اور جمہوریت کے حامی تھے جس کی تائید ان کی خودنوشت سے بھی ہوتی ہے۔ہندوستان میں اردو کی ترقی و بقا کے خواہش مند تھے اور اس سلسلے میں کیے گئے امور میں دلچسپی بھی لیتے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ موجودہ دور میں کوئی زبان صرف اپنی خوبیوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی اسے کچھ قانونی تحفظات بھی چاہیے۔

1971 میں گوپال متل کی خودنوشت 'لاہور کا جو ذکر کیا'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔یادداشتوں پر مبنی یہ کتاب ابتدا میں دہلی کے ادبی پرچے ''تحریک'' میں ''کچھ آپ بیتی و کچھ جگ بیتی'' کے نام سے قسط وار چھپتی رہی، بعد ازاں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔جس میں انہوں نے 1932 کے بعد کی صورت حال کی تصویر کشی کی ہے، ساتھ ہی اپنے نجی حالات وغیر منقسم ہندوستان کا مرقع بھی پیش کیا ہے۔خصوصی طور پر پنجاب میں جدوجہد آزادی کی تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہے۔اس میں اپنے لاہور کے مختلف ہم عصروں کا ذکر کیا ہے۔پروفیسر آزاد گلاٹی لکھتے ہیں:

> ''گوپال متل کی ایک اور اہم تصنیف لاہور کا جو ذکر کیا ہے جو 1932 سے 1947 کے دوران لاہور میں ان کے ادبی وسیاسی تجربوں کا دلکش مرقع ہے۔وہ اپنے قاری کو پنجاب کے ایک بحرانی دور کے سیاسی اور ادبی ماحول کی سیاحت پر ساتھ لے چلتے ہیں۔ذریعہ معاش کی تلاش اور ان کے ذہن کے مخصوص تخلیقی رجحانات نے انہیں اس دور کے لاہور

کے ادبی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں شریک ہونے کے جو مواقع فراہم کیے تھے وہ ان سے جذباتی وابستگی کے باعث ان کا اظہار ایک عجیب نسطالجیہ Nostalgia سے کرتے ہیں۔''2

مذکورہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی و ادبی مصروفیات کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے واقعات اور لاہور کے فسادات کی صحیح و غیر جانب دارانہ تفصیلات پیش کی ہے۔ یہ کتاب ہر قسم کے غلو سے پاک ہے جو ان کی شخصیت اور نظریات کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اپنی خامیوں و کمزوریوں کا بھی بڑی بے باکی سے ذکر کیا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد زندگی سے متعلق ان کے وسیع نقطۂ نظر، ادبی مصروفیات اور ان کے حلقۂ احباب کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

راقمہ کے پاس اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن موجود ہے جو کہ 2012 میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس خودنوشت میں گوپال متل نے اپنے حالات و واقعات کو اتنی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اپنے ہم عصر ادبا و شعرا کا تذکرہ بھی کیا ہے اس کے باوجود بھی کتاب کی طوالت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے اور نہ ہی قاری مطالعہ کرتے ہوئے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ اس میں مختلف ادبی سرگرمیوں، روزمرہ کے حالات و واقعات، صحافت، آزادی ہند، تقسیم ہند اور اس سے ہونے والے ہولناک فسادات کی روداد انتہائی پر اثر و مختصر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ خودنوشت کے متعلق سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

''متل صاحب کے اسلوب کی دلکشی اور دل میں گھر کر لینے والی عبارت کی مثال میں لاہور کا جو ذکر کیا، پیش کی جا سکتی ہے۔ جسے ایک بار پڑھنے پر سیری نہیں ہوتی اور بار بار پڑھتے رہنے کو جی کرتا ہے۔ اس کتاب کے کچھ اقتباسات اتنے دلچسپ ہیں جن سے متل صاحب کی حاضر جوابی، بے باکی، رواداری، غیر متعصب ذہن کی عکاسی بھی ہوتی ہے کہ سچ بات کیا ہے؟ وہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے۔۔۔''3

گوپال متل کا تعلق مالیر کوٹلہ سے تھا، ان کے مزاج اور ذہنی تشکیل میں ابتدائی زندگی کے ماحول کا بڑا اثر تھا۔ وہاں کے ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے، دونوں فرقے ایک دوسرے کے عقائد کا احترام بھی کرتے تھے۔ اس بھائی چارگی کا ذکر انہوں نے خودنوشت میں کیا ہے۔ 1947 کے ہنگامے میں بھی مالیر کی زمین انسانی خون سے آلودہ نہیں ہوئی۔ جو مسلمان اس کی سرحد میں داخل ہو جاتا تھا، فسادی ان کا تعاقب کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں کو بھی

مہاجر کے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ گوپال متل کے دل میں پاکستان کے لیے کوئی نفرت نہیں تھی اور نہ ہی اسے ہندوستان کا حریف سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں پاکستان کی حیثیت ہندوستان کے لیے چھوٹے بھائی جیسی ہے جو کبھی روٹھ جاتا ہے کبھی مان جاتا ہے۔ دونوں ملکوں میں کشیدگی کی وجہ سے لاہور جو کسی زمانے میں ان کے لیے کوئے یار تھا شہر عدو بن گیا۔ لیکن جس طرح قبیلوں میں جنگ ہوتی رہتی ہے اور دوستی بھی ہو جاتی ہے اسی طرح وہ امید رکھتے تھے کہ ایک دن پاکستان سے بھی دوستی ہو جائے گی۔

تقسیم ہند کے بعد پورے ملک میں جو فساد برپا ہوا اس کی جھلکیاں اس خودنوشت میں ملتی ہیں۔ گوپال متل نے لاہور کے ایک علاقے انارکلی کا ذکر کیا ہے جو ابتدا میں فسادات سے محفوظ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے دونوں فرقوں نے آپسی مشورے کے بعد سمجھوتہ کر لیا تھا کہ بازار کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔ چناں چہ جب لاہور کا باقی حصہ جل رہا تھا تب بھی اس علاقے پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ لیکن بعد میں وہاں بھی لوٹ مار و آتش زنی شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں گوپال متل لکھتے ہیں:

> ''ایک دن دوپہر کو میں گھر پر بیٹھا تاش کھیل رہا تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ آتش زنی و لوٹ مار کا سلسلہ انارکلی میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ کچھ غنڈے راجہ برادرز کی دکان کا، جو میرے گھر کے قریب ہی تھا، تالا توڑ رہے تھے اور آگ لگانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان دنوں فائر بریگیڈ اور پولیس کی مدد حاصل کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے یہ یقینی نظر آتا تھا کہ اگر آگ لگ گئی تو سارا بازار جل کر رہ جائے گا۔ لیکن کراکری کی مشہور دکان بیجا میل اینڈ سنس کے مالک کی حکّام رسی آڑے آ گئی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو، جو ایک انگریز تھا، براہ راست ٹیلی فون کر دیا۔ وہ کچھ سپاہیوں کو لے کر جائے واردات پر پہنچا اور اپنے ہاتھ سے مشین گن چلا کر تین فسادیوں کو ہلاک کر دیا۔ باقی بھاگ گئے۔ آگ البتہ لگ چکی تھی۔ بہر حال یہ پھیلی نہیں اور جو واحد دکان جلی وہ کسی ہندو کی نہیں بلکہ مسلمان کی تھی۔''4

ان فسادیوں کی لاشیں لوگوں کی عبرت کی خاطر ایک روز تک بازار میں پڑی رہی۔ اس وقت فساد پھیلانے والے اکثر نچلے طبقے کے پیشہ ور غنڈے تھے۔ جن کو انسانی جان کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ان کی دلچسپی بس معاشرے میں انتشار پھیلانے اور لوٹ مار کرنے میں تھی۔ ایسی ذہنیت والے لوگوں کا ذکر دیوان سنگھ نے بھی اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ ایسے لوگ آج بھی ہمارے معاشرے میں مل جاتے ہیں۔ حالاں کہ انارکلی کو بچانے میں ایک انگریز افسر کی تنہا

بہادری کا دخل تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ یہ فسادات انگریز ہی کرا رہے ہیں۔

انارکلی کے لوگوں کے سمجھوتے کے باعث وہاں خنجر زنی کے اکّا دکّا واقعات چھوڑ کر کوئی بڑا ہنگامہ نہیں ہوا۔ لیکن وہاں کے ہندو برادری سہمے ہوئے تھے کیوں کہ اس سکون کو آنے والے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے۔ انارکلی کے علاقے کے علاوہ پورا شہر جل رہا تھا۔ گوپال متل لکھتے ہیں:

''انارکلی پرسکون ہی سہی لیکن اندرون فصیل قیامت کا عالم تھا اور ہندوؤں کے بازار یکے بعد دیگرے جلائے جا رہے تھے۔ جب تک ہندوؤں کو یہ خیال رہا کہ لاہور ہندوستان میں ہی رہے گا وہ وہاں ڈٹے رہے لیکن جب لاہور کے بارے میں فیصلہ ہو گیا کہ وہ پاکستان میں جائے گا تو ان کے قدم اکھڑ گئے۔ پھر اونچی سطح پر خواہ مضمر طور پر ہی سہی تبادلۂ آبادی کا فیصلہ بھی ہو گیا اور جانے والوں کے لیے سرکاری ٹرک مہیا کر دیے گئے۔ اب ہندوؤں کے وہاں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔''5

گوپال متل نے اپنی خودنوشت میں لاہور کے ان قلندروں کا ذکر کیا ہے جن سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہیں وہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان قلندروں میں ایک باری علیگ تھے جن سے گوپال متل کی نگینہ بیکری میں ملاقات رہتی تھی۔ ان پر فسادات کا صرف اتنا اثر ہوا کہ جب بھی متل بیکری جاتے تو وہ نعرہ لگاتے کہ کافر آیا چھری نکالو۔ لیکن بعد میں یہ نعرہ بند ہو گیا اور ان کو صرف ذمی بنانے کی دھمکی دیتے تھے لیکن کبھی عمل پیرا نہیں ہوئے۔ لاہور سے ہجرت کرنے والے ہندوؤں کو یقین تھا کہ ایک دن آئے گا جب وہ واپس لاہور آئیں گے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔ لیکن وہاں سے صرف ہندو ہی ہجرت نہیں کر رہے تھے بلکہ ہندوستان سے مسلمان بھی وہاں پہنچ رہے تھے۔ لاہور کا پورا نقشہ بدل گیا تھا۔ فسادات منظّم تھے یا خوردرو، اس سلسلے میں جتنی منھ اتنی باتیں تھیں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''فسادات منظّم تھے یا خوردرو، اس سلسلے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ فسادات اس لیے شروع ہوئے کہ امرتسر کے بدمعاشوں نے لاہور کے بدمعاشوں کو چوڑیاں بھیجی تھیں۔ کچھ کہتے تھے کہ فسادات کی تنظیم مسلم لیگی لیڈروں نے کی ہے۔ لیکن بعض یہ بھی کہتے تھے کہ نواب ممدوٹ اور کچھ دوسرے مسلم لیگی مسجد مسجد جا کر امن کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ہی صحیح ہوں۔ شروع شروع میں انہوں نے فساد کو ہوا دی ہو اور جب فسادی حد سے زیادہ تجاوز کر گئے ہوں تو انہیں باز

رکھنے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اگر فساد منظّم ہیں تو اتنی دکانوں اور اتنے مکانوں کو جلایا کیوں جا رہا ہے جو بہر حال پاکستان کا اثاثہ ہے۔''6

آزادی کے بعد حالات بدل گئے، زندگی درہم برہم ہوگئی۔ عام و خاص ہر کوئی اس زد میں آئے۔ ادیب و شاعر بھی نہ بچ سکے۔ خاص طور پر پنجاب کے ان اردو ادیبوں اور شاعروں، جو مشترکہ تہذیب کے علمبردار تھے انہیں بھی ہجرت کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے ان کا رشتہ اپنی پیدائشی سرزمین سے ٹوٹ گیا، دوست جدا ہو گئے، ماحول بدل گیا۔ یان ساری تبدیلیوں نے ان کے ذہن پر گہرا اثر مرتب کیا۔ وہ اپنے ہی وطن میں اجنبی ہو گئے تھے۔ ہجرت کے بعد نئی سرزمین میں خود کو بسانے میں وقت لگ گیا۔ ان جیسے لوگوں میں گوپال متل بھی شامل تھے جنہوں نے ہجرت کر کے دہلی کا رخ کیا اور یہاں اپنی علمی و ادبی سوجھ بوجھ کے بنا پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

تقسیم ہند کے بعد گوپال متل نے بھی کوشش کی کہ وہ لاہور میں ہی رہ جائیں۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ انہوں نے تقسیم کے بعد لاہور میں ہونے والے فسادات پر خصوصی بحث کی ہے۔ 14 اگست 1947 گزر چکا تھا ایک دن وہ نگینہ بیکری (لاہور) میں ناشتہ کر رہے تھے کہ کچھ غنڈہ صورت لوگ اندر داخل ہوئے۔ کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے قتل و غارت گیری کے اپنے کارنامے فاتحانہ انداز میں ایک دوسرے کو بتانے لگے۔ گوپال متل کو وہ لوگ مسلمان سمجھ رہے تھے، جب انہوں نے اپنے ہندو ہونے کا انکشاف کیا تو ان لوگوں کے تیور بدل گئے۔ ان میں سے ایک بولا اگر تم سے پرسوں ملاقات ہوئی ہوتی تو میں تمہیں ضرور قتل کر ڈالتا لیکن اب پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ تم میرے مہمان ہو، میرے گھر چلو، میں تمہاری تواضع کروں گا اور اگر کوئی تم پر انگلی بھی اٹھائے گا تو اس کا سر کاٹ کر پھینک دوں گا۔ یہ کہہ کر اس شخص نے گوپال متل کو پستول کی کچھ گولیاں دکھاتے ہوئے کہنے لگا ''یہ دیکھو! یہ ان میں سے چند گولیاں ہیں جو تمہارے بھائی بندھو ہم پر چلاتے رہے ہیں۔ لوٹ مار اور تشدد کا نشانہ دونوں فرقوں کے لوگ ہوئے تھے۔ صرف ایک فرقے کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

گوپال متل لاہور اور اپنے قلندر دوستوں کو چھوڑنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے مگر 15 اگست کے بعد فسادات نے زور پکڑا اور ان کی نظروں کے سامنے فسادیوں نے ان کے محبوب استاد پروفیسر برج نرائن کو قتل کر ڈالا، جس سے ان کو بڑا دھچکہ لگا اور وہ دل برداشتہ ہو کر لاہور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جب لاہور سے امرتسر کے لیے آخری قافلہ ہندوستان کے لیے روانہ ہوا تو وہ اس میں سوار ہو گئے۔ اس وقت ان کے دل و دماغ کا عجب عالم تھا اپنی کیفیات بیان کرتے ہوئے خودنوشت کے آخر میں لکھتے ہیں:

''ان کی موت میرے لیے زبردست دھچکا تھی۔ وہ میرے استاد تھے اور میرے مزاج کی تشکیل میں ان کا بڑا دخل تھا۔ گھر والے لاہور میں رہنے کے لیے پہلے بھی تیار نہ تھے، اب میرے بھی قدم ڈگمگا گئے اور جب امرتسر جانے والے لاریوں کا آخری قافلہ روانہ ہوا تو اس میں، میں بھی سوار تھا۔ مجھے الوداع کہنے کچھ مسلمان دوست بھی آئے تھے۔ ان میں سے ایک دو کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ایک ہم سفر نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا: سالے پہلے مار مار کر بھگاتے ہیں پھر روتے ہیں۔ مجھے غصہ آ گیا میں نے کہا: بکومت۔ یہ فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکا کہ یہ جھاڑ میں نے اسے ڈالی تھی یا خود اپنے آپ کو، کیوں کہ دل اندر ہی اندر کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میں قلندروں کو جُل دے کر جا رہا ہوں۔ قافلہ امرتسر پہنچا تو وہاں بھی جلے ہوئے مکان نظر پڑے۔ لاہور میں پیشانی پر نورِ شہادت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن یہاں آ کر ندامت کے قطرے ضرور نمودار ہو گئے۔''7

برصغیر کی آزادی بے شمار تباہیوں کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ ہندوستان میں جہاں مسلمان لٹ پٹ رہے تھے وہی رویہ پاکستان میں ہندوؤں کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ہجرت کرنے والے لوگوں کے ذریعہ سنی سنائی واردات پر لوگ مشتعل ہو کر زیادہ قتل وغارت گیری کر رہے تھے۔ بہر حال آج عالم انسانیت کو پیشانی پر نورِ شہادت کی نہیں بلکہ ایسی ہی ندامت کی ضرورت ہے جیسی ندامت گوپال متل کو ہوئی تھی، تاکہ روئے زمین پر اور کہیں بربادی کا ایسا کھیل نہ کھیلا جائے۔

بعض دوسرے لوگوں کی طرح گوپال متل بھی لاہور اور اپنے دوستوں خاص کر ان قلندروں کو نہیں بھول پائے تھے جن کے ساتھ ان کا ملنا جلنا تھا۔ وہ اپنے قلندر دوستوں کو پیچھے چھوڑ تو آئے تھے مگر زندگی بھر ان کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور جب بھی انہیں اپنے کسی ایسے دوست کی یاد آتی، ''تحریک'' میں اس پر ایک خاکہ ضرور لکھتے۔

ہندوستان کے بٹوارے کے بعد گوپال متل پاکستان سے جب ایک مہاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو ان کو بھی دوبارہ بسنے میں کافی وقت لگ گیا۔ یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ ایک بار اجڑنے کے بعد دوبارہ اپنے آپ کو بسانا بہت دشوار اور بڑے دل گردے کا کام ہے۔ انہوں نے اپنی محنت اور سچی لگن کے ساتھ اپنے آپ کو دوبارہ بسایا بھی اور ہندوستان میں اپنی ایک الگ پہچان بھی قائم کی۔ جب مہاجرین کو رہائش کے لیے دہلی کے انصاری مارکیٹ میں سرکاری طور پر فلیٹ الاٹ کیا گیا تو قرعے میں گوپال متل کو نو نمبر کا فلیٹ ملا۔ یہ فلیٹس کم قسطوں میں مہاجروں کو الاٹ ہوئے تھے لیکن اس وقت معاشی پریشانیوں کے سبب اس کی بھی ادائیگی مشکل تھی۔ انہوں نے رسالہ ''تحریک'' کا اجرا وہیں سے

کیا۔ بعد میں ایک پریس بھی قائم کیا اس طرح انہوں نے اپنی محنت سے معاشی پریشانیوں پر قابو پالیا۔

مختصراً گوپال متل نے اپنی خودنوشت ''لاہور کا جو ذکر کیا'' میں ملک کے بٹوارے کے دوران اور بعد میں قیام لاہور میں جو کچھ بھی ان کے ساتھ ہوا، جو کچھ بھی محسوس کیا اور جن جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا، ان سب کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں ہندوستان و پاکستان کی عظیم شخصیتوں کے عادات واطوار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ مشمولہ، گوپال متل: ذات وصفات، مرتب پریم گوپال متل، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2012، ص: 9
2۔ ایضاً، ص: 198
3۔ ایضاً، ص: 190
4۔ گوپال متل، لاہور کا جو ذکر کیا، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2015، ص: 109
5۔ ایضاً، ص: 110
6۔ ایضاً، ص: 111
7۔ ایضاً، ص: 114

بیگم انیس قدوائی: آزادی کی چھاؤں میں

سنہ اشاعت: 1974

آزادی کی چھاؤں میں (بیگم انیس قدوائی)

اردو میں خواتین خودنوشت نگاروں میں ایک اہم نام بیگم انیس قدوائی کا بھی ہے جن کی خودنوشت ''آزادی کی چھاؤں میں'' اردو ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ مصنفہ اردو کے مشہور ادیب، مزاح نگار و انشائیہ نگار ولایت علی بمبوق کی بیٹی تھیں۔ 1906 میں بارہ بنکی میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی مشہور مجاہد آزادی اور سیاسی رہنما رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی شفیع احمد قدوائی سے ہوئی تھی۔ جن کو 1947 کے ہنگامہ خیز دور میں امن و امان کی کوششوں کے دوران مسوری میں 7 اکتوبر کو کچھ شر پسندوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد انیس قدوائی اپنا غم بھلانے اور درد بانٹنے کے لیے دہلی چلی گئیں۔ وہ گاندھی جی سے بہت متاثر تھیں۔ چناں چہ دہلی جانے کے بعد سب سے پہلے گاندھی جی سے ملیں۔ ان سے ملنے کے بعد انیس قدوائی کے صبر کا ضبط ٹوٹ گیا اور ان کے سامنے زار و قطار رو پڑیں۔ ان کے شوہر کی شہادت پر بھی گاندھی جی نے خط کے ذریعہ انہیں دلاسہ دیا اور گہرے دکھ کا اظہار کیا تھا۔ گاندھی جی نے نہ صرف ان کو حوصلہ دیا بلکہ فلاحی کاموں کے لیے بھی آمادہ کیا۔ اس طرح وہ سماجی و سیاسی میدان میں آئیں اور سبھدرا جوشی و مریدولا سارابائی جیسی اہم خواتین کے ساتھ اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا جو تقسیم ملک کا زخم جھیل رہے لوگوں کو راحت پہنچانے، ان کی مدد کرنے اور دوبارہ بسانے کے لیے چلائی گئی تھیں۔

انیس قدوائی نے خدمت خلق کو ہی اپنی زندگی کا شعار بنالیا اور اس سلسلے میں عملی اقدامات بھی اٹھائے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں 1947 کے روح فرسا حالات اور انسانوں کی تباہی و بربادی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر جو محسوس کیا اس پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس وقت کے تمام حالات و واقعات کو بڑی غیر جانب داری اور معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ اپنی خدمات کی وجہ سے وہ عوام الناس میں انیس آپا کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بعد ازاں 1956 تا 1962 کے دوران راجیہ سبھا میں رکن پارلیمان کے عہدے پر بھی فائز ہوئیں۔ ان کی تصنیفات میں خودنوشت ''آزادی کی چھاؤں میں'' کے علاوہ ادبی مضامین کا مجموعہ ''نظرے خوش گزرے'' اور چند اہم شخصیات کے خاکوں پر مبنی کتاب ''اب جن کے دیکھنے کو'' قابل ذکر ہیں۔ ادبی و عملی میدان میں ان کے کارہائے نمایاں کے لیے حکومت ہند کی طرف سے ''ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

چوں کہ یہ خودنوشت مصنفہ کی پوری زندگی کا احاطہ نہیں کرتی اس لیے اسے مکمل خودنوشت کے زمرے میں شامل کرنے کے لیے نقاد شش و پنج میں ہیں۔ انیس قدوائی نے اگر چہ ایک مخصوص عہد، جس میں دو ملکوں کی خونیں داستاں شامل ہے، اُسے تفصیلی بیان کے ساتھ اپنی خوبصورت نثر اور اشعار سے مزین کر کے خودنوشت کو بہت ہی دلکش بنا دیا

ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ خودنوشت میں مصنفہ نے اپنی حالات زندگی کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے بلکہ اپنی ذات کو ان ہی ہنگامہ خیز حالات و واقعات کے تناظر میں پیش کیا ہے۔اگر انہوں نے اپنی حالات زندگی لکھی ہوتی تو ان کی شخصیت کی اور بھی پرتیں ہمارے سامنے کھلتیں۔وہ ایک طویل عرصے تک راجیہ سبھا کی ممبر رہیں اور ان کی سماجی وثقافتی خدمات کا سلسلہ تاعمر جاری رہا،افسوس کہ یہ کتاب ان کوائف سے محروم ہے۔

لیکن'' آزادی کی چھاؤں میں'' ایک ایسی کتاب ہے جس میں ایک خاص عہد میں ہی مصنفہ کی ذات سے واقفیت ہوتی ہے۔ساتھ ہی ان کے شوہر شفیع احمد قدوائی، جیٹھ رفیع احمد قدوائی، گاندھی جی، مولانا آزاد اور سماجی کارکنوں کی شخصیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔اس لیے اسے مکمل خودنوشت نہ سہی لیکن اس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔راقمہ شبانہ سلیم کی مندرجہ ذیل رائے سے مکمل اتفاق کرتی ہے:

> ''بیگم انیس قدوائی کی یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ کے اہم دور پر روشنی ڈالتی ہے اگرچہ اس کتاب میں مصنفہ نے مشکل سے دوسال کے عرصہ کا احاطہ کیا ہے۔مگر یہ دوسال ایک نہیں، موجودہ دوملکوں کی خونیں تاریخ سے وابستہ ہیں۔اس کے ہر ایک منظرنامے میں وہ خود شامل رہی ہیں اس وجہ سے اس دور کی ان کی زندگی کی جھلک بھی ملتی ہے اور یہی جواز ہے کہ اسے خودنوشتوں کی فہرست میں شامل کرنے کا۔''1

ساڑھے تین سو سے زائد صفحات کی اس خودنوشت میں مختلف عنوان دے کر ابواب قائم کیے گئے ہیں۔یہ خودنوشت 1974 میں قومی ایکتا ٹرسٹ، دہلی سے شائع ہوئی۔یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا ہے۔انیس قدوائی 1947 کے بعد پر آشوب دور کی داستان، پناہ گزینوں کے درد وغم اور اپنے تجربات کو ایک کاپی میں نوٹ کرتی رہتی تھیں۔جسے دیکھنے کے بعد لکھنؤ کے ''قومی آواز'' کے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری اور عبادت بریلوی نے ان چیدہ چیدہ تحریروں کو کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کی سفارش کی۔چناں چہ ان دونوں حضرات کے اصرار پر مصنفہ نے'' آزادی کی چھاؤں میں'' مرتب کرنا شروع کیا۔خودنوشت کے دیباچے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان دونوں حضرات کے اصرار اور روز کے تقاضوں سے عاجز آ کر میں نے منتشر اوراق سمیٹے اور ان پر نظر ثانی شروع کی۔اس کتاب کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے انیس قدوائی لکھتی ہیں:

> ''خدا کے لیے زیر نظر کتاب میں علمی کاوشوں اور ادبی موشگافیوں کو نہ ڈھونڈیے۔یہاں آپ کو نہ پختگی اور گیرائی ملے گی، نہ زبان کا چٹخارہ۔یہ گاؤں اور قصبہ کی رہنے والی ایک

ایسی عورت کی تحریر ہے جس کی آنکھیں بند چار دیواری کے اندر کھلیں اور اسی لیے یہ گرد
وپیش سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔''2

اس خودنوشت کا پہلا باب ''کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو'' نام سے ہے جس میں انیس قدوائی نے آزادی کے پہلے یعنی 1946 کے ملک گیر فسادات، تقسیم ہند کے بعد ہونے والی قتل و غارت گری کا ذکر کیا ہے۔ 16 اگست 1946 کو مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی نامنظوری کے بعد پورے ملک میں ''ڈائریکٹ ایکشن ڈے'' کے نام پر ہڑتال کا اعلان کیا۔ کلکتہ کی عوام میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جلسے کے بعد مسلم لیگ کے لوگ کانگریسیوں پر حملہ کر کے ان کی املاک لوٹ لیں گے، اس پر سے طرہ یہ کہ بنگال کے چیف منسٹر حسین شہید سہروردی نے سرکاری تعطیل کا اعلان بھی کر دیا جس سے مزید سراسیمگی پھیل گئی۔

پہلے ہی غیر مسلم تقسیم کے فیصلے سے نالاں تھے، اس لیے کلکتے میں مسلم لیگ کے جلسے کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کی اور کچھ شر پسند اپنے طور پر ہتھیار بھی جمع کرتے رہے۔ جیسے ہی جلسے سے لوگ باہر آئے گلی نکڑ میں چھپے ہتھیار لیس بلوائیوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد پورے شہر میں قتل و غارت گیری بڑے پیمانے پر ہوئی اور دونوں فرقوں نے یکساں درندگی کا ثبوت دیا جس میں ہزاروں افراد مارے گئے۔ اس فساد کی آگ پورے ملک میں پھیل گئی۔ ان فسادات کی تباہیوں کے بعد مسلمان بہت ڈرے ہوئے تھے اس لیے تقسیم ہند پر مہر لگتے ہی لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ ابھی 1946 اور اس کے بعد لگنے والے زخم مندمل بھی نہ ہوئے تھے کہ 15 اگست آزادی کا دن بھی آ گیا اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

اس دوران پورے ملک میں چھوٹے بڑے فسادات ہوتے رہے تھے۔ برطانوی حکومت کے لیے اب ہندوستان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کی حالت خود خستہ تھی چناں چہ جب لیبر پارٹی کی حکومت اقتدار میں آئی تو وزیر اعظم ایٹلی نے اعلان کیا کہ 30 جون 1948 کو ہندوستان آزاد کر دیا جائے گا۔ لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان قیام پاکستان کو لے کر چپقلش نے ملک کو فرقہ وارانہ فسادات کے حوالے کر دیا۔ ان ہنگاموں سے عاجز آ کر ہی جو کام برطانوی حکومت کو دو سال میں کرنا تھا وہ محض ایک سال کے اندر کر کے ر ملک کی تقسیم کے ساتھ ہندوستان کو آزادی دے دی۔ اس آزادی کی خوشی ہندوستانی و پاکستانی عوام نے بڑے جوش و خروش سے منائی لیکن یہ بھی سچ ہے کی اسی دن ملک کے کچھ حصوں میں زبردست قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔

انیس قدوائی نے خودنوشت کا آغاز ان ہی کشت وخون کے واقعات سے کیا ہے۔ انسان اس وقت درندہ بن چکا

تھا، ہندو مسلم ایک دوسرے کے دشمن بنے پھر رہے تھے، درندگی اور نفرت دونوں قوموں کے دلوں میں اس قدر گھر کر گئی تھی کہ ہر طرح کا لحاظ ہی بھول گئے تھے۔ مصنفہ نے خودنوشت کے آغاز میں ہی کچھ ایسے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جو اپنی بربادی وتباہی پر انصاف مانگنے کے بجائے اس میں دلچسپی رکھتے تھے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو کتنا جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنا سرمایہ تک لٹا رہے تھے۔ اس وقت کے حالات اور لوگوں کی ذہنی سوچ کا اندازہ انیس قدوائی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''کتنی درندگی پیدا ہوگئی تھی ان دنوں۔ ایسی ایسی کمزور طبیعت کے لوگ جو ایک پھانس بھی چبھ جاتی تو رو دیتے، دوسروں کی مصیبت پر خوشیاں منا رہے تھے اور تو اور اچھے بھلے تعلیم یافتہ سمجھدار آدمی بھی نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکانے والوں میں شامل تھے۔ میں سوچتی تھی ہائے کیا حال ہوا ہوگا جب بچے ماؤں کی گود سے چھین کر جلتی آگ میں جھونکے گئے ہوں گے، جب بیٹیاں ماں باپ سے چھین کر، بیویاں اپنے شوہروں سے چھڑا کر جبراً تبدیلی مذہب پر مجبور کی گئیں۔ وہ مائیں اور بہنیں جن کے سینے چھلنی ہو چکے تھے، کیا ہندو یا مسلمان بن سکی ہوں گی؟ لعنت ہے ایسے ہندو اور مسلمان بنانے والوں پر!۔۔۔''3

آزادی کے بعد پیدا ہونے والے وحشت ناک ماحول پر انیس قدوائی نہ صرف افسوس کرتی ہیں بلکہ اس سے پہلے ملک کے امن وسکون اور بھائی چارگی کو یاد کر کے آنسو بھی بہاتی ہیں۔ برصغیر میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب سماج میں ہندو ہو یا مسلمان دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ، شادی بیاہ، تہواروں کے موقعے پر شامل ہوتے، ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے، عزت واحترام کے ساتھ پیش آتے، بچے اور عورتیں بلاخوف سڑکوں اور گلیوں میں نکلتے لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہوگئیں اور تقسیم ہند کے بعد تمام انسانی اخلاقیات تو طاق نسیاں ہوگئیں تھیں۔ بچے، عورتیں، جوان، بزرگ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔

تقسیم ہند پر مہر لگنے کے بعد عوام میں کافی بے چینی تھی، ملک کے فسادات نے ان کو بدحواس کر رکھا تھا۔ ان کی یہ بے چینی اور بدحواسی آنے والے وقت کا پیش خیمہ تھی۔ سب سے زیادہ وہ مسلمان پریشان تھے، جو اس دھرتی کو اپنا مان کر اپنا سب کچھ گنوا چکے تھے، تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے بے شمار قربانیاں بھی دیں۔ مسلمانوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو تقسیم کے خلاف تھے اور ہجرت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ جب تقسیم کا فیصلہ ہوا تو ان کو امید تھی کہ تقسیم ہند پر کم سے کم کانگریس نہیں تو گاندھی جی کبھی تیار نہیں ہوں گے اور

یہ سچ بھی ہے کہ گاندھی جی تقسیم کے خلاف تھے۔لیکن ملک کے حالات دیکھنے کے بعد جب انہوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی تو مسلمانوں کی حالت غیر ہوگئی۔ملک میں جس طرح فساد ہو رہے تھے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ایسے ہی لوگوں کے تذکروں میں انیس قدوائی نے اپنی بہن کا ذکر کیا ہے جو گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں اپنے سوالوں کا جواب لینے پہنچ گئی تھیں کہ آپ نے تقسیم کیوں قبول کی؟ یہ زمین کیا ہماری نہیں ہے؟ ہم تو یہیں رہیں گے اور سپرد خاک بھی ہوں گے۔ جب ہم سب ہجرت چاہتے ہی نہیں تو یہ تبادلۂ آبادی اور بٹوارہ کیسا؟ اس وقت عوام اپنے غم و غصے کا اظہار بڑے بڑے لیڈروں کے سامنے کر رہی تھی۔لیکن اب واویلا مچانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

انیس قدوائی نے 15 اگست کی خون میں لتھڑی، بے گناہوں کی چیخوں اور دھوئیں میں لپٹی ہوئی آزادی کو نام نہاد دن سے یاد کیا ہے۔اس دن کی تباہی و بربادی کو دیکھ کر مصنفہ کو آزادی کی خوشی نہیں ہوئی بلکہ وہ بہت پریشان اور مضطرب تھیں۔کم سے کم انہوں نے اس آزادی کا خواب تو نہیں دیکھا تھا جہاں جمہوریت کی جگہ دھرم اور مذہب کی ٹھیکیداری حکومت لے لے۔قتل و غارت گری کا جو بازار آزادی کے دن سے شروع ہوا تو مسلسل کئی ماہ تک چلتا رہا بلکہ آج بھی مختلف شکلوں میں ہنوز جاری و ساری ہے۔اس وقت ملک کی حالت اور سروسامانی کا ذکر کرتے ہوئے انیس قدوائی لکھتی ہیں:

> ''ہندوستان کو آزاد ہوئے ابھی پندرہ دن بھی نہیں بیتے تھے کہ دہلی میں مار دھاڑ شروع ہوگئی۔مکانوں، دکانوں، گلی کوچوں میں لہراتے ہوئے ترنگے جھنڈے ابھی میلے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان پر خون کی چھینٹیں پڑنے لگیں۔انتشار، بدامنی، فتنہ و فساد کا ایک سیلاب تھا جو پنجاب سے چلا آرہا تھا۔ٹیلیفون غائب، ڈاک بند، ریلیں بند، پل ٹوٹے ہوئے اور انسان تھے کہ کیڑے مکوڑوں کی طرح، سڑکوں پر، گلیوں اور میدانوں میں رینگ رہے تھے، مر رہے تھے، کچلے جا رہے تھے، لوٹے جا رہے تھے۔لیکن بھگدڑ تھی کہ خدا کی پناہ۔ادھر سے ادھر خدا کی بے آواز لاٹھی ان کو ہنکا رہی تھی۔کشت و خون کا اتنا بڑا طوفان شاید ہی کبھی ہندوستان کی تاریخ میں آیا ہو۔''4

آزادی کے وقت انیس قدوائی لکھنؤ میں تھیں اور ان کے شوہر دہرہ دون میں کمشنر تھے اور ان کا قیام مسوری میں تھا۔فسادات اور بدامنی جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی اس سے لکھنؤ کسی حد تک محفوظ تھا۔لیکن ماحول میں کشیدگی کی

وجہ سے وہاں کی عوام بھی ڈری ہوئی تھی۔ شہر میں ہندو مسلم دونوں نے مل کر مختلف کمیٹیاں بنائیں جس کے تحت امن وامان قائم کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی گئیں۔ انیس قدوائی کے علاوہ آدا جعفری، ساجدہ زیدی، حمیدہ سالم، آل احمد سرور وغیرہ خودنوشت نگاروں نے بھی اس پرآشوب دور میں لکھنؤ کا فسادات سے بچ جانا اور وہاں کے امن وامان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس وقت لکھنؤ میں ہندو مسلمان دونوں کی متفقہ کوششیں رنگ لائی تھیں اور اس شہر نے اپنی تہذیب وتمدن اور شائستگی کی لاج رکھ لی۔ لیکن پورے ملک کی دل سوز خبریں ہی وہاں کی عوام کا سکون غارت کرنے کے لیے کافی تھیں۔

انیس قدوائی کے شوہر شفیع احمد قدوائی مسوری میں مظلوموں اور بے بسوں کی ہر طرح سے مدد کر رہے تھے اور ماحول میں بہتری لانے کی ہر ممکن کوشش بھی کر رہے تھے۔ وہ بہ ذریعہ خطوط مسوری و دہرہ دون کے حالات سے بیوی کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ انیس قدوائی اور گھر والوں نے ان کو واپس لکھنؤ بلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں پہنچ سکے۔ شفیع احمد کو بلوائیوں اور شر پسندوں کی طرف سے ٹیلوفون یا خطوط کے ذریعے دھمکیاں مل رہی تھیں کہ جتنی جلدی ہو سکے شہر خالی کر دو۔ لیکن ان دھمکیوں سے ڈرے بغیر وہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر کار 7 اکتوبر 1947 کو صبح دفتر جاتے وقت ان ہی شر پسندوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

شفیع احمد کے وہ خطوط جسے انیس قدوائی نے خودنوشت میں بھی بیان کیا ہے ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسوری میں بھی حالات حد درجہ خراب تھے۔ ان حالات میں حکام کی بے پروائی اور عوام کی غنڈہ گردی اور شفیع احمد کا دھمکیوں کے باوجود بھی میدان میں ڈٹے رہنا یہ سب خودنوشت میں موجود ہے۔ انیس نے شوہر کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کی شہادت پر اپنے گہرے دکھ اور جذبات کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے شوہر کے قتل کا بدلہ اس لیے نہیں لیا کہ قاتل کو پکڑوا کر اور پھانسی دلوا کر اس کی بیوی، بچوں اور گھر والوں کو کیوں تکلیف دوں۔ انہوں نے اپنے دکھ کو بانٹنے کے لیے دہلی جانے کا فیصلہ کیا جہاں ہر عورت ان ہی کی طرح پریشان تھی۔

خودنوشت کا دوسرا باب ''شہید اعظم گاندھی جی'' کے نام سے معنون ہے۔ مصنفہ گاندھی جی کی شخصیت سے بہت متاثر تھیں۔ انہوں نے اس باب میں اپنے دہلی کے سفر اور گاندھی جی سے ملاقات کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ دہلی پہنچنے کے بعد جب انیس قدوائی گاندھی جی سے ملیں تو اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکیں۔ گاندھی جی نے ان کو تسلی دی اور پناہ گزینوں کی مدد کے لیے سبھدرا جوشی، سوشیلا جیسی سوشل ورکرس کے پاس بھیج دیا۔ یہ خواتین کیمپوں میں مریضوں کی تیمارداری اور کھانا پہنچانے کا کام کرتی تھیں۔ انیس قدوائی نے بھی اپنا کام بڑی دلجمعی کے ساتھ شروع کیا۔ پناہ گزینوں کے دکھ درد کو دیکھ کر وہ اپنا غم بھول گئیں۔ اسی باب میں مختلف کیمپوں کی خستہ حالت، گاندھی جی کی پریشانی اور

دہلی کی تباہی کا بھی بیان ملتا ہے۔ اس وقت ہر شخص کو گاندھی جی سے ہی امید تھی اس لیے پرارتھنا سبھا میں شرنارتھی و مظلوم مسلمان شامل ہوتے اور اپنے دکھ درد کو گاندھی جی سے بیان کرتے۔ اس سلسلے میں انیس قدوائی کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''کوئی جگہ محفوظ نہ تھی، کوئی دل مطمئن نہ تھا، کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی، محبت کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ ہر طرف نفرت کا بول بالا تھا۔ ادھر مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا، زمین سخت تھی، آسمان دور۔ ادھر پاکستان کے ہندو مصیبت زدہ بے سہارا، بے کس، لٹے پٹے، قافلہ در قافلہ چلے آ رہے تھے۔ نہ کہیں شانتی تھی نہ کہیں سکون۔ ایسے میں صرف مہاتما گاندھی جی کا کمرہ ایک امن اور پناہ کی جگہ تھی۔ جہاں خوف زدہ دکھیارے مسلمان، تباہ حال غم و غصہ کی آگ میں پُھنکتے ہوئے ہندو شرنارتھی..... یہ کمرہ سب ہی کا ٹھکانہ تھا۔ کبھی کبھی ایسا اثر قلب پر ہوتا کہ لوگ رونے لگتے۔ چوٹ کھائے دلوں کو یہاں مرہم بھی ملتا تھا، اور تسکین بھی۔۔۔''5

ملک کے حالات کے متعلق گاندھی جی بار بار حکومت ہند سے سوال کرتے تھے کہ کتنے آدمی مارے گئے، کتنے لوگوں نے ہجرت کی، کتنے ابھی پناہ گزین ہیں اور ان سب کی مدد و حفاظت کے لیے حکومت کیا کیا اقدام اٹھا رہی ہے۔ یہ تمام چیزیں بھی خودنوشت میں موجود ہیں۔ حکومت کی طرف سے گول مول جواب سے اور مسلمانوں و دوسرے لوگوں کی تباہی و بربادی دیکھ کر گاندھی جی نے برت رکھنے کا فیصلہ کیا۔ 12 جنوری 1948 سے انہوں نے اپنا برت شروع کیا۔ مولانا آزاد، حفظ الرحمٰن، پنڈت نہرو وغیرہ بہت سارے لوگ برلا ہاؤس میں جمع تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ گاندھی جی اپنے برت رکھنے کا ارادہ ترک کر دیں لیکن وہ نہیں مانے۔

گاندھی جی اپنے برت توڑنے کی کچھ شرائط وضع کیں جسے حکومت کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان شرائط میں سے پہلی شرط ہی یہی تھی کہ ہندو مسلم میں اتحاد قائم کیا جائے علاوہ ازیں یہ بھی کہا کہ جو بھی مسلمان بے بسی و مجبوری میں ہجرت کر گئے ہیں انہیں واپس بلایا جائے۔ جتنی جلدی ہو سکے ملک کے بگڑتے حالات کو سدھارنے میں عملی اقدام اٹھایا جائے۔ ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں گاندھی جی کے برت اور ان کی شرائط کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب حکومت کی طرف سے گاندھی جی کی باتوں پر عمل کرنے کی منظوری مل گئی تو پانچویں دن یعنی 15 جنوری کو بقول انیس قدوائی مولانا آزاد نے سنترے کا رس پیش کیا اور باپو نے اسے پی کر برت توڑا۔ گاندھی جی

کے برت رکھنے کی خبر نے لوگوں کو حواس باختہ کر دیا تھا اور اپنے اس عظیم باپو کی خاطر فضا میں امن وسکون قائم کرنے کے لیے جی توڑ محنت کرنے لگے۔ انیس قدوائی لکھتی ہیں:

''جس دن برت شروع ہوا، صبح تک شہر کی حالت خراب تھی، مگر آج فضا پر سکون تھی۔ فتنہ کے سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور سورج کی کرن نظر آ رہی تھی۔ دلوں کی سیاہی دور ہو رہی تھی، اور اس کی جگہ اعتماد کی روشنی براجمان ہو رہی تھی۔''6

لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو گاندھی جی کے دشمن بنتے جا رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ گاندھی جی محض مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔ چناں چہ ان پر 20 جنوری 1948 کو پرارتھنا سبھا میں کسی نے بم پھینکا۔ گاندھی جی تو بچ گئے اور ملزم بھی گرفتار ہو گیا لیکن اس حملے نے دشمن کے خوفناک ارادے کو ظاہر کر دیا۔ انیس قدوائی نے خودنوشت میں گاندھی جی سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا ہے بلکہ اپنی آخری ملاقات کا بیان بڑے پر اثر انداز میں کرتی ہیں۔

مذکورہ خودنوشت میں مصنفہ نے دہلی کے مختلف مسلم کیمپوں کی خستہ حالی اور وہاں کی بدانتظامی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ آزادی کے بعد کا زمانہ بڑا پر آشوب تھا، ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ایسے حالات میں دہلی کے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی تھی، کس طرح اپنی جان و مال اور عزت بچانے کی خاطر مختلف کیمپوں میں اپنا سر چھپاتے پھر رہے تھے، اور کس طرح یہ جوان عورتیں سشیلا نائر، مریدولا سارابائی، سبھدرا جوشی اور انیس قدوائی خدمت خلق میں رات دن ایک کیے ہوئے تھیں، ان ہی خونچکا داستان کو انیس قدوائی نے بیان کیا ہے۔ جو کہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ پرانے قلعے کے مسلم کیمپ جہاں بھوک پیاس سے بے حال بڑی تعداد میں پناہ گزین تھے۔ کیمپ کا اسپتال اور وہاں دکھیاری مریضوں کی بھیڑ غرض کہ اس کیمپ کا حال بہت برا تھا جیسا کہ مصنفہ کے درج ذیل اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے:

''انسانوں کا یہ جنگل جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لوگ ہاتھوں میں لے لے کر یا کاغذوں اور ٹھیکروں میں کھانا کھاتے، ٹھیکروں پر مٹی ملے ہوئے آٹے کی سیاہ روٹیاں پکاتے۔ توا، دیگچی اور گلاس سب کا کام پتوں اور مٹکی کے ٹکڑوں سے لیتے تھے۔ دو اینٹیں رکھ کر رفع حاجت کر لیتے اور کبھی کبھی ان ہی دو اینٹوں سے باورچی خانہ بھی تعمیر ہو جاتا۔ ہیضہ، سیکھا، پیچش، بخار غرض کون سی بیماری تھی جو یہاں نہیں پھیلی ہوئی تھی۔ رہی سہی کسر سانپوں نے پوری کر دی، انہوں نے بیسیوں انسانوں کو اس مصیبت کی زندگی سے چھٹکارہ دلا دیا۔ ستمبر میں خدا کا قہر بارش کی صورت میں نازل ہوا۔ لوگ گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں،

آسمان کی چھت کے نیچے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے موت کا انتظار کرنے لگے۔''7

انیس قدوائی نے ''آزادی کی چھاؤں میں'' پرانے قلعے میں اپنی خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔اس کیمپ کے مسلمانوں کا پاکستان ہجرت کرنا،ٹرینوں کے حالات وغیرہ کا بیان بھی موجود ہے۔بعد میں یہ کیمپ ختم کر کے وہاں کے زیادہ تر پناہ گزینوں کو پاکستان بھیج دیا گیا جن میں اکثریت ان کی تھی جو وہاں جانا نہیں چاہتے تھے،بقول انیس قدوائی ''وہ لوگ در و دیوار سے لپٹ کر روتے اور جناح صاحب اور پاکستان کو گالیاں دیتے ٹرینوں میں سوار ہوتے۔'' جو بچ گئے انہیں ہمایوں کے مقبرے والے مسلم کیمپ میں بھیج دیا گیا۔

ہمایوں کے مقبرہ میں خیمے نسب کر کے کیمپ بنائے گئے تھے۔وہاں کی حالت پرانے قلعے کے کیمپ سے کافی بہتر تھی۔انیس قدوائی نے دونوں کیمپوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے درمیان تضادات کو بھی بیان کیا ہے۔دونوں کیمپوں کا احوال تفصیل سے خودنوشت میں موجود ہے۔جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پناہ گزینوں کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔انیس قدوائی لکھتی ہیں کہ ان کیمپوں میں مجھے دہلی کا اعلیٰ طبقہ کہیں نظر نہیں آیا۔لوگوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ بہت پہلے اسپیشل ٹرینوں سے پاکستان جا چکے تھے۔غرض کہ ان کیمپوں میں عوام الناس ہی تھے اور یہی طبقہ ہر طرح کی مشکلات و پریشانیاں جھیل رہا تھا۔

انیس قدوائی کی بیٹی کشور بھی ان کے ساتھ کیمپوں میں خدمت خلق کرتی رہیں۔ان کیمپوں سے جب مسلمانوں کا قافلہ پاکستان جاتا تو ان میں ایسے جوان بھی تھے جو اپنے بڑے بزرگ کو اپنے ساتھ نہ لے جا کر یہیں چھوڑ جاتے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بیماری کا بہانہ کر کے اسپتالوں میں پڑے رہتے۔مصنفہ نے لوگوں کی اس بے حسی کا بیان افسوس کے ساتھ کیا ہے۔انہوں نے دہلی اور آس پاس کے حالات معلوم کرنے کے لیے گشت بھی لگائی تھی۔لیکن یہ دیکھ کر ان کو بہت افسوس ہوا کہ مسلم محلوں سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ چکا تھا،ان کے محلوں میں شرنارتھی آ کر بس چکے تھے۔مصنفہ نے کتاب کے دیباچے میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں جو کہوں گی سچ کہوں گی چناں چہ اس وقت کے حالات بڑی سچائی کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔انیس قدوائی کسی بھی واقعات کو اتنی چابک دستی اور خوبصورت منظر کشی کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ قاری خود کو ان حالات کا حصہ سمجھنے لگتا ہے اور لوگوں کی تکالیف کو محسوس بھی کرتا ہے۔

مذکورہ خودنوشت سے لوگوں کی بے حسی اندازہ بھی ہوتا ہے۔اس کتاب میں بے شمار ایسے کردار ہیں جن کی بے بسی، پریشانی اور دکھ درد کی داستان پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔لاوارث بچے جن کا پورا خاندان فساد اور لوٹ

مار کی نظر ہو گیا اور جن کے پاس اپنی جان کے سوا کچھ بھی نہیں تھا ان بچوں کی نفسیاتی کیفیات کا تذکرہ انیس قدوائی نے بڑے دل سوز انداز میں کیا ہے۔ اسی طرح ان مریضوں کی تفصیل جو فسادات میں زخمی ہوئے، جن میں کسی کے ہاتھ کٹے، کسی کے پیر کٹے ہوئے تھے، خاص کر لیڈی ہارڈنگ اسپتال میں زیر علاج عورتوں اور کم سن بچیوں کی داستان اس وقت کی درندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انیس قدوائی ان اسپتالوں کا چکر لگاتیں اور مریضوں کی ہر ممکن مدد بھی کرتیں۔ اسپتالوں کے مریضوں میں کچھ ایسے کردار پیش کیے گئے ہیں جن پر گزری داستان سن کر دل دہل جاتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک بچی کا ذکر انیس قدوائی نے کیا ہے جس سے اس وقت کی بربریت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

> ''ننھے بچے کو گود میں لیے ایک جوان عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ پاس ہی پلنگ پر اس کی تین سالہ بچی چیخ رہی تھی۔ یہ ننھی سی جان شیر دل سورماؤں کی بربریت کا اس بری طرح شکار ہوئی تھی کہ خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نیزہ اس کے نازک مقام سے گزر کر پیٹ تک پہنچ گیا تھا اور اتنے گہرے زخم میں جب گزوں لانبی دوا میں ڈوبی ہوئی بتی رکھی جاتی تھی تو بچی کی تڑپ اور ماں کے آنسو دیکھنا کسی ذی حس انسان کے بس کی بات نہ تھی۔''8

ایسے ہی دلخراش مناظر اور واقعات سے خودنوشت بھری پڑی ہے۔ مصنفہ نے جہاں لوگوں کی نفرتوں اور کدورتوں کو پیش کیا ہے تو وہیں انسانیت کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے والے کردار بھی موجود ہیں۔ ان بھلے انسانوں میں سے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو بلا تفریق، بغیر مذہبی تعصب کے اسپتالوں میں زخمی مریضوں کی تیمارداری اور پناہ گزینوں کی مدد بھی کرتے تھے۔ جب مصیبت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انسان کے اندر کی حس بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس وقت کیمپ میں رہنے والے لوگوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس دکھ بھرے ماحول میں لوگ خوشی و مسرت کی تلاش کرتے تھے۔ اس حوالے سے انیس قدوائی نے کچھ کرداروں کے ذریعے بڑے دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ کیمپوں میں بچوں کی پیدائش اور لوگوں کی وفات بھی ہوتیں، ان کو غسل دینا اور دفنانا بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اس سلسلے میں مختلف سوشل ورکرس کی کارکردگی کا تذکرہ بھی شاملِ کتاب ہے۔

انیس قدوائی نے اپنی کارکردگی کے درمیان ایک واقعہ بیان کرتی ہیں جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کی لوٹ مار میں اقتدار میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ ایک منظّم گروہ بھی کام کر رہا تھا۔ دسمبر 1947 کے اواخر میں ایک دن سبھدرا نے مصنفہ کو بتایا کہ پاس کے گاؤں میں شرنارتھیوں کا بہت بڑا مجمع بھی پناہ گزین ہے۔ جب

سماجی کارکن وہاں پہنچا تو کچھ اور ہی نظارہ تھا۔ سب کے سب راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے لوگ تھے جو کہ کرتن اور جلسے کر رہے تھے جن کی صدارت پٹیالہ کے مہاراجہ ادھیراج کر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دہلی اور اس کے آس پاس کے فسادات میں پیش پیش تھے۔ اور تو اور ان کو آشیرواد دینے کے لیے حکومت کے ایک ذمہ دار رکن بھی وہاں پہنچے تھے۔ جس کا نام انیس قدوائی نے کتاب میں مخفی رکھا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر مصنفہ کے ساتھ جتنے لوگ بھی گئے تھے سب پریشان ہوئے کہ حکومت کچھ اچھا کرنا چاہتی ہے تو ان کے اہلکار اس میں رخنہ ڈال رہے ہیں۔ جب پنڈت نہرو اور گاندھی جی کو ان تخریبی سرگرمیوں کا علم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے۔ اس وقت گاندھی جی نے افسوس کے ساتھ کہا تھا' لگتا ہے فضا میں امن وشانتی کے لیے مجھے مرنا ہی پڑے گا'۔ ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے انیس قدوائی لکھتی ہیں:

> ''دہلی کا امن پسند طبقہ آج کئی دن سے انگشت بدنداں تھا کہ باپو کی موجودگی میں، کانگریس گورنمنٹ کے ہوتے ہوئے شر پسندوں کی جماعت اس دہلی میں اکٹھی ہو رہی ہے۔ جس میں ابھی چند ماہ پہلے خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں۔ یہ نئی تیاریاں آخر کس لیے ہیں؟ کیا حکومت ابھی تک چونکی نہیں ہے؟ سمجھی نہیں ہے؟ کیا اس کی دوست اور دشمن کو پہچاننے کی طاقت سلب ہو چکی ہے کہ اب ایسے فتنہ پردازوں کو اپنے ساتھ لے کر چلے گی۔۔۔''9

لیکن مصنفہ کے ان سوالوں کا جواب نہ خود ان کے پاس تھا اور نہ کوئی دینا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے جب ماحول میں ایسا زہر گھلا ہو تو حکومت اور اس کے کارندے بھی بے بس نظر آتے ہیں اور سوشل ورکر بھی۔ ان تمام پریشانیوں کے خاتمے اور حالات سازگار کرنے کی خواہش میں ہی گاندھی جی نے مرن برت شروع کیا تھا۔ ایک طرف تو ان کے برت کا اثر ہو رہا تھا مگر دوسری طرف دہلی کی سڑکوں پر ایسی لاریاں بھی گزرتی تھیں جن پر سوار لوگ گاندھی جی کے خلاف نعرے بازی کرتے تھے۔ مثلاً ملاّ گاندھی مردہ باد، محمد گاندھی مردہ باد۔ دہلی کے لال کنویں کے پاس خود مصنفہ نے بھیڑ کو یہ نعرے لگاتے سنا تھا کہ ''مسلمانوں کو نکالو، خون کا بدلہ خون، گاندھی کو مرنے دو وغیرہ۔'' اس وقت بدلے کی آگ میں لوگ جل رہے تھے۔ سرحد پار کا بدلہ یہاں کے مظلوم مسلمانوں سے بڑے دلیرانہ انداز میں لیا جا رہا تھا۔ جس میں ان بلوائیوں کی مدد اقتدار پر قابض لوگ بھی کر رہے تھے۔ مصنفہ نے خودنوشت میں کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد وغیرہ کچھ چاہتے ہیں اور کام کرنے والے لوگ اس کا الٹا کرتے ہیں۔

انیس قدوائی نے دہلی کے آس پاس کے گاؤں و دیہات کا تذکرہ کیا ہے جہاں کے مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر

مجبور کیا جا رہا تھا اور اس کام میں افسران بھی پیش پیش تھے۔ جب اس بات کی خبر پنڈت نہرو کو ہوئی تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ اس بات سے افسردہ تھے کہ میرے سمجھانے کے باوجود بھی مسلمانوں نے دہلی آ کر کیمپوں میں کیوں پناہ لی۔ سبھدرا، مریدولا، انیس قدوائی اور باقی لوگوں سے وجہ بھی جاننی چاہی لیکن ان کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ بقول انیس قدوائی 'ان بے چاروں کو کیا پتہ کہ ان کی جو پالیسی ہوتی ہے، ان کے افسران اس پر عمل ہی کہاں کرتے ہیں۔' بعد میں جب ان گاؤں میں شرنارتھیوں کے ساتھ مقامی ہندوؤں کی بازآبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا تو ان میں سے اکثر لوگوں نے حکومت ہند سے اپیل کی کہ ان کے مسلم پڑوسیوں کو بھی ان کے گھروں کو واپس بھیجا جائے۔ کچھ ہندوؤں نے بذات خود مسلم کیمپوں میں جا کر اپنے جان پہچان والے مسلمانوں کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑے کہ گاؤں واپس چلو، لیکن وہ سب کے سب ناکام رہے۔ اس سلسلے میں انیس قدوائی اور دوسرے لوگوں نے بھی کام کیا لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ لکھتی ہیں:

> ''باپو کے حکم سے جو کام پورا ہوا اس میں کون مین میخ نکالنے والا تھا۔ خود پرائم منسٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب بھی اگر لوگ کیمپ سے پلٹ جائیں تو ان کی سب چیزیں اسی طرح ان کو ملیں گی جیسے ہندوؤں کو مل رہی ہے۔ اب یہ ہمارا کام تھا کہ ان کو واپس کرائیں اور افسوس ہے ہم اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔''10

اس منافرت بھرے ماحول میں اتحاد و ترقی لانے کے لیے حکومت اور مختلف گروپوں کی طرف سے جو بھی اقدام اٹھائے گئے، اس کی بھی تفصیل انیس قدوائی نے بیان کی ہے۔ مثلاً پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا، ہندو مسلم اتحاد، دونوں قوموں کے بچوں کو آپس میں دوستی کرانا، گھریلو کاروبار کی طرف نوجوانوں کو راغب کرنا، لڑکیوں اور عورتوں کی مشغولیت کے لیے مختلف سینٹر قائم کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اس سب سے قطع نظر جس طرح سے مسلمان ملک سے خوف و دہشت میں بھاگ رہے تھے اس سے بھی پورے ملک میں عجیب بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کو روکنے کی حکومت کی ساری کوششیں بے کار جا رہی تھیں کیوں کہ گاؤں و دیہات کے علاقوں کی فضا جنوری 1948 تک کافی مکدور رہی تھی اور مار دھاڑ کی خبریں وہاں سے برابر ملتی رہتی تھیں۔ اس لیے مسلمان خوف و ہراس میں بھاگ کر کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور تھے۔ وہاں پناہ گزینوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ جتنے لوگوں کو پاکستان بھیجا جاتا اس سے دوگنی تعداد میں لوگ ملک کے مختلف حصوں سے کیمپوں میں پہنچ جاتے۔ خوف و دہشت کے اس ماحول میں جہاں حکومت لوگوں سے امن و شانتی بنائے رکھنے کی اپیل کر رہی تھی تو وہیں اس کام

میں والنٹیرس بھی اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔

خودنوشت میں انیس قدوائی نے گاؤں و دیہات کے بگڑتے حالات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ ان ہی میں ایک گاؤں کا ذکر ملتا ہے جہاں کے زیادہ تر مسلمان گوشت اور جانوروں کی کھال کی تجارت کر کے گزر بسر کر رہے تھے۔ لیکن جب فسادات نے چاروں طرف تباہی مچائی تو یہ گاؤں بھی محفوظ نہ رہ سکا اور وہاں کا ہندو طبقہ مذہبی تعصب اور ہندو مسلم دشمنی کے بنا پر جانوروں کی قربانی پر بھی پابندی لگا دی۔ گائے کی قربانی اور گوشت کی تجارت کے شبہ میں دوسرے جانوروں کی کھال اور گوشت کی تجارت کو بھی بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہاں گوشت کے نام پر جو تنازعہ ہوا اس میں چند مسلمانوں کو ہندوؤں نے قتل کر دیا۔ جس سے خوف زدہ ہو کر بقیہ مسلمانوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر ضروری اشیاء لے کر کیمپوں میں پہنچنے لگے۔ انیس قدوائی اور ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں نے گاؤں والوں کو سمجھایا اور مسلمانوں سے ان کے گھر واپس جانے کے لیے منت سماجت کی۔ جب مسلمان اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تو ہندوؤں اور سکھوں نے واویلا مچا دیا۔ وہ چیخ رہے تھے کہ پاکستان میں ہمارے آدمیوں اور عورتوں و بچوں کو مارا گیا ہے ہم اپنا بدلہ لے کر رہیں گے۔ سبھدرا اور انیس قدوائی نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی اور ان کے وقتی غصے اور جذبے کو ملک و قوم کی ترقی کے لیے مضر بتایا۔ بڑی مشکلوں کے بعد ان میں سے چند پڑھے لکھے لوگ آگے آئے اور باقی لوگوں کے غصے کو قابو کیا۔ اس وقت ان دو خواتین نے جس بہادری کا مظاہرہ کیا تھا، اس کو مصنفہ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

گاندھی جی کے برت کے دوران ملک میں امن و امان قائم کرنے کے لیے بچوں نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ جو مختلف جگہوں پر تانگوں، لاریوں پر سوار ہو کر باپو کو بچاؤ، ہندو مسلم بھائی بھائی، ہندو مسلم ایک ہو جاؤ جیسے نعرے لگاتے۔ انیس قدوائی بچوں کے اس حوصلے اور کارکردگی کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''بچوں کا کارنامہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ دہلی کی سرزمین پر جب شانتی، محبت اور سچائی کا وجود باقی نہیں رہ گیا تو باپو نے بساط زندگی پر جان کی بازی لگائی اور فطرت معصوم بچوں کی شکل میں ان کی مدد کے لیے کود پڑی۔ اس دن تو ایسا لگتا تھا جیسے زمین و آسمان سے بچے نکل پڑے ہیں۔ ہزاروں بچے چیختے، چلاتے، سڑکوں اور گلیوں میں باپو کو نہیں، انسان اور انسانیت کو قائم رکھنے کے لیے، شیطانی قوتوں کو چیلنج کر رہے تھے۔ معصومیت ازلی نیکی کی تنظیم کر رہی تھی، سچائی کو ڈھونڈھ رہی تھی اور نور کی کرنیں ظلمت کی قبا چاک کرنے کو نکل پڑی تھیں۔۔۔''11

ایسی ہی مختلف ریلیوں اور کچھ لوگوں کی کوششوں کی بدولت دہلی کے ماحول میں تبدیلی آ گئی اور کوئی بھی قتل یا لوٹ مار کی خبریں بھی نہیں ملیں۔ گاندھی جی کے برت کا تیسرا دن یعنی 15 جنوری 1948 کا دن تھا پھر بھی سرکش لوگ گاندھی جی کے خلاف نعرے لگانے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ فضا میں عجیب سی خاموشی تھی تو دوسری طرف کہیں کہیں ریلیوں کی شکل میں مسلمانوں سے نفرت کا اظہار بھی ہوتا۔ یہ خاموشی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھی کیوں کہ ان ہی دنوں گاندی جی پر حملہ ہوا تھا بالآخر 30 جنوری کو قاتل اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ بہر کیف برت کے پانچویں دن تقریباً ایک لاکھ سرکاری عہدہ داروں کے دستخط کے ساتھ گاندھی جی کی شرائط کو منظور کر لیا گیا جو انہوں نے برت توڑنے کے لیے رکھی تھی۔ گاندھی جی اپنی شرائط کے پورا ہونے پر برت تو توڑ دیا لیکن اب بھی وہ مطمئن نہیں تھے۔ ملک کی خاموش فضا ان کو پریشان کر رہی تھی۔ حالاں کہ اس کے بعد حکومت، والنٹیر وغیرہ ملک کی شانتی کے لیے جی توڑ محنت کر رہے تھے۔ انیس قدوائی نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے اپنی خدمات انجام دی تھیں۔

20 جنوری 1948 کو گاندھی جی پر حملہ کرنے والے مدن لال کا ذکر بھی موجود ہے۔ جس نے پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی پر بم پھینکا، گاندھی جی تو بچ گئے لیکن شر پسندوں کے ذہنی خیالات سامنے آ چکے تھے۔ ان کے اندر جو نفرت کا لاوا پک رہا تھا ہزار کوششوں کے باوجود بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ انیس قدوائی کا کہنا ہے کہ بم پھینکنے والا تو پکڑا گیا لیکن کچھ لوگوں کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا کیوں کہ اس وقت حملہ آور کا ساتھ دینے والے اور لوگ بھی سبھا میں موجود تھے۔ ان ہی لوگوں کی سازشوں کی بدولت 30 جنوری 1948 کو ناتھورام گوڈسے نامی شخص نے گاندھی جی جیسے انسان دوست اور رحم دل شخص کو گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

انیس قدوائی گاندھی جی کے قتل والے دن لکھنؤ میں تھیں کیوں کہ ان کے والد بیمار تھے اور وہ ان کی عیادت و تیمارداری کے لیے دہلی سے لکھنؤ گئی تھیں۔ گاندھی جی کے قتل کی خبر سن کر وہ بہت بے چین ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف وہ شخص جو ان کو دنیا میں لایا اور پروان چڑھایا زندگی و موت کے بیچ جھول رہا تھا تو دوسری طرف وہ شخص دنیا سے جا چکا تھا جس کی شخصیت سے مصنفہ بہت متاثر تھیں، جنھوں نے ان کو ہر موڑ پر دلاسہ دیا تھا۔ اس وقت کی ذہنی و دلی کیفیات کا بیان خودنوشت میں بڑے پر اثر انداز میں ملتا ہے۔

جواہر لعل نہرو نے گاندھی جی کے قتل کی روح فرسا خبر ریڈیو کے ذریعے ملک کی عوام کو دی تھی لیکن قاتل کا نام اعلان نہیں کیا تھا بس اتنا کہا کہ گاندھی جی کو کسی پاگل نے گولی مار کر قتل کر دیا ہے۔ قاتل کی شناخت جب تک نہیں ہوئی

مسلمان بہت ڈرے ہوئے تھے کہ خدایا وہ مسلمان نہ ہو ورنہ قیامت تک یہ لعنت ہمارے سر رہے گی۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ ہو نہ ہو یہ قتل مسلمان نے ہی کیا ہے۔ لیکن جیسے ہی قاتل کا نام سامنے آیا مسلمانوں اور سکھوں نے چین کا سانس لیا۔ جوشؔ، ساجدہ زیدی، جلیل عباسی، جتیندر بلو وغیرہ کی طرح انیس قدوائی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر جواہر لعل نہرو نے قاتل کا نام اعلان کرنے میں ذرا بھی دیر لگائی ہوتی تو پورے ملک میں نہ جانے کتنے مسلمانوں کا خون بہہ جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ قاتل کا نام سامنے آنے پر بھی تعصب پسند لوگ مسلمانوں کو ہی گاندھی جی کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ انیس قدوائی لوگوں کی بے حسی اور نفرت کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ ان کو اس بات پر افسوس تھا کہ گاندھی جی جیسے عظیم شخص کو قتل کرنے والے زندہ کیسے ہیں۔ لکھتی ہیں:

> ''اب تو زندگی ایک بار پھر مصیبت بن کر سامنے آ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا قیامت آ جائے گی، آسمان ٹکڑے ہو کر گر پڑے گا، زمین پھٹے گی اور اس سے سوتے ابل کر اس پاپی ملک کو غرق کر لیں گے۔ یہ چھت آخر رکی کیوں ہے، یہ لوگ چل پھر کیوں رہے ہیں، ساری دنیا واویلا کیوں نہیں کرتی؟ مگر اب بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو بپھر رہے تھے، مسلمانوں کی وجہ سے یہ ہوا۔ ان کے سبب سے گاندھی جی کی جان گئی۔ انہیں قاتل پر غصہ کم تھا اور مسلمانوں پر زیادہ۔۔۔''12

مذکورہ خودنوشت میں ایسے کرداروں کو بھی مصنفہ نے پیش کیا ہے جو گاندھی جی کی موت کے بعد اپنا آپ ہی بھول گئے تھے۔ ان ہی میں سے لکھنؤ کے ایک نواب کا ذکر ملتا ہے جو گاندھی جی کی موت سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ دوسرے ہی دن یہ کہتے ہوئے فوت ہو گئے' گاندھی جی جہاں گئے ہیں میں بھی وہیں جا رہا ہوں'۔ انیس قدوائی نے گاندھی جی کی موت پر لوگوں کی آہ و بکا کو بھی پیش کیا ہے۔ کہتی ہیں کہ پورا ہندوستان باپو کی موت کا غم منا رہا تھا دہلی کی سرزمین ایک مکمل انسان کا خون پی کر ساکت تھی۔ لیکن خودنوشت میں مصنفہ نے ان مکروہ چہروں کو بھی بے نقاب کیا ہے جو گاندھی جی کی موت کا جشن منا رہے تھے۔ مٹھائیاں بانٹ رہے تھے۔ آٹھواں باب ان ہی حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں اس کتاب میں اغوا شدہ لڑکیوں کی بازیافت کا جو خطرناک مسئلہ سامنے آیا تھا اس کا ذکر بھی تفصیل سے ملتا ہے۔ جب یہ مغویہ لڑکیاں ہندوستان لائی گئیں تو ان کے اعزہ و اقربا اپنانے سے صاف انکار کر دیا۔ اغوا ہوئی لڑکیوں کے لیے یہ دوسرا صدمہ تھا جو ناقابل برداشت تھا۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی وہ قصوروار ٹھہرائی گئیں۔ ان کو گھر

نہ لے جانے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ مسلمانوں کے یہاں سے رہ کر آئی تھیں اور اب وہ اپوتر ہو چکی تھیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کو نہ صرف خندہ پیشانی کے ساتھ اپنایا بلکہ ان کو عزت و احترام کے قابل بھی سمجھا۔ ہندوؤں کے مقابلے مسلمانوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ ان کی بہو بیٹیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ انیس قدوائی نے کئی ایسے مسلم لوگوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے پاس سے اپنی مغویہ لڑکیوں کی بازیافت کے لیے درخواست لے کر پہنچے تھے۔ جب ان لوگوں کو ان کی لڑکیاں واپس کی گئیں تو بڑے عزت و احترام کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو بھی لے گئے۔ غیر مسلم عورتوں کو یہ سب دیکھ کر اس بات کا احساس تھا کہ یہ ظلم صرف ہم پر ہی ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں انیس قدوائی نے کئی واقعات پیش کیے ہیں۔

اسی طرح ان عورتوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو غیرت کی بنا پر اپنے گھروں کو واپس ہونے کے بجائے طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئیں، اکثریت ان میں سے ایسی تھی جنہوں نے موت کو گلے لگانا مناسب جانا اور چند ایسی بھی تھیں جنہوں نے اغوا کیا تھا ان کے ساتھ ہی قسمت کا لکھا سمجھ کر گزارا کرنے پر اکتفا کیا۔ اس وقت مغویہ عورتوں کی گھر واپسی میں انکار کی سب سے بڑی وجہ بتاتے ہوئے انیس قدوائی لکھتی ہیں:

> ''جاہل اور تعلیم یافتہ دونوں لڑکیاں ایک اور مصیبت میں گرفتار تھیں۔ جب انہیں لینے پولیس یا کارکن پہنچتے تو وہ اس سوچ میں پڑ جاتیں کہ آیا اس ہونے والے بچے کو بھی والدین یا شوہر برداشت کر سکیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو قومی غیرت ان کو اس کے قتل پر مجبور کر دے۔ غرض یہ تھا پس منظر اس انکار کا۔ جو ہم سب کے لیے باعث حیرت ہو رہا تھا۔''13

غرض کہ خودنوشت کا نواں باب ایسی ہی مجبور و بے بس لڑکیوں اور عورتوں کی پریشانیوں کے قصوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ مغویہ عورتیں محض اپنوں کی محبت اور اپنائیت کی ایک نظر کے لیے نہ صرف تڑپ رہی تھیں بلکہ مدد کرنے والوں میں چند لوگوں کی بھینٹ بھی چڑھ رہی تھیں۔ جس پر انیس قدوائی افسوس کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کے مددگار ہی درندگی کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ اسی طرح اغوا کی گئی لڑکیوں کی بے بسی، لاچاری اور استحصال کے بہت سے قصے مصنفہ نے بیان کیے ہیں، لوگوں کی درندگی کی ایک مثال ملاحظہ ہوں:

> ''میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر والنٹیر نے مجھ سے بیان کیا کہ بہت سی عورتوں کی پیشانیوں پر پاکستان زندہ باد کھدا ہوا ہے اور ہاتھوں یا سینوں پر نہ جانے کتنوں کے نام گدے ہوئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے، میں اس روایت کی اب تک تصدیق نہ کر سکی.....لیکن مسلمان

لڑکیاں ایسی سیکڑوں میرے پاس لائی گئیں جن کے ہاتھوں پر بدمعاشوں نے اپنے نام اور گناہ کی تاریخ تک ثبت کر دی تھی۔ پٹیالہ سے بھاگ کر آئی ہوئی ایک لڑکی نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جو اس نے تیزاب سے جلا ڈالا تھا تاکہ بدنامی کے اس داغ کو مٹا سکے۔'' 14

اغوا شدہ لڑکیوں کی خدمت اور دل جوئی کرنے میں مصنفہ نے اہم کردار نبھایا تھا جسے وہ خودنوشت میں بھی بیان کرتی ہیں۔ ان لڑکیوں و عورتوں کو سماجی کاموں کی طرف بھی راغب کرتی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی ساتھیوں کے ساتھ مل کر مختلف سینٹر قائم کیے، جہاں ہندو مسلمان غرض ہر مذہب کی لڑکیاں اور خواتین شامل ہوتی تھیں۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں فرقوں کی خواتین آپس میں گھل مل کر رہنے لگیں، ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے ساتھ دکھ درد بھی بانٹنے لگیں۔ انیس قدوائی لکھتی ہیں کہ یہ خواتین جب پہلی بار ملی تھیں تو ہندو مسلم عورتیں ایک دوسرے کے سائے سے ہی دور بھاگتی تھیں لیکن بعد میں یہی دوست بن کر رہنے لگیں۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد بلوائیوں نے اپنے غصے اور انتقام کی آگ کیسے اور کہاں کہاں سے بجھائی، اس کی بھی تفصیل خودنوشت میں شامل ہے۔ جب فسادات نے زور پکڑا اور قتل و غارت گری نے تباہی مچائی تو اس سے بھی جب تسکین نہ ملی تو بلوائیوں نے مردوں کو بھی نہ بخشا، عبادت گاہوں اور قبرستانوں کر مسمار کیا گیا۔ انیس قدوائی اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

''زندوں سے انتقام کی آگ جب نہ بجھ سکی تو غنڈوں نے مردوں پر ہاتھ صاف کیا، مگر ہر چیز کی طرح یہ بھی ایک منظّم سازش تھی، کوئی انفرادی یا اضطراری فعل نہ تھا۔ مہاتما جی جب دہلی آئے تو یہاں کی جامع مسجد کے علاوہ تقریباً ساری مسجدیں رفیوجیز کی جائے رہائش بن چکی تھیں، یا کُھد گئی تھیں، چند ایک کو مندر بھی بنا لیا گیا تھا۔ یہی حال مشرقی پنجاب اور ریاستوں کا ہوا تھا، دسمبر میں جب اجمیر سے خبر آئی تو وہاں بھی اسی پروگرام پر عمل کیا گیا۔'' 15

انیس قدوائی کی یہ کتاب ڈائری تو نہیں ہے لیکن وقت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور مہینوں کا حساب رکھتی ہے۔ مارچ 1948 میں پناہ گزینوں کے کیمپوں کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اسے ختم کرنے کی کوشش کی گئی، جس میں سماج دشمن عناصر پیش پیش تھے۔ یہاں تک کہ اقتدار میں بیٹھے لوگ بھی اسی کوشش میں تھے کہ دہلی کی سرزمین کو کس طرح مسلمانوں سے خالی کرائی جائے۔ اپنے منصوبے کی کامیابی کے لیے ہر طرح کی چالبازیوں سے کام لیا گیا۔ اس معاملے میں یہاں

کے لیڈر مسلم لیگ کے لیڈروں سے بھی مدد لے رہے تھے۔ گویا کہ تبادلۂ آبادی میں سودے بازی بھی شروع ہوگئی تھی اور سرحد کے دونوں پار افسران جھوٹ سچ بول کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے۔

اپریل 1948 میں پھر سے افواہ پھیلی کہ دہلی میں فساد ہوگا اور 15 جون کو مسلمانوں کو چن چن کر مارا جائے گا، اس کے لیے گاؤں و دیہات میں بڑے پیمانے پر ہتھیار جمع کیے جا رہے ہیں۔ راشٹریہ سویم سیوک کی شاخائیں جگہ جگہ لگ رہی ہیں۔ جب یہ افواہ مسلمانوں تک پہنچی تو ان میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اس سے پہلے بھی تقسیم ہند کے بعد 5 ستمبر 1947 کو مقررہ تاریخ کو بلوائیوں نے مسلمانوں کا کھلے عام قتل کیا تھا۔ پھر سے افواہوں کا جو بازار گرم ہوا تو مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ اس بار ہم جو تھوڑی تعداد میں بچ گئے ہیں، مارے جائیں گے۔ چناں چہ حکومت اور سماجی کارکن پہلے سے زیادہ مستعد ہو کر کام کرنے لگے اور دہلی کی فضا میں امن و امان قائم کرنے کے لیے رات دن ایک کر دیے۔ اس سلسلے میں مختلف سماجی گروپ اور ان کی خدمات کی تفصیلات بھی خودنوشت میں موجود ہے۔

انیس قدوائی نے ان مسلمانوں کی بے بسی کو بھی بیان کیا ہے جن کو شرنارتھیوں اور مقامی ہندو پیسے کا لالچ دے کر یا تلوار کے بل پر زور زبردستی کر کے گھروں سے نکال رہے تھے۔ یہی نہیں ان مسلمانوں سے ملک کے تئیں وفاداری کا ثبوت بھی مانگا جاتا غرض کہ مسلمانوں کو ہر طرح سے پریشان کیا جا رہا تھا۔ انیس قدوائی کی مذکورہ خودنوشت سے نہ صرف ان کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان اشخاص کی بھی جانکاری ملتی ہے جنھوں نے بغیر لالچ اور مذہبی تفریق کے مسلمانوں کو ان کا حق دلانے، ان کی دوبارہ بازآبادکاری میں اور مکان و زمینیں الاٹ کرانے میں کلیدی رول ادا کیے تھے۔ بے گھر لوگوں کو دوبارہ بسانے میں شانتی دل اور اس کے کارکنوں کی تفصیلات بھی کتاب میں موجود ہے۔

غرض کہ انیس قدوائی کی کتاب ''آزادی کی چھاؤں میں'' پیش کی گئی وہ داستان جو تقسیم ہند کے زیر اثر وقوع پذیر ہوئیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ لکھنؤ سے دہلی کے لوگوں کی مسیحائی کرنے کے لیے ہی آئی تھیں اور اپنی خدمات واثر ورسوخ کی وجہ سے حکومتی پیمانے پر امداد بھی حاصل کی تھیں۔ ان کی خدمات اور خلوص کو دیکھتے ہوئے دہلی کے آس پاس علاقوں میں بھی خدمت خلق کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مصنفہ نے کنگزوے کیمپ کی بدحالی دیکھی اور اس کی اصلاح کے لیے عملی اقدامات بھی اٹھائے۔ گڑگاؤں کے مسلم رفیوجی کیمپ بھی گئیں جہاں الور کے آٹھ ہزار مسلمان پناہ گزین تھے۔ ان کی خوفناک کہانیاں بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ان پر بربریت اور مظالم کی انتہا کر دی گئی تھی۔ ان مسلمانوں کے مسائل کو بھی سلجھانے میں انیس قدوائی نے بھرپور کوشش کی تھی۔ مغویہ لڑکیوں کی بازیافت کے بعد سماج میں ان کو ایک مقام دلانے کے لیے بھی مصنفہ نے کام کیا۔ ستمبر 1948 تک مغویہ لڑکیوں کی بازآبادکاری ہوتی رہی ان میں سے

جن کے رشتہ دار نہیں ملتے یا جن کے گھر والوں نے انہیں اپنانے سے انکار کیا تھا، ان لڑکیوں کو دوبارہ پاکستان بھیج دیا گیا، کچھ نے خودکشی کی اور کچھ نے طوائف کا دھندا اختیا کرلیا۔ اس کے بعد بقول مصنفہ میں نہیں جانتی کہ کیا ہوا کیوں کہ تھک ہار کر میں نے بھی دو تین ماہ کے لیے دہلی چھوڑ دی تھی۔

خودنوشت کا آخری باب ''انسان مر نہیں سکتا'' کے عنوان سے ہے جس میں مصنفہ پرانی تہذیب و اقدار اور انسانیت کو افسوس کے ساتھ یاد کرتی ہیں جب سماج کا ہر طبقہ مل جل کر ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا تھا۔ داخلی زندگی میں لوگ بھلے ہی جداگانہ حیثیت رکھتے تھے لیکن خارجی زندگی میں ہر مذہب کے لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر شریک ہوتے تھے۔ بھائی چارہ، انسانی برادری اور انسانیت کی منزلِ اعلیٰ کا ایک خدائی تصور بھی ان کے پاس تھا۔ لیکن انگریزوں کے آنے کے بعد سماج کے ٹوٹتے نظام پر مصنفہ نے آنسو بھی بہایا ہے۔ انیس قدوائی اپنے تجربات کی بنا پر موجودہ سماج اور حکومت کی پراگندہ حالت پر ماتم بھی کرتی ہیں، اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''کوئی محکمہ، ادارہ، گھر اور مقام ایسا نہیں ہے جہاں تک اس دور کے ناقص اثرات نہ پہنچے ہوں۔ جیسے کالرا کے موسم میں ہوا پانی ہر چیز مسموم ہو جایا کرتی ہے اس وقت بالکل یہی حال سارے ملک کا ہے۔ نظم و ترتیب کا ہر شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔ مذہب کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئی ہیں۔ تہذیب و تمدن کی چولیں ہل چکی ہیں۔ پرانا سماجی نظام ختم ہو گیا، بڑا اچھا ہوا۔ آخر وہ کب تک زندہ رہتا، کوئی حد ہے، اس کو تو مرنا ہی تھا۔ لیکن اندیشہ اور افسوس تو یہ ہے کہ اب جو سماج بن رہا ہے وہ آدمیوں کی سوسائٹی نہیں بلکہ جانوروں کا جنگل ہوگا۔ انسانی برادری وحشیوں کے غول میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔''16

مذکورہ درج بالا نتائج انیس قدوائی نے تقسیم ہند کے بعد دل سوز حالات میں دہلی کی گلیوں میں پھر کر، ریل کے مسافروں میں گھل مل کر، شہروں اور گاؤں کے لوگوں کی روداد سن کر، مغویہ اور زخمی عورتوں و لڑکیوں اور بچوں سے مل کر اخذ کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن واقعات کو جھٹلایا اور حقیقت کو غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ 1947 کے بعد جو حالات ملک میں پیدا ہوئے اس پر بھی تبصرہ کھل کر کرنے کے بعد اپنی رائے بھی دیتی ہیں۔ مصنفہ نے لوگوں کی نفسیات خاص کر بچوں کے ذہن پر لوٹ مار اور فسادات کا کیا اثر ہو رہا تھا مختلف واقعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔ بچوں کی نفسیات کا بغور جائزہ لینے کے بعد وہ خوف زدہ بھی ہوئیں کہ ملک کا کیا حال ہوگا۔ مستقبل میں جو بچے ملک و قوم کی خدمت کرنے والے تھے ان کے معصوم دماغ میں مذہبی تعصب اور نفرت گھر کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں انیس

قدوائی ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میرا حساس دل اور گہری آنکھیں اس پردہ میں کوئی اور ہی سین دیکھ رہی تھیں۔ مار دو، جلا دو، ختم کر دو، وہ خود نہیں کہہ رہے تھے۔ بلکہ ان کے باپ بھائی، رشتہ داران دنوں اسی کام میں مصروف تھے اور ان کے ننھے معصوم دماغ فرضی چیز کو پیٹ کر، تصور میں جلا کر ختم کر کے لطف اندوز ہو رہے تھے۔''17

مسلمانوں سے دشمنی کی بنا پر عوام اخلاقی طور پر کتنا گر گئی تھی اس کی بے شمار مثالیں مصنفہ نے خودنوشت میں مختلف واقعات اور کردار کے ذریعے پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے افسران کے اردلی، اسکول کے بچے، اسپتالوں میں کام کرنے والے نرس اور چپراسی تک شامل تھے۔ مطلب کہ کوئی ایسا محکمہ نہیں تھا جہاں مسلمانوں کو لعنت و ملامت کا نشانہ نہ بنایا جاتا رہا ہو۔ انیس قدوائی نے عوام کی اس ذہنیت کو ختم کرنے کے لیے اٹھائے گئے حکومتی اقدام اور اپنی خدمات کا جائزہ بھی خودنوشت میں پیش کیا ہے۔ آخر میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس وقت ایسا کون سا مسئلہ تھا جو اس وقت نہیں ہوا اور وہ تمام مسئلے گزرے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر نئے روپ میں سامنے آتے تھے۔ ان مسئلوں میں مثال کے طور پر زمیندار اور کسانوں کی جنگ، مزدور اور سرمایہ داروں کی کشمکش، امیر اور غریب کا الجھاؤ، ہندوؤں اور سکھوں کا جھگڑا، دھوکہ دھڑی، فریب، اغوا، قتل، عصمت دری وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے مسائل، وہاں پیدا ہونے والی بدکاریوں اور عیاشیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

علاوہ ازیں مصنفہ نے 1948 کے اواخر میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہونے والے فسادات کا بیان بھی کیا ہے۔ جہاں پر مسلمانوں سے زبردستی گھروں اور محلوں کو خالی کرایا گیا تھا۔ ان ہی فساد میں اجمیر میں ساڑھے چار ہزار مسلمان مارے گئے تھے، باقی لوٹے گئے، بھگائے گئے، اور ہزاروں کے قریب شدھی کیے گئے، بقول انیس قدوائی 80 ہزار مسلمانوں کی آبادی گھٹ کر 8 ہزار رہ گئی تھی۔ خودنوشت کے آخر میں انہوں نے سماج میں امن و شانتی قائم کرنے، نئی طرز زندگی اپنانے اور نفرتوں و کدورتوں کو ختم کرنے پر زور بھی دیتی ہیں، لکھتی ہیں:

''یہ بے روح سماج، یہ غنڈہ تہذیب، یہ لٹیا پاجامہ والا تمدن اور یہ ایک کلچر، ایک قوم کا خواب دیکھنے والے دماغ، ان سب کو نئے ہندوستان کے کھیتوں کی کھاد بنانا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر زمین میں طاقت کیسے پیدا ہوگی۔''18

مختصر یہ کہ انیس قدوائی کی مذکورہ کتاب ایک اہم دور کی تاریخی مرقع ہے۔ جس میں انسانی فطرت کے بہتیرے

سین اور بہیمیت کی سیکڑوں داستانیں موجود ہیں۔ان داستانوں میں مخلص لوگوں کے ساتھ بلوائیوں کی شکل میں درندے بھی ہیں،جنہوں نے مذہب کے نام پر فخریہ لوٹ مار اور عصمت دری کا کارنامہ انجام دیا۔مخلص لوگوں میں وہ بھی ہیں جو بلوائیوں سے ڈٹ کر اپنے مسلم بھائیوں و بہنوں کی جان و آبرو بچائی۔اس کتاب میں پیش کیے گئے واقعات کے تضادات کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انسان ابھی مرا نہیں ہے ان میں انسانیت بھی زندہ ہے۔بہر حال انیس قدوائی نے تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے حالات و واقعات اور اپنے تجربات کو جس طرح تنقیدی بصیرت کی روشنی میں ایک معیاری اسلوب و زبان کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔''آزادی کی چھاؤں میں'' کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے وہاج الدین علوی لکھتے ہیں:

> ''خودنوشت سوانح نگاری کے لحاظ سے یہ خودنوشت صرف ایک مخصوص دور کی ترجمان ہے جس سے ان کے خاندان، بچپن، جوانی اور عہد کا حال معلوم نہیں ہوتا۔اس لیے اسے ہم ادھوری خودنوشت کہنے کے بجائے زندگی کے صرف ایک اہم واقعہ یا بحرانی دور کے عکاسی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔زبان اور اسلوب کے نقطہ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کی چھاؤں میں اردو کی اعلیٰ خودنوشتوں میں اپنا اہم و منفرد مقام رکھتی ہے۔''19

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نثری پارہ اردو خودنوشت میں اہمیت کا حامل ہے۔اس میں خودنوشت کے کینوس میں قارئین کے سامنے ایک مخصوص دور اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے، جہاں مصنفہ ان حالات کا دور سے کھڑی نظارہ کرنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ اس آگ میں کود کر خدمت خلق بھی کرتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ شبانہ سلیم، اردو میں خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں: تجزیاتی مطالعہ، باب العلم پبلی کیشنس، بھوپال، 2015 ص:67
2۔ انیس قدوائی، آزادی کی چھاؤں میں، قومی ایکتا ٹرسٹ، نئی دہلی، 1974، ص: 14
3۔ ایضاً، ص: 17
4۔ ایضاً، ص: 22
5۔ ایضاً، ص: 39,38
6۔ ایضاً، ص: 47
7۔ ایضاً، ص: 53
8۔ ایضاً، ص: 88
9۔ ایضاً، ص: 102
10۔ ایضاً، ص: 108
11۔ ایضاً، ص: 138
12۔ ایضاً، ص: 154
13۔ ایضاً، ص: 172
14۔ ایضاً، ص: 182
15۔ ایضاً، ص: 220
16۔ ایضاً، ص: 362
17۔ ایضاً، ص: 363
18۔ ایضاً، ص: 375
19۔ وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت: فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، 1989، ص: 413

قاضی جلیل عباسی: کیا دن تھے

سنہ اشاعت: 1975

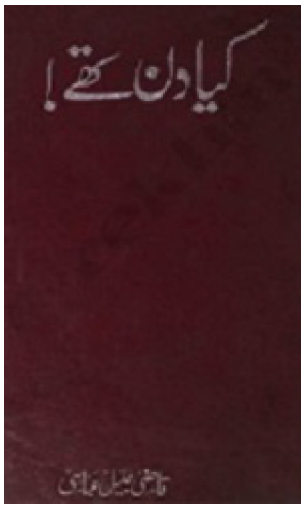

کیا دن تھے! (قاضی جلیل عباسی)

اتر پردیش کے ضلع بستی کے مشہور کانگریسی سیاست داں قاضی جلیل عباسی 19 نومبر 1912 کو بستی کے ایک گاؤں بیارہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد بسم اللہ عباسی ایک شاعر تھے اور آصیؔ تخلص رکھتے تھے، انہیں اردو کے علاوہ عربی اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ ان کی شاعری کے مجموعے ''جام کوثر'' اور ''نسخہ تواریخ'' 1930 میں شائع ہوئے۔ یہ دونوں مجموعے قطعات، تاریخی اشعار اور قصائد پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ضخیم بیاض فارسی میں موجود ہے۔ جلیل عباسی کل چھ بھائی اور تین بہنیں تھیں جن میں وہ سب سے چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم بستی سے حاصل کی، لکھنؤ یونی ورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ 1947 سے بستی میں اپنی وکالت کا آغاز کیا، ساتھ ہی باقاعدہ سیاست میں بھی حصہ لینے لگے اور کانگریس کے رکن بن کر سیاسی میدان میں آئے۔ 1950 میں ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے، بعد ازاں وزیر ریاست ہوتے ہوئے ممبر آف پارلیمنٹ بنے۔ جلیل عباسی اور ان کے بھائی عدیل عباسی کو نہ صرف سیاست سے لگاؤ تھا بلکہ جدو جہد آزادی میں باقاعدہ حصہ بھی لیتے رہے، وہ دونوں تا عمر کانگریس پارٹی سے جڑے رہے۔ جلیل عباسی کا 1996 میں انتقال ہوا۔ انہوں نے جدو جہد آزادی اور اپنی سیاسی زندگی کی تفصیلات اپنی خودنوشت ''کیا دن تھے'' میں بیان کی ہے۔ ان کی زندگی سیاسی ہنگاموں سے بھری ہے، اس میدان میں بے شمار نشیب و فراز آئے لیکن مشکل سے مشکل وقت میں بھی ان کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔

جلیل عباسی نے اپنی زندگی کے شب و روز کی داستان اپنے بھائی عدیل عباسی کی ترغیب پر لکھنا شروع کیا اور زندگی کے 74 ویں سال میں مذکورہ کتاب مکمل کی۔ خودنوشت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس کتاب میں بے جا انکسار سے تو کام نہیں لیا ہے لیکن خودنمائی اور خودستائی سے اجتناب ضرور کیا ہے۔ حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کے بیان میں رنگ آمیزی سے گریز کرتے ہوئے حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے تا کہ انہیں صحیح تناظر میں پیش کیا جا سکے۔ پھر بھی ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں سہواً تاریخ و ترتیب میں فرد گذاشت ہو گئی ہو، اسے قارئین معاف فرمائیں۔''1

مذکورہ خودنوشت جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے 1975 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ علی سردار جعفری نے تحریر کیا ہے۔ تقریباً 250 صفحات پر مشتمل خودنوشت کو مختلف ابواب میں منقسم کیا گیا ہے اور ہر باب کا ایک عنوان مختص ہے جو اپنے متن کی ترجمانی کرتا ہے۔ پیش لفظ میں سردار جعفری نے مصنف کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''وہ بنیادی طور سے سیاسی انسان ہیں اور ہندوستان کی تحریک آزادی کے لیے ایک نڈر اور بے باک سپاہی، حوصلہ منداور پر جوش۔ان کا جوش وخروش جب جلال پر ہوتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی۔اس کی کئی مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں۔''2

1919 میں جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوئیں تو ان کے بھائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی سلسلے میں 1922 میں جیل بھی گئے تب جلیل کی عمر تقریباً گیارہ برس تھی۔اس واقعے سے ان کے والد اور خصوصی طور پر دادا کو بہت صدمہ پہنچا اور اسی صدمے میں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ دراصل انہیں سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا ان کے نزدیک سیاست دانوں کا کام تھا۔چناں چہ جب ان کے بچے اس میدان میں آئے اور جیل گئے تو وہ بہت پریشان ہوئے۔جلیل کے گھر کا ماحول مذہبی تھا لیکن ان کے گھر میں علی برادران کی تحریک خلافت اور انگریزوں کے ظلم وستم کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''میں سات آٹھ برس کا ہوا تو گھر میں سیاسی رنگ بھی نظر آنے لگا۔تحریک خلافت چل رہی تھی۔دین و مذہب کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کی مخالفت کے تذکرے بھی کانوں میں پڑ رہے تھے۔اس طرح بچپن سے ہی میری زندگی پر سیاسی اثرات پڑنے لگے۔''3

جلیل کی ہنگامہ خیز زندگی کا آغاز آٹھویں جماعت سے ہوا جب انہوں نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اسکول کے ہاسٹل میں اذان دے کر نماز پڑھنی چاہی لیکن ہیڈ ماسٹر نے اس کی اجازت نہیں دی، جس کی مخالفت میں انہوں نے اسکول میں ہڑتال کرادی۔اس کے بعد مسلمان لڑکوں کو اذان دے کر نماز ادا کرنے کی اجازت مل گئی۔ بعد ازاں نویں جماعت میں اسپورٹس کے معاملے میں طلبہ کے درمیان خفگی کا مسئلہ پیدا ہوا، تو پھر انہوں نے اسکول میں ہڑتال کرائی۔ خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جب طلبہ کے کسی ایجی ٹیشن کی قیادت کی اور ریلیوں میں حصہ لیا۔اس سلسلے میں ان کے ہیڈ ماسٹر نے کہا تھا کہ تم اسکول میں ایک تاریخ رقم کر رہے ہو لیکن ان سب کے ساتھ تعلیم پر بھی توجہ دو لیکن سیاسی رجحانات کے سبب ان کی تعلیم متاثر ہوتی رہی اور بقول مصنف ''اس طرح میری اعلیٰ تعلیم کا رجحان ٹوٹ گیا۔'' حالاں کہ وہ مذہبی ماحول میں پیدا ہوئے تھے لیکن اس کے برعکس ان کی طبیعت میں ہنگامہ ریزی کا میلان زیادہ تھا، وہ اپنی نام کی طرح جلالی تھے۔

1933 میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ پروفیسر حبیب کی مدد سے ان کا داخلہ آسان ہوگیا۔ یونی ورسٹی کے نصر اللہ ہاسٹل میں کمرہ مل گیا۔اختر انصاری ان کے روم میٹ تھے۔دوسرے سال

ممتاز ہاسٹل میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آنے کے بعد بھی تعلیم سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لی اور تحریک آزادی میں باقاعدہ حصہ لینے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں سیاسی سرگرمیاں ایک نئے موڑ پر آ گئی تھیں۔ طلبا میں بھی سیاسی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ جلیل کا رجحان آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف تھا جو کانگریس سے ہم آہنگ تھی۔ اس طرح ان کو یونی ورسٹی میں ایک سیاسی میدان مل گیا اور فیڈریشن کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یونی ورسٹی یونین کے الیکشن، جس میں ملکی سیاست کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن جلیل نے جب داخلہ لیا اس وقت کے سیکریٹری الیکشن نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ نعمان زبیری سیکریٹری کے عہدے پر کھڑے ہوئے جو مسلم لیگ کے حامی تھے اور طلبہ میں کافی مقبول تھے، ان کے مقابل میں نیشنلسٹ طلبہ نے فرحت اللہ انصاری کو امیدوار بنایا لیکن الیکشن کے کچھ دن پہلے ہی ان کا پرچہ خارج کر دیا گیا۔ نیشنلسٹ طلبہ نے سمجھا کہ یہ نعمان زبیری نے کرایا ہے بس اس افواہ نے چنگاری کا کام کیا۔ جلیل عباسی نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے تعلق رکھنے والے مسعود نامی لڑکے کو کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ پورے کانگریسی تھے۔ جلیل عباسی اور ان کے ساتھیوں نے مسعود کو فتح دلانے کے لیے دن رات محنت کی اور بالآخر وہ لوگ کامیاب ہوئے۔ یہ یونی ورسٹی کی سیاست میں ان کا پہلا اقدام تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ یہ الیکشن میری سیاسی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد یونی ورسٹی کے ایک طلبہ کی بے عزتی اور اس کی حمایت میں کی گئی ہڑتالوں میں بھی حصہ لیا، اور یہ ہنگامہ اتنا طول پکڑا کہ ان کو یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا۔ لیکن جلد ہی ان کے بھائی عدیل عباسی کی سفارش پر دوبارہ داخلہ مل گیا۔

اس کے بعد مسلم لیگ کی ایما پر اور اسٹوڈنٹس فیدریشن کے مقابلے میں نعمان زبیری کی آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں لانے کی کوشش کو جلیل عباسی اور ان کے کانگریسی ساتھیوں نے ناکام بنایا۔ دراصل وہ مسلم لیگ کی پالیسیوں اور پاکستان کی مانگ کے سخت خلاف تھے۔ جس کی پوری تفصیل خودنوشت میں ملتی ہے۔ یونی ورسٹی میں دوبارہ داخلہ ملنے کے بعد کئی سیاسی ہستیوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ جن کی شخصیت سے متاثر بھی تھے۔ 1936 میں گورنمنٹ آف انڈیا کے تحت انتخاب میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے امیدوار بھی میدان میں اترے۔ اس الیکشن میں مسلم لیگ کو مختلف مقامات پر شاندار جیت حاصل ہوئی تھی۔ پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے کہ یونی ورسٹی کے طلبہ کو ملکی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی لیکن نیشنلسٹ طلبہ کانگریس کی حمایت میں آگے آئے اور جلیل عباسی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مختلف مقامات پر جلسے وجلوس کرتے رہے، جن میں لوگوں کے درمیان کانگریس کی حمایت میں بڑی ولولہ انگیز تقاریر کر کے نوجوانوں کو متاثر کیا۔

جب طلبہ کی ان مصروفیات کی خبر وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین کو ہوئی تو انہوں نے سخت قدم اٹھایا اور احکام جاری کیا کہ طلبہ سیاست سے دست بردار ہو جائیں اور تعلیم پر مکمل توجہ دیں ورنہ کڑی کارروائی کی جائے گی۔ جب جلیل عباسی کو خبر ہوئی تو غم و غصے کی حالت میں ایک بڑے مجمع کے سامنے ہی وائس چانسلر کو برا بھلا کہا، گالیاں بھی دیں، ان پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ وائس چانسلر یہ دیکھ کر گھبرا گئے کیوں کہ وہاں موجود طلبہ کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا چناں چہ انہوں نے جلیل عباسی کو اپنی ہی گاڑی سے اسپتال پہنچایا۔ اس واقعے نے نوجوانوں کو بہت متاثر کیا۔ دراصل انہیں لگتا تھا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے تب ہی عام لوگ بھی آگے آئیں گے لیکن یونی ورسٹی کی انتظامیہ ایسا نہیں چاہتی تھی، بس پھر کیا تھا ہنگامہ بڑھتا گیا اس کے بعد جلیل کے ساتھ دوسرے کئی طلبہ کو دوبارہ یونی ورسٹی سے برطرف کر دیا گیا۔

انہوں نے علی گڑھ سے نکلنے کے بعد باقاعدہ تحریک آزادی میں حصہ لینے کی ٹھانی۔ وہاں سے اپنے سر پر آزادی کا جنون سوار کر کے نکلے اور علی سردار جعفری جو پہلے ہی اسی سلسلے میں علی گڑھ سے نکالے جا چکے تھے، ان کے پاس گئے۔ ان کا ماننا تھا کہ لوگ بس روپیہ کمانے کے چکر میں پڑے ہیں اگر ہر کوئی میری طرح آزادی کے لیے ساتھ دے تو ہم بہت جلد آزاد ہو جائیں، ورنہ سچے مجاہدوں کو تو دو وقت کی روٹی اور کپڑا تو کہیں سے بھی مل جاتا ہے۔ اس وقت ان پر آزادی حاصل کرنے کا جنون سوار تھا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''کیا کیا خیالات تھے اس وقت، اور کیا جنون سر پر سوار تھا۔ آج اس کو سمجھنا دشوار ہے۔ زندگی کچھ اس طرح گزر رہی تھی کہ جہاں پہنچا کسی دوست نے ٹکٹ کے پیسے دے دیے۔ جس کے پاس گیا اس کا کپڑا لے کر پہن لیا اور اسی سے پیسہ لے کر دوسری جگہ چلا گیا۔ اول تو بستر کی فکر ہی نہ تھی اور اگر کہیں مل گیا تو بچھا لیا۔ کچھ عرصہ تک تو بستر میسر آنے پر بھی نہیں بچھاتا تھا۔ بلا بستر اور تکیہ کے سونے کا جنون ہو گیا تھا۔ دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ تکلیف اٹھاؤں گا تو ملک جلد آزاد ہو جائے گا۔ آرام سے سوؤں گا تو ملک آزاد نہ ہوگا۔ ایک سیماب صفت آشفتہ سر کی طرح جگہ جگہ کی خاک چھانتا ہوا کبھی دلی سے امرتسر اور لاہور پہنچا، کبھی بلند شہر اور میرٹھ کی طرف نکل گیا۔ کبھی علی گڑھ آ گیا تو کبھی لکھنؤ پہنچ گیا۔ غرض کہ نہ کوئی مخصوص منزل تھی، نہ مقام، نہ سکون تھا نہ آرام، ہمہ وقت پا بہ رکاب۔ صرف ایک ہی دھن تھی کہ بس چلتے رہو اور کچھ کرتے رہو۔''4

حالاں کہ اس وقت جلیل ازدواجی زندگی میں داخل ہو چکے تھے اور ان کی ایک بیٹی بھی تھی لیکن ان کو امور خانہ داری سے زیادہ ملک کو دشمنوں سے آزاد کرانے کی فکر تھی۔ اس سلسلے میں وہ مسلسل کوشش کرتے رہے، گھر سے کئی کئی دن غائب رہتے اور شہر شہر جا کر مسلمانوں و ہندوؤں کو متحد کرنے اور کانگریس کی تحریکوں میں حصہ لینے اور پارٹی کی حمایت میں آگے آنے کی تلقین کرتے رہے۔ مسلم لیگ اور ان کی پالیسی کے خلاف تھے، اسی لیے ان کے خلاف مختلف مقامات پر عوام سے خطاب بھی کیا۔ 1936 میں الیکشن کے دوران کانگریس کی طرف سے کام کرنے کے لیے بحیثیت خطیب یو پی کے ایک علاقے ہمیر پور بھیجے گئے۔ وہاں پر مسلم لیگی سوچ کے خلاف لوگوں کے درمیان جلسے کرتے، ان کا کہنا تھا کہ لیگ فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیتی ہے، اور وہ فرقہ واریت کے خلاف تھے اس لیے خفیہ طور پر لوگوں کے درمیان جاتے اور ان کو سمجھا بجھا کر کانگریس میں شامل کرتے۔ جب کہ جس علاقے میں وہ گئے تھے وہاں مسلم لیگ کی جیت حتمی تھی لیکن جلیل اور ان کے ایک ساتھی چنی لال بڑی جانفشانی کے ساتھ لگے رہے اور لوگوں سے کانگریس کے لیے ووٹ ڈالنے کی اپیل کرتے رہے۔

ان دنوں اس قدر پر جوش تھے کہ دن بھر گھوم گھوم کر لوگوں کو خطاب کرتے اور رات ہونے پر ایک حلوائی کی دکان سے پوری سبزی ادھار لے کر کھاتے اور وہیں بینچ پر سو جاتے۔ خودنوشت میں کئی ایسے واقعات کا تذکرہ ملتا ہے جس میں مسلم لیگ کی مخالفت میں جلیل کے اٹھائے گئے اقدامات کی تفصیلات موجود ہیں۔ علی گڑھ سے نکالے جانے کے بعد بقول جلیل عباسی تین سال تک ایسے ہی مجنوں بنا گھومتا رہا۔ ان کو نہ کھانے کی فکر تھی، نہ پہننے کی، جہاں جگہ ملی سو گئے اور جو کھانے کو ملا کھا لیا۔ آزادی پانے کی دھن اور للک اس قدر تھی کہ انہیں اپنے اہل وعیال کا تو دور خود کا بھی ہوش نہیں تھا۔

تین سال بعد علی سردار جعفری کے پاس دہلی گئے جو عربک کالج میں زیر تعلیم تھے، ان کے ہی مشورے پر جلیل نے بھی کالج میں داخلہ لیا اور سردار جعفری کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ لیکن سیاسی کارکردگیوں اور سرگرمیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے ان کی حاضری بہت کم تھی جس کی وجہ سے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا اور اس طرح تعلیم پھر سے ادھوری رہ گئی۔ مذکورہ خودنوشت میں انہوں نے 1937 سے 1940 تک کی سیاسی روداد کو پیش کیا ہے۔ یہ دور ملک کی سیاست اور خود ان کے لیے بھی کافی ہنگامہ خیز تھا۔ ایسے بے شمار واقعات کو پیش کیا ہے جو تحریک آزادی سے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں کلکتہ کے اس اجلاس کا بھی ذکر ملتا ہے جس میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آنا تھا اور محمد علی جناح اس اجلاس کی صدارت کرنے والے تھے۔

جلیل عباسی کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنے نیشنلسٹ ساتھیوں کے ساتھ اس اجلاس کو ناکام بنانے کی کوشش

کی اور علی گڑھ ولکھنؤ کے طلبہ کو لے کر کلکتہ پہنچ گئے۔ وہاں جانے کے بعد مذکورہ اجلاس کے مقابلے میں اسی دن جلیل عباسی کے ساتھیوں نے ایک دوسرا اجلاس رکھا اور مسلم لیگ وفرقہ واریت کو بڑھاوا دینے والوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا، دراصل وہ لوگ اس بات پر غصہ تھے کہ جب طلبہ کی ایک تنظیم پہلے سے موجود ہے تو اب الگ سے محض مسلم طلبہ کی تنظیم بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے ملک میں سوائے تناؤ اور نفرت کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے جلیل اور ان کے ساتھیوں نے کانگریس کو بڑھاوا دیا اور پاکستان کی مانگ، اس کی حمایت کرنے والوں کے خلاف ریلی نکالی۔ اس سلسلے میں ان لوگوں نے کئی کانگریسی لیڈروں سے بھی ملاقات کی اور اپنی منشا ظاہر کی۔

1940 کے بعد برصغیر کے سیاسی افق پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کی بھی تفصیل مذکورہ خودنوشت میں موجود ہے۔ مصنف اس وقت لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ انگریزوں کے خلاف ملک میں ستیہ گرہ اور دیگر تحریکات کے سبب ملک کے قد آور لیڈروں کی گرفتاریاں جاری تھیں۔ برطانوی حکومت کے خلاف مظاہرے، جلوس، بغاوتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حکومت کے خلاف فیڈریشن نے بھی لکھنؤ کے امین آباد میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا۔ اس اجلاس کے متعلق جلیل نے اپنی خودنوشت میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا لکھنا ہے کہ مذکورہ اجلاس میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس ضمن میں سلطانہ جعفری کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے جو علی سردار جعفری کی زوجہ تھیں۔ اس جلسے میں مسز وجے لکشمی پنڈت الہ آباد (پریاگ راج) سے خطاب کے لیے آئی تھیں۔ جلیل عباسی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''لڑکیاں کافی جوش میں تھیں، جلوس میں بھی لڑکیاں آگے آگے چل کر آئی تھیں۔ چناں چہ جب مسز وجے لکشمی پنڈت وہاں آئیں تو انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ملک کی آزادی کی تحریک میں صرف لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی برابر کی شریک ہیں۔''5

اسی سال جلیل عباسی، سردار جعفری اور ان کے ساتھی بھی گرفتار ہوئے۔ ہوا یوں کہ دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سر موریس لنفورڈ گوئیر لکھنؤ یونی ورسٹی کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے آنے والے تھے۔ یونی ورسٹی انتظامیہ نے متحرک طلبہ کو سر ماریس کا استقبال اور ان کی خاطر مدارات کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ جس میں جلیل عباسی بھی شامل تھے۔ دہلی یونی ورسٹی سے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دو طلبہ کو نکال دیا گیا تھا جب لکھنؤ میں جلیل اور فیڈریشن کے دوسرے طلبہ کو اس کی خبر ہوئی تو ان لوگوں نے اپنے ساتھیوں کی حمایت میں سر ماریس کا نہ صرف استقبال کرنے سے انکار کیا بلکہ ان کے خلاف مظاہرے بھی کیے۔ اس مظاہرے نے تشدد کا روپ اختیار کر لیا اور وائس چانسلر بھی زخمی ہو گئے۔ اس وجہ

سے جلیل کے ساتھ ان کے تمام ساتھی گرفتار کیے گئے، حالاں کہ جلیل نے بھیڑ سے بچا کر سر ماریس کو محفوظ مقام پر پہنچایا تھا، لیکن انگریز حکومت کے عتاب کا شکار تمام طلبہ ہوئے۔ جلیل عباسی نے جیل کے شب و روز کو خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ جیل کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیا دن تھے بے فکری کے، سوائے ملک کی آزادی کے سر میں کوئی اور سودا نہیں تھا۔ ہمہ وقت گفتگو کا یہی موضوع رہتا تھا کہ ملک کیسے آزاد ہو۔ کمیونسٹ ہو یا انارکسٹ، سوشلسٹ ہو یا کانگریسی، اعتدال پسند ہو یا انقلابی، ہر شخص آزادی وطن کے جذبے سے سرشار تھا۔''6

جون 1941 میں جلیل عباسی اور سردار جعفری رہا کر دیے گئے تھے۔ 1942 میں گاندھی جی اور کانگریس نے انگریزوں کے خلاف بھارت چھوڑو تحریک کا آغاز کیا۔ انگریزی حکومت نے اسے غیر قانونی قرار دے کر تمام بڑے سیاست دانوں کو گرفتار کر لیا۔ اس گرفتاری سے ہندوستانی عوام کافی مشتعل ہوئی، ان لوگوں نے سرکاری خزانوں، عمارتوں اور بینکوں کو لوٹ کر نظر آتش کرنا شروع کیا۔ پورے ملک میں اس تحریک کے سبب بے شمار گرفتاریاں ہوئیں۔ جلیل عباسی نے اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کے ساتھ حکومت کے خلاف مورچہ کھول دیا جس میں کانگریس، کمیونسٹ کے ساتھ مسلم لیگی طلبہ بھی پیش پیش تھے۔ حکومت کے خلاف مظاہرے و احتجاج کیا اور اپنی گرفتاری بھی دی۔ پہلی بار جب مصنف جیل سے رہا ہوئے تو کمیونسٹ پارٹی کو جوائن کر لیا تھا لیکن بعد میں جب یہ پارٹی مسلم لیگ کا ساتھ دینے لگی تو پارٹی سے الگ ہو گئے اور کانگریس کی کھل کر حمایت کرنے لگے۔ بعد ازاں اسی پارٹی کے ممبر بنے اور تا حیات اسی سے جڑے رہے۔

جداگانہ انتخابات کے اصول پر 1946 کے انتخاب میں جلیل کے بھائی عدیل عباسی بھی کانگریس کی طرف سے ضلع بستی کے ڈومریا گنج کے امیدوار تھے۔ یہ تقسیم سے پہلے آخری جداگانہ انتخابات تھا۔ جلیل عباسی کانگریس اور بھائی کی حمایت میں لوگوں کے درمیان ووٹ دینے کی اپیل کر رہے تھے۔ اس انتخاب میں ان کے بھائی کو شکست ہوئی، غرض کہ اکثر مقامات میں یعنی سرحد کو چھوڑ کر تمام صوبوں میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس انتخابات نے یہ واضح کر دیا کہ مسلمانوں میں تقسیم کا جذبہ کس قدر گھر کر گیا ہے، اس نے تقسیم ہند پر مہر ثبت کر دی تھی۔ قاضی جلیل عباسی لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ لگا کر مسلمان امیدواروں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا کیا تھا۔ کانگریس کی پوزیشن مسلمانوں میں اچھی نہ تھی پھر بھی مسلمان امیدوار کانگریس ٹکٹ پر

کھڑے کیے گئے.....کانگریس کے زیادہ تر امیدوار ہار گئے اور مسلم لیگ بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئی.....اس طرح مسٹر علی جناح کو قیام پاکستان کا مضبوط اعلیٰ اور انگریز کو ملک کی تقسیم کرنے کا ایک جواز حاصل ہو گیا۔''7

مذکورہ خودنوشت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ 1946 کے الیکشن میں مسلم لیگ نے ملک میں فرقہ واریت کو اس قدر ہوا دی کہ جو کانگریسی مسلم تھے، ان کا جینا دوبھر ہو گیا۔ حالاں کہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ فرقہ واریت اور دوقومی نظریہ بہت پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا۔ کچھ کانگریس کی پالیسیوں وضد اور انگریزوں کا بھی کانگریس کا ساتھ دیتے ہوئے مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا، پھر کانگریس کے بڑھتے رسوخ کو کم کرنے کے لیے انگریزوں کا مسلم لیگ کا ساتھ دینا، علاوہ ازیں ہندو مسلم فسادات، شدھی و سنگھٹن، ہندو مہاسبھا اور تبلیغ جیسی تنظیموں نے جس طرح فرقہ واریت کو بڑھاوا دیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو ملک میں نفرت کی دیوار کو مضبوط کر رہی تھیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ سیاسی داؤ پیچ کو مدنظر رکھ کر مسلم لیگ نے جب ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل خطرے میں دیکھا تو کن حالات میں ایک الگ ملک کی مانگ کی۔

اگر تمام حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ الگ ملک کی مانگ جن حالات میں کی گئی تھی وہ بجا تھی یا نہیں۔ اگر مسلم لیگ کے ساتھ کانگریس نے مفاہمت کی ہوتی اور دونوں کانصب العین محض ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہوتا، مسلمانوں کے حقوق پر اور کیبنٹ مشن پلان پر کانگریس نے اپنی منظوری دے دی ہوتی تو شاید ملک کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ جب کہ جلیل عباسی کی خودنوشت سے کم سے کم مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ غلطی محض مسلم لیگ کی تھی۔ دراصل وہ کانگریس کے پکے رہنما تھے اور شاید اسی وجہ سے وہ صرف ایک پہلو سے حالات کا جائزہ لیے ہوں۔ بہر حال یہ سچ ہے کہ مذکورہ الیکشن کے دوران اور بعد میں فرقہ واریت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی، ہندو مسلم جان کے دشمن بن گئے تھے اور الیکشن کے نتائج نے تو اس دشمنی کو مزید تقویت بخشی۔

اس الیکشن میں جو مسلم کانگریسی امیدوار تھے یا جتنے مسلمان کانگریس کے حمایتی تھے ان سے مسلم لیگی یہی طنز کرتے رہتے کہ تم تو ہندو ہو گئے ہو، مسلمانوں کی حمایت کے بجائے کانگریس کا ساتھ دیتے ہو۔ لیکن یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ مسلم کانگریسی ایسے بھی تھے جو تقسیم اور مسلم لیگ کے سخت خلاف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ دونوں پارٹیوں کو بات چیت کے ذریعہ کوئی درمیانی راستہ نکالنا چاہیے۔ لیکن ملک کی ہوا اس قدر مکدور ہو گئی تھی اور اتنا زہر بھر دیا گیا تھا کہ ہر کوئی حقیقت کو سمجھنے کے بجائے بس ہندو مسلم کا رٹا رٹایا نعرہ لگا رہا تھا۔ عوامی سطح پر مذہبی تعصب بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے

علاوہ دونوں پارٹیوں کے درمیان رسہ کشی بھی جاری تھی۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی پارٹی اور کانگریس کو ہندوؤں کی پارٹی سمجھا جا رہا تھا، اسی وجہ سے مذہبیت میں ڈوبے مسلمان، کانگریس کے مسلم ممبران اور کارکنوں کو طعنے دینے سے بھی نہیں چوک رہے تھے۔ اس تعلق سے جلیل عباسی لکھتے ہیں:

> ''مسلم لیگ کے قائدین نے فرقہ پرستی کو اتنی ہوا دی کہ قوم پرور علمائے دین بھی مسلم عوام کی ہدف ملامت کا نشانہ بنے، ان پر ہر طرح کے نازیبا اور رکیک حملے کیے گئے۔ ان کو ہندوؤں کے زرخرید غلام اور کتے کہا گیا۔ وہ جب مسجدوں سے نکلتے تو مسجدیں دھلوائی جاتیں۔ مولانا آزاد جنہیں تحریک خلافت کے دوران مسلم عوام نے امام الہند کا خطاب دیا تھا ایسے مرتد قرار پائے کہ انہیں کلکتہ میں عیدین کی نماز کی امامت نہیں کرنے دی گئی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ نے مولانا آزاد کے سامنے ننگے کھڑے ہو کر ان سے بدکلامی کی۔''8

مصنف کے بھائی اس الیکشن میں کانگریس کے امیدوار تھے اور وہ ہر لحاظ سے موزوں بھی تھے لیکن اسی پروپیگنڈے کے شکار وہ بھی ہوئے، ان کے جان پہچان کے لوگ کہتے تھے کہ آپ تو ہندو ہو گئے ہیں آپ کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں۔ لوگوں کے ذہن اتنے مسموم ہو گئے تھے کہ وہ بہ آسانی بہک جاتے تھے۔ مذکورہ خودنوشت میں جلیل عباسی نے اس تعلق سے کئی واقعات تحریر کیے ہیں۔ ایک واقعہ انہوں نے بیان کیا ہے جس کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے، 'ایک دفعہ مصنف ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے لوگوں کو کانگریس کی پالیسیوں اور مقاصد بیان کر رہے تھے جس میں تقسیم کے خوں ریز نتائج سے آگاہ کیا اور ان کے مذہبیت پر سوال کرتے ہوئے لوگوں کو مسٹر جناح کی تصویر دکھا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ تم سب ان کا ساتھ کیوں دے رہے ہو یہ تو انگریزوں کی طرز پر زندگی گزارتے ہیں، ان کا دین سے زیادہ واسطہ نہیں ہے، اور مولانا آزاد کی تصویر دکھا کر جب یہ کہا کہ ایسے عالم دین کا ساتھ تم سب چھوڑ رہے ہو جو اسلام اور وطن کے لیے اپنا سب کچھ لٹا رہے ہیں۔ تو مجمع سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ صاحب کیوں جھوٹ بول رہے ہو، وہ مولانا آزاد کی تصویر کو جناح کی تصویر بتا کر کہنے لگا کہ جو نماز روزے کا پابند ہو، داڑھی رکھ کر سنت نبوی کو بڑھاوا دے رہا ہو، اسلام کا سچا علم بردار ہو ہم کیوں نہ اس کا ساتھ دیں۔' اندازہ لگائیے کہ کتنی خطرناک سطح پر سازش کے ذریعہ گاؤں و دیہات کے معصوم مسلمانوں کو بہکایا جا رہا تھا۔

جلیل عباسی اتر پردیش سے تعلق رکھنے کے سبب اس صوبے کے مختلف مقامات میں جا کر لوگوں کو یہ بھی سمجھاتے

رہے کہ اگر ملک تقسیم بھی ہوگا تو یو پی ہندوستان میں ایسی جگہ ہے کہ وہ ہر حال میں ہندوستان میں ہی رہے گا۔ کیوں مسلم لیگ کا ساتھ دے کر، قیام پاکستان کی مانگ کر کے ہندو مسلم فساد کو ہوا دے رہے ہو، اور دونوں کے درمیان جو اختلاف پیدا ہو چکا ہے اسے مزید تقویت دے رہے ہو۔ جب کہ محمد علی جناح نے بھی یو پی کے متعلق واضح کر دیا تھا کہ اتر پردیش کے مسلمانوں کو ہندو غلبہ برداشت کرنا ہوگا اور اپنے مسلمان بھائیوں کے امداد میں ان کو قربانی بھی دینی ہوگی۔ لیکن لوگوں کے ذہن مقفل ہو چکے تھے۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگائے بغیر بڑا مضحکہ خیز جواب دیتے، دراصل مسلم لیگ کے پروپیگنڈے نے لوگوں میں مذہبی جنون کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جس کا تفصیلی ذکر خودنوشت میں موجود ہے۔

یہاں تک کہ اُس گندی سیاست نے خاندان کو بھی منتشر کر دیا تھا۔ جلیل عباسی کی ایک بہن کا خاندان اور ان کے بھائی بھی مسلم لیگی کارکن تھے۔ لیکن یہ لوگ کوئی اوچھا حربہ استعمال کیے بغیر ایمانداری سے قیام پاکستان کو مسلمانوں کے حق میں مفید سمجھ کر سرگرم عمل تھے۔ لیکن ایک بھائی عدیل عباسی کانگریسی امیدوار تھے، دونوں بھائی ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ اس سلسلے میں جلیل عباسی کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''حقیقی بھائی مقابلہ میں تھا جو کانگریسی ٹکٹ پر کھڑا تھا، اس کی لیاقت، اس کی خدمات اور اس کی دین داری مسلمہ تھی۔ یہ بھی معلوم تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو یو پی کی کانگریسی وزارت میں اس کی شمولیت یقینی ہے۔ لیکن مسلم لیگ کا زہر اتنا سرایت کر چکا تھا کہ ان باتوں کا کوئی لحاظ نہیں تھا۔ بھائی اپنے ہاتھ سے اپنے بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ وہی بھائی اپنے بھائی کے خلاف زہر اگل رہا تھا، 'مسلمانوں! ایک بکس ہے جواہر لال کا اور ایک بکس ہے محمد ﷺ کا بولو! کس میں ووٹ ڈالو گے۔' مسلمان اس کے جواب میں گلے کی پوری طاقت سے نعرۂ تکبیر لگاتا تھا۔ کیا بھوت سوار تھا، کسی ذاتی عناد کی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی وقومی مسائل کے غلط ادراک کے تحت بھائی نے بھائی کی، ماں نے بیٹے کی، بیٹے نے باپ کی اور میاں نے بیوی کی مخالفت اس شد و مد سے کی کہ سیاسی اختلافات کے جلوس میں ذاتی اختلافات بھی جنم پا گئے اور الیکشن کے بعد بھی اختلافات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہ اختلافات بھی اکثر صورتوں میں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانے کے محرک بنے۔''9

مذکورہ بالا اقتباس سے اس وقت کے حالات کی سنگینی، لوگوں کے ذہن اور نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جمیعتہ العلمائے ہند اور بارسوخ مسلم رہنماؤں کو بھی نہیں بخشا گیا تھا، یہ لوگ بھی تقسیم کے خلاف تھے۔ مسلم لیگ قائدین

پاکستان بنانے کے چکر میں یہاں کے کروڑوں مسلمانوں کو مذہب کے سہارے جنت ارضی کا خواب دکھایا تھا اور جب ملک تقسیم ہوا تو وہی قائدین محض اپنی فکر میں لگے رہے اور ان مسلمانوں کو مرتا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے جنہوں نے پاکستان کے قیام میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ نئے ملک میں اتنی وسعت کہاں تھی کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی منتقلی ممکن ہوسکتی۔ 1946 کے انتخابات اور بعد میں مسلم لیگ کے مذہبی نظریات نے لوگوں کو خوب متاثر کیا جس کی وجہ سے مسلمان نتیجے کا اندازہ لگائے بغیر بڑھ چڑھ کر ان کا ساتھ دیا۔

قیام پاکستان کے پہلے اور اس کے بعد ملکی سیاست جن خطوط پر چلی، فرقہ واریت اور مسلم لیگ کی مذہبیت نے حالات کا جو رخ اختیار کیا اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ یہاں کی اکثریت یعنی ہندوؤں کی نظر میں مسلمان مشکوک ہو جاتے، اور ہوا بھی یہی۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غم وغصہ کے جذبات بڑھ گئے اور فرقہ پرور ہندو مبلغین کو مخالفت میں زہر افشانی کرنے کا موقع مل گیا۔ بس پھر کیا تھا پورے ملک کو فسادات کی آگ نے لپیٹ لیا۔ حالاں کہ مسلم اقوام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا بھی تھا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا ان کی وفاداری ہمیشہ کے لیے مشکوک ہوگئی۔ اس نازک دور میں ان مظلوم مسلمانوں کا ساتھ ان ہی مسلم رہنماؤں نے دیا جو تقسیم کے خلاف تھے، جن کو مسلم لیگ کی ایما پر کانگریس کے نام پر ذلیل کیا گیا تھا۔ ان ہی رہنماؤں نے فرقہ پرستی کو روکنے میں جی جان سے محنت کی تھی۔ ان رہنماؤں میں سر فہرست مولانا آزاد تھے۔

بہر کیف کہنا یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہاں کے مسلمانوں کو سبز باغ دکھایا انہوں نے ہی ان کے تحفظ اور جان و مال کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اسی وجہ سے آج تک مسلمان شک وشبہ کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ آج بھی ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ جب کہ پاکستان بنانے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ تقسیم کے بعد ساری قیامت یہاں پر رہ گئے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ تر لوگوں نے ہجرت کے بجائے اپنے ہی وطن میں رہنے کو ترجیح دی۔ علاوہ ازیں ایک بڑا طبقہ بخوشی اپنے مستقبل کی فکر میں ہجرت کی، تو ایسے بھی ہیں جن کو زبردستی ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا یہی لوگ تھے جو اپنا سب کچھ لٹا کر جان بچا کر بھاگ رہے تھے اور یہی وہ لوگ تھے جن کو سب سے زیادہ نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

1946 میں تقسیم پر مہر لگتے ہی جو فساد شمالی ہندوستان میں شروع ہوا وہ تقسیم کے بعد خطرناک روپ اختیار کر گیا۔ ہندوستان تو آزاد ہوا لیکن پورے ملک میں کشت وخون کا بازار گرم تھا۔ جلیل عباسی کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''1947 میں ملک کی تقسیم کے بعد ایسا ہنگامہ برپا ہوا جیسے جوالا مکھی پہاڑ پھٹ پڑا ہو۔ فرقہ واریت اپنے شباب پر تھی، جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے۔ فرسٹ کلاس میں بھی سفر کرنے والا محفوظ نہیں تھا۔ ٹرین روک کر اور مسلمانوں کو تلاش کر کر کے بے رحمی سے مارا جا رہا تھا۔ اس بات کی شناخت کے لیے کہ وہ مسلمان ہے یا نہیں اکثر پاجامہ اتروا دیا جاتا تھا۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد حکومت نے ہر ٹرین میں ایک بوگی الگ کرا دی تھی جس میں صرف مسلمان بیٹھ سکتے تھے۔ دو سپاہی ان کی حفاظت کی خاطر بندوق لیے بوگی کے اندر موجود رہتے تھے۔''10

تقسیم کے بعد حالات بے قابو تھے۔ لوگ جوق در جوق جان بچا کر بھاگے جا رہے تھے۔ اتر پردیش کانگریس کمیٹی نے صوبہ کے فسادات پر قابو پانے، مسلمانوں کے ہجرت کو روکنے اور ان کو سمجھانے کے لیے دو دو کی تعداد میں کانگریسیوں کو جگہ جگہ معمور کیا تھا۔ جلیل عباسی کو جھانسی اور جالون کے علاقوں میں تعینات کیا گیا۔ جھانسی اور آس پاس کے علاقوں میں مسلمان خوف و دہشت سے ہجرت کر گئے تھے۔ جب جلیل عباسی نے وہاں کے حالات معلوم کیے تو پتہ چلا کہ خود کانگریس اور بقیہ ورکر کمیٹی کے لوگ فرقہ پرستی میں آ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ للت پور جو کہ جھانسی سے قریب ہی ایک علاقہ تھا وہاں کے حالات جلیل عباسی نے جب معلوم کرنے چاہے تو ان کو وہاں کی کانگریس کمیٹی کے صدر نے یہ بتا کر ٹالنا چاہا کہ للت پور میں شانتی ہے اور سارے مسلمان خود ہی پاکستان چلے گئے ہیں۔ لیکن جب مصنف وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ صورت حال کچھ اور ہے۔ بقول جلیل عباسی شہر میں کانگریس کمیٹی کے عہدے دار اور دیگر لوگ فرقہ پرستی کا شکار ہو چکے تھے۔ یہ پہلو کانگریس کے لیے کتنا ہی افسوس ناک رہا ہو لیکن حقیقت یہی تھی۔ جو مسلمان اس علاقے میں رہ گئے تھے ان سے ملاقات کر کے حالات معلوم کرنا چاہا اور ان سے بات کرنی چاہی تو ان لوگوں نے مارے خوف کے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس تعلق سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''میں نے دو ایسے مسلمانوں سے الگ الگ ملاقات کی لیکن مجھے انتہائی افسوس ہے کہ وہ لوگ اتنا سہمے ہوئے تھے کہ سوائے یہ کہنے کہ سب ٹھیک ہے، کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں نے بے حد خوشامد کی اور ہزار ہا سمجھا کر کہا کہ یہاں کوئی نہیں ہے ساری باتیں آزادی سے بتاؤ اور ڈرو نہیں، لیکن حالاتِ زمانہ نے انہیں اس درجہ خوف زدہ اور مایوس کر دیا تھا کہ ان اللہ کے بندوں نے ایک لفظ بول کر نہیں دیا۔''11

فسادات اور قتل و غارت گیری سے جلیل عباسی کو بہت افسوس تھا وہ گھوم گھوم کر لوگوں کے درمیان جاتے ،انہیں سمجھاتے اور متحد رہنے کی تلقین کرتے۔ مذکورہ خودنوشت میں ایک بار سوخ تاجر حافظ جی کا ذکر ملتا ہے۔ جو کہ سیاسی طور پر کانگریسی تھے اور موقع محل پارٹی کو امداد بھی پہنچاتے تھے۔ مشہور کانگریسی شری دھولیکر نے ایک بار ان سے کہا کہ آپ پاکستان کیوں نہیں گئے، جب انہوں نے بتایا کہ میرا وطن یہی ہے تو دھولیکر نے جواب دیا کہ آپ کے لیے بس دو جگہیں ہیں پاکستان یا پھر جیل۔ حافظ جی یہ سن کر کافی گھبرائے اور دو تین دن کے اندر ہی اپنی ضروریات کی چیزیں لے کر ایک بس کے ذریعہ مع اہل وعیال پاکستان روانہ ہو گئے۔

حالاں کہ مقامی ہندوؤں نے ان کو بہت روکا اور ان کی حفاظت کا وعدہ بھی کیا لیکن وہ اتنا ڈر گئے تھے کہ کسی کی نہیں سنی ،وہ اپنی ساری زمین و جائیداد اپنے ایک ہندو منشی کو سونپ گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس علاقے کے مسلمانوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ سب کے سب بدحواسی کے عالم میں بھاگنے لگے اور دیکھتے دیکھتے پورا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا جو رہ گئے تھے جن کی تعداد نہ کے برابر تھی وہ تحصیل کے احاطے میں پولیس کی نگرانی میں رکھے گئے۔ جھانسی میں بھی کانگریسی صدر کے تعلق سے لکھتے ہیں 'وہ بھی دھولیکر کی طرح مسلمانوں کی دل آزاری کرتے رہتے۔ جب جلیل عباسی کو معلوم ہوا تو ان کو سمجھایا تب انہوں نے وعدہ کیا کہ اب وہ غلط بیانی سے کام نہیں لیں گے۔

جھانسی کے بعد مصنف جالون گئے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ جھانسی وللت پور کے مقابلے میں جالون کے حالات اچھے تھے۔ وہاں پر کانگریسی کارکن رات دن محنت کر کے لوگوں کو متحد رکھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہاں کے اکثر مسلمان ملک کے دوسرے خطے کے دل سوز واقعات کو سن سن کر خوف زدہ تھے اور پاکستان جانے میں ہی اپنی بھلائی سمجھ رہے تھے۔ حکومت کی جانب سے ان کے تحفظ کا یقین دلا کر ان کو پرسکون کرنے کی کوشش کی جاتی۔ خیر ملک کے دوسرے حصے سے مسلمان جب پاکستان پہنچتے اور اپنے اوپر ٹوٹی قیامت کو بیان کرتے تو وہاں کے مسلمان ہندوؤں کی جان و مال کو لوٹ کر بدلہ لیتے یہی حال ہندوستان میں بھی تھا۔ شرنارتھیوں کے قصے سن سن کر یہاں کے لوگ مسلمانوں کا چن چن کر کشت وخون کر رہے تھے۔ اس وقت ملک کے حالات وفسادات اور اپنے سفر کی روداد پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے جلیل عباسی لکھتے ہیں:

> ''میری زندگی کا یہ سفر میرے حافظے میں اب تک صرف اس لیے محفوظ رہ گیا کہ اس میں، میں نے انسانیت کا خون ہوتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کسی سیکولر ملک کی اس سے بڑی اور کیا توہین ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے ٹرین میں الگ بوگی لگائی جائے۔

دراصل بات یہ تھی کہ پاکستان کا وجود نفرت کے بیج کا پھل تھا جس سے سارا ملک نفرت کی آگ میں جل رہا تھا۔ ہر ہندو ہر مسلمان کو شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ روزانہ قافلے کے قافلے پاکستان سے ہندوستان آرہے تھے جس کا انتہائی برا اثر یہاں کی ہندو آبادی پر پڑ رہا تھا اور وہ آنے والے کے حالات سن سن کر اپنے دماغ کا توازن کھو بیٹھتے تھے اور اپنے شہر یا گاؤں کی مسلم آبادی پر بدلہ کی نیت سے حملہ آور ہوتے تھے۔''12

اس وقت کے بگڑتے حالات پر قابو پانے کے لیے کانگریس کے ورکرس اور مخلص رہنما اپنی انتھک کوششوں سے نفرت کی آگ کو بجھانے میں کار بند رہے۔ ان کی دن رات کی محنت کی بدولت ہی ملک کی مسموم فضا پر قابو پایا جا سکا۔ جلیل عباسی نے خودنوشت میں واضح کیا ہے کہ جہاں ہندو تو تنظیم یا کانگریس لیڈروں میں تعصب غالب تھا وہاں حالات بہت خراب اور کشیدہ تھے، وہاں مسلمانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچلا جا رہا تھا اور ان کے جان و مال کو تہہ و تیغ کیا جا رہا تھا۔ اس کے برعکس جہاں پر غیر مسلم اور سیاستدان کھلے ذہن کے تھے یا ان میں انسانیت تھی، ان علاقوں میں وہ اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ دراصل پاکستان کی بنیاد نفرت پر پڑی تھی جس کا شکار مسلمان صرف اس وقت ہی نہیں بلکہ آج تک ہو رہے ہیں۔

30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کے قتل کے بعد پورے ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اور عوام پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹا، اس کی عکاسی مذکورہ خودنوشت میں بڑے دل سوز انداز میں ملتی ہے۔ گاندھی جی کی موت کی خبر نے مصنف کو بھی بد حواس کر دیا تھا۔ جس طرح مسلمانان ہند سوچ رہے تھے کہ اب ہماری رہنمائی کون کرے گا، کچھ ایسے ہی سوالات نے جلیل عباسی کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''مجھے آج تک وہ الم ناک منظر نہیں بھولا کیوں کہ گاندھی جی کی موت بلکہ شہادت ہندوستان کی تاریخ کا سنگین ترین المیہ تھا۔ ہمارے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ گاندھی جی نہیں رہے تو اب مسلمان کے تحفظ اور حقوق کے لیے کون لڑے گا۔ پانی پت کی مسجدیں، دہلی کی عبادت گاہیں جن پر سکھوں نے قبضہ کر رکھا تھا انہیں گاندھی جی نے برت رکھ کر واگذاشت کرایا تھا۔ اب اگر ایسے مواقع آئیں گے تو کون یہ کام کرے گا۔ تقسیم ہند کے بعد لاکھوں پناہ گزینوں کے ایک ملک سے دوسرے ملک کو نقل وطن نے قتل و غارت

گیری اور فتنہ و منافرت کی جو آگ بھڑکائی تھی اسے کون ٹھنڈا کرے گا۔''13

بیشتر مصنفین نے اپنی خودنوشت میں گاندھی جی کے قتل کے متعلق لکھا ہے۔ان تمام نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اگر قاتل کی شناخت فوراً نہ کی گئی ہوتی تو ملک ایک بھیانک آگ کی لپیٹ میں آ گیا ہوتا۔شاعر انقلاب جوشؔ اپنی خودنوشت ''یادوں کی برات'' میں لکھتے ہیں کہ ''اگر جواہر لعل نہرو نے قاتل کے نام کے اعلان میں ذرا سی تاخیر کی ہوتی تو پورا ملک مسلمانوں کے خون سے رنگ گیا ہوتا۔'' کچھ اسی طرح کا اظہار خیال جلیل عباسی بھی ''کیا دن تھے'' میں کرتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ اب سارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑیں گے، اب مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔پہلے ریڈیو نے خبر دی تھی کہ ایک پاگل نے مہاتما گاندھی کا قتل کر دیا ہے۔لیکن جلد ہی یہ بات صاف کر دی گئی کہ اس قتل کا مرتکب ایک پاگل ہندو نوجوان تھا۔اس خبر نے حالات کو سنبھال لیا اگر اس وضاحت میں تاخیر ہوگئی ہوتی تو خدا جانے کتنے بے گناہ فرقہ وارانہ جنون کا شکار ہو جاتے۔''14

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جو فساد برپا ہوئے تھے اور ہنوز اس کا بازار گرم تھا، گاندھی جی کے انتقال کے بعد سرد پڑ گئے۔نفرت کا جو سیلاب ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا، تھم چکا تھا۔گاندھی جی کی موت نے لوگوں کی آتماؤں کو جگا دیا تھا۔ان کے مرنے کے بعد جواہر لعل نہرو اور دیگر کانگریسی کارکنوں نے ملک میں شانتی بنائے رکھنے کی بھرپور کوشش کی، اس سلسلے میں خود پنڈت نہرو امن و شانتی کا پیغام لے کر آگے بڑھے اور مسلمانوں کی دل جوئی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔پنچ شیل کا اعلان کیا، جیو اور جینے دو کا نعرہ بلند کیا، امن بریگیڈ بنائے۔ملک کے کسی بھی گوشے میں فرقہ وارانہ فساد ہوتا تو تعصب سے پاک رہنماؤں کو تعینات کیا جاتا۔جنہوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر دونوں فرقوں کی جان بچائی۔نہ جانے کتنے ہندو اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی حفاظت کی اور نہ جانے کتنے مسلمانوں نے ہندوؤں کی جان بچائی۔

جلیل عباسی نے مذکورہ خودنوشت میں دہرہ دون کے فساد کا ذکر کیا ہے۔رفیع احمد قدوائی نے ایک ہندو مہابیر تیاگی نامی شخص کو جائے واردات پر بھیجا، جہاں مسلمانوں کو تہہ و تیغ کیا جا رہا تھا۔اس شخص نے مسلمانوں کے درمیان جا کر انہیں تسلی اور حوصلہ دیا کہ گھبراؤ مت، میں آ گیا ہوں، میری ٹیم تم لوگوں کو محفوظ مقام پر لے جائے گی، ان لوگوں نے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی۔مصنف نے گاندھی جی کے قتل کے بعد ملک کے بدلتے حالات کو پیش کرنے کے ساتھ

آپسی محبت واتحاد کے لیے کی گئی کوششوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔اس تعلق سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''کتنے ہندو کانگریسیوں نے مسلمان کے لیے جان دی،اور کتنے مسلمان کانگریسیوں نے اپنی قربانی دے کر ہندوؤں کی جانیں بچائیں۔فرقہ وارانہ فسادات کا یہ دوسرا رخ ہے۔ افسوس کی اس پر کسی نے خاطر خواہ محنت نہیں کی اور نہ زیادہ مواد اکٹھا ہوسکا ورنہ بحالیٔ امن کی خاطر یہ کوشش مفید ثابت ہوتی،لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ گاندھی جی کی موت نے فرقہ وارانہ نفرت اور کشیدگی کی فضا بدلی۔ یک جہتی اور میل ومحبت کا ماحول پیدا ہوا۔اسی لیے گاندھی جی کی موت کو موت نہیں سمجھنا چاہیے وہ امر ہیں ان کا پیغامِ محبت امر رہے گا۔''15

جلیل عباسی نے نہ صرف تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا بلکہ تقسیم کے بعد مسلمانان ہند کی دل جوئی بھی کی۔آزادی سے پہلے اتر پردیش میں مسلم لیگ کا اثر زیادہ تھا،نتیجتاً وہاں فرقہ پرستی بھی بڑھ گئی تھی۔جس کو انہوں نے نہ صرف حل کرنے کی کوشش کی بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی اس سلسلے میں کام کروایا۔آزادی کے بعد اتر پردیش میں مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی رہ گئی تھی جو ہجرت نہ کرسکی۔اس وقت وہاں کے حالات بھی کشیدہ تھے ایسے سخت اور مشکل دور میں جلیل عباسی سچے رہنما بن کر سامنے آئے۔حالات بدلنے کا بیڑہ اٹھایا،اس سلسلے میں کانگریس کی جانب سے الیکشن لڑے اور کامیاب بھی ہوئے۔ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے معاشرے میں پھیلی نفرتوں کو کم کرنے کی انتھک کوشش کی،یہ وہ حقیقت ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال ان سب کے علاوہ مذکورہ خودنوشت میں ان مہاجروں اور شرنارتھیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو اپنا وطن،زمین وجائیداد چھوڑ کر ہجرت کی تھی۔لیکن یہ بھی ایک کڑوی سچائی ہے کہ ہندوستان آنے والے شرنارتھی یہاں کے لوگوں میں پوری طرح ضم ہوگئے اور آج ان کا کوئی نام ونشان بھی نہیں ہے،نہ ہی ایسی کوئی پہچان ہے جس سے موجودہ نسل کو معلوم ہو سکے کہ شرنارتھی کون ہے۔اس کے برعکس پاکستان میں جو مہاجر ہیں آج بھی ان کی شناخت قائم ہے۔وہاں کے مقامی باشندے آج بھی یوپی،بہار سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو مہاجر سمجھتے ہیں۔جلیل عباسی کا کہنا کہ وہ لوگ ان مہاجرین کو اپنا سمجھ ہی نہیں سکے۔اسی طرح صوبہ بہار سے جو لوگ مشرقی پاکستان گئے ان کی حالت تو اور خراب ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد اس میں اضافہ ہی ہوا،وہ اپنے ہی ملک میں اجنبی ہوگئے،اور کیمپوں میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئے۔جلیل عباسی نے پاکستان کے سیاسی حالات پر کھل کر بحث کی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''تحریک پاکستان میں جو خارجی و داخلی تضادات شروع سے موجود تھے، وہ قیام پاکستان کے بعد ابھر کر سامنے آئے۔ وہاں کی مختلف قومیتیں اپنے اختلافات ختم کر کے ابھی تک مستحکم اور متحدہ پاکستانی قومیت کا شعور نہیں پیدا کر سکیں۔ کرسیٔ صدارت پر جو بھی بیٹھا، وہ قتل ہوا یا فوج نے اسے معزول کر دیا۔ آج تک پاکستان کو سیاسی استحکام حاصل نہ ہو سکا اور نہ ملک میں کوئی پائیدار آئین نافذ ہو سکا۔ پاکستان مذہبی جنون کی پیداوار ہے۔۔۔''16

یہ صحیح ہے کہ قیام پاکستان کے وقت کہا گیا تھا کہ وہاں اسلامی قانون نافذ ہوں گے بلکہ اس کی بنیاد جن چیزوں پر رکھی گئی تھی، دنیا دیکھ رہی ہے کہ آج اس میں ایک بھی باقی نہیں ہے۔ مولانا آزاد نے پاکستان کے متعلق انڈیا ونس فریڈم میں جو پینشن گوئی کی تھی وہ سچ ثابت ہوئی۔ تقسیم کے کچھ سال بعد ہی مشرقی پاکستان کا تنازعہ کھڑا ہوا اور وہ الگ ہو کر بنگلہ دیش کے نام سے نیا ملک بن گیا۔

ہندوستان میں بقول مصنف تمام اقلیتیں بشمولیت مسلم قوم عزت و وقار سے رہ رہی ہیں۔ آئین کی رو سے ہر کسی کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اس کے بنیادی حقوق مثلاً مذہب، زبان، ثقافت، پیشہ، نقل و حمل اور فکر و عمل کی پوری آزادی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کے تمام مسئلے حل ہو چکے ہیں۔ کشمیر کے مسلمانوں کی طرح ملک کے دوسرے خطے میں بھی جوان کے ساتھ آئے دن دلسوز واقعات ہوتے رہتے ہیں وہ بھی کسی سے چھپے نہیں ہیں۔ اسی طرح موجودہ حکومت نے این آر سی جیسی پالیسی لا کر بھی عوام کو مشتعل کر دیا ہے۔ بہر کیف اس سلسلے میں جلیل عباسی لکھتے ہیں:

''آج ہندوستان میں تمام اقلیتیں بشمولیت مسلمان عزت و وقار کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ لیکن کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ مسلم اقلیت کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات اب بھی بھڑک اٹھتے ہیں جن میں پولیس اور حکام کی غیر جانب داری بھی مشکوک ہوتی ہے۔ امتیاز و تعصب برتنے کی مثالیں بھی ملتی رہتی ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی ملک کے جمہوری نظام میں تمام اقلیتیں برابر کی شریک ہیں، کم از کم انہیں اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول یابی کے لیے آئینی طریقوں سے جدوجہد کی مکمل آزادی ہے اور عدلیہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔''17

مختصر یہ کہ جلیل عباسی نے اپنی خودنوشت میں ملکی سیاست کے ساتھ اپنی عملی سیاسی سرگرمیوں کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ آزادی کے بعد ملک کے حالات، فسادات، بعدازاں عوام میں اندرا گاندھی کی عوامی مقبولیت، ان کی شخصیت اور قتل، ان کے بیٹے سنجے گاندھی کی سیاسی سرگرمیاں، ان کی بھی حادثاتی موت، دونوں اموات پر عوام کا ردعمل، اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہونے والے سکھ ہندو فساد کا تذکرہ کیا ہے۔ بعدازاں راجیو گاندھی کے برسر اقتدار آنا اور پھر جلد ہی ملک کے طول عرض میں ان کی بڑھتی مقبولیت، ان کے ذریعہ ملک وعوام کے لیے کی گئی کارکردگی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بلکہ خودنوشت کا اختتام بھی راجیو گاندھی کے متعلق ذکر سے ہی ہوتا ہے۔ جلیل عباسی کی سیاسی زندگی میں کافی اتار چڑھاؤ آئے، انہیں ہدف کا نشانہ بھی بنایا گیا لیکن وہ میدان عمل میں جم کر کھڑے رہے اور اپنے مخالفین کا ڈٹ کر سامنا بھی کیا۔ مذکورہ خودنوشت میں سیاست کے ساتھ مصنف کے نجی حالات، شخصیت، اور ہم عصروں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بہرحال یہ خودنوشت تاریخی وسیاسی اعتبار سے خصوصیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ اس میں کئی ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو وقت کے ساتھ قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ قاضی جلیل عباسی، کیا دن تھے، جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی، 1975، ص: 13
2۔ ایضاً، ص: 10
3۔ ایضاً، ص: 15
4۔ ایضاً، ص: 56,57
5۔ ایضاً، ص: 97
6۔ ایضاً، ص: 110
7۔ ایضاً، ص: 131
8۔ ایضاً، ص: 132
9۔ ایضاً، ص: 134,135
10۔ ایضاً، ص: 137
11۔ ایضاً، ص: 141
12۔ ایضاً، ص: 144
13۔ ایضاً، ص: 171
14۔ ایضاً، ص: 170
15۔ ایضاً، ص: 172
16۔ ایضاً، ص: 136
17۔ ایضاً، ص: 135

اختر حسین رائے پوری: گرد راہ

سنہ اشاعت: 1984

گردراہ (اختر حسین رائے پوری)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شخصیت ادب کے ایک نابغۂ روزگار کی تھی۔ وہ ہمہ جہت ادیب تھے۔ ماہر تعلیم کے ساتھ ایک اچھے نقاد، محقق، مترجم بھی تھے۔ لیکن ان کی اولین شناخت بحیثیت افسانہ نگار کے ہے۔ اصل نام سید اختر حسین اور قلمی نام اختر حسین رائے پوری ہے۔ انہیں مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1935 سے کیا۔ حالاں کہ ان کا پہلا افسانہ 1933 میں ''زبان بے زبانی'' کے نام سے نیاز فتح پوری کے ''نگار'' میں چھپا تھا۔ ان کی پیدائش 12 جون 1912 کو رائے پور موجودہ چھتیس گڑھ میں ہوئی۔ والد سید اکبر حسین علی گڑھ اور طامس انجینئرنگ کالج، رڑکی سے فارغ التحصیل تھے، ان کا تعلق محکمہ آبپاشی سے رہا، وہ سرکاری ملازم تھے جس کی وجہ سے ان کا مختلف جگہوں پر ٹرانسفر ہوتا رہا۔ اختر حسین کی والدہ ممتاز النساء تعلیم یافتہ تھیں، وہ اردو، ہندی اور انگریزی زبان سے واقفیت رکھتی تھیں، ان کے مضامین ''تہذیب نسواں اور زیب النساء'' نامی رسالوں میں شائع ہوتے تھے محض 26 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اختر حسین تین سال اور ان کے بڑے بھائی چھ سال کے تھے۔ والدہ کی جانب سے وراثت میں دو گاؤں اور شہر میں خاصی جائداد ملی تھی۔ لیکن بعد میں ننہالی رشتہ داروں نے تمام جائداد پر قبضہ کر لیا۔ اس وجہ سے ان کے والد نے ننہالی رشتوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔

اختر حسین نے ابتدائی تعلیم روایتی ڈھنگ سے رائے پور میں حاصل کی۔ بچپن سے مطالعے کا شوق تھا۔ پہلے ہندی ادب کی طرف مائل ہوئے اور متعدد کتابیں پڑھ ڈالیں۔ بارہ برس کی عمر میں اردو کتب کی طرف متوجہ ہوئے۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کے مضامین ہندی زبان میں شائع ہونے لگے تھے۔ میٹرک میں امتیازی نمبر سے کامیابی ملنے کے بعد کلکتہ چلے گئے اور ودیاساگر میں داخلہ لے لیا وہاں سے انٹر پاس کر کے علی گڑھ سے بی۔ اے و ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد بنارس یونی ورسٹی سے ساہتیہ النکار کی ڈگری لی جو ایم۔ اے کے مساوی سمجھی جاتی ہے۔ پھر پیرس سے ''ہند کی سماجی تاریخ (سنسکرت ادب کے آئینے میں)'' پر ڈاکٹریٹ کیا۔ وطن واپسی کے بعد کئی چھوٹی بڑی نوکریاں کیں۔ ان کی عملی زندگی 1942 میں ایم۔ او کالج، امرتسر میں بحیثیت پروفیسر سے شروع ہو کر 1972 میں اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ختم ہوئی۔ اس دوران وہ برطانوی حکومت ہند کے معاون مشیر تعلیم، حکومت پاکستان کے نائب مشیر تعلیم اور یونیسکو کی نمائندے کی حیثیت سے حکومت صومالیہ اور حکومت ایران کے مشیر تعلیم کے فرائض انجام دیے۔

اختر حسین رائے پوری کا پہلا ہندی افسانہ سراج الدولہ سے متعلق ''پراجت'' کے نام سے لکھنؤ کے معروف

ہندی رسالہ ''مادھوری'' میں 1928 میں شائع ہوا۔ انہوں نے ہندی کے ساتھ اردو ادب میں اپنی متعدد تخلیقات کے ذریعہ ادب میں اضافہ کیا ہے۔ ادب سے ان کو حد درجہ لگاؤ تھا جس کا انہوں نے بذات خود اظہار کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں محبت اور نفرت، زندگی کا میلہ (افسانوی مجموعے)، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے افسانے، جبش اور اطالیہ، روشن مینار (تاریخ)، ادب اور زندگی (مضامین)، ادب اور انقلاب، سنگ میل (تنقیدی کتابیں)، شکنتلا، پیام شباب، پیاری زمین، گورکی کی آپ بیتی حصہ اول، روٹی کی تلاش، جوانی کے دن، مقالات گارساں دتاسی (تراجم) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انہیں نشان سپاس سے بھی نوازا۔ جون 1992 میں کراچی میں وفات پا گئے۔

اختر حسین نے اپنی سرگزشت ''گرد راہ'' کے نام سے لکھی ہے۔ جو کہ ''مشہور آفسیٹ پریس، کراچی سے 1984 میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت مختلف ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب ایک عنوان سے مزین ہے۔ اس خودنوشت کو لکھنے کی وجہ خود مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

> ''سولہ سال کی عمر میں علم کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا اور اب گرد راہ کو دامن سے جھٹکنے کی فرصت ملی ہے۔ ہر شخص عموماً اپنی ذات میں گم صم رہتا ہے۔ بہ ایں ہمہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد اور ماحول سے بہت کچھ اخذ کرتا ہے۔ احباب کا تقاضہ ہے کہ از سرِ نو قلم اٹھاؤں اور اپنی سرگذشت لکھ ڈالوں۔ مجھے اس میں تامل ہے۔ میں طبعاً خلوت پسند ہوں اور دنیا کو رازداں بنانا مجھے پسند نہیں۔ البتہ دوسروں کی طرح میں بھی اپنے دور کا گواہ ہوں۔''1

اختر حسین جس عہد میں پیدا ہوئے وہ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں تغیر کا زمانہ تھا۔ دنیا پہلی جنگ عظیم کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم وستم بڑھتے جا رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری، بے سروسامانی تھی۔ یقیناً ان حالات کا ان کی شخصیت پر ضرور اثر ڈالا ہوگا اور وہ اپنے عہد کے گواہ بھی رہے ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنی سرگذشت میں مطالعے اور مشاہدے سے جو بھی محسوس کیا، جن ہستیوں سے متاثر ہوئے، سب کچھ بلا تکلف لکھتے گئے۔

جب 1919 میں پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تھی تو ہندوستان میں برطانیہ کی جیت کی خوشیاں بڑے زور شور سے منائی گئی تھیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے وفاداروں کو انعام واکرام سے نوازا گیا تھا، جیل سے قیدیوں کو رہا کیا گیا تھا، اسکولوں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئی تھیں۔ اس وقت ہندوستان میں لوگ جدید ٹکنالوجی سے بہت دور تھے۔ لیکن اس

ذہنی پسماندگی کی تاریکی میں کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ انگریزوں کے ظلم و بربریت کے خلاف سیاسی بیداری کی لہر لوگوں میں اس تیزی سے اٹھے گی کہ انگریزوں کی بنیاد ہل جائے گی۔ 1918 میں گاندھی جی کے ہندوستانی سیاست میں آنے کے بعد ملک میں بڑی تیزی سے بدلاؤ آیا۔ ان کی قیادت میں کانگریسیوں وملکی عوام نے آزادی کے حصول کے لیے آواز اٹھانی شروع کی اور ولایتی چیزوں ونوکریوں اور خطابوں کے خلاف ترک موالات کی تحریک شروع کی۔

دوسری جانب علی برادران (مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی) کی رہنمائی میں مسلمان خلافت کے تحفظ کے لیے ''خلافت تحریک'' شروع کی۔ یہ دونوں تحریک آپس میں اس طرح گھل مل گئیں اور ہندو مسلمان اس طرح متحد ہوئے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایسا لگنے لگا کہ بہت جلد انگریزوں سے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ دونوں اقوام متحد ہو کر برطانوی حکومت کے خلاف سڑکوں پر اتر آئی۔ نہ صرف بدیسی مال کا ہی بلکہ انگریزی تعلیم کا بھی بائیکاٹ کیا گیا۔ وہ قیامت برپا ہوئی کہ انگریزوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اختر حسین اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''بائیکاٹ نامی ایک نیا لفظ لغت میں داخل ہو گیا۔ بدیسی مال کے ساتھ دفتروں اور تعلیم گاہوں کا بائیکاٹ بھی عام ہو گیا۔ ایسا ہنگامہ برپا ہوا کہ ہمارا خوابیدہ شہر بھی چونک پڑا۔ قومی خدمت گار قسم کے لوگ ریلوے اسٹیشن کا طواف کرنے لگے تاکہ آتی جاتی ٹرین میں کسی لیڈر کے درشن ہو جائیں۔ عورتوں نے پرانے چرخوں کی صفائی کی اور گاندھی جی کی ارشاد کی تعمیل میں ان پر سوت کاتنے لگیں۔ راہ گیر چھڑی کے بجائے تکلی ہاتھوں میں لیے پھرنے لگے اور محفلوں میں غزلوں کے بجائے قومی ترانوں کی صدا گونجنے لگی۔''2

اختر حسین بھی اس اتھل پتھل سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے ہونے والے اجلاس میں شرکت کرنے لگے اور تحریک کے پیغامات و چندہ وصول کرنے کے لیے لوگوں کے درمیان جاتے۔ جب کوئی سیاسی لیڈر شہر میں داخل ہوتا تو سب کے ساتھ مل کر جے جے کار کے نعرے لگاتے۔ ملک میں سرگرم کارکنوں کو پولیس گرفتار کر کے جیل بھیج رہی تھی۔ ان قیدیوں کو جن راستوں سے لے جایا جاتا تھا ان کی حوصلہ افزائی اور عظمت میں لوگ ان پر پھولوں کی بوچھار کرتے تھے۔ اس وقت اختر حسین کم عمر تھے لیکن ان کو اس وقت کے ماحول اور سیاست سے ایسی دلچسپی قائم ہوئی جو تادیر باقی رہی۔

ان کے والد سرکاری ملازم تھے اس کے باوجود سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ وہ ''الہلال'' اور''

کامریڈ'' جیسے اخباروں کے خریدار تھے۔ان پرچوں کے علاوہ قومی خیال کا کوئی نہ کوئی روزنامہ باقاعدگی سے منگاتے رہے۔ان کے جدامجد بھی انگریزوں کے مخالف تھے،ان کے ہی خاندان کے ایک بزرگ جنرل میر مدن پلاسی کی لڑائی میں شہید ہوئے تھے۔ان کے دادا سید شجاعت حسین اپنے دونوں بیٹوں سے اس لیے تاعمر خفا رہے کیوں کہ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔اختر حسین کے والد انگریزوں کے خلاف چلائی گئی بیشتر تحریکوں میں خفیہ طریقے سے حصہ لیتے رہے۔جس کی اطلاع حکام تک پہنچتی رہی۔ جب 1921 میں ناگپور میں کانگریس کا جلسہ ہوا تو ان کے والد نے چپکے سے اس جلسے میں شرکت بھی کی تھی،مجسٹروں نے سرکار کو خبر کر دی جس کی وجہ سے ان سے جواب طلب کیا گیا تھا۔ اس معاملے نے اتنا طول کھینچا کہ ان کی ترقی روک دی گئی جس پر انہوں نے احتجاجاً نوکری ہی چھوڑ دی۔

ترک موالات اور خلافت تحریک یہ دونوں جذبات پر مبنی تحریک تھی اور محض جذبات پر مبنی تحریک بھلا کب تک چل سکتی تھی۔ چناں چہ جب ترکوں نے خلافت کو خیر باد کہا تو ہندوستانی مسلمانوں نے بھی گھٹنے ٹیک دیے۔اسی طرح گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی پورے ہندوستان میں نافذ کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا کیوں کہ ملک کا ہر فرد عدم تشدد پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔اسی وجہ سے جب اتر پردیش میں چوری چورا کا سانحہ ہوا تو گاندھی جی نے تمام تحریکی سرگرمیوں کو بہ یک وقت روک دیا۔اس کے بعد سیاسی انتشار کا دور شروع ہوا جس نے نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کیا بلکہ کچھ وقت کے لیے کانگریس کا شیرازہ بھی بکھر گیا تھا۔لیکن ان دونوں تحریکوں کے دور رس نتائج سامنے آئے۔ معاشرے کا نچلا ودبا ہوا طبقہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے لگا۔لوگوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور آزادی کی للک بڑھ گئی۔اس سلسلے میں اختر حسین لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کا اثر دور رس ہوا اور صدیوں کے سوئے ہوئے سماج میں نئی جان پڑھ گئی۔تحریر و تقریر میں کہا جانے لگا کہ حقوق صرف زمینداروں کے نہیں بلکہ کسانوں کے بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے صوبے میں جو بے شمار اچھوت،اونچی ذات والوں کے قدموں تلے پڑے ہوئے تھے،اب اپنی نجات کا راستہ تلاش کرنے لگے۔یہ بھی سننے میں آیا کہ بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں کارخانوں کے مزدور ہڑتال کر رہے ہیں۔یہ عجیب خبر گشت لگانے لگی کہ روس میں مزدوروں نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔شہر کے تعلیم یافتہ نوجوان، پنڈتوں اور مولویوں پر نکتہ چینی کرنے لگے۔قومی زبانوں کے ادب میں بھی اب اظہار کے نئے نئے عنوان قائم ہونے لگے۔غرض یہ کہ وہ پرانی قدریں جو اٹل اور

امٹ سمجھی جاتی تھیں، رفتہ رفتہ مسمار ہونے لگیں۔''3

اختر حسین میٹرک کے بعد حصول تعلیم کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے وہاں داخلے کے ساتھ معاش کی فکر بھی تھی۔ بعد میں ایک ہندی اخبار ''وشوامتر'' میں جونیر سب ایڈیٹر کی پوسٹ پر تقرری عمل میں آئی۔ 1928 کے دسمبر ماہ میں کانگریس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں و پارٹیوں کا سالانہ اجتماع کلکتہ میں ہوا تھا جس میں اختر حسین بحیثیت رپورٹر شرکت کی تھی۔ یہیں سے ان میں سیاسی رجحان کا جذبہ پیدا ہوا۔ سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں یہ بڑے ذہنی انتشار کا دور تھا، پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد گاندھی جی اور علی برادران کی رہبری میں تمام ہندو مسلمان ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ بڑوں کے ساتھ بچے بھی قومی اور آزادی کے جذبوں سے لبریز نظر آ رہے تھے۔ ترک موالات اور خلافت تحریکوں نے برطانیہ سامراج کی چولیں تک ہلا دی تھیں۔ لیکن یہ دونوں تحریکیں عوام کے تشدد کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی ناکامی میں سب سے زیادہ نقصان ہندو مسلم اتحاد پر ہوا۔ اس وقت کے سیاسی حالات پر، چاہے خلافت تحریک ہو یا ترک موالات، یا نہرو رپورٹ اور اس کے نتائج ہو، یا سائمن کمیشن کا ذکر ہو مصنف نے اپنی خودنوشت میں ان تمام واقعے پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ بقول اختر حسین:

> ''عوام کو بے قابو ہوتے دیکھ کر گاندھی جی نے یک بیک ترک موالات کی تحریک کا دم گھونٹ دیا تو پہلے ہزیمت و انتشار اور بعد میں ہندو مسلم نفاق کا لاوا پھوٹ پڑا۔ آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا نے شدھی اور سنگھٹن کا ذکر چھیڑا تو مسلمانوں نے بھی تبلیغ و تنظیم کی صدا بلند کی۔ جگہ جگہ مسجدوں کے آگے باجے بجنے لگے، کہیں گؤکشی پر تلواریں چلنے لگیں۔ وہی صحافی و شاعر جو اتحاد کی تلقین کر رہے تھے، اب عوام کو عداوت پر ابھارنے لگے۔ مسلمانوں کی سیاست خلافت کمیٹی کے مجاوروں کے ہاتھ آ گئی اور مسلم لیگ میں ایسی کھنڈت پڑی کہ ایک کے رہنما جناح صاحب اور دوسرے کے سرغنہ انگریزوں کے مداح میاں محمد شفیع قرار پائے۔ گاندھی نے کانگریس سے روٹھ کر احمد آباد کے آشرم میں خلوت نشینی اختیار کر لی۔ کانگریس پر بنگال کے مشہور لیڈر سی آر داس اور پنڈت موتی لعل نہرو کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے کونسلوں میں شرکت اور آئینی اصطلاحات کا مطالبہ کیا۔ پنڈت سندر لال نے بطور احتجاج کانگریس کے جنرل سیکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور سی آر داس کے ناگہانی انتقال کی وجہ سے پنڈت موتی لعل نہرو کانگریس کے کرتا دھرتا بن بیٹھے۔ برطانیہ

کے لیے فضا ایسی سازگار ہوئی کہ اس نے 1937 میں سر جان سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن قائم کیا، جس کا سب نے بائیکاٹ کیا۔''4

یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ سائمن کمیشن 1928 میں ہندوستان آیا تھا۔لیکن اختر حسین نے اپنی خودنوشت میں 1937 لکھا ہے، جو کہ صحیح نہیں ہے۔1928 میں جب نہرو رپورٹ پیش کی گئی تو موتی لعل نہرو نے مسلمانوں کے معقول مطالبات کو ایک سرے سے مسترد کر دیا۔حالاں کہ اس وقت مسلم لیڈروں سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور اس وقت دوقومی نظریہ بھی منظر عام پر نہیں آیا تھا۔جب مسلمانوں نے اپنے حقوق کو مسترد ہوتے دیکھا تو ان کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا۔چناں چہ اس رپورٹ کے سامنے آتے ہی بیشتر مسلم کانگریسی لیڈروں نے، جن میں محمد علی جوہر، سعید قریشی وغیرہ نے پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔آگے چل کر یہی نا اتفاقی ملک کے بٹوارے کا سبب بنی۔بقول اختر حسین:

''یہ بھی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ پنڈت موتی لعل نہرو نے ہندو مسلم آئینی مصالحت کے جس امکان کو شدید صدمہ پہنچایا تھا وہ ان کے فرزند جواہر لعل نہرو نے ہمیشہ کے لیے یوں ختم کر دیا کہ انہوں نے 1946 میں برطانوی کابینہ مشن کے مصالحتی فارمولا کو رد کر کے تقسیم کی راہ ہموار کر دی۔یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔''5

مصنف نے اپنی خودنوشت میں اس دور کے سیاسی حالات کو کھل کر پیش کیا ہے۔انہوں نے سبھاش چندر بوس، سی آر داس اور راج گوپال آچاریہ ان تینوں کانگریسی لیڈروں کی تعریف کی ہے۔وہ مانتے تھے کہ یہ تینوں ایسے لیڈر تھے جو اپنی سوجھ بوجھ اور وسیع النظری کے ساتھ مسلمانوں سے مصالحت کی کوئی راہ نکال لیتے، لیکن سی آر داس کی اچانک موت اور بقیہ دونوں کی کانگریس سے نا اتفاقی کے سبب ایسا ممکن نہ ہو سکا۔مصنف نے کلکتہ کے اُس اجلاس کی سرگرمیوں اور تقاریر کا ذکر کیا ہے جس میں بحیثیت رپورٹر شرکت کی تھی۔اس وقت کلکتہ کی سڑکوں پر لوگ جھنڈا اٹھائے آزادی کے لیے آواز بلند کر رہے تھے اور فضا نعروں کے شور سے لرز رہی تھی۔

ان تمام سرگرمیوں کے بعد ہندو مسلم دونوں قوموں میں جو دوریاں پیدا ہوئیں اس کا اثر آج تک باقی ہے۔بعد ازاں فرقہ واریت بڑھنے لگی۔دونوں قوموں کے درمیان خلیج پیدا کرنے میں جہاں ہندوستانی لیڈروں نے غلطیاں کیں ان سے کہیں زیادہ انگریزوں کا ہاتھ ہے۔انگریزوں نے ہندوستان آنے کے بعد اول روز سے یہاں ایسی بساط بچھانی شروع کی تھی اور ایسی چال چلے تھے کہ آگے چل کر دوقومی نظریوں نے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔دونوں

قوموں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اپنی مشترکہ قدروں کو مسمار کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کی جو صدیوں سے چلی آ رہی تھیں۔ مصنف نے اس مشترکہ تہذیب کا ذکر بھی کیا ہے۔ جب دونوں قومیں آپسی میل ملاپ کے ساتھ رہتی تھیں۔ دیوالی پر مسلم گھرانوں میں چراغ جلائے جاتے تھے اور ہندو عید و بقرعید کی خوشیوں اور محرم کے موقعے پر ماتم میں شریک ہوتے تھے۔ بقول اختر حسین:

> ''ہولی اور دیوالی ہندوؤں کے تہواروں کی طرح محرم اور ماہ رمضان بڑی دھوم سے منائے جاتے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تعزیے اٹھاتے اور ان جلوسوں میں جوق در جوق شامل ہوتے تھے جو سواری کے نام سے رات کو مشعلوں کے ہجوم میں رواں ہوتے تھے۔ غرض کہ دس دن ماتم کے ساتھ میلوں اور تماشوں کی رونق رہتی تھی جس کا تصور بھی اب ممکن نہیں ہے۔ ہولی کی بات ہی نرالی تھی جب ہندو مرد و زن پچکاری سے رنگ پھینکتے، گلال ملتے گلی کوچوں میں نکل آتے تو سنجیدہ مسلمان گھروں میں چھپ جاتے۔ لیکن مجھ جیسے کم عمر بلا تکلف اس دل لگی میں شریک ہو جاتے۔''6

اس وقت ملک کو بچانے کی خاطر پہلا تقاضہ یہی تھا کہ قومی آزادی کے لیے قومی اتحاد کو برقرار رکھا جاتا۔ لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود کچھ شورش پسندوں کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ 1930 میں گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک نے تمام ہندوستانیوں کو انگریزوں کے خلاف لڑائی میں متحد کر دیا۔ اس کے تحت گاندھی جی کی قیادت میں 12 مارچ 1930 کو نمک قانون توڑنے کے لیے مشہور ڈانڈی مارچ نکالا گیا تھا۔ اس ریلی کو ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمک ستیہ گرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حکومت نے اخباروں کی گرم گفتاری کو دبانے کے لیے ان پر پابندی لگا دی تھی، نہ جانے کتنے لوگ گرفتار ہوئے۔ اخباروں کی پابندی کے بعد بابو مول چند اگروال (وشوامتر کے ایڈیٹر) نے سارے عملے کو دو ماہ کی تنخواہ دے کر چھٹی کر دی لیکن جب حکومت کی پابندی منسوخ ہوئی اور اخبار پھر سے شائع ہونے لگے تب اختر حسین بھی اپنی ملازمت پر واپس لوٹ گئے۔ بھگت سنگھ کے ایک قریبی کندن لال مصنف کے ساتھ کام کرتے تھے۔ 1931 میں بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد وہ گرفتار ہو گئے، حکومت کی پکڑ دھکڑ تیز ہوئی تو لوگوں کے مشورے پر 1932 میں اختر حسین علی گڑھ آ گئے اور وہیں سے وشوامتر کے لیے مضامین لکھتے رہے جس کے عوض میں ان کو 40 روپیہ ماہانہ ملتا تھا جو کہ ان کی تعلیمی خرچ کے لیے کافی تھا۔

اختر حسین نے دوسری جنگ عظیم کے وجوہات اور اثرات کا بھی ذکر اپنی سرگزشت میں کیا ہے۔ اس وقت

ہندوستان میں کیا کیا سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اس کو بھی بڑے جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ 1935 کے بعد نئے ملک کی مانگ تیز ہوگئی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے تئیں الگ الگ سمتوں میں رواں دواں تھیں۔ دوقومی نظریہ وجود میں آچکا تھا جس کی رو سے مسلمانوں نے مسٹر جناح کی سربراہی میں پاکستان کی مانگ شروع کر دی۔

ملک کے قوم پرست نوجوانوں نے کچھ خفیہ تنظیم بنائی جس میں دو نے جنگ آزادی میں خاصہ اہم کردار ادا کیا تھا۔ پہلی بنگال کی یگانتر پارٹی اور دوسری جلاوطن حریت پسندوں کی غدر پارٹی، آخرالذکر کے سرگرم رکن مولوی برکت اللہ بھوپالی تھے۔ یگانتر پارٹی کا اولین مقصد یہ تھا کہ بنگال کے منقسم حصوں کو پھر سے ایک کیا جائے جسے 1905 میں انگریزوں نے بانٹ دیا تھا۔ اس سلسلے میں انگریزوں کے خلاف کئی دہشت گردی کے واقعات ہوئے جن میں سب سے سنگین حادثہ علی پور بم کیس سے موسوم ہے۔ بھری عدالت میں انگریز سیشن جج کو ہلاک کرنے کے الزام میں خودی رام بوس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ جب بنگال کے دو ٹکڑوں کو پھر سے ملا دیا گیا تو اس پارٹی کا زور ٹوٹ گیا۔ ان تمام واقعات کی تفصیل مذکورہ خودنوشت میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی لسانی سیاست پر بھی مصنف نے بحث کی ہے کہ اس کی ابتدا کہاں سے اور کس جگہ ہوئی۔ نتیجتاً ہندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ بلند ہوا اور اردو کا تحفظ مسلم لیگ کے لیے ایک اہم نقطہ بن گیا۔ اختر حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''پہلے تو سمجھ نہ آیا کہ گاندھی جی نے خوامخواہ ہندی اردو کا قضیہ کیوں شروع کیا اور ادبی مسائل کے بجائے لسانی عداوت کیوں پیدا کی۔ بعد میں جا کر اصل بھید کھلا۔ گاندھی جی باخبر سیاست داں تھے لیکن ادبی وثقافتی معاملات میں ان کے مشیر کے ایم منشی اور کاکا کالیکر جیسے متعصب فرقہ پرست تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کو سمجھایا کہ ادب میں جدید خیالات عام ہو رہے ہیں اور اگر فوری طور پر ادیبوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع نہ کیا گیا تو وہ کسی اور طرف بہک جائیں گے۔ بنا بریں گاندھی جی جلسے کی تشکیل کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس کی تاریخ ہندی ساہتیہ سمیلن کے سالانہ جلسے کے ساتھ رکھی گئی جو ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔ اس طرح ساہتیہ پریشد کے جلسے میں ہندی کی طرفداری میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے اور پس پردہ یہ طے پایا کہ اسی وقت طے کرا لیا جائے کہ قومی زبان ہندی اتھوا ہندوستانی ہوگی۔ یہ تجویز کانگریس کے اس فیصلے کے منافی تھی کہ قومی زبان ہندوستانی ہو

گی۔جس سے مراد شمالی ہندوستان کی وہ بول چال کی زبان ہے جو ہندی یا اردو لکھی جاتی ہے۔''7

دراصل اس اجلاس میں یہ طے پایا تھا کہ ہندی/ہندوستانی زبان کو پرائمری اسکولوں میں لازم کیا جائے اور اردو کو مدارس بورڈ تک ہی محدود کیا گیا۔اسی اجلاس کا اور اس میں اردو کے تئیں بے رخی کی طرف آل احمد سرور نے بھی اپنی خودنوشت میں اشارہ کیا ہے۔اس کے بعد مولوی عبدالحق نے اردو کے تحفظ کے لیے تنظیم وادارے بنانے کی پہل کی۔وہ کہتے تھے کہ میں گاندھی جی کو قومی اتحاد کا داعی سمجھتا تھا لیکن وہ تو قومی زبان کو مٹانے کے درپے ہیں۔اب ہمیں اردو کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہنا ہوگا اور انجمن و تنظیم کو فعال ادارہ بنانا ہوگا اور اس پر انہوں نے کام بھی شروع کر دیا۔حکومت کی مخالفت میں انہوں نے انگریزی ہندی لغت نویسی کا کام ترک کر دیا۔اس واقعے کا ذکر اختر حسین نے تفصیل سے کیا ہے کیوں کہ اس اجلاس میں وہ بھی شامل تھے۔

اختر حسین 1937 میں پیرس گئے، وہاں کی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ پیرس میں ہی تھے۔انہوں نے جنگ کے دوران پیرس کے حالات اور تباہیوں کے ساتھ لوگوں کی پریشانیوں کو بھی پیش کیا ہے۔وہاں سے کافی مشکلات سہتے ہوئے ہندوستان لوٹے۔جنگ کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست اور عوام کی زندگی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔مسلم لیگ نے مارچ 1940 میں لاہور میں دوقومی نظریہ کی بنیاد پر وہ تاریخی قرارداد منظور کیا جس کے تحت برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کے حصول کے لیے تحریک شروع کی گئی اور سات برس کے بعد مسلم لیگ اپنا مطالبہ منظور کرانے میں کامیاب رہی۔حالاں کہ سب سے پہلے الگ ملک کا تصور 1930 میں علامہ اقبال نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کی تھی۔اس کے بعد ہی یہ مطالبہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔اس واقعے کا ذکر بیشتر خودنوشت نگاروں نے اپنی خودنوشتوں میں کیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی علیحدگی ایک مسلمہ حقیقت تھی لیکن ذات پات کے تعصّبات نے اسے اور بڑھاوا دیا۔بعد میں یہ خلیج اتنی بڑھی کہ الگ ملک کی مانگ شروع ہوگئی۔اختر حسین کہتے ہیں کہ مغرب میں سب سے پہلے پاکستان کا تصور متعارف کرانے کا سہرہ خالدہ ادیب خانم کے سر جاتا ہے۔انہوں نے اپنی کتاب INSIDE INDIA جس کا اردو ترجمہ جامعہ ملیہ نے ''اندرون ہند'' کے نام سے شائع کیا تھا۔اس کتاب کا نیا ایڈیشن جب چھپنے کو ہوا تو اس کی ایک کاپی خالدہ خانم نے اختر حسین کو بھی پڑھنے کے لیے دی تھی۔اس کا ایک باب چودھری رحمت علی کے منصوبے اور پاکستان کے بیان کے لیے وقف تھا۔بذات خود مصنف نے بھی سب سے پہلے پاکستان کا نام 1929 میں

چودھری رحمت علی کے ایک پمفلٹ میں پڑھا تھا۔

اختر حسین نے اپنی خودنوشت میں 1940 کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ 1942 میں ایم او کالج امرتسر میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے چلے گئے۔ وہاں پر نجی مشاغل کے ساتھ ہی وہاں کے حالات و واقعات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی آزادی یقینی تھی کیوں کہ برطانوی حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔ جنگ کے بعد برطانیہ کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ اس کے پارلیمنٹ تک ٹوٹے پڑے تھے، اپنا ملک سنبھالنا مشکل تھا تو مقبوضہ ملک کو کیسے سنبھالتا؟ چناں چہ بڑی جلد بازی میں دو سال کے اندر وقت سے پہلے ہندوستان کے ٹکڑے کر کے آزادی دے دی گئی۔ ان تمام حالات و واقعات کا تذکرہ ''گرد راہ'' میں ملتا ہے۔

شملہ کانفرنس جو کہ 1945 میں منعقد ہوئی تھی، جس میں تمام انتخابات کرانے کی تجویز رکھی گئی، جس کی رو سے پہلے اسمبلی اور بعد میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ اس میں مسلم لیگ اور کانگریس دو بڑی پارٹیوں نے انتخابات کرائے۔ کانگریس کا منشور تھا کہ جنوبی ایشیا کو ایک وحدت کی صورت میں آزاد کروایا جائے گا اور تقسیم کی کوئی اسکیم قابل قبول نہ ہوگی۔ کانگریس نے اس انتخاب میں اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگایا۔ ان کا ماننا تھا کہ ان کی پارٹی تمام مذہب اور فرقے کی نمائندگی کرے گی۔ جب کہ مسلم لیگ کا قرارداد پاکستان کے مطابق جنوبی ایشیا کو تقسیم کرنا اور مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کو مکمل اقتدار حاصل کرانا تھا۔ اس انتخاب میں مسلمانوں کو ہر سیٹ پر شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ جس سے یہ طے ہو گیا کہ ملک بٹ کر ہی رہے گا۔ بقول اختر حسین:

> ''سال کے آخر میں ہندوستان میں عام انتخابات کرائے گئے تو یہ ظاہر ہو گیا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ ہے اور عملاً کانگریس کو فقط ہندو قوم کی تائید حاصل ہے۔''8

اپنی خودنوشت گرد راہ میں 1946 کے کچھ اہم سیاسی نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی بنا پر اختر حسین کو یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان کا قیام ضرور ہوگا۔ لکھتے ہیں:

> ''مارچ 1946 میں دہلی وارد ہو کر کابینہ مشن نے مہینوں کی انتھک گفت و شنید کے بعد سیاسی بحران کا جو حل پیش کیا وہ کیبنٹ مشن کے نام سے مقبول ہوا۔ اس کا مقصد ہندوستان کی وحدت اور پاکستان کے مطالبے میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ منصوبے کا لب لباب یہی

تھا ۔مرکز کا اختیاری دفاع امور خارجہ اور رسل و رسائل تک محدود رہے۔باقی تمام اختیارات کما حقہ صوبوں کے سپرد ہوں گے جو تین حلقوں میں تقسیم ہوں گے۔ایک میں غیر منقسم بنگال اور آسام، دوسرے میں غیر منقسم پنجاب، سندھ صوبہ سرحد اور بلوچستان کیے جائیں۔ان دونوں حلقوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوگی، باقی ملک تیسرے حلقے میں شامل ہو جہاں واضح ہندو اکثریت ہوگی۔ان اصولوں کے تحت قانون ساز اسمبلی آزاد مملکت کا آئین تیار کرے۔دریں اثنا مرکز میں عبوری حکومت قائم ہو جس میں مسلم لیگ اور کانگریس کو 6-6 نشستیں دی جائیں گی، مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اپنی منظوری دے دی۔''9

یہ قرارداد ہونے کے بعد اچانک پنڈت نہرو نے ایک کانفرنس میں یہ اعلان کر دیا کہ منصوبے کی تاویل کا حق ان کی پارٹی کو ہوگا۔دوسری طرف گاندھی جی نے بھی آسام کو بنگال سے الگ کرنے کی مانگ کر دی۔جس کا مسلم لیگ نے احتجاج کیا۔موجودہ وائسرائے نے بھی کانگریس کا ساتھ دیا اور عبوری حکومت کے قیام کرتے وقت مسلم لیگ کو طے شدہ سیٹ چھ سے گھٹا کر پانچ کر دی۔مسلم لیگ نے اس کے بعد کابینہ مشن کے منصوبے پر اپنی منظوری کو منسوخ کر دیا اور مسلمانوں کو عوامی جدوجہد کی دعوت دی۔مسلم لیگ نے اس مخالفت میں 16 اگست 1946 کو یوم سیاہ منایا۔لارڈ ویول سے لے کر مولانا آزاد نے بھی کابینہ مشن کے منصوبے کو ختم کرنے اور ملک کی تقسیم کی ذمہ داری کانگریس اور پنڈت نہرو پر عائد کی ہے۔مولانا آزاد نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''انڈیا ونس فریڈم'' میں ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے اور پنڈت نہرو کے ذریعہ کی گئی غلط بیانی پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے۔اس کے بعد تقسیم کا اعلان ہوتے ہی کلکتہ میں جو فسادات شروع ہوئے تو اس کی آگ ملک کے تمام حصے میں پھیل گئی۔لاکھوں بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اختر حسین لکھتے ہیں:

''نومبر میں بہار میں ایسے وسیع پیمانے پر مسلم کش فسادات ہوئے کہ گاندھی جی کے پرائیویٹ سکریٹری پیارے لال کے بقول 'ہندوستان کے سیاسی وحدت کا تصور ختم ہو گیا'۔بہار کے فسادات میں کم سے کم 20 اور زیادہ سے زیادہ 50 ہزار مسلمان مارے گئے، ان میں میری بوڑھی چچی بیگم اصغر حسین بھی تھیں۔ان فسادات کا اثر پایۂ تخت دہلی پر اس طرح پڑا کہ تقریباً ایک سال تک شہر میں بدامنی کی وجہ سے مسلسل کرفیو رہا۔روز کہیں نہ

کہیں قتل و غارت گیری برپا رہی۔''10

بداعتمادی اتنی بڑھ گئی تھی اور فضا اتنی مکدور ہو گئی تھی کہ روزمرہ کے انتظامی کاروبار میں بھی دونوں جماعتوں (کانگریس و مسلم لیگ) کے وزراء میں تعاون ممکن نہ رہا۔ 1946 کے بعد حالات اتنے خراب ہوئے کہ لارڈ ویول پر کانگریس کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ یا تو استعفیٰ دے دیں یا مسلم لیگ کو ختم کر دیں۔ انہوں نے مجبور ہو کر برطانوی حکومت سے اپیل کی کہ جتنی جلدی ہو سکے برصغیر کو خیر باد کہہ دیں۔ کیوں کہ ہندوستان کا مسئلہ مشکل بنتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اہل ہند جو چاہے کریں۔ برطانوی حکومت نے اس کے بعد پنڈت نہرو، مسٹر جناح اور وائسرائے کو لندن بات چیت کے ذریعے مسائل کے حل کے لیے بلایا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر بھیج دیا۔ فروری 1947 میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ جون 1948 میں برطانیہ برصغیر کو چھوڑ دے گا، لیکن حالات کچھ ایسے بنے کہ قبل از وقت ہندوستان کو آزاد کرنا پڑا۔ بقول اختر حسین:

> ''تقسیم کا کام دو مہینے کے اندر یعنی اگست میں ختم ہو جائے اور اس کے عوض ہندوستان ڈومینن کی حیثیت قبول کر لے گا اور ماؤنٹ بیٹن کو ایک سال کے لیے آزاد ہند کا گورنر جنرل مقرر کرے گا۔ مسلم لیگ نے بھی اس معیار کو منظور کر لیا۔ البتہ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانے سے انکار کر دیا۔ اس کا ردعمل کتنا شدید تھا، اس کا اظہار اس کی ڈائری کے حوالے سے HODSON نے یوں درج کیا ہے 'میں نے (ماؤنٹ بیٹن نے) مسٹر جناح سے کہا کہ اس کی قیمت پاکستان کو ادا کرنی ہوگی'۔ جذبہ انتقام میں ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو جیسا نقصان عظیم پہنچایا وہ سب کو معلوم ہے۔''11

اختر حسین نے ملک کے بٹوارے کے بعد کتب خانوں کے تقسیم کا جو مسئلہ ہوا تھا اس پر بھی نظر ثانی کی ہے۔ پاکستان کی طرف سے جو کمیٹی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے تشکیل کی گئی تھی اس میں وہ بحیثیت سیکریٹری مقرر ہوئے تھے اس لیے اس کی پوری تفصیل ''گرد راہ'' میں ملتی ہے۔ ہندوستان کے مرکزی کتب خانوں میں جن کتابوں کے دو دو نسخے تھے ان میں سے ایک ایک پاکستان کو دینا منظور ہوا تھا لیکن بعد میں ہندوستان کی وزارت تعلیم نے بے اعتنائی برتی اور ان کتابوں کی فہرست سے صاف انکار کر دیا۔ چناں چہ ان کتابوں کی فہرست کی از سر نو تکمیل کے لیے پاکستان سے ایک عملہ ہندوستان آیا، لاکھوں روپیے خرچ کر کے اور کافی بھاگ دوڑ کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا، تو 1952 میں اختر حسین مولانا آزاد سے اس مسئلے پر گفت و شنید کے لیے دہلی پہنچے۔ لکھتے ہیں:

''1952 میں مجھے دہلی بھیجا گیا کہ مولانا آزاد سے کہہ سن کر تصفیہ کراؤں۔ مولانا نے کہا کہ میں لاکھ کہتا ہوں، مگر ہندو اہل کار تعاون نہیں کرتے۔ اپنے عملے کو واپس لے جاؤ کیوں کہ اس کوشش کا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہاں اگر دونوں حکومتیں مل کر برطانیہ سے کہیں کہ انڈیا آفس لائبریری کو لندن سے منتقل کر کے برصغیر میں لے آئیں تو پاکستان کا خسارہ پورا ہو جائے گا۔ کراچی لوٹ کر جب میں نے اپنی حکومت کو رپورٹ پیش کی تو مولانا کے مشورے پر عمل کا فیصلہ کیا گیا۔ 1955 میں جب وزیر اعظم محمد علی بوگرا مختلف امور پر پنڈت نہرو سے گفتگو کے لیے دہلی گئے تو اپنے ساتھ وزیر تعلیم (کرنل عابد حسین) اور مجھے لیتے گئے۔''12

لیکن آخر الذکر ملاقات میں بھی پاکستانی عملے کو مایوسی ہوئی۔ تقسیم کے اعلان کے بعد اس پر عمل اتنی جلدی ہوا کہ کسی بھی چیز کا منظّم ڈھنگ سے بٹوارہ نہیں ہو سکا۔ 1946 کے ہنگاموں اور اس کے بعد ملک کے حالات نے سب پر یہ واضح کر دیا تھا کہ پاکستان کا قیام ہی مسلمانوں کے لیے سیاسی نجات کا واحد حل ہے۔ کسی نے بھی یہ نہیں سوچا کہ ہندوستان میں بچے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا کیوں کہ پاکستان کے محدود رقبے میں برصغیر کے تمام مسلمانوں کی منتقلی ممکن نہیں تھی۔ تقسیم کے بعد اپنے ملک سے محبت و عقیدت کے سبب جو مسلمان یہاں رہ گئے، افسوس کہ آج انہیں اپنی حب الوطنی کا ثبوت دینا پڑ رہا ہے۔ تقسیم کے بعد ناموافق حالات دیکھ کر اختر حسین نے بھی پاکستان کی راہ لی۔ حالاں کہ پہلے پہل وہ پاکستان جانے کو تیار نہیں تھے کیوں کہ ان کو اندیشہ تھا کہ نئے ملک میں اتنے مسائل ہوں گے کہ تعلیم کا مسئلہ حل کرتے کرتے کافی وقت لگ جائے گا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''چودھری محمد علی نے اس وقت مجھے بلا کر کہا کہ آپ نے اب تک پاکستان کے لیے آپشن کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا ترک وطن کا فیصلہ آسان نہیں۔ مزید برآں پاکستان کو شروع میں اتنے مسائل کا سامنا ہوگا کہ تعلیم کی توسیع کی طرف توجہ نہ ہوگی اور مجھ جیسا آدمی وہاں کچھ نہ کر سکے گا۔ چودھری صاحب نے وثوق سے کہا کہ آپ کا یہ اندیشہ صحیح نہیں ہے۔ پاکستان مسلم عوام کی پس ماندگی دور کرنے کے لیے بنا ہے اور یہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ ادھر کئی مخلص غیر مسلم دوستوں نے خبردار کیا کہ 15 اگست کے بعد مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام کا وسیع پیمانے پر انتظام ہو رہا ہے لہٰذا جان کی خیر چاہتے ہو تو بلا

پس وپیش پاکستان چلے جاؤ۔'' 13

چناں چہ بگڑتے حالات کے آگے اختر حسین مجبور ہو گئے، اپنی ملازمت کا عہد نامہ پاکستان کو لکھا اور ہجرت کی تیاری کرنے لگے۔ یہ خبر جب قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا آزاد نے سُنی تو مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن جب دہلی میں ستمبر کے ہنگامے میں قرول باغ اور اس کے اطراف کے مسلمانوں کو چن چن کر مارا گیا تو بعد میں ان ہی حضرات نے اعتراف کیا کہ اچھا ہوا آپ وقت رہتے نکل گئے ورنہ بے موت مارے جاتے۔

10 اگست 1947 کو اختر حسین مع اہل وعیال اور کچھ ضروری سامان کے ساتھ اسپیشل ٹرین سے کراچی روانہ ہوئے۔ اس ٹرین میں ایک ڈبہ ان کے لیے مختص تھا۔ یہ ٹرین پاکستانی افسروں کے لیے خصوصی طور پر چلائی گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ اس ٹرین پر بھی حملہ ہوا جس میں بہت سارے لوگ زخمی ہوئے اور ایک عورت اپنی بچی سمیت ہلاک ہوئی۔ لکھتے ہیں:

> ''رات کے ساڑھے نو بجے پٹیالہ ریاست کی سرحد سے گزرتے ہی ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ انجن الگ کٹ گیا، چند ڈبوں کے گرنے کی آواز آئی اور میرا ڈبہ لرز کر کھڑا ہو گیا۔ بجلی کٹ گئی اور ہر طرف اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ موت کے سے سناٹے میں پاس جنگل میں پوشیدہ دشمن شب خون مارنے کو تیار تھے۔ بند کھڑکی کی جھلمل سے ان کی گاڑیوں کی روشنی نظر آتی تھی اور ان کی بندوقوں کے منھ ہماری طرف کھلے ہوئے تھے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہماری حفاظت کے لیے جو چند فوجی تھے انہوں نے اپنی مشین گنوں کا منھ اسی طرف موڑ دیا اور قاتلوں کو حملے کی جرأت نہ ہوئی، جب وہ فرار ہو گئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ریل کی پٹری ہٹا کر ٹائم بم رکھا تھا۔'' 14

اُس جائے حادثے کے قریب ہی انگریزی فوج کا کوئی دستہ تھا جب ان کو حادثے کی خبر ہوئی تو انہوں نے کوئی چھوٹی ٹرین بھیجی جس میں تمام مسافر بمشکل سوار ہو کر بہاول پور پہنچے۔ پھر وہاں سے دوسری ٹرین سے وہ لوگ 13 اگست کو کراچی پہنچے۔ پاکستان جانے والی سرکاری ٹرین پر یہ پہلا مسلح حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا چرچہ پوری دنیا میں ہوا۔ لیکن یہ مصیبت آئی اور اللہ کے فضل سے اختر حسین اپنے گھر والوں کے ساتھ صحیح سلامت کراچی پہنچ گئے۔ اس حادثے کے بعد پھر تو معمول ہو گیا تھا کہ روزانہ پاکستان جانے والی ٹرین لٹ لٹا کر وہاں پہنچ رہی تھی۔ بقول مصنف ''اللہ جانے کتنے بے گناہ اکالی سکھوں، سیوا سنگھ کے قاتلوں، ماؤنٹ بیٹن کی بے رخی اور پٹیل کی سرد مہری کا شکار

ہوئے۔''

تقسیم سے پہلے کچھ سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے تھے کہ 15 اگست کو آزادی کا پرچم بلند ہوتے ہی سارا فتنہ وفساد ختم ہو جائے گا۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت اور پاکستان میں مسلمانوں کی حکومت واسلامی قوانین ہوں گے۔ گویا ایک ایسا فیصلہ انگریزوں کی عدالت میں پیش ہوا تھا جس کو فریقین بے چوں چرا کے تسلیم کر لیں گے۔ لیکن فسادات اور مختلف مسئلوں کے آگے یہ فریب جلد ہی ٹوٹ گیا۔ 16 اگست کو ماؤنٹ بیٹن نے دہلی سے پنجاب اور بنگال کی حد بندی کا وہ اعلان کیا جو ریڈکلف ایوارڈ کہلاتا ہے۔ سیرل ریڈکلف کو ان صوبوں کی تقسیم کے لیے مقرر کیا گیا تھا جو سرحد کے دونوں جانب پڑتے تھے۔ اس نے ایک ہفتے کے اندر ہی دونوں ملکوں کے درمیان حد بندی کر کے ایوارڈ کا مسودہ ماؤنٹ بیٹن کو دے دیا۔ اس نے گرداس پور کے علاوہ کئی مسلم علاقہ ہندوستان کے حوالے کر دیے۔ سرحدوں کے تعین کے بعد جو فسادات ہوئے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اختر حسین لکھتے ہیں:

> ''اس اعلان کے ساتھ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی، لاکھوں تو اکالی سکھوں کے ہاتھوں تہہ وتیغ ہوئے اور چالیس پچاس لاکھ لٹ پٹ کر پاکستان کی سرحد میں ڈھکیل دیے گئے۔ انگریزوں کی سرحدی فوج اور کانگریس کی حکومت تماشا دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں دہلی اور اس کے اعتراف میں قتل عام شروع ہوا اور پناہ گزینوں کا ریلا کراچی اور اندرون سندھ پر چڑھ آیا۔ اس تباہ کاری کے ساتھ ہندوستان نے جونا گڑھ پر یہ کہہ کر فوج کشی کر دی کہ پاکستان سے الحاق کا جو فیصلہ نواب نے کیا ہے وہ اس کی ہندو رعایا کو منظور نہیں اور کشمیر پر یہ کہہ کر حملہ کیا کہ وہاں کے مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کیا ہے۔ اس اقدام کی پرزور حمایت شیخ عبداللہ نے کی تھی۔''15

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ کشمیری عوام ہندوستان سے الحاق کے حق میں بالکل نہیں تھی، محض راجہ کی خواہش پر حکومت ہند نے کشمیر کو ہندوستان میں شامل کر لیا۔ یہی حال بیشتر ریاستوں کا ہوا جس میں حیدرآباد کا معاملہ سرفہرست ہے۔

چوں کہ تقسیم کے بعد اختر حسین پاکستان چلے گئے تھے اس لیے تقسیم کے بعد پاکستان کے نامساعد حالات کا ذکر بھی مذکورہ خودنوشت میں کیا ہے۔ کتابوں کے پھیر بدل کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ساتھ ہی وہ سرکاری فائلیں جو ہندوستان سے پاکستان بھیجی گئی تھیں اسے بھی دہلی کے باہر سنسان علاقے میں نظر آتش کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کو 75 کروڑ جو روپیے دینے تھے اس کی بھی صرف پہلی قسط یعنی 20 کروڑ روپیے گاندھی جی کے بھوک ہڑتال کی وجہ سے ہی

دیے گئے، نتیجتاً گاندھی جی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا کیوں کہ کچھ کٹر لوگ اس رقم کو بھی دینے کے حق میں نہ تھے۔ بقیہ رقم حکومت ہند نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے کا ذکر جتیندر بلو نے بھی اپنی خودنوشت ''دیکھو ہم نے کیسے بسر کی'' میں کیا ہے لیکن انہوں نے مجوزہ رقم 55 کروڑ لکھی ہے۔ یہ رقم کچھ لوگوں نے 50 کروڑ بھی لکھی ہے۔ بی بی سی اردو کی عقیل عباس کی ایک رپورٹ کے مطابق جو کہ 12 جنوری 2021 کو شائع ہوئی تھی، میں 75 کروڑ رقم کا ذکر ہے جس میں 20 کروڑ ہی پاکستان کو دیا گیا تھا۔

پاکستان ہر طرف سے پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا، وہاں کے باشندوں اور حکومت کو اپنی سوجھ بوجھ سے اس نئے ملک کی ترقی و ترویج میں کام کرنا تھا۔ مہاجرین کی مشکلیں، معاشی پریشانیوں کے ساتھ مقامی باشندوں کے تعاون کا ذکر بھی مذکورہ خودنوشت میں ملتا ہے۔ شروع میں مہاجروں اور مقامی باشندوں میں تعلقات اچھے تھے۔ لیکن دونوں کے درمیان تعلقات تب بگڑے جب لوگ جان بچانے نہیں بلکہ مال بنانے کے لیے آنے لگے۔ تب تارکین وطن اور مقامی باشندوں کے مفاد میں رسہ کشی شروع ہوئی۔

ابھی لوگ اپنی مشکلوں اور پریشانیوں سے نبرد آزما ہو ہی رہے تھے کہ بانی پاکستان محمد علی جناح رحلت کر گئے۔ اختر حسین نے اس وقت پاکستان کے سیاسی حالات اور اس کی معاشی اعتبار سے گرتی ہوئی حالت پر بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے تقسیم کے بعد پاکستان کی اس کانفرنس کا ذکر کیا ہے جو تعلیم سے متعلق فضل الرحمٰن کی قیادت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے ماہرین تعلیم نے شرکت کی تھی اختر حسین نے سیکریٹری کے فرائض انجام دیے تھے۔ اسی کانفرنس میں ملک کے تعلیمی نظام کی تشکیل نو رکھی گئی تھی۔ مصنف کو اس تعلق سے کئی محاظ پر کام کرنا پڑا تھا جس کا ذکر گرد راہ میں کیا ہے۔ انہوں نے مشرقی و مغربی پاکستان کے تنازعے کو بھی پیش کیا ہے۔ دونوں جگہ کے باشندوں میں لسانی و ثقافتی اختلاف اتنے بڑھ گئے کہ مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بنا۔ بقول اختر حسین:

> تحریک پاکستان کے جوش و خروش میں یہ سوچا بھی نہیں گیا تھا کہ اس سرزمین کے باشندوں میں لسانی و ثقافتی اختلافات رونما ہو سکیں گے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے ہی بنگالی اور اردو کے تنازعے نے ویسی ہی تلخی اختیار کر لی جیسی کسی زمانے میں اردو اور ہندی کے قضیے نے کی تھی۔ علاقائی زبانوں کی موجودگی کے باوجود یہ صورت مغربی پاکستان میں پیش آئی۔ اس کی ایک وجہ ان میں اور اردو میں رسم الخط کی یکسانیت ہے۔''16

''گرد راہ'' ایک ایسی خودنوشت ہے جس میں نہ صرف مصنف کی زندگی کے حالات و واقعات ملتے ہیں بلکہ

سیاسی وسماجی اعتبار سے بھی انہوں نے اپنے خیال پیش کیے ہیں۔ مذکورہ خودنوشت کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس خودنوشت کے متعلق مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''آپ بیتی کے پیرائے میں دراصل یہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز ہے۔ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام ہی اس کے مستند اور معتبر ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔وہ راہی بھی رہے ہیں اور رہبر بھی۔ان کی یہ کتاب بھی ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے سنجیدہ حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔''14

مختصر یہ کہ اختر حسین کی اس خودنوشت میں روداد زندگی کے ساتھ برصغیر کی سیاست کا بھی تفصیلی بیان ہوا ہے۔ مصنف نے صرف انگریزی حکومت ہی نہیں بلکہ ان کے ظلم وبربریت کو بھی پیش کیا ہے۔جنگ آزادی کی جدوجہد، تقسیم ہند اور اس سے ہونے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔انہوں نے برصغیر کی سیاست کی پوری تاریخ پیش کردی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کہیں کہیں یہ خودنوشت تاریخی مرقع نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ اختر حسین رائے پوری، گرد راہ، مکتبہ افکار، کراچی، جنوری 1984ء ص: 9,10
2۔ ایضاً ص: 41
3۔ ایضاً ص: 42
4۔ ایضاً ص: 61
5۔ ایضاً ص: 62
6۔ ایضاً ص: 44
7۔ ایضاً ص: 103,104
8۔ ایضاً ص: 168
9۔ ایضاً ص: 169
10۔ ایضاً ص: 171
11۔ ایضاً ص: 172
12۔ ایضاً ص: 178,179
13۔ ایضاً ص: 180
14۔ ایضاً ص: 181
15۔ ایضاً ص: 183
16۔ ایضاً ص: 315
17۔ ایضاً ص: 320

قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ

سنہ اشاعت: 1987

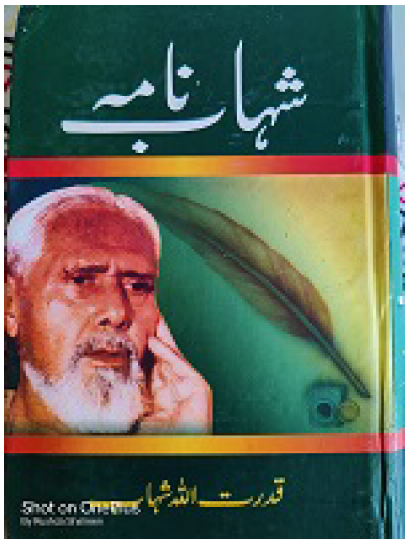

شہاب نامہ (قدرت اللہ شہاب)

قدرت اللہ شہاب نے نہ صرف ادب میں اپنا مقام بنایا بلکہ بیوروکریسی میں بھی اپنی شناخت قائم کی۔ سرکاری عہدوں پر فائز رہے، برصغیر کی سیاست کو قریب سے دیکھا اور جانا۔ قدرت اللہ شہاب کی شخصیت عجز وانکساری، صبر استقلال، جرأت مندی، فرض شناسی، حب الوطنی، ادب نوازی، دیانت داری، انسان دوستی، سادگی اور تصوف کا ایک ایسا مرقع تھی جس کے ہر رنگ میں سو رنگ پنہاں تھے۔ وہ 1917 میں گلگت (موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم جموں اور چمکور صاحب ضلع انبالہ سے مکمل کی۔ پرنس آف ویلز کالج، جموں سے بی ایس سی اور لاہور کے گورنمنٹ ڈگری کالج سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ 1940 میں آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا۔ ان کو ریاست جموں وکشمیر کا پہلا مسلم آئی سی ایس افسر بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ تقسیم ہند سے قبل انہوں نے ہندوستان کے مختلف اضلاع میں بطور آئی سی ایس افسر سرکاری فرائض انجام دیے۔ جن میں بہار، اڑیسہ اور بنگال سرفہرست ہیں۔

تقسیم کے بعد آزاد کشمیر کے سیکریٹری جنرل ہوئے، بعدازاں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد، اسکندر مرزا اور صدر ایوب خان کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے دیا اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو سے وابستہ ہو گئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل انہی کی کوششوں سے عمل میں آئی۔ وہ ایک عمدہ نثر نگار اور ادیب تھے۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بطور افسانہ نگار کے کیا، ان کا پہلا افسانہ ''چندراوتی'' کے نام سے 1938 میں شائع ہوا۔ حالاں کہ انہوں نے کم ہی لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا وہ فکری، فنی اور موضوعاتی اعتبار سے بلند معیار کا حامل ہے۔ تقسیم ہند کی تباہی کے موضوع پر ان کا شاہ کار ناولٹ ''یا خدا'' 1948 میں شائع ہوا جسے ادبی دنیا میں کافی پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ان کے تین افسانوی مجموعے ''ماں جی، نفسانے اور سرخ فیتہ'' منظر عام پر آیا۔ پہلے رونق چمکوری اور بعد میں جعفر چمکوری تخلص رکھ کر شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔

لیکن جو تصنیف ان کی شہرت وعظمت کا باعث بنی اور جس نے ان کو جاوداں کر دیا وہ ان کی وفات کے ایک سال بعد 1987 میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع کردہ کتاب ''شہاب نامہ'' ہے۔ ان کی وفات سے قبل مذکورہ کتاب کے ابتدائی ابواب سیارہ ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ، معاصر، دستاویز، نیا دور اور تخلیقی ادب جیسے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ کتابی صورت میں آنے کے بعد اس خودنوشت کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ راقمہ کے پاس ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے 2018 میں شائع کردہ

ایڈیشن موجود ہے۔

مختلف عنوان کے تحت 1200 سے زیادہ صفحات پر مشتمل اس ضخیم خودنوشت میں تحریک پاکستان، تقسیم ہند اور اس کے اثرات، سکھوں، ہندوؤں اور انگریزوں کی چالبازیاں، پس پردہ سامراجی حقائق، پاکستانی سیاست دانوں کا اصل چہرہ، انسانی نفسیات، مذہب، روحانیت اور بہت کچھ ایک ساتھ شامل ہیں۔ ایک اہم و دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اسے اردو خودنوشت کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ یہ اپنے عہد کا ایک اہم سیاسی و تاریخی شہ پارہ ہے، جس میں بیسویں صدی کے تمام سیاسی حالات و انقلابات اور اس سے نسل انسانی پر مرتب ہونے والے اثرات کا مکمل طور پر بیان ملتا ہے۔ اس خودنوشت میں جموں و کشمیر کے سیاسی پس منظر کو پیش کر کے کچھ تلخ حقائق سے پردہ بھی اٹھایا گیا ہے۔ مذکورہ خودنوشت میں ڈوگرہ مہاراجاؤں کی ناخواندگی، شدت پسندی، بد اخلاقی اور مسلمانوں کے ساتھ متعصّبانہ رویے کی عکاسی، ریاست کے مسلمانوں کی پس ماندگی، بے سروسامانی، افلاس، سادگی، ناداری اور مظلومیت کا بیان موجود ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے چودھری غلام عباس اور شیخ عبداللہ کے خاکے کے ساتھ مصنف نے ان دو سیاسی رہنماؤں کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو بھی پیش کیا ہے۔ یہاں تک کی ریاست کے مسلمانوں میں سیاسی و سماجی شعور پیدا کرنے میں ان دونوں رہنماؤں کے کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ''شہاب نامہ'' میں تقسیم کے زیر اثر ہونے والے خوں ریز فسادات کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔ 1947 سے قبل ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورت حال، حصول پاکستان کے سلسلے میں کانگریس و مسلم لیگ کے درمیان رسہ کشی، قیام پاکستان کے بعد اس کی ابتدائی مشکلات، وہاں کے سیاست دانوں کے متعلق دلچسپ معلومات، مسئلہ کشمیر وغیرہ ان تمام امور پر بڑے تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان تمام موضوعات کو قدرت اللہ شہاب نے خودنوشت کی ہیئت میں اپنی ذات کے حوالے سے بیان کر کے اس کتاب کو منفرد کر دیا ہے۔

مصنف 1938 سے اپنے شب و روز کو ایک ڈائری میں مختصر نویسی کی صورت میں اہم واقعات پر مبنی روز نامچہ لکھتے رہے۔ جس کو بعد میں ابن انشاؔ نے ترتیب کرنے کی فرمائش کی۔ بقول قدرت اللہ شہاب:

> ''اس (ابن انشا) نے وصیت کی کہ اپنی ڈائری کی خفیہ نویسی کو بے نقاب کرو اور دلجمعی سے ایک کتاب لکھو۔ میں تو اسے پڑھنے کے لیے زندہ نہ رہوں گا لیکن میری روح خوش ہوگی۔''1

چنانچہ ان کی ترغیب پر قدرت اللہ شہاب نے اپنے شب و روز کو صفحہ قرطاس پر بکھیر کر آنے والی نسلوں کے لیے

ایک تاریخی وسیاسی شہ پارہ چھوڑ دیا ہے۔

شہاب نامہ کا آغاز ''اقبال جرم'' کے عنوان سے کیا گیا ہے جو اس کتاب کا ابتدائیہ ہے۔اس میں مصنف نے چند اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شہاب نامہ کا بنیادی مقصد کسی کی بت شکنی یا بت تراشی نہیں ہے بلکہ جن واقعات ،مشاہدات و تجربات نے مجھے متاثر کیا ہے ان تمام کو بلا کم وکاست بیان کر دیا ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنی خودنوشت کا باقاعدہ آغاز بچپن کی حسین یادوں سے کیا ہے۔ان کے بچپن کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب جموں وکشمیر پر ڈوگرہ مہاراجاؤں کا راج تھا اور ریاست کے مسلمانوں کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔اس خودنوشت کے ابتدائی چند ابواب میں دو کہانیاں بیک وقت ساتھ چلتی ہیں جس میں پہلی کا تعلق مصنف کے نجی زندگی سے ہے اور دوسری اس وقت کے جموں وکشمیر کے سیاسی منظر نامے پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں کہانیاں دلچسپ ہونے کے ساتھ معلوماتی بھی ہیں۔

مذکورہ خودنوشت میں ان کی ماں (کریمن بی بی) اور والد (محمد عبداللہ) کا خاکہ بھی ملتا ہے۔ان کے والد اپنے دور کے پڑھے لکھے ،کافی ذہین نوجوان تھے۔جن کو سرسید کی وساطت سے آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے انگلستان جانے کا سرکاری وظیفہ ملا تھا لیکن انہوں نے والدہ کے اصرار پر لندن جانے سے انکار کر دیا اور علی گڑھ سے واپس آ کر گلگت میں بطور کلرک اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور بہت جلد اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت 1912 میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور میں گلگت کے گورنر مقرر ہوئے۔ ہری سنگھ کے راجہ بننے کے بعد انہوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔بعد میں جموں میں تاحیات مسلمانوں کی ایک فلاحی انجمن ''انجمن اسلامیہ جموں'' کے آنریری سیکریٹری رہے۔ ان کو انگریزی زبان پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ ان سے متاثر ہو کر چودھری غلام عباس اور شیخ عبداللہ جیسے اہم سیاسی رہنما اپنی تمام سیاسی وقانونی دستاویزات لکھواتے تھے۔شہاب نامہ میں اس وقت کے جموں وکشمیر کے سیاسی منظر نامے میں والد کے کردار کے حوالے سے دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنے آئی سی ایس بننے کی داستان خودنوشت کے باب ''آئی سی ایس میں داخلہ'' میں تفصیل سے بیان کی ہے۔اپنے گردونواح کے ماحول اور مسلمانوں کی پس ماندگی کو دیکھ کر ان کو اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی بقا ان کی اعلیٰ تعلیم میں مضمر ہے۔چناں چہ انہوں نے آئی سی ایس کی تیاری شروع کی اور کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ مذکورہ باب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں انہوں نے سر گورڈن ایرے ،سر عبداللہ اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو آئی سی ایس انٹرویو بورڈ کے ممبر تھے۔ڈاکٹر رادھا کرشنن کا ذکر بڑے طنزیہ انداز میں کیا

ہے کیوں کہ وہ قدرت اللہ شہاب کو مسلمان اور تعصب کی بنیاد پر آئی سی ایس کے لیے ناموزوں سمجھتے تھے۔ البتہ سر عبداللہ کو عقیدت سے یاد کیا ہے۔ ان کے کردار کے ذریعے اس دور کے مسلمانوں کی بے بسی اور مجبوری کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس میں ایک طرف برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ ان کی محبت و ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف انگریزوں اور ہندوؤں کی مسلم مخالف ذہنیت بھی فطری انداز میں بے نقاب ہوئی ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی ملازمت کا باقاعدہ آغاز 1942 میں بھاگلپور بہار کے اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے کیا۔ وہاں پر اپنے قیام اور ملازمت کی تمام روداد کو ''بھاگلپور ہندو مسلم فسادات'' کے عنوان سے کیا ہے۔ یہاں سے ان کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اور ''شہاب نامہ'' میں بھی ایک نیا موڑ آتا ہے۔ یہیں سے خودنوشت میں سیاسی و تاریخی عنصر کا گہرا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ 1942 میں بھاگلپور میں متعدد فسادات ہوئے تھے جس کے وہ عینی شاہد تھے چناں چہ ان کی تفصیل خودنوشت میں بھی ملتی ہے۔ مصنف نے جب ان فسادات کو از سر نو جانچ پڑتال کی غرض سے فائل نکالی تو وہ حیران رہ گئے کہ تمام فسادات ایک منصوبے کے تحت کروائے گئے تھے۔ اس کے خلاف کارروائی شروع کی تو ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔ قدرت اللہ شہاب کو ایک ذمہ دار اعلیٰ افسر ہونے کے ناطے تقریباً ملک کے تمام بڑے لیڈروں سے ملنے کا اور ان کو قریب سے جاننے کا موقع بھی ملا۔

قدرت اللہ شہاب نے ہندوستان میں تقسیم سے قبل مختلف اضلاع میں اپنی خدمات انجام دیں۔ اپنی زندگی کے اس دور کے حالات و واقعات کا ذکر خودنوشت کے مختلف ابواب مثلاً ''صاحب، بنیا اور میں''، ''بھاگلپور ہندو مسلم فسادات''، ''ایس ڈی او''، ''نندی گرام اور لارڈ ویول''، ''بملا کماری کی بے چین روح''، ''پاکستان کا مطلب کیا'' اور ''سادگی مسلم کی دیکھ'' میں کیا ہے۔ انہوں نے 1947 سے پہلے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورتحال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں مختلف حالات کے ساتھ انگریزوں کی ہندوؤں کے تئیں وفاداری، مسلمانوں کی بے بسی و سروسامانی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے متعلق تمام پہلوؤں پر بڑی باریک بینی سے روشنی ڈال کر تمام واقعات کو بلا جھجک پیش کیا ہے۔

خودنوشت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے متعلق ان کا نقطۂ نظر واضح تھا۔ جب وہ برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کا روشن، تابناک اور محفوظ مستقبل صرف اور صرف قیام پاکستان میں مضمر ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی مسائل کا واحد حل پاکستان کے قیام میں ہی ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے ''شہاب نامہ'' میں کافی تفصیل کے ساتھ برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور ان کے مقاصد پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے ملازمین کا واحد مقصد یہی ہوتا تھا کہ ہندوستان آ کر وہ کم سے کم عرصہ میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹیں اور پھر وطن عزیز واپس جا کر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد براری کی دھن میں انہیں طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔''2

نیز انگریز کس طرح اس سرزمین پر آنے کے بعد یہاں کے راجاؤں، نوابوں، سرمایہ داروں پر قابض ہوتے گئے اس کا بھی ذکر خودنوشت میں ملتا ہے۔ انگریز یہاں سے کچا مال سستے دام میں مقامی لوگوں سے حاصل کرتے اور اپنے ملک میں مہنگے داموں میں بیچتے، جس سے ان کو کافی فائدہ ہوتا تھا حالاں کہ انگریزوں کے علاوہ برصغیر میں دوسری غیر ملکی کمپنیاں بھی تجارت کرتی تھیں لیکن زیادہ مال اور فائدے کے چکر میں یہ سب آپس میں ہی لڑ پڑیں، جس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔ انہوں نے تجارت کے فروغ کے لیے 1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور دھیرے دھیرے یہاں کے سیاسی، سماجی و معاشی طور پر پہل کرنا شروع کر دی۔

جب انگریز اس کرۂ عرض پر اپنا تسلط قائم کرنے لگے اور عوام الناس پر ظلم و ستم کرنے لگے تو بنگال، لکھنؤ، رامپور غرض مختلف ریاستوں کے نوابوں اور مغل شہنشاہ نے انگریزوں کے خلاف اپنا محاظ کھول دیا۔ لیکن دھیرے دھیرے انگریز نے کچھ اپنی طاقت کے بل پر کچھ مقامی لوگوں کی غداری کی وجہ سے سب کو شکست دے کر ملک کو غلام بنا دیا۔ 4 مئی 1799 کو ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد برصغیر میں انگریزوں کے راج کرنے کے سارے دروازے کھل گئے اور ان کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے جیت کی خوشی میں کلکتہ میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ بقول قدرت اللہ شہاب:

> ''4 مئی 1799 کا وہ منحوس دن تھا جب سرنگا پٹم کے تاریخی معرکے میں ٹیپو سلطان شہید ہوئے اور ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لیے انگریزوں کا راستہ بالکل صاف ہو گیا۔ اس فتح کی خوشی میں لارڈ کارنوالس نے کلکتہ تھیٹر میں ایک شاندار محفل رقص و سرور کی منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ ہال میں جگہ جگہ دشمن سے چھینے ہوئے سامانِ حرب کی نمائش لگائی گئی۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینوں کے سامنے معرکۂ سرنگا پٹم کے مختلف مناظر کے قدِ

آدم تصویریں بنا کر لٹکائی گئی تھیں.....انگریزوں کے جس جس رجمنٹ نے سرنگا پٹم کی جنگ میں حصہ لیا تھا،ان کے جھنڈے ہال کے عین وسط میں لہرائے گئے ۔ان کے عین نیچے سلطان ٹیپو شہید کے جھنڈے کو الٹا لٹکایا گیا۔''3

کہا جاتا ہے کہ اس پارٹی میں شریک تمام انگریز افراد نے اپنی قمیض پر 4 مئی نقش کروایا تھا۔جس کا مقصد ہندوستانی عوام ،خاص طور پر مسلمانوں کی دل آزاری کرنا تھا،علاوہ ازیں اس سے برصغیر پر اپنے قابض ہونے کا کھلا اعلان کرنا بھی تھا۔اگر ملک کے غدار قسم کے لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو ان کا اتنا لمبا عرصہ حکومت کرنا آسان نہیں تھا۔ہندوؤں کے ساتھ کچھ مسلم غدار بھی ایسے تھے جنہوں نے انگریزوں کی غلامی کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے فرمارواؤں کے ساتھ دھوکہ کیا۔قدرت اللہ شہاب نے اشاروں کنایوں میں ان کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کی کامیابی کے پیچھے سب سے بڑا ہاتھ ان شر پسند غیر مسلموں کا تھا جنہوں نے مسلمانوں کو کبھی اپنا نہیں سمجھا بلکہ اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر مسلمانوں کا ساتھ دینے کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دیا۔دراصل دونوں کے درمیان ایک بڑی بات قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں مسلمانوں کو اپنا واحد دشمن تصور کرتے تھے۔حکومت ان سے ہی چھینی گئی تھی ، سیاست میں تب تک وہی قوم براجمان تھی۔چناں چہ دونوں ہی اس قوم سے پیچھا چھڑانے کی فراق میں تھے۔انگریزوں اور ہندوؤں کی یہ ملی بھگت خوب رنگ لائی کیوں کہ دونوں کا نصب العین ایک ہی تھا مسلمانوں کے اقتدار کو پامال کرنا۔لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جن انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں (کانگریس) نے بھی اتنی جدوجہد کی اسی کو آزادی کے بعد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل بنا دیا۔

قدرت اللہ شہاب نے مذکورہ کتاب میں انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانی عوام پر کیے گئے ظلم وستم کو باب ''صاحب، بنیا اور میں'' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔انہوں نے ان ہندوستانیوں کا تذکرہ خاص طور پر کیا ہے جو گرمی کے دنوں میں انگریزوں کو پنکھا جھلتے تھے اگر ان کی آنکھ لگ جاتی تو انگریز کچھ اس طرح ان کے پیٹ میں مارتے تھے کہ وہ بے چارے وہیں دم توڑ دیتے ، لکھتے ہیں کہ'' یہ جرم کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔'' اسی باب میں انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد والیان ریاست کی انگریزوں کے سامنے ''جی حضوری'' کو بھی پیش کیا ہے۔ایسے موقعوں پر ان کی تحریر میں طنزیہ لہجے کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔اس کے ساتھ ہی انگریزوں کی فضول خرچی اور ہندوستانیوں سے مول بھاؤ کے وقت بدعنوانیوں کی لمبی فہرست بھی دی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہونے کے لیے شروع سے ہی ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی پالیسی کو پیش

نظر رکھا۔ 1857 میں انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے ان میں غم و غصہ کی لہر زیادہ تھی، دوسرے تعصب کی بنیاد پر ہندوؤں کا ساتھ ملنے کے بعد انگریزوں نے سب سے پہلے ان کو اقتصادی طور پر آگے بڑھانا شروع کیا۔ مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے پیچھے ڈھکیلنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے لیے انگریزوں نے فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان کا عہدہ دے دیا جس کا ہندوؤں نے بھی خیر مقدم کیا۔ اس سلسلے میں قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

> ''برصغیر میں مسلمانوں پر تعلیم و ترقی کے سبھی دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ لارڈ میکالے کا فتویٰ تھا کہ یہاں پر جو نظام تعلیم رائج کیا جائے وہ ایسے انسان پیدا کرے جو رنگت میں تو بے شک ہندوستانی ہوں، لیکن چال ڈھال، فہم و فراست، ذوق و مذاق، اخلاق و اطوار اور ذہنی اعتبار سے انگریز ہوں۔ اس پالیسی کے تحت جب فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا تو برصغیر کے ہزاروں مسلمان علما و فضلا بہ یک وقت نوک قلم غیر تعلیم یافتہ قرار دے دیے گئے۔ اس فیصلے کا ہندوؤں نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اس لیے نہیں کہ انہیں انگریزی سے کوئی خاص محبت تھی بلکہ صرف اس لیے کہ انہیں فارسی سے چڑ تھی، کیوں کہ اس زبان کا رابطہ مسلمانوں سے تھا۔''4

مندرجہ بالا اقتباس سے مذہبی تعصب اور نفرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ 1857 میں مغلیہ سلطنت کا آخری چراغ گل ہونے کے بعد انگریزوں کے ساتھ ہندوؤں کی بھی یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے ہر اس گھر کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے جہاں سے کسی بھی مسلمان کے سر اٹھانے کا ذرا سا شائبہ ہو۔ تعلیمی میدان میں انگریزوں کے درج بالا اقدام اٹھانے کے بعد کافی عرصے تک مسلمان گورنمنٹ اسکولوں میں داخلہ لینے سے ہچکچاتے رہے اس کی کئی وجوہات تھیں۔ جس میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گورنمنٹ اسکولوں میں دینی تعلیم پر مکمل پابندی عائد تھی اور مسلمانوں کے نزدیک بغیر اس کے تعلیم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ تعلیم کے ساتھ سرکاری ملازمتوں سے بھی مسلمان پیچھے ہوتے گئے۔ مسلمانوں کی اُس حالت زار کو دیکھ کر سر سید احمد خاں آگے آئے اور مسلمانوں میں اپنی تحریک کے ذریعے وقت و حالات کی مناسبت سے جدید تعلیم پر زور دیا۔ پورے برصغیر میں مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان اور سر سید تحریک کے زیر اثر بدلتے ہوئے حالات کو قدرت اللہ شہاب نے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں مذکورہ خودنوشت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''1880-81 میں سارے برصغیر میں انگریزی ہائی اسکولوں میں 36686 ہندو اور

363 مسلمان طلبہ پڑھتے تھے۔اسی طرح اس سال پورے ہندوستان میں 3155 ہندو اور فقط 75 مسلمان گریجویٹ تھے۔قدرتی طور پر ملک کے انتظامی اور معاشی نظام میں بھی ہندوؤں کا تناسب اسی لحاظ سے تھا۔مسلمانوں کی پس ماندگی کے اس جمود کو سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ نے بڑے مؤثر طور پر توڑا۔1912 میں جب آئی سی ایس کے مقابلے کا امتحان لندن اور دہلی میں بہ یک وقت منعقد ہونے لگا تو اس سروس میں مسلمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ شروع ہوگیا۔''5

قدرت اللہ شہاب نے بھاگلپور میں اپنی تقرری ، وہاں کے فسادات ، خاص طور پر نتھہ نگر میں ہندوؤں کا مسلمانوں پر حملے جسے بعد میں فساد کا رنگ دے دیا جاتا،مسلمانوں کی بے بسی و مجبوری اور آر ایس ایس کے کرتا دھرتا کچھ سرکاری ہندو افسران جن میں مذہبی تعصب کوٹ کوٹ کر بھری تھی،ان کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔مصنف نے ''شہاب نامہ'' میں چند واقعات کا ذکر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ فسادات سوچ سمجھ کر پورے پلان کے ساتھ کروائے جاتے تھے جن میں ان ہی سرکاری افسران کا ہاتھ ہوتا تھا۔قدرت اللہ شہاب نے بطور سرکاری افسر ہونے کے ناطے ان تمام حالات کا خود جائزہ لیا تھا جب انہیں حقیقت کا اندازہ ہوا تو انہیں مسلمانوں کی بے بسی کا بہت افسوس ہوا۔

یہ 1942 کا زمانہ تھا اس کے علاوہ پورے ملک میں گاندھی جی کی قیادت میں بھارت چھوڑو تحریک شروع ہوگئی تھی۔8 اگست 1942 کو ممبئی میں کانگریس کے ذریعے Quit India کا ریزولیشن پاس کرتے ہی انگریزوں نے کانگریس پارٹی کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر اس کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔اس کے بعد پورے ملک میں قتل و غارت گری،لوٹ مار اور دہشت انگیزی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔

حالاں کہ کانگریس اور گاندھی جی نے اس تحریک کو عدم تشدد کی بنیاد پر چلانے کا حکم دیا گیا تھا۔لیکن عجیب بات ہے کہ گاندھی جی سمیت تمام کانگریسی ''کرو یا مرو'' کا نعرہ بلند کر رہے تھے،جس کا عام لوگوں نے کچھ اور ہی مطلب نکالا۔بقول قدرت اللہ شہاب ''یہ تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی ایک کھلی دعوت تھی۔''اس کے بعد جو پورے ملک میں تباہی ہوئی وہ جگ ظاہر ہے۔بھاگلپور بھی اس تحریک کی تباہیوں سے نہ بچ سکا۔وہاں تشدد اور تخریب کاری کے جو واقعات رونما ہوئے ان کی ایک فہرست ''شہاب نامہ'' میں ملتی ہے۔لیکن جب اس تحریک کا زور ٹوٹا اور انگریز حکومت کا پلہ بھاری رہا تو حکومت کے ظلم و تشدد کی ساری گاج عام ہندوستانیوں پر گری۔ برطانوی حکومت نے ان تمام صوبوں، شہروں اور گاؤں میں جرمانہ عائد کر دیا جو اس تحریک کے زیر اثر سرکاری خزانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔اُس جرمانے کی

ادائیگی عام جنتا سے کی گئی۔ ''شہاب نامہ'' کے ریکارڈ کے مطابق محض صوبہ بہار کے آٹھ ضلع کے 170 دیہات سے نو لاکھ 78 ہزار رقم اجتماعی جرمانے کے طور پر وصول کی گئی تھی۔ اس میں بھاگلپور ضلع کے 24 گاؤں کا حصہ ایک لاکھ تھا۔ سرکاری افسر ہونے کے ناطے اس تفصیل کے مصنف خود عینی شاہد تھے اس لیے یہ ریکارڈ ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ بھاگلپور کے بعد ان کا تبادلہ پہلے صوبہ بہار کے گیا، پھر اورنگ آباد کر دیا گیا وہاں کے بھی افسروں کی بدعنوانیوں اور عوام پر ہونے والے ظلم کا ذکر کیا ہے۔

1943 میں دوسری جنگ عظیم کے دوران بنگال میں قحط اور سمندری طوفان نے وہاں کی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ جنگ سے زیادہ بھوک پیاس اور طوفان کی زد میں لوگ آ کر مر رہے تھے۔ محض قحط سے تقریباً 30 لاکھ لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ اس دوران قدرت اللہ شہاب بہار میں تعینات تھے۔ ایک دن اپنے کسی عزیز کو لینے سہسرام اسٹیشن گئے، کلکتہ سے جو گاڑی آئی وہ کھچا کھچ بھری تھی جس میں کچھ لوگ جاپانی فوج کے حملوں کے خوف سے فرار ہو رہے تھے اور باقی ڈبوں میں اس بھوکی عوام کا جم غفیر تھا، جو قحط سے بچنے اور مٹھی بھر چاول کی تلاش میں کلکتہ سے بھاگ رہے تھے۔ یہ منظر اور بعد ازاں وہاں کے طوفان کی خبریں پڑھ کر مصنف کے ضمیر نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ بہار کے آرام و آسائش سے بھرپور آفس میں بیٹھ کر اپنا سرکاری فریضہ انجام دیں۔ چناں چہ انہوں نے پٹنہ کے گورنر سے درخواست کی کہ انہیں بنگال کے قحط زدہ علاقے میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ عوام کی کچھ خدمت کر سکیں۔ ان کی یہ درخواست منظور کر لی گئی اور قدرت اللہ شہاب اسی سال بنگال چلے گئے۔ انہوں نے بھوک، افلاس، طوفان اور سیلاب کی بلا ناگہانی آفت میں گرفتار انسانوں کے حالِ زار کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سارا بنگال ہیبت ناک اور بھیانک قحط کی زد میں آیا ہوا تھا۔ بھوک سے سسک سسک کر جان دینے والوں کی تعداد دوسری جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ قحط کے ساتھ ساتھ سمندر میں بھی جوش آیا اور مغربی بنگال کے ساحلی علاقوں میں جوار بھاٹے کی ایک عظیم لہر سائیکلون کے دوش پر سوار ہو کر کئی میل تک خشکی میں در آئی، اور بے شمار بستیوں، انسانوں اور مویشیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر سمندر کی تہہ میں لے گئی۔''6

بنگال قحط کے ذمہ دار انگریز تھے۔ حکومت کی بدانتظامیوں کے سبب وہ قیامت ٹوٹی تھی۔ یہ تاریخ میں برطانوی حکومت کا ایک سیاہ باب ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ مغرب میں جاپانی فوجیں اپنی فتوحات کے بعد ہندوستان کی طرف

بڑھ رہی تھیں، کلکتہ اور مدراس پر جاپانی حملے بھی ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی بنگال کے ساحلی علاقوں سے جاپانی ایجنٹوں کے پہنچنے کی خبریں بھی مل رہی تھیں۔ دوسری طرف انگریزی حکومت بھی بھارت چھوڑو تحریک کی وجہ سے تذبذب میں تھی کہ جاپان نے اگر حملہ کر دیا تو کیا مقامی لوگ ساتھ دیں گے یا نہیں۔ علاوہ ازیں بنگال میں کئی لوگ سبھاش چندر بوس سے متاثر ہو کر ''جاپان چلو'' مشن میں شامل ہو گئے تھے۔ انگریزوں کو مقامی لوگوں کی وفاداری پر شک تھا۔ چناں چہ انہوں نے جاپانی حملوں سے بچنے کے لیے اپنے ایجنٹس پورے صوبے میں مقرر کر دیے۔ ان لوگوں نے شہروں اور دیہاتوں میں جگہ جگہ اپنے گودام قائم کیے اور حکومت کی مدد سے ساری فصل سستے داموں میں خرید کر ان گوداموں کو بھرنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے صوبہ بنگال کی ساری فصل انگریزوں کے ہاتھوں منتقل ہو گئی۔ اس ذخیرے کو بھرنے کا مقصد جنگ کے دوران سول اور ملٹری کی ضروریات کو پوری کرنا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ اگر واقعی جاپان نے حملہ کر دیا تو سارے گوداموں کو جلا دیا جائے تاکہ وہ تمام رسد دشمنوں کے ہاتھوں نہ لگے۔ جو تھوڑا اناج بچا تھا اسے مقامی زمینداروں اور امیر لوگوں نے مہنگے داموں میں خرید لیا۔ ان سب کی وجہ سے چاول کے دام آسمان کو چھونے لگے، عام آدمی چاول خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ بقول قدرت اللہ شہاب:

> ''رفتہ رفتہ اناج کی منڈیاں بند ہو گئیں، کاشت کاروں کے اثاثے ختم ہو گئے اور زمینداروں و بنیوں کے چاول کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ شروع شروع میں غریب دیہاتیوں نے چاول کی جگہ ساگ پات پر گزارہ کرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ درختوں کے پتے ابال ابال کر کھانے لگے۔ گاؤں گاؤں میں بھوک اور موت نے چھاؤنی ڈال دی۔ آدمیوں کی کمریں خمیدہ ہو گئیں۔ عورتوں کی چھاتیاں سوکھ کر مُردار گوشت کی طرح لٹکنے لگیں۔ بچوں کی پسلیاں تڑمُڑ کر اندر گھس گئیں اور پیٹ غباروں کی طرح پھول کر باہر نکل آئے۔''7

قدرت اللہ شہاب نے ''شہاب نامہ'' میں قحط کے سلسلے میں جو واقعات بیان کیے ہیں وہ کافی دلسوز ہیں۔ کلکتہ میں شام ہوتے ہی ہوڑہ پُل پر فاقہ زدہ عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم لگ جاتا تھا۔ اس میں سے ہر کسی کو امید ہوتی تھی کہ امیر گھرانے کا کوئی ان کی حالتِ زار پر رحم کر لے گا، ہر ماں اس کوشش میں ہوتی تھی کہ کوئی کھاتا پیتا خاندان اس کے بچے کو لے جائے۔ ان میں سے اکثر مائیں بھوک سے تڑپتے بچے کو دریائے ہگلی میں پھینک دیتیں یا خود ساتھ میں چھلانگ لگا دیتیں۔ بنگال قحط کی پوری تفصیل شہاب نامہ کے ''نندی گرام اور لارڈ ویول'' باب میں ملتی ہے۔ جس کے مطالعے اور

وقتی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کو صرف جاپانی حملوں کی فکر تھی۔ ان کی ذہنی مشغولیت سیلاب اور قحط کی تباہی کے ساتھ نہیں تھی۔لیکن بعد میں پورے ملک سے احتجاج کے بعد قحط اور سیلاب زدہ علاقوں میں سرکاری امداد پہنچائی گئیں۔

قدرت اللہ شہاب کی تقرری بنگال کے تملوک میں ہوئی تھی،شہاب نامہ میں اس کے ایک علاقے نندی گرام میں سمندری تباہی کی تفصیل ملتی ہے۔اسی جگہ پر مصنف نے سرکاری گودام کے تالے تڑوا کر اناج تقسیم کروایا تھا۔اس علاقے کی دو ندیوں میں سیلاب آنے کی وجہ سے درمیان کے گاؤں دنیا سے کٹ گئے تھے، وہاں حکام کے ذریعے بھیجی گئی امداد کا پہنچنا بھی مشکل ہو گیا۔اس علاقے میں انگریزوں کا ایک گودام تھا جو اناج سے بھرا ہوا تھا۔چناں چہ جب وہاں حالات بگڑنے لگے تو قدرت اللہ شہاب نے حکومت سے درخواست کی کہ اس اناج کو قحط اور سیلاب کی زد میں آئے لوگوں میں بانٹ دیا جائے،لیکن حکومت کی طرف سے اس تعلق سے کوئی جواب نہیں آیا۔دو چار دن بعد گشت کے دوران مصنف نے دیکھا کہ اسی گودام کے پاس تین بچوں اور دو عورتوں کی لاش پائی گئی جو بھوک سے تڑپ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔مصنف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،کانگریس،مسلم لیگ اور فارورڈ بلاک سے ایک ایک ممبر کو لے کر پولیس کی نگرانی میں گودام کا تالا تڑوایا اور غلہ مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ان کی اس کارکردگی سے خوب شور شرابہ ہوا اور نتیجتاً ان کا تبادلہ اڑیسہ کر دیا گیا۔

اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکریٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے ان کو کچھ ایسے سرکاری دستاویزات ہاتھ لگے جن کی رو سے کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کو تقسیم ہند کے قبل اور بعد میں اعلیٰ عہدوں سے برطرف کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا جس پر جلد از جلد ہندو سرکاری افسروں سے عمل کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ تقسیم پر مہر لگتے ہی فسادات زوروں پر ہوں گے اور اگر مسلمان سرکاری عہدوں پر رہیں گے تو جانچ میں ان کی مظلومیت اور ہندوؤں و سکھوں کی اصلیت سامنے آجائے گی۔چناں چہ کانگریس نے بڑی چالاکی سے مسلمانوں کو ان کے عہدوں سے اپنے علاقوں سے برطرف کرنا شروع کیا۔قدرت اللہ شہاب ان دستاویزات کو لے کر محمد علی جناح کے پاس گئے۔انہوں نے وہ رپورٹ دیکھ کر اپنی خفگی ظاہر کی کیوں کہ ان کو ڈر تھا کہ اگر یہ دستاویزات عام لوگوں کے ہاتھوں لگ گئے تو بہت برا ہو جائے گا۔ایک سرکاری افسر ہوتے ہوئے دور دراز کا سفر اختیار کر کے مسٹر جناح سے محض اس بنا پر ملاقات کرنا کہ ان کو مسلمانِ ہند کے سلسلے میں کانگریس کے ممکنہ مسلم زیادتی رویوں کو بے نقاب کر سکیں،اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قدرت اللہ شہاب آنے والے خطرے کو بھانپ گئے تھے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے میں غیر معمولی قوت ان میں بدرجہ اتم

موجود تھی۔

شہاب نامہ میں انہوں نے باب ''پاکستان کا مطلب کیا؟'' میں قیام پاکستان سے متعلق واقعات وحالات اور اس کے دردانگیز نتائج کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔1946 میں جب لاہور میں مسلم لیگ نے پاکستان کا ریزولیشن منظور کرایا اسی دن سے گاندھی جی سمیت کانگریسی لیڈروں نے اسے ناکام بنانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔اس سلسلے میں کانگریس نے جو بھی اقدام اٹھائے ان کا ذکر بھی خودنوشت میں موجود ہے۔مطالبۂ پاکستان کے تئیں گاندھی جی کا کہنا تھا کہ ''ہندوستان ایک اٹوٹ اور ناقابل تقسیم اکائی ہے اس کی تقسیم میری لاش پر ہوگی۔'' ملک میں پہلے ہی مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔قائداعظم اور دوسرے مسلم لیگی کی حمایت میں مسلم عوام بھی میدان میں آ گئی تھی اور اپنے روشن مستقبل کے لیے قیام پاکستان پر زور دینے لگی۔کیوں کہ حالات کی سنگینی کو دیکھ کر ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں ان کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔اس کے علاوہ ملک بھر میں خصوصی طور پر شمالی ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات بھی بڑھتے جا رہے تھے۔چناں چہ برصغیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے کیبنٹ مشن کے نام سے ایک وفد ہندوستان بھیجا۔جس میں بات چیت کے ذریعے یہاں کے سیاسی مسائل کو سلجھانا تھا۔اس مشن کی میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا کہ ہندوستان میں امور خارجہ، دفاع اور ذرائع آمد و رفت مرکزی حکومت کے اختیار میں ہوں گے، صوبوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پہلے حصے میں ہندو اکثریت کے صوبے، دوسرے میں پنجاب، سرحد سندھ، بلوچستان اور تیسرے حصے میں بنگال اور آسام ہوں گے۔تین مرکزی شعبوں کو چھوڑ کر باقی ہر گروپ میں سب امور خود مختار ہوں گے۔

مسلم لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔الگ ملک کا مطالبہ کرنے والی مسلم لیگ نے اس تجویز پر اپنی منظوری دے دی اور پاکستان کی مانگ کو رد کر دیا، لیکن کانگریس نے اس کی مخالفت کی بعد ازاں پنڈت نہرو کے بیان کے بعد مشن کے ممبران نے اس کے بنائے گئے اصولوں میں ترمیم کر کے اس کی اصل شکل ہی بدل ڈالی۔جس کی وجہ سے مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری واپس لے لی، اس طرح کانگریس کی مہربانیوں سے ہندوستان اکھنڈ بھارت بنتے بنتے رہ گیا۔کانگریس کے اس مخالفانہ رویے سے ہی ملک تقسیم ہوا کیوں کہ یہ آخری کوشش تھی جس سے ملک کی تقسیم کو روکا جا سکتا تھا۔ورنہ اس مشن کے پاس ہونے کے بعد ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور یہ یقینی امر تھا کہ ملک تقسیم نہیں ہوگا۔کانگریس کے اس رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''قائداعظم اپنا فرض پورا کر چکے تھے۔کیبنٹ مشن کے پلان کو تسلیم کر کے انہوں نے

پاکستان کا مطالبہ داؤ پر لگا دیا تھا۔لیکن کانگریس کے خوف وخوشامد میں آکر مشن نے جب اپنے پلان کی صورت خود ہی مسخ کر دی،تو مجبوراً مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری واپس لے لی۔اس طرح اکھنڈ بھارت کی آخری ہنڈیا کانگریس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی مسلم کُش پالیسیوں کے چوراہے میں پھوڑ دی۔کانگریس کے بلیک میل کے آگے سر جھکا کر اور دُم ہلا کر خود اپنے ہی تیار کردہ پلان میں تحریف وتخریب کرنے والے کیبنٹ مشن نے بھی متحدہ ہندوستان کے تابوت میں آخری کیل گاڑ دی۔''8

مشن کے ناکام ہونے کے بعد مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ ہم نے مفاہمت کی پوری کوشش کی۔دلیلیں اور حجت کو کام میں لا کر دیکھ لیا۔اب یہ بات حتمی طور پر پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ ان تمام مسائل کا حل قیام پاکستان ہے۔ انگریزوں کی موجودہ اور ہندوؤں کی مجوزہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے مسلم لیگ نے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کا اعلان کر دیا اور 16 اگست 1946 کو ایکشن ڈے منایا،اسی دن پاکستان کے قیام پر مہر بھی لگ گئی۔مسلم لیگ کی اپیل پر مسلمانوں نے انگریزوں کے دیے گئے خطابات واپس کر دیے۔

16 اگست کا دن ہر جگہ تو امن وامان سے گزر گیا لیکن کلکتہ میں زبردست فساد برپا ہو گیا۔اس فسادات کی تباہی کا ذکر شان الحق،مولانا آزاد وغیرہ نے بھی اپنی خودنوشت میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔اس وقت مسٹر حسین شہید سہروردی بنگال کے چیف منسٹر تھے انہوں نے 16 اگست کو کلکتہ میں عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔اس اعلان پر کانگریسی بہت سیخ پا ہوئے۔اس دن کلکتہ میں ایک میدان میں لاکھوں مسلمان ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے جلسے میں شریک ہوئے تھے۔ جب وہ لوگ اس جلسے سے واپس ہونے لگے تو نہتے مسلمانوں پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔اس فساد سے برصغیر میں پہلی بار دوقومی نظریہ سیاست کی بساط سے میدان کارزار میں اتر آیا تھا جس نے مستقبل میں بڑے گہرے اور دورس اثرات مرتب کیے۔16 اگست کی خونریزی کے متعلق قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''کلکتہ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 24 فیصد کے قریب تھی۔16 اگست کو وہ لاکھوں کی تعداد میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے جلسے میں شریک ہوئے۔مسٹر سہروردی نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔جلسے کے بعد جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے تو شہر کے گلی کوچوں میں مسلّح ہندوؤں نے اچانک ان پر قاتلانہ حملے شروع کر دیے۔جلسہ گاہ سے واپس آنے والے مسلمانوں کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح یکا یک

ایک پہلے سے ٹھانی ہوئی سازش کا شکار ہو جائیں گے، وہ بالکل نہتے تھے۔اس کے برعکس ہندوؤں کے جتھے ہر قسم کے مہلک ہتھیاروں سے لیس تھے.....تاریخ یہ کبھی نہ بتا سکے گی کہ اس روز کلکتہ کے گلی، کوچوں، سڑکوں اور بازاروں میں کتنے مسلمان شہید ہوئے۔ان کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں تھی۔یہ قیامت صغریٰ کئی روز تک شہر کے طول وعرض میں برپا رہی۔کلکتہ کے ہندو پہلے سے تیار بھی تھے، مسلح بھی تھے اور تعداد میں بھی مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھے۔لیکن ہندو پریس یہی اودھم مچاتا رہا کہ زیادتی سراسر مسلمانوں کی ہے اور صوبے کے چیف منسٹر سہروردی ان کی خفیہ طور پر مدد کر رہے ہیں۔''9

اس سال برصغیر میں ہونے والے فسادات کا یہ پیش خیمہ تھا کیوں کہ اس کے بعد پورا ملک اس کی زد میں آ گیا تھا۔بہر حال جب وائسرائے لارڈ ویول اس فساد کا جائزہ لینے کلکتہ پہنچے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، فساد کی تباہی کو دیکھنے کے بعد جب جانچ پڑتال کی تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ ہندو مسلم فساد نہ ہو کر سوچی سمجھی سازش کے تحت کروایا گیا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق نہیں دیے گئے تو پورا ملک خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔چناں چہ کانگریس سے مشورہ کیے بغیر مسلم لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کی براہ راست دعوت دے دی۔وائسرائے کے اس قدم سے کانگریس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔اس نے شدید مخالفت کی اور لارڈ ویول کے خلاف برطانوی حکومت کو لکھا کہ اس کی جگہ کسی اور کو وائسرائے بنا کر بھیجا جائے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان رسہ کشی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، دوسری طرف پورے ملک میں ہندو مسلم فسادات باضابطہ خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔کلکتہ مین فساد کے بعد مشرقی بنگال کے نواکھلی میں فساد شروع ہوا جس میں تقریباً300 افراد مارے گئے جس میں مرنے والوں کی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔اس واقعے کو میڈیا نے بڑھا چڑھا کر کچھ ایسے انداز میں پیش کیا کہ پورے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ ہندو پہلے ہی بپھرے تھے چناں چہ انہوں نے نواکھلی کے بدلے میں بہار میں جوابی کارروائی شروع کی۔اس قتل عام میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔سرکاری اعداد وشمار کے مطابق آٹھ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔اس قتل عام کا ذکر کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''جن علاقوں میں یہ خونی طوفان اٹھا وہاں پر مسلمانوں کی آبادی سات آٹھ فیصد سے بھی کم تھی۔ ہندوؤں کے مسلّح جتھے ہاتھیوں، گھوڑوں اور بیل گاڑیوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور

گاؤں گاؤں جا کر مسلمان آبادیوں کو نیست و نابود کر دیتے تھے۔ پیدل بلوائیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ٹڈی دل کی طرح پھیلے ہوئے تھے، اور مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر، چن چن کر برچھیوں اور بھالوں سے مار ڈالتے تھے یا گھروں میں بند کر کے زندہ جلا دیتے تھے۔ درجنوں مسجدیں کھود کر ہل چلا دیا گیا۔ سیکڑوں عورتوں نے اپنی عصمت بچانے کی خاطر کنوؤں میں کود کر جان دے دی۔ بہت سے بچوں کو درختوں کے تنوں کے ساتھ میخوں سے ٹھونک کر مصلوب کر دیا گیا۔ ایک بھاری اکثریت کے ہاتھوں ایک قلیل، بے ضرر اور بے یار و مددگار اقلیت پر ظلم و بربریت کی اس سے زیادہ گھناؤنی مثال ملنا محال ہے۔''10

بہار کی اسی خونریزی میں مشہور شاعر کلیم عاجز کا پورا خاندان مٹ گیا تھا۔ ان کی شاعری میں اس درد و کرب کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی فساد کی تفصیل بیشتر خودنوشت نگاروں نے بھی پیش کی ہے۔ بہر کیف اسی طرح یوپی کے گڑھ مکتیشر کے میلے میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ وہاں ہر سال ہندوؤں کا ایک میلہ لگتا تھا جس میں کچھ مسلمان خرید و فروخت کے سلسلے میں آتے تھے۔ ایک دن ان مسلمانوں پر ہندوؤں نے حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں موجود تمام مسلمانوں کا بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ان فسادات کی وجہ سے پورے ملک میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور جو خونریزی کا بازار گرم ہوا، بیان سے باہر ہے۔ نواکھلی میں فساد کے بعد گاندھی جی وہاں جا کر لوگوں کے درمیان گھوم گھوم کر اتحاد اور دونوں قوموں کے درمیان بھائی چارگی کی تلقین کرتے رہے۔ جب بہار میں لوٹ مار شروع ہوئی تو مقامی کانگریسی کے بلاوے پر گاندھی جی بہار پہنچے۔ وہاں کی تباہی کو دیکھ کر ان کو بہت دکھ ہوا تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے 1946 میں ملک میں ہونے والے فسادات کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ گاندھی جی کے بہار دورے کے متعلق رقم طراز ہیں:

''یہاں پر (بہار) انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس نے ہندو جاتی کی امن پسندی، صلح جوئی اور غیر تشدد پسندی کے متعلق ان کے بہت سے مفروضات کی کایا پلٹ دی۔ یہاں پر وسیع و عریض علاقوں میں مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ یہ روح فرسا نظارے دیکھ کر گاندھی جی کو غالباً زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہندو قوم اتنی نرم دل، امن پسند اور غیر متشدد نہیں ہے جتنا کہ وہ سمجھتے اور پرچار کرتے رہے ہیں..... گاندھی جی کے جیون ساتھی، سیکریٹری اور سوانح نگار پیارے لال نے اپنی کتاب ''Mahatma Gandhi: The Last Phase میں بڑے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا

ہے کہ بہار کی خونریزی دیکھ کر گاندھی جی کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور متحدہ ہندوستان کے متعلق ان کا دیرینہ خواب ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔'' 11

ان بڑھتے ہوئے فسادات پر قابو پانے کے لیے لارڈ ویول کے پاس وسائل بہت کم تھے۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اعلیٰ انتظامی افسروں میں انگریزوں کی تعداد نصف ہو گئی تھی، ساتھ ہی افواج بھی کم تھیں۔ معاشی طور پر بھی برطانوی حکومت پریشان تھی۔ اب ان میں معاشی اعتبار سے اتنی طاقت نہیں تھی کہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک پر اپنی حکومت جاری رکھ سکتے کیوں کہ ان کو اپنے مسائل کو حل کرنے کی زیادہ فکر تھی۔ چناں چہ حالات اور کانگریس کے رویوں سے تنگ آ کر لارڈ ویول نے برطانوی حکومت سے سفارش کی کہ برصغیر کا اقتدار مقامی لوگوں کے ہاتھوں سونپ کر برطانیہ کو جلد از جلد اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ اس سفارش پر وزیر اعظم ایٹلی نے 20 فروری 1947 کو اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ جون 1948 تک لازمی طور پر ہندوستان کے اقتدار سے دست بردار ہو جائے گی۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''وزیر اعظم ایٹلی نے یہ اعلان بھی کیا کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس اعلان پر کانگریس نے خوشی کے بڑے شادیانے بجائے۔ لارڈ ویول مدت سے کانگریس کی تنقید و تنقیض کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ کانگریسی گرگے کافی عرصے سے حکمران لیبر پارٹی کے حلقوں میں لارڈ ویول کے خلاف اپنا اثر و رسوخ مستعدی سے استعمال کر رہے تھے۔ فیلڈ مارشل لارڈ ویول کا قصور صرف اتنا تھا کہ کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے اس نے مسلم لیگ کو براہ راست عبوری حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اب یہ بات تاریخی شواہد سے پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ لارڈ ویول کی معزولی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کا پنڈت جواہر لعل نہرو کو پہلے سے علم تھا اور اس فیصلے کو ان کی اشیر باد بھی حاصل تھی۔'' 12

1946 کے فسادات، لارڈ ویول کا مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کرنا، کانگریس کا اس کی مخالفت کرنا، ویول کا واپس انگلینڈ جانا، اور وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ہندوستان آنا، یہ تمام حالات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ قدرت اللہ شہاب نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے شہاب نامہ میں کچھ ایسے ثبوت پیش کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1946 اور اس کے بعد کے فسادات میں مقامی ہندوؤں کا ہاتھ تھا جو پورے منصوبے کے ساتھ کروایا گیا تھا۔ مختلف

پارٹیوں، سکھ راجاؤں وغیرہ نے بھی بھرپور مدد کی تھی۔ بہار کی ملازمت کے دوران انہوں نے ایک شخص مسٹر حامد علی کا ذکر کیا جو کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ وہ جب تک مصنف کے پاس رہا ایک ہی بات دہراتا رہا کہ ہندوستان بھر میں کانگریس، ہندو مہاسبھا، آر ایس ایس، اکالی دل اور کئی دوسرے ہندو اور سکھ اداروں کی سرپرستی میں بڑے وسیع پیمانے پر مہلک ہتھیار جمع کیے جا رہے ہیں جو یقیناً نہتے مسلمانوں کے خلاف استعمال کیے جائیں گے۔ پہلے تو قدرت اللہ شہاب نے سوچا کہ شاید جذبات میں آ کر ایسی باتیں کر رہا ہے لیکن بہت جلد ان کو اس بات کا ثبوت مل گیا کہ سیاسی جماعتیں بھی مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندی میں بری طرح ملوث ہیں۔

مارچ 1947 میں جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے کا عہدہ سنبھالا تو تقسیم ہند طے شدہ امر تھا جسے کانگریس نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ممکن بنایا تھا۔ اسی سال فروری میں خان لیاقت علی خان نے بجٹ پیش کیا اس کے بعد بڑا ہنگامہ ہوا کیوں کہ اس بجٹ میں امیر و غریب سب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔ جس پر ہندو صنعت کاروں، تاجروں نے خوب مخالفت کی اور کانگریس کو چندہ دینے سے صاف انکار کر دیا جس کی وجہ سے کانگریس بھی ان کے ساتھ ہو کر بجٹ کے خلاف کھڑی ہو گئی۔ اس سے پہلے کانگریس نے کیبنٹ مشن کے پلان کو فیل کر کے تقسیم کو یقینی بنا دیا تھا۔ اب ہندو تاجروں، سرمایہ داروں اور صنعت کاروں نے بھی تعصب کی بنا پر مطالبۂ پاکستان کی حمایت کرنے لگے۔ دراصل ان کو ڈر تھا کہ اگر حکومت میں مسلم لیگ کا تھوڑا بھی عمل دخل رہا تو وہ اپنی من مانی نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح کانگریس بھی ہندوستان پر اکیلے راج کرنے کی خواہاں تھی۔ ان کے اسی لالچ کی وجہ سے ملک دو حصوں میں منقسم ہوا۔

تقسیم ہند کا معاملہ طے ہونے کے بعد کانگریس کی یہ بھی کوشش رہی کہ کچھ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جس سے نوزائدہ ملک ابتدا سے ہی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ شہاب نامہ میں پیش کیے گئے اس وقت کے حالات کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی کانگریس کا ساتھ دیا تھا۔ جو کام ایک سال بعد طے ہونا پایا تھا وہ محض چند مہینوں میں مکمل کر کے ملک کو فسادات، تعصب اور نفرت کے گہرے اندھیرے میں ڈھکیل دیا گیا۔ اگر اقتدار کی منتقلی چند ماہ میں ہوتی یا ایک سال بعد، اس سے ہندوستان کو خاص فرق نہیں پڑتا اور نہ کوئی نقصان ہوتا لیکن پاکستان کو انتظامی امور مکمل کیے بغیر الگ کیا جاتا تو یقیناً اس کے سامنے بے شمار دشواریاں تھیں۔ لیکن ان سب سے کانگریس یا وائسرائے کو کوئی غرض نہیں تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے اس تعلق سے کچھ واقعات کا ذکر کیا ہے جس میں پاکستان کے تئیں کانگریس یا انگریزوں میں کسی طرح کی ہمدردی نظر نہیں آتی۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اقتدار پندرہ ماہ میں منتقل ہو یا دو ماہ میں، بھارت کے ہر طرح پو بارہ تھے۔ اسے بنی بنائی

راجدھانی ملتی تھی، جمے جمائے دفتر ملتے تھے اور صدیوں سے قائم شدہ چالو ادارے ملتے تھے۔ اس جلد بازی میں اگر کوئی مشکل درپیش تھی تو وہ صرف پاکستان کو تھی۔ جسے ایک نئی مملکت کا آغاز انتہائی بے سروسامانی اور سراسیمگی کی حالت میں کرنا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اپنے قول کے مطابق: انتظامی طور پر پاکستان کی حکومت کو اپنا کام شروع کرنے کے لیے ہم نہ کوئی بنی بنائی عمارت دے سکتے ہیں، نہ ٹین کی چھت دے سکتے ہیں۔ بلکہ فقط ایک خیمہ دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔'' 13

تقسیم ہند کا اعلان ہوتے ہی کانگریس کی طرف سے عوام میں یہ یقین دہانی بھی کرائی جاتی رہی کہ یہ صرف حالات کے پیش نظر عارضی ہے۔ اس نئے ملک میں ترقی کے امکانات بہت کم ہیں اس لیے بہت جلد نیا ملک ہندوستان میں شامل ہو جائے گا۔ قدرت اللہ شہاب نے ان چیزوں کی فہرست بھی پیش کی ہے جس میں تقسیم کے بعد پاکستان کا جائز حصہ تھا۔ تقسیم کے بعد حکومت ہند کے پاس جو نقد روپیے تھے ان میں سے پاکستان کو 75 کروڑ دینا طے ہوا تھا لیکن مجوزہ رقم کا صرف ایک حصہ ادا کرنے کے بعد حکومت ہند نے بقیہ رقم دینے سے صاف انکار کر دیا۔ جس کی ادائیگی کے لیے گاندھی جی نے برت رکھا تھا، نتیجے میں ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس واقعے کا ذکر جتیندر بلو، انیس قدوائی، اختر حسین رائے پوری وغیرہ کی خودنوشتوں میں بھی ملتا ہے۔

اس کے علاوہ فوجی سامانوں، دفتری فائلوں اور دیگر اشیا کی تقسیم کے بعد اسے ہندوستان سے ٹرین کے ذریعہ پاکستان روانہ کی گئی تھی لیکن پنجاب میں ان ٹرینوں پر حملہ کر کے آگ لگا دی گئی جس سے سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا۔ بعد میں کچھ اشیا کو ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان بھیجا گیا۔ قدرت اللہ شہاب نے خودنوشت کے باب'' پاکستان کا مطلب کیا ہے؟'' آخر میں تمام حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد مجوزہ سوال کے جواب میں چند نکات پیش کیے ہیں جو 1857 سے لے کر آزادی تک مختلف واقعات پر مبنی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک عام مسلمان کی طرح پاکستان کا مطلب کلمہ شہادت پیش کر کے اپنا بھی جواب دیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم وستم اور بربریت روا رکھی گئی تھی اس کو مختلف واقعے کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ جب مصنف تقسیم کے بعد پاکستان جانے لگے تو اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ نے ایک میٹنگ کے دوران، ان سے کہا تھا کہ اگر اسی طرح سارے مسلمان افسر پاکستان چلے گئے تو یہاں کے مسلمانوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ لیکن اس وقت بہت کم لوگ ایسے تھے جنہیں مسلمانوں کی فکر تھی ورنہ حکومت ہند نے آزادی سے پہلے ہی حکم نامہ جاری کر کے تمام بڑے

سرکاری عہدوں سے مسلمانوں کو فارغ کرنے کی مانگ کی تھی۔ کچھ ہندو ایسے بھی تھے جو مسلمانوں کا پاکستان چلے جانا ہی اس کے حق میں بہتر سمجھتے تھے کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ جتنے بھی مسلمان افسر موجود ہیں ان کو اپنے عہدوں سے برطرف ہونا پڑے گا، ان کا نہ کوئی مستقبل ہوگا اور نہ ان کی حفاظت کے لیے کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔ قدرت اللہ شہاب وزیر اعلیٰ کی بات پر غور کر کے اپنا خدشہ چیف سیکریٹری مسٹر بی سی مکر جی سے ظاہر کیا، ان کا جواب ملاحظہ ہوں:

''مہتاب جی (وزیر اعلیٰ) رسمی باتیں کرتے ہیں۔ تم یہاں رہ بھی جاؤ تو پندرہ اگست کے بعد تمہیں ہوم ڈپارٹمنٹ سے نکال کر غالباً ریکارڈ آفس کا افسر بنا کر لگا دیا جائے گا۔ تاکہ بند کمرے میں بیٹھ کر پرانی پرانی فائلوں کی گرد جھاڑتے رہو۔ میرا خیال ہے کہ چیف سیکریٹری کے طور پر میں بھی چند روز کا مہمان ہوں۔ یہ لوگ مجھے درجہ اول کا ہندو نہیں سمجھتے۔ اس لیے مجھے بھی بہت جلد کسی بے ضرر اور بے اثر محکمے کی پول میں دھانس دیا جائے گا۔ مجموعی طور پر یہ چھوٹے دل کے کمینے لوگ ہیں۔ ان کے پتھریلے ضمیر انسان دوستی کی شبنم سے نا آشنا ہیں۔ تم بڑے شوق سے پاکستان جاؤ وہاں جانا تمہارا فرض ہے۔''14

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت سیکیولر خیال کا غیر مسلم چاہے کسی بھی عہدے پر فائض ہو اگر وہ مسلمانوں کی کسی بھی طرح کی مدد کرتا تھا تو اسے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ یہی چیز دیوان سنگھ نے بھی مختلف واقعے کے ذریعہ پیش کی ہے۔ شہاب نامہ میں ریڈکلف ایوارڈ کے متعلق ہونے والے واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ریڈکلف نے کانگریس اور ماؤنٹ بیٹن کے دباؤ میں آ کر جو سرحد بندی کی اس نے کئی جگہ تنازعہ کھڑا کر دیا۔ اس سلسلے میں جو رپورٹ پیش کی گئی اس میں جموں و کشمیر اور گورداس پور جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی اسے ہندوستان کو دے دیا گیا۔ اسی طرح بنگال میں کلکتہ کے حوالے سے وہاں کی عوام کی رائے جانے بغیر ہندوستان میں شامل کر دیا۔ قدرت اللہ شہاب نے اس تقریر کا ذکر کیا ہے جس میں سردار پٹیل نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ کانگریس نے ہندوستان کی تقسیم اس شرط پر مانی تھی کہ کلکتہ ہندوستان کے حصے میں آئے گا۔ یقیناً یہ معاہدہ کانگریس اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان ہوا تھا کیوں کہ بقول مصنف مسلم لیگ کو اس سازش کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ریڈکلف نے سرحد بندی کا جو نقشہ پیش کیا اسے ہی ریڈکلف ایوارڈ کہا جاتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل شہاب نامہ میں ملتی ہے۔

مسلم اکثریت علاقوں کا ہندوستان میں ملنا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور وہ ہجرت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ لیکن مسلح ہندوؤں اور سکھوں نے جو تباہی مچائی کہ انسانیت شرمسار ہو گئی۔ ریڈکلف ایوارڈ کا

اعلان 16 اگست 1947 کو ہوا تھا تب مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ فوجی دستوں اور پولیس کی نگرانی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا تھا، عورتوں کی عصمت لوٹی جا رہی تھیں، ان کے مال و متاع کو لوٹ کر گھروں میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ دیوان سنگھ نے بھی دہلی کے کئی حملوں کا ذکر کیا ہے جو پولیس دستے کی زیر نگرانی ہندو اور سکھ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھی بلوائیوں نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا اور ان کے خون سے ہولی کھیلنے میں مصروف عمل تھے۔ صرف آزادی کے دن ساری نفرتوں اور کدورتوں کو بھلا کر لوگ آزادی کے جشن میں شامل ہوئے تھے۔ لیکن امرتسر میں یہ دن بڑے شرمناک انداز میں منایا گیا۔ قدرت اللہ شہاب جان کونیل کے جملے کو کوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''15 اگست کو بھارت پر جب آزادی کی دیوی کا نزول ہوا تو امرتسر شہر نے اس روزِ سعید کو عجیب طور پر منایا۔ جان کونیل نے اپنی کتاب 'آکنلیک' میں لکھا ہے: اس روز سکھوں کے ایک ہجوم نے مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ پھر سارے جلوس کی عصمت دری کی گئی۔ اس کے بعد کچھ عورتوں کو کرپانوں سے ذبح کر دیا گیا، باقی کو زندہ جلا دیا گیا۔ واہ گرو کا خالصہ، واہ گرو کی فتح۔''15

آزادی کے دوسرے ہی دن خونریزی کا جو بازار گرم ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ آج بھی مسلمانوں کو اپنی حب الوطنی کا ثبوت دینے کے لیے جان کی بازی لگانی پڑ رہی ہے۔ مذہبی تعصب جو اس وقت تھا آج بھی بدستور قائم ہے۔ مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان پر ظلم و ستم کیا جا رہا ہے بس نوعیت بدل گئی ہے۔ کہیں کہیں یہ تعصب خطرناک حد تک پایا جاتا ہے۔

بہر حال ریڈکلف کی سرحد بندی کے بعد ان علاقوں میں مسلمانوں کے لیے ہجرت کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ ان کے لیے ہندوستان کی ہر شاہراہ، ہر پگڈنڈی پاکستان کی طرف جاتی تھی۔ محض چند ماہ میں ہی ڈیڑھ کروڑ سے اوپر لٹے پٹے مہاجر پاکستان ہجرت کر گئے۔ حالاں کہ ہزاروں شرنارتھی بھی پاکستان سے جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ وہاں پر بھی شر پسند مسلمانوں نے بے گناہ ہندو عوام کا جینا حرام کیا تھا۔ گوپال متل نے اپنی خودنوشت ''لاہور کا جو ذکر کیا'' میں لاہور شہر کے کچھ حملوں کا ذکر کیا ہے۔ ان حملوں کے خوف سے اپنی تمام جائداد چھوڑ کر وہ بھی اپنے خاندان کے ہمراہ ہندوستان آ گئے تھے۔

مذکوہ خودنوشت کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمانوں پر حملے کیے گئے وہ ایک

پورے پلان کے ساتھ پولیس کی نگرانی میں ہوئے۔ان شر پسندوں کا ساتھ کچھ سکھ راجہ، مہاراجہ اور زمینداروں نے دیا تھا وہ کافی تعداد میں حملہ آوروں تک اصلحہ ،روپیہ پیسہ پہنچاتے تھے۔لیکن اس کے برعکس پاکستان میں جو بھی فساد یا خونریزی ہوئی وہ پلان کے تحت نہیں ہوئی تھی ،نہ ہی ان بلوائیوں کو کسی کی سرپرستی حاصل تھی۔لیکن مہاجروں کی حالت دیکھ کر وہ غصے سے بھڑک اٹھتے اور بدلے میں بے گناہ ہندوؤں پر حملہ کر دیتے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تباہیوں کو سن سن کر پاکستان کے ہندو کافی ڈرے ہوئے تھے،اسی طرح اسلامی ملک بن جانے کے بعد ان کو اپنا مستقبل بھی خطرے میں نظر آرہا تھا۔اس لیے وہاں سے بھی بے شمار ہندوؤں نے بھی سب چھوڑ چھاڑ کر ہجرت کر لی۔ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو سوائے مکان اور زمین جائداد کو چھوڑ کر نقد و زیورات اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے۔دیوان سنگھ نے اس تعلق سے کئی نام گنوائے جس میں ایک خاندان کا قصہ کافی دلچسپ ہے جو اپنے ساتھ پاکستان سے اُس ہنگامی حالت میں نقد و زیور کے ساتھ اچار کا ڈبہ بھی بحفاظت لے آئے تھے۔اس تعلق سے قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

> ''کچھ ہندو خاندان آٹھ دس اونٹ گاڑیوں پر اپنا سامان لادے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔نشتر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: یہ لوگ کتنے آرام سے اپنا تنکا تنکا سمیٹ کر یہاں سے لے جا رہے ہیں۔اُس طرف سے ہمارے لوگ جس حالت میں یہاں پہنچتے ہیں،اس کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''16

قدرت اللہ شہاب نے تقسیم کے بعد پاکستان کی فوری مشکلات کا جو وہاں کی حکومت کے لیے دردسر بنی تھی،اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔انہوں نے خاص طور پر ان مہاجرین کا ذکر کیا ہے جو کافی مشکلوں اور پریشانیوں سے لٹ پٹ کر پاکستان پہنچے تھے۔پاکستانی حکومت کے لیے ان کو از سر نو بسانا اور روزگار مہیا کرانا بڑا مشکل امر تھا۔مصنف کے گھر بھی کچھ مہاجرین قیام پذیر تھے۔ان میں سے ان کا ایک عزیز مع خاندان چمکور سے کراچی آنے والا تھا انہیں تلاش کرنے کی غرض سے قدرت اللہ شہاب نے کراچی کے مختلف مہاجر کیمپوں کا دورہ کیا لیکن ان کا عزیز نہیں ملا اور نہ اس کی کوئی خبر ملی،شاید وہ لوگ بھی بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔دوست تو نہ مل سکا لیکن کیمپوں میں مہاجروں کی درد بھری داستان سن سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک رات میں ہی ناولٹ ''یا خدا'' لکھ ڈالا جو سب سے پہلے نیا دور کے فسادات نمبر میں شائع ہوا۔بعد ازاں 1948 میں ناولٹ کی صورت میں کراچی سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔

تقسیم کے بعد جموں و کشمیر کے مسلمانوں نے آزادی کا بگل پھونک دیا۔وہ پاکستان سے الحاق کے لیے زور دے رہے تھے۔وہاں مہاراجہ ہری سنگھ کی قیادت میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔اس تمام واقعات کی تفصیل

شہاب نامہ میں ملتی ہے۔ان کے گھر والے بھی جموں سے اپنی جان بچا کر بمشکل پاکستان پہنچے تھے۔شہاب نامہ میں ''آزاد کشمیر'' کے نام سے ایک باب میں بڑی تفصیل کے ساتھ جموں وکشمیر کی پوری تاریخ اور سیاسی حالات کو چھوٹے چھوٹے کالم کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جس میں آزاد کشمیر ومقبوضہ کشمیر اور اس کے تئیں حکومت ہند کی دغابازیوں کا ذکر کیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد وہاں کے سیاسی حالات کا ذکر خودنوشت کے نصف حصے پر مشتمل ہے۔جس میں بڑی تفصیل کے ساتھ وہاں کے سیاسی ہتھکنڈوں،صوبائی علاقوں کی بدعنوانیوں،خفیہ سیاسی ریشہ دوانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے اس میں کچھ ایسے راز بھی پنہاں ہیں جس کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔حالاں کہ اس خودنوشت پر خاص کر آخری دو باب پر کافی تنازعے بھی ہوئے،کچھ ایسے کردار بھی ہیں جسے عقل تسلیم نہیں کرتی۔اسی طرح مصنف نے نقادوں کے ان تبصروں کو بھی شامل کیا ہے جو ان کی تخلیقات پر کیے گئے ہیں۔خودنوشت میں اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی اس سے صرف اس کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے۔مصنف کے ذاتی احوال جن کا تعلق ان کے گھر خاندان سے تھا اس کا بھی ذکر بہت کم ہے۔لیکن انہوں نے اپنی ذات کو سیاسی رنگ میں خودنوشت کے پیرائے میں ڈھالنے کی جو سعی کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

غرض خودنوشت کی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ایک مکمل تاریخی مرقع ہے۔اس میں بھرپور زندگی کی رونے رلانے، ہنسنے ہنسانے والے واقعات کا حیرت ناک وعبرت ناک قصہ شامل ہے۔اس کتاب میں انگریزوں کا راج، ہندوؤں کا سماج،سکھوں کا مزاج،مسلمانوں کا ٹمٹماتا ہوا چراغ،مطالبۂ پاکستان، پاکستان کی مشکلات، وہاں کے سیاسی سربراہوں کی کج رویوں، ہیرا پھیریوں،نوکر شاہی کی جی حضوریوں،بیوروکریٹس کی من مانیوں،انتظامیہ کی دھاندلیوں اور معاشرے کی بے حسی سب کچھ شامل ہے۔

حوالہ جات

1۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2018ء، ص: 11
2۔ ایضاً، ص: 152
3۔ ایضاً، ص: 153
4۔ ایضاً، ص: 158
5۔ ایضاً، ص: 160
6۔ ایضاً، ص: 217
7۔ ایضاً، ص: 220
8۔ ایضاً، ص: 271
9۔ ایضاً، ص: 272
10۔ ایضاً، ص: 276
11۔ ایضاً، ص: 277
12۔ ایضاً، ص: 279
13۔ ایضاً، ص: 283
14۔ ایضاً، ص: 295
15۔ ایضاً، ص: 303
16۔ ایضاً، ص: 312

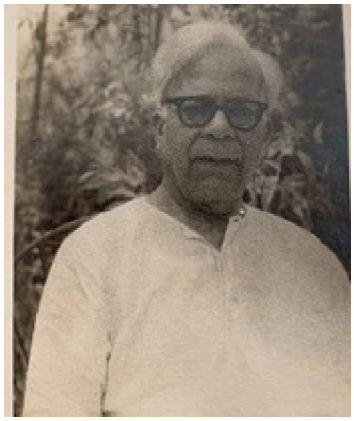

آل احمد سرورؔ: خواب باقی ہیں

سنہ اشاعت: 1991

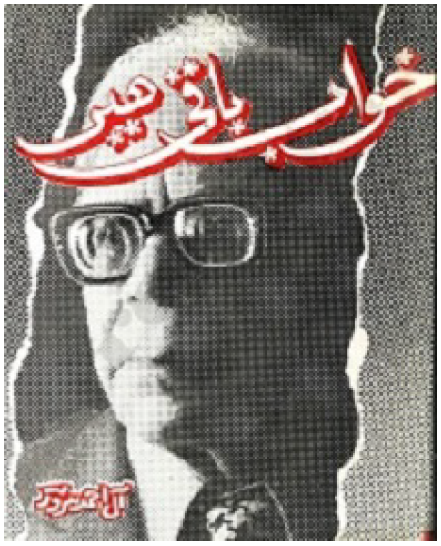

خواب باقی ہیں (آل احمد سرورؔ)

پروفیسر آل احمد سرور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے خواہ وہ تنقید ہو یا تخلیق، نثر ہو یا شاعری، مقالے ہوں یا اداریے ہر جگہ اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ لیکن ان کی تنقید اس قدر حاوی اور غالب ہے کہ دوسری حیثیتیں پس پشت پڑ گئی ہیں۔ وہ اردو کے قد آور نقاد تسلیم کیے گئے ہیں۔ وہ 9 ستمبر 1911 کو شمالی ہند کی ریاست اتر پردیش کے علاقہ پیلی بھیت ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ دراصل جب ان کا اسکول میں داخلہ کرایا گیا تو ان کے والد نے 17 اکتوبر 1912 درج کرایا جو کہ درست نہیں ہے۔ تاہم اسی بنا پر بعد کے محققین اور نقادوں میں ان کی تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا گیا ہے لیکن آل احمد سرور نے اپنی خودنوشت میں 9 ستمبر 1911 درج کی ہے اس لحاظ سے راقمہ نے بھی اسی تاریخ کو لکھا کیا ہے۔

ان کے والد محکمہ ڈاک میں ملازم تھے۔ ان کا یوپی کے مختلف شہروں میں تبادلہ ہوتا رہا۔ لہٰذا سرورؔ کی تعلیم مختلف شہروں میں مکمل ہوئی۔ 1928 میں انہوں نے ہائی اسکول پاس کیا۔ 1932 میں آگرہ کے سینٹ جارج کالج سے سائنس میں گریجویٹ کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے پہلے انگریزی میں پھر اردو میں ایم اے کیا۔ اسی دوران وہ علی گڑھ کی اردو میگزین کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔ 1938 میں شعبہ اردو میں لکچرر ہوئے۔ اس کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے منتخب ہوئے جہاں انہوں نے 1955 تک کام کیا بعد ازاں وہاں استعفیٰ دے کر دوبارہ علی گڑھ کا رخ کیا اور رشید احمد صدیقی کے بعد شعبہ کے صدر ہوئے۔ ملازمت کا زمانہ جس میں انہوں نے اپنا زیادہ وقت علی گڑھ میں گزارا۔ اس کے علاوہ رام پور، کشمیر میں بھی ملازمت کی تھی۔ ہماری زبان (1956 1974) اور سہ ماہی رسالہ اردو ادب (1971-1950) کے مدیر بھی ہوئے۔ ان کا انتقال 9 فروری 2002 کو دہلی میں ہوا۔

آل احمد سرور کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں کشمیر یونیورسٹی نے 1989 میں انہیں ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ 1990 میں شعبہ اردو، علی گڑھ میں انہیں پروفیسر ایمریٹس مقرر کیا گیا۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی سے چار مرتبہ اور ساہتیہ اکیڈمی سے ایک مرتبہ انعام ملا۔ ان کو 1992 میں حکومت ہند نے پدم بھوشن کا خطاب دیا اور 2001 میں حکومت مدھیہ پردیش نے اقبال سمان ایوارڈ دیا۔

1911 سے 2002 تک کا طویل عرصہ وہ دور رہا ہے جس میں دنیا نے نہ صرف دو عالمی جنگوں کا سامنا کیا بلکہ ایٹم بم کے خطرناک اثرات بھی دیکھے۔ ہر طرح کی نسل کشی، تشدد پسندی وغیرہ کے ساتھ آزادی ملک، تقسیم ہند،

رشتوں کا ٹوٹنا بکھرنا آل احمد سرور نے نہ صرف ان چیزوں کا مشاہدہ کیا بلکہ ایک حد تک لوگوں کو علم سے آراستہ کرنا، ان کی آگہی میں اضافہ کرنا، ان کے شعور کو بیدار کرنا اور لفظوں کو نئی معنویت دینا ان سب میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اردو زبان سے محبت تھی۔ وہ کھلے ذہن رکھنے والے نقاد تھے انہوں نے خود کو کسی گروہ یا تحریک سے وابستہ نہیں کیا جب بھی کوئی نئی چیز نظر آئی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ لکھنؤ قیام کے دوران ترقی پسند سے متاثر ہوئے اور انجمن کے جلسوں میں شریک ہونے لگے لیکن وہ کبھی بھی ترقی پسند نظریاتی جبر کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کی ترقی پسند فکر ہمیشہ انسان دوستی کی علمبردار رہی، وہ سرمایہ داری اور رجعت پسندی کی مخالفت کرتے رہے۔ ان میں ترقی پسندوں جیسا جوش وخروش نہیں پایا جاتا۔ جب جدیدیت کا رجحان آیا تو اس کے طرز وفکر سے بھی متاثر ہوئے۔

اردو سے اپنی محبت کی بدولت اور اس کی ترویج کے لیے انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوئے۔ انہوں نے مغربی اور مشرقی ادب کے گہرے مطالعے کے بعد اپنی تنقید نگاری کے لیے ایک الگ ہی انداز دریافت کیا اس میں مغربی تنقیدی اصولوں سے استفادہ بھی ہے اور مشرقی اقدار کا رچاؤ بھی۔ ان کے ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ ''تنقیدی اشارے'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی تنقید اور شاعری پر متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں نئے اور پرانے چراغ، تنقید کیا ہے؟، ادب اور نظریہ، نظر اور نظریے، مسرت سے بصیرت تک، اقبال اور ان کا فلسفہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری کا مجموعہ سلسبیل، ذوقِ جنوں اور خواب وخلش ہیں۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' کے نام سے تحریر کی ہے۔

آل احمد سرور اردو ادب کی ایک عظیم المرتبت شخصیت تھے انہوں نے ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''کتاب پڑھتے پڑھتے خود کتاب بن گئے۔'' انہوں نے ایک طویل عمر پائی، اتنی ہمہ گیر اور فعال شخصیت سے یہ توقع بجا طور پر تھی کہ وہ اپنے قارئین کو اپنی زندگی کے اسرار ورموز سے آگاہ کریں اور اپنے تجربات میں انہیں شامل کرسکیں۔ شاید سرورؔ کو خود اس بات کا احساس تھا انہوں نے خودنوشت کے حرف آغاز میں خود اعتراف کیا ہے۔ چناں چہ انہوں نے ''خواب باقی ہیں'' کے نام سے اپنی سرگزشت قلم بند کی۔ یہ خودنوشت جو کہ 373 صفحات پر مشتمل ہے، سب سے پہلے ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ نے 1991 میں شائع کیا۔

راقمہ کے پاس اس کا دوسرا ایڈیشن موجود ہے جو 2000 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوا۔ انہوں نے روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے خودنوشت کی ابتدا اپنے بچپن سے کی ہے۔ اس ضمن میں اپنے وطن بدایوں، اپنے آباواجداد، اہل خاندان، اپنی پیدائش اور بسم اللہ خوانی کا ذکر کیا ہے۔ وہ عام طور سے غیر جذباتی رویہ اختیار کرتے ہوئے

انتہائی سادگی سے کتابِ زندگی کے اوراق اُلٹتے چلے گئے ہیں۔اپنی خودنوشت میں دوقومی نظریے کی بحث بھی اٹھائی ہے ساتھ ہی اس کی مخالفت بھی کی ہے۔اس خودنوشت کو پڑھنے کے بعد ایک تشنگی کا احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب کی نثر میں وہ رنگینی اور شگفتگی نہیں جو سرورؔ کا خاصہ تھی۔اس ضمن میں خالد علوی لکھتے ہیں:

''خواب باقی ہیں میں بہت سی معلومات قید ہیں لیکن جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے کاش سرور صاحب اس خودنوشت پر نظر ثانی کرتے تو اس کی نثر شگفتہ اور دلچسپ ہوتی جس کے لیے وہ مشہور ہیں۔''1

بہر حال ان خامیوں سے درگزر کیا جائے تو معلومات کے اعتبار سے یہ ایک اہم خودنوشت ہے کیوں کہ اس میں کچھ تاریخی دستاویز بھی محفوظ ہیں۔آل احمد سرور نے اپنے وقت کے سیاسی حالات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔آزادی ملک اور تقسیم ہند کے ساتھ اس کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔بچپن میں وہ اپنے اقربا کے ساتھ ان محفلوں میں جاتے تھے جہاں انگریزوں کی غلامی سے آزادی کے لیے تقریریں ہوا کرتی تھیں۔جمعہ کے دن بدایوں کی جامع مسجد میں نماز کے بعد تقریریں ہوتی تھیں جن کا موضوع سیاسی ہوتا تھا۔خلافت تحریک کے دوران اکثر علماء اور سیاسی لیڈر اس مسجد میں آتے اور اپنی طرز فکر سے لوگوں کو آگاہ کرتے۔اس وقت سرورؔ کو ساری باتیں سمجھ تو نہ آتی تھیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ لطف بہت آتا۔اس سلسلے میں اپنے بچپن کے کئی واقعے کا ذکر کیا ہے۔ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بدایوں آئیں اس وقت ان کی تقریر سے پہلے وہ نظم پڑھی گئی جو اس وقت بہت مقبول تھی۔

بولیں اماں محمد علی کو　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔۔۔

اس نظم کو بعد میں بچوں کے ساتھ مل کر وہ بھی گایا کرتے۔ان کے گھر کے افراد خلافت تحریک میں سرگرم عمل تھے اور اس کے لیے وہ لوگ چندہ اکٹھا کرتے تھے۔یہ دیکھ کر ایک بار سرورؔ نے بھی اپنے خالہ زاد بھائی کے ساتھ مل کر خلافت تحریک کے لیے چندہ اکٹھا کیا تھا۔ان اجلاس کا بھی ذکر کیا جو 1925 میں کانپور میں کانگریس اور خلافت کمیٹی کا ہوا تھا اس میں وہ شریک ہوئے تھے۔اس وقت ان کی عمر زیادہ نہیں تھی اور نہ ان کو سیاست کی اتنی سمجھ تھی لیکن انہوں نے اس وقت جو دیکھا اور محسوس کیا، اس کی منظر کشی خودنوشت میں کی ہے۔جب وہ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے اس وقت پنڈت نہرو علی گڑھ آئے تھے یہ 33-1932 کا زمانہ تھا۔اسٹریچی ہال میں پنڈت نہرو کی تقریر ہوئی۔انہوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''جواہر لعل نے اپنی تقریر کے شروع میں کہا کہ لوگ میرے متعلق کہتے ہیں کہ میں خواب

دیکھتا ہوں۔ میں اس جرم کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں خواب دیکھتا ہوں، میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھتا ہوں۔ پھر انہوں نے آزادی اور جمہوریت اور سوشلزم کے نصب العین پر زور دیا۔''2

آل احمد سرور، جواہر لعل نہرو کی شخصیت اور ان کی سوچ سے کافی متاثر تھے۔1938 میں علی گڑھ میں بھی مسلم لیگ کا رجحان اور پاکستان کی مانگ بڑھ گئی تھی۔اس کا بھی ذکر انہوں نے کیا ہے۔مسلم اسٹوڈنٹس فیدریشن وجود میں آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی والے بھی لیگ کی حمایت کرنے لگے اور پاکستان کی مانگ کو حق بجانب ٹھہرا رہے تھے۔ دراصل اس دوران محمد علی جناح کئی بار علی گڑھ آ چکے تھے جس کی وجہ سے مسلم لیگ کا اثر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔اس کے علاوہ مسلم لیگ کے دوسرے لیڈر بھی علی گڑھ کا رخ کرتے تھے جس کی وجہ سے طلبہ کے ساتھ اساتذہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔سرورؔ نے گاندھی جی کی اس اسکیم کا بھی ذکر کیا ہے، جو واردھا اسکیم کے نام سے جانی جاتی ہے جس کے تحت طلبہ میں ہاتھ کے کام کو ابتدائی تعلیم میں ضروری قرار دیا گیا تھا جس سے کتائی، بنائی وغیرہ کا کام کر کے وہ اپنے تعلیم کا خرچ نکال لیں۔اس کے علاوہ اس کے ذریعہ آٹھویں جماعت تک مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا تھا ساتھ ہی ہر سرکاری ادارے سے مذہبی تعلیم کو الگ کرنے کی بات کی گئی تھی۔اس سے مسلم لیگی کو اردو اور مسلمانوں کے لیے خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے اس اسکیم کی مخالفت کی تھی۔

سرورؔ نے اپنی خودنوشت میں لسانی تفریق پر بحث بھی کی ہے۔1945 میں جے پور میں پی ای این کانفرنس ہوئی تھی جس میں سرورؔ کو بھی مقالہ پڑھنے کے لیے پیش کش کی گئی۔اس کانفرنس میں پنڈت نہرو، سروجنی نائیڈو، رادھا کرشنن جیسے بڑے لوگ شامل تھے۔ان تمام لوگوں سے سرورؔ نے ملاقات کی اور اردو کے خلاف جو پروپیگنڈہ ہو رہا تھا اس کے متعلق ان کو آگاہ کیا۔پنڈت نہرو کچھ ہی وقت پہلے احمد نگر جیل سے رہا ہوئے تھے اس لیے ملک میں ہونے والی لسانی تفریقات کا ان کو علم نہیں تھا۔انہوں نے دلاسہ دلایا کہ میں خود اپنے تئیں معلومات حاصل کر کے جواب طلب کروں گا۔دراصل سرورؔ اردو زبان کے سچے شیدائی تھے اور اس کے ساتھ سوتیلا برتاؤ ان کی برداشت سے باہر تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے حکومت وقت کی وزراء کی کارکردگی پر بھی خاصی نکتہ چینی کی ہے اس ضمن میں سمپورنانند اور پرشوتم داس کی اردو دشمنی کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

1946 میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر ان کا تقرر ہوا۔وہاں سے گرمی کی تعطیل میں اپنے شہر بدایوں آئے۔4 جون 1947 کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہونے کے بعد چاروں طرف فسادات پھوٹ پڑے۔

سرورؔ بدایوں میں ہی تھے کہ وہاں سے بھی فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ جولائی میں وہ علی گڑھ ہوتے ہوئے دہلی گئے۔ قرول باغ جانے کے لیے انہوں نے ایک جگہ سے بس پکڑی وہاں شرنارتھیوں کے ہجوم اور ان کے غصے کا ذکر کیا ہے جو ذرا سی بات پر مار پیٹ کے لیے تیار تھے۔ لکھتے ہیں:

''شام کو بس سے فوارہ پہنچا تا کہ وہاں سے قرول باغ کے لیے دوسری بس لے لوں، فوارہ پر بہت ہجوم تھا۔ دہلی میں پنجاب سے بہت سے شرنارتھی آ گئے تھے۔ سب غیض وغضب کے عالم میں تھے، ذرا سی بات پر لڑنے کو تیار۔ میں بش شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا اس لیے وہ مجھے ہندو سمجھے۔ مسلمانوں کو خوب برا بھلا کہہ رہے تھے۔''3

بڑی مشکل سے وہ قرول باغ پہنچے۔ دہلی میں جن کے گھر ٹھہرے تھے بعد میں ان کا گھر بھی لوٹ لیا گیا انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے نام گنوائے ہیں جن کا گھر فسادات کی نظر ہو چکا تھا۔ بعد میں سرورؔ نے ایک سکھ کے گھر پناہ لی تھی اس نے اپنی جان پر کھیل کر ان کی حفاظت کی۔ ایسے کشیدگی بھرے ماحول میں بھی کچھ لوگ تھے جن کے لیے انسان دوستی اور رحم دلی ہی اولیت کا درجہ رکھتی تھی۔ سرورؔ دہلی پہنچنے کے دوسرے دن بدایوں ہوتے ہوئے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں فسادات تو نہیں ہوئے لیکن پرانے شہر سے اکّا دکّا خبریں آ رہی تھیں۔ شرنارتھی مسلمانوں کے گھر پر رات میں نشاندہی کرتے اور دوسرے دن دھاوا بول دیتے۔ ایسے ہی ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں میرے گھر کے قریب غلام حسن بٹ رہتے تھے جو لکھنؤ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے مکان پر ایک خاص قسم کا نشان بنا ہوا ہے۔ پڑوس میں کئی مسلمانوں کے مکانات تھے ان پر بھی اسی قسم کا نشان تھا۔ مگر اس علاقے میں ہندوؤں اور عیسائیوں کے مکانوں پر نہیں تھا۔ میں بٹ صاحب کے پاس گیا ان کے مکان پر بھی یہ نشان تھا۔ انہوں نے فوراً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے رابطہ قائم کیا۔ رات کو ہمارے علاقے میں پولیس لاریوں میں ہر گھنٹے دو گھنٹے کے وقفے سے گزرنے لگی۔ جو لوگ پنجاب سے لٹ لٹا کر آئے تھے وہ غصے میں تھے۔ ان میں سے بعض نے شہر کے ہندوؤں کو اکسایا مگر لکھنؤ والے اپنی روایتی صلح پسندی پر قائم رہے۔''4

اس وقت ملک میں عجیب دہشت گردی کا ماحول تھا لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ جو لوگ اپنا سب کچھ کھو کر سرحد کے پار آ اور جا رہے تھے وہ مقامی لوگوں کو اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم کی داستان سناتے جسے

سن کر لوگ مشتعل ہوتے اس طرح وہ ایک دوسرے کے دشمن بنتے چلے گئے۔

دوسری بات ملک کی تقسیم مذہب اور دوقومی نظریے کی بنیاد پر ہوئی تھی اس لیے یہاں کے ہندوؤں میں نفرت اور غصہ بڑھتا رہا۔ ہم سایے جو کبھی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ ہوا کرتے تھے، ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے۔ لکھنؤ قیام کے دوران ہر اتوار کو سرورؔ اپنے گھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے منعقد کرتے تھے۔ انہوں نے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے جس میں جلسے کے دوران پڑوس میں شور شرابہ ہوتا ہے جب معلوم کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے گھر سے ایک پتھر پڑوسی کے گھر میں پھینکا گیا تھا۔ اس سکھ کے کئی بیٹے پنجاب میں مارے گئے تھے ایک بیٹا بچا تھا وہ پتھر اس کے پاس جا کے گرا تو وہ سکھ بہت غصہ ہوا اور اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ پھر سرورؔ کے بیٹے صدیق، جس کا ان کے گھر آنا جانا لگا تھا، اس نے بتایا کہ ہمارے گھر جلسہ ہو رہا ہے جہاں کچھ بچے بھی ہیں انہوں نے ہی پھینکا ہوگا اس طرح وہ سکھ مان گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات کتنے کشیدہ تھے چھوٹی چھوٹی بات پر لوگ آستین چڑھا لیتے تھے۔

چاروں طرف فساد ہو رہے تھے لیکن سرورؔ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ اس سے پاک رہا تھوڑے بہت اور جو فساد ہوئے اس پر قابو پا لیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ لکھنؤ والے امن پسند ہیں جب شرنارتھی پنجاب سے آئے تو یہاں بھیک مانگنے اور اپنے حالات پر ماتم کرنے کے بجائے مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر تجارت شروع کر دی اور اس طرح انہوں نے اپنی مالی حالت کو بحال کیا۔ انہوں نے اس مشاعرے کا بھی ذکر کیا ہے جو پناہ گزینوں کی امداد کے لیے منعقد کیا گیا تھا جس سے اچھی خاصی آمدنی ہوئی اور وہ رقم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حوالے کر دی گئی تھی۔

آل احمد سرور کبھی مسلم لیگ کے حمایتی نہیں تھے اور نہ اقبالؔ اور مسٹر جناح کے نظریے کے قائل تھے۔ وہ قوم پرست تھے۔ ان کا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں تھا، وہ کسی مذہب یا فرقے کی بنیاد پر نہیں سوچتے تھے لیکن ان کو اس بات کا افسوس تھا کہ ملک میں آزادی کے بعد ہندو احیا پرستی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کی تعصبی اور تنگ نظریے سے وہ نالاں تھے۔ کچھ لوگوں کو اس ملک میں مسلمانوں کا وجود بھی ناگوار گزرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تنگ نظری اور تعصب ملک کے مفاد میں نہیں تھا۔ انہوں نے اس تعصب کی ایک مثال دی ہے لکھتے ہیں:

> ''جب 1947 میں ہندستان آزاد ہوا تو دلی میں جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ ہم دو سو سال کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں گووند ولبھ پنت (وزیر اعلیٰ یوپی) نے کہا تھا کہ ہم ہزار سال کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔''5

دراصل پنڈت نہرو انگریزوں کی غلامی کی طرف اشارہ کر رہے تھے لیکن پنت جی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ

مسلم حکمرانوں کے دور میں بھی ہندوستان غلام تھا۔ جب کہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان جب ہندوستان میں آ کر بسے تو اسی کے رنگ میں رنگ گئے اور اسے ہی اپنا ملک جانا۔ سرورؔ نے اس تقریر کا ذکر کیا ہے جس میں جواہر لعل نہرو نے 1963 میں دہلی میں جشن ظفر کے موقع پر کہا تھا کہ مغل ہمارے ہیں۔ وہ مغلوں کی حکومت کو بدیسی نہیں سمجھتے تھے کیوں کہ وہ ہندوستان کی ترقی و ترویج کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور شاہجہاں کے دور میں یہی ملک سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ سرورؔ نے جواہر لعل نہرو اور گاندھی جی کی سوچ اور فکر کی بہت تعریف کی ہے۔ آزادی کے بعد جواہر لعل کی کوششوں کے باوجود ہندو احیا پرستی بڑھتی رہی حالاں کہ گاندھی جی کے قتل کے بعد اس کا زور ٹوٹا تھا لیکن آر ایس ایس اور جن سنگھ کی سرگرمیوں سے یہ احیائی قوتیں پھر سے زور پکڑنے لگی تھیں جس پر انہوں نے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

1977 میں لاہور میں بین الاقوامی اقبال کانفرنس کا ہفت روزہ اجلاس ہوا تھا جس میں آل احمد سرورؔ نے بھی شرکت کی۔ تقسیم کے بعد پہلی بار پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں رہنے والے مہاجروں کے ذکر کے ساتھ پاکستان کی معیشت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں ملک کی معیشت کا انحصار ان رقوم پر ہے جو مشرق وسطیٰ میں مقیم پاکستانی اپنے عزیزوں کو بھیجتے ہیں۔ گرانی ہندوستان سے زیادہ ہے لیکن بڑی بات ہے کہ کوئی بھوکا نہیں سوتا۔ اس کے علاوہ آل احمد سرور نے کشمیر کی خوبصورتی کے ساتھ وہاں کی تہذیب و تمدن، معاشی و سیاسی حالات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ کشمیر کے تشخص کو ختم کرنے میں سیاسی پارٹیوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح وہ دفعہ 370 کو ختم کرنے میں لگے ہوئے ہیں بالآخر موجودہ حکومت نے اس میں کامیابی حاصل کر ہی لی۔

خودنوشت کا اختتام حرف آخر کے عنوان سے کیا گیا ہے جس میں اپنے اور چند ادبی لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی میں ہندوستان کی بڑھتی ترقی پر بھی بحث کی ہے۔ آزادی کے بعد ملک تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہوا۔ بدعنوانی، مہنگائی بڑھنے کی وجہ سے لوٹ مار، لوگوں میں اخلاقی قدروں کا کم ہونا ان تمام چیزوں کے ذکر کے ساتھ ہی ہندوستان کی ان سیاسی پارٹیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ملک کی ترقی و ترویج میں خطرہ بن کر فرقہ واریت کو جنم دے رہی ہیں۔ تشدد کو بڑھاوا دے رہی ہیں، مذہب کے نام پر عوام کو گمراہ کرنے کا کام بھی زور و شور سے کیا جا رہا ہے۔ اسکولوں کالجوں میں پڑھائی کی جگہ سیاست زیادہ ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے، ان تمام امور پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''میرا کبھی کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں رہا لیکن ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کا پُر جوش حامی رہا گو کہ اس جد و جہد میں کوئی عملی حصہ نہ لے سکا۔ مسلم لیگ کی سیاست مجھے کبھی

متاثر نہ کر سکی۔''6

مختصر یہ کہ آل احمد سرور کی خودنوشت میں واقعات و حادثات کی بہتات ہے۔ اپنے نجی حالات کے تذکرے کے ساتھ سیاسی، سماجی و معاشی پہلو پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ معلومات کے اعتبار سے ''خواب باقی ہیں'' کا شمار اچھی خودنوشت میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ایسی رزمیہ داستان ہے جس کے ہیرو سرور ہیں۔ اردو کی اہم خودنوشتوں کا جائزہ لیتے وقت اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات

1۔ مشمولہ، ڈاکٹر خالد علوی، مضمون خواب باقی ہیں، آج کل، 2012، دہلی، ص: 15
2۔ آل احمد سرورؔ، خواب باقی ہیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، اشاعت ثانی 2000، ص: 59,60
3۔ ایضاً، ص: 129,130
4۔ ایضاً، ص: 130
5۔ ایضاً، ص: 171
6۔ ایضاً، ص: 351

شکیل الرحمٰن: آشرم

سنہ اشاعت: 1992

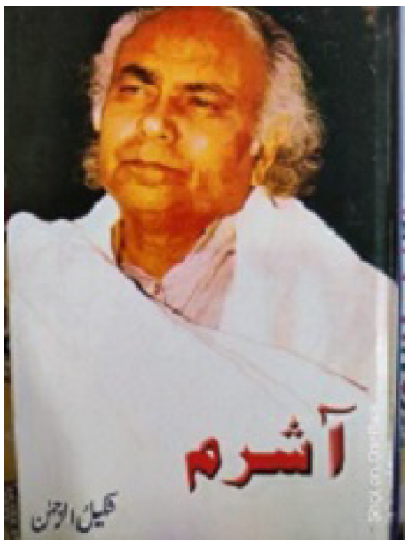

آشرم (شکیل الرحمٰن)

شکیل الرحمٰن درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور میدان سیاست کی مشہور شخصیت تھے۔ ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد عملی سیاست میں حصہ لیا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اردو ادب کے ہر میدان کے مجاہد شکیل الرحمٰن نے کلاسیکی ادب، فکشن، غالبیات، جمالیات اور چند دوسرے موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھ کر سرمایہ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے شب و روز کی داستان، سیاسی، سماجی اور معاصرین کا تذکرہ ''آشرم'' کے نام سے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ 18 فروری 1931 کو بہار کے ضلع چمپارن میں موتیہاری علاقے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خان بہادر مولوی محمد جان، بہار کے مشہور وکیل تھے، سماج میں ان کا اعلیٰ مقام تھا۔ یہ لوگ بہار کے ہی چھپرہ شہر سے موتیہاری آ کر بس گئے تھے اور وہیں محمد جان منزل کے نام سے ایک شاندار کوٹھی بنا کر سکونت پذیر ہوئے۔

شکیل الرحمٰن کی ابتدائی تعلیم گھر اور مدرسوں میں ہوئی، بعد ازاں مزید تعلیم پٹنہ یونی ورسٹی سے مکمل کی۔ 1953 میں ڈگری کالج، بھدرک (اڑیسہ) میں لکچرر ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد مولانا آزاد کے حکم پر کشمیر گئے اور ایس پی کالج میں شعبہ اردو کے سربراہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کشمیر یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام کے وقت بنیاد کی پہلی اینٹ انہوں نے ہی رکھی تھی۔ وہ شعبہ اردو کے بانی و اولین سربراہ بھی تھے۔ اس کے بعد تو ان کی ترقی کے راستے کھلتے گئے۔ بحیثیت پروفیسر و سربراہ شعبہ اردو (کشمیر یونی ورسٹی)، بحیثیت وائس چانسلرس (بہار یونی ورسٹی، متھلا یونی ورسٹی، کشمیر یونی ورسٹی) اور مختلف سرکاری عہدوں پر رہتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کو بے شمار انعام و اعزازات سے نوازا گیا، جس میں غالب ایوارڈ، نیشنل ایوارڈ، اردو اکیڈمی ایوارڈ، احمد ندیم قاسمی ایوارڈ (پاکستان) وغیرہ اہم ہیں۔ اردو میں جمالیاتی تنقید کا یہ ممتاز نقاد 2016 میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

''آشرم'' کے نام سے مصنف کی خودنوشت سب سے پہلے 1992 میں شائع ہوئی۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب 2011 میں عرفی پبلی کیشنز، ہریانہ سے منظر عام پر آئی اور یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا۔ 250 صفحات پر مشتمل مذکورہ خودنوشت میں کوئی ابواب بندی نہیں کی گئی ہے۔ محض ایک سے لے کر بیس تک کے اعداد الگ الگ صفحات پر جلی حرفوں میں نمایاں کیا گیا ہے اور ان ہی کے ضمن میں مختلف موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے پوری کتاب میں استعاروں، کنایوں اور تشبیہوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اپنے حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک جدت اور کی ہے کہ وہ خودنوشت میں اپنی روداد حیات بذات خود اپنی جانب منسوب نہ کر کے صیغہ واحد غائب میں بیان کرتے ہیں۔ اسی طرز پر ندا فاضلی نے بھی اپنی خودنوشت رقم کی ہے۔ بہر حال شکیل الرحمٰن نے خودنوشت کی ہیئت

کے خلاف ایک نیا طرز طریقہ اختیار کر کے اپنی مذکورہ کتاب کو کافی دلچسپ اور الگ بنا دیا ہے۔لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کی اس کوشش کے سبب عام قارئین کو عبارت کی افہام و تفہیم میں دشواری کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔صفحات کے صفحات پڑھنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مصنف کس کے متعلق واقعات کو بیان کر رہے ہیں۔گویا پوری داستان سننے کے بعد 'سیتا کس کی بیوی' جیسے سوالات کے اٹھنے کی صورت حال سے قاری کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

خودنوشت کا آغاز اپنیشد کے حوالے سے فلسفیانہ باتوں سے ہوتا ہے۔اس کے بعد اپنے خاندان، بچپن، گھریلو ماحول، تعلیم و تربیت کے ساتھ برصغیر کے سیاسی حالات کا ذکر ملتا ہے۔مصنف کے دادا لیلا دھر پرشاد نے اسلام قبول کر کے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا تھا، ان کے خاندان کے اکثر لوگ ہندو ہی رہ گئے، لیکن اس سے ان کے آپسی رشتوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔صدر ہند راجندر پرشاد ان کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔مذکورہ کتاب میں مصنف نے اپنے اردگرد کے ماحول، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی و تمدنی حالات کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔لیکن اپنی بیوی اور بچوں کے متعلق مکمل خاموشی اختیار کی ہے، اسی طرح بھائی بہن اور والدین کے تذکروں میں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔اس کتاب میں مصنف کے بچپن، لڑکپن اور جوانی تک کے حالات ہی ملتے ہیں۔اس طرح یہ مکمل خودنوشت بھی نہیں کہی جا سکتی۔قارئین کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اپنی خودنوشت کا دوسرا حصہ بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، جس میں ایام ملازمت، ازدواجی زندگی، قیام کشمیر، مختلف یونی ورسٹیوں کی وائس چانسلری اور عملی سیاست میں آنے اور اس کے بعد کے حالات و واقعات، تجربات اور مشاہدات کا بیان ہوگا۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔بہر حال یہ خودنوشت اپنی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ اپنے منفرد طرز کی وجہ سے غیر افسانوی ادب میں اہمیت کی حامل ہے۔کیوں کہ ''آشرم'' اپنے شاعرانہ انداز، ڈرامائی تکنیک اور استعاراتی و داستانی اسلوب بیان کی وجہ سے بقیہ خودنوشتوں میں امتیازی مقام رکھتی ہے۔مذکورہ خودنوشت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز خاں لکھتے ہیں:

> شکیل الرحمٰن کی یہ خودنوشت اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک منفرد و ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔اس میں مصنف کی حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول و معاشرے کی بھی عمدہ عکاسی ہوئی ہے۔یہ شکیل الرحمٰن کے زمانے کی تہذیبی، ادبی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کی مستند و معتبر دستاویز بھی بن گئی ہے۔یہ کتاب معلومات سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی و محبت کے جذبات سے بھی معمور ہے..... کسی قسم کی آلودگی،

فحاشی اور ڈینگ سے یہ خودنوشت پاک ہے اس کی زبان جا بجا شاعرانہ و فلسفیانہ ہونے کے باوجود اس کی نثر شفاف طاقتور اور مؤثر ہے۔۔۔''1

اس جہانِ فانی میں شکیل الرحمٰن نے جب آنکھیں کھولیں تو سیاسی اعتبار سے نہ صرف برصغیر میں بلکہ پوری دنیا میں ہنگامہ برپا تھا۔ برصغیر میں انگریزوں کے مظالم، ملک کے بگڑتے حالات، دوقومی نظریہ و فرقہ واریت کا عروج، نتیجتاً ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں (مسلم لیگ و کانگریس) کے درمیان تصادم، تقسیم ہند کی مانگ اور تحریک آزادی میں انقلابی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ مصنف بچپن میں اپنے استاد، جو انہیں پڑھانے کے لیے گھر آتے تھے، سے 1857 کی جنگ آزادی، انگریزوں کے ظلم و ستم، تحریک آزادی سے متعلق مختلف بغاوتوں کے قصے سن چکے تھے اور اسی وجہ سے ان کو بچپن میں ہی سیاست سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں خودنوشت کا اقتباس ملاحظہ ہوں:

''وہ ہندوستان کی آزادی کا مفہوم سمجھاتے، آزادی کی جدوجہد اور اس میں علما کی شرکت کا ذکر سب سے پہلے ان سے سنا، چمپارن کی تحریک انہوں نے سمجھائی، سلطنت مغلیہ کے عروج و زوال کے کئی واقعات سنائے، پہلی بار بہادر شاہ ظفر اور ان کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سروں، رانی جھانسی، ٹیپو سلطان اور برما میں بہادر شاہ کے آخری لمحوں کے قصے ان سے سنے، ان ہی سے معلوم ہوا کہ ہم انگریزوں کے غلام ہیں، غلامی کیا ہے، آزادی کیا ہے۔۔۔''2

شکیل الرحمٰن کے ذہن میں بزرگوں کے درمیان ہونے والی سیاسی گفتگو گھر کرتی گئی اور ان کو دلچسپی اتنی ہوئی کہ وہ مسلسل سیاسی افق پر ہونے والی سرگرمیوں کی معلومات کے لیے بے چین رہنے لگے۔ جس کی وجہ سے کچھ ہی عرصے بعد سیاسی نوعیت کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ اخباروں اور ریڈیوں سے ملک کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ برصغیر میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مختلف تحریکیں اور بغاوتیں رونما ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف پوری دنیا میں ایسی سیاسی ہلچل پیدا ہوئی کہ دوسری جنگ عظیم ہونا طے ہوگئی تھی۔ غرض کہ چاروں طرف تباہی، پریشانی و بحرانی کا بول بالا تھا۔ شکیل الرحمٰن نے ان سیاسی تبدیلیوں اور اس کے نتائج کے واقعات کو خودنوشت میں ضمنی طور پر پیش کیا ہے۔ 1939 میں جب عالمی جنگ شروع ہوئی اور کچھ ہی دن بعد برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا برا حال ہونے لگا اور دوسری طرف ہندوستان کے بگڑتے حالات کو دیکھا تو برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔

برصغیر میں لوگوں کے درمیان جنگ کی تباہیوں کا ذکر موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ ابتدا میں مقامی باشندوں کو یقین تھا کہ اس جنگ سے ہندوستان کو زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔ اس وقت مصنف کم عمر تھے لیکن لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو اور اخباروں سے دنیا بھر میں مچی تباہی کا اندازہ انہیں ہو رہا تھا۔ اس تعلق سے وہ اپنے بزرگوں سے سوال بھی کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اخباروں اور لوگوں کی گفتگو سے دوسری جنگ عظیم کی ہولناک کہانیوں، جبر و تشدد، لہو اور درد، وحشت اور دہشت اور موت کی کربناک صورتیں، سب اپنی حقیقتیں سمجھا رہی تھیں۔''3

لیکن بہت جلد یہ جنگ ہندوستان میں دھیرے دھیرے اپنا اثر دکھانے لگی۔ اشیائے ضرورت کی چیزیں آسمان کو چھونے لگیں، روزگار چوپٹ ہو گئے، مہنگائی اتنی بڑھی کہ غریب عوام بھوکوں مرنے لگی۔ معیشت برباد ہونے کے ساتھ ہی سماجی اقدار میں بھی گراوٹ آئی۔ چوری، لوٹ مار، زنا وغیرہ عام ہو گیا۔ اس وقت ملک کی حالت کافی دگرگوں ہو گئی تھی۔ روزمرہ کی چیزیں راشن کارڈ پر ملتے تھے۔ بقول شکیل الرحمٰن ان کی کوالٹی حد درجہ خراب تھیں، جو چاول ملتے تھے وہ انتہائی بدبودار ہوتے۔ بہرکیف کہنا یہ ہے کہ اس وقت لوگ مٹھی بھر چاول کے لیے ترس گئے۔

1943 میں بنگال میں بھیانک قحط بھی اسی جنگ کے زیر اثر اور انگریزوں کی بدانتظامی کے سبب پڑا۔ جس نے لاکھوں انسانوں کو بہ یک وقت نگل لیا۔ اس پر سے طرہ یہ کہ بنگال میں ہی سمندری طوفان کی وجہ سے سیلاب بھی آ گیا، تباہی و بربادی میں رہی سہی کسر اس سیلاب نے پوری کر دی۔ بنگال کے گاؤں سے لوگ جوق در جوق شہروں کا رخ کرنے لگے، بھاری تعداد میں لوگ کلکتہ پہنچے صرف اس امید پر کہ ان کو وہاں کوئی روزگار نہیں تو کم از کم کھانے کو ضرور کچھ مل جائے گا۔ لیکن افسوس کلکتہ کی سڑکیں لاغر اور بھوکے عوام سے بھر گئیں، نالیاں لاشوں سے پٹ گئیں۔ اس تعلق سے شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

گاؤں اور دیہات کی حالت اور غیر تھی، دوسری جنگ عظیم نے جیسے سب کچھ نگل لیا تھا، غذا کی تلاش میں چھوٹے بڑے گاؤں چھوڑ کر شہر کا رخ کرتے اور یہاں پہنچ کر ان کی حالت اور خراب ہو جاتی، گھروں میں ملازمت آسانی سے نہیں ملتی، اور ان میں اکثر فاقے کی زندگی بسر کرتے، سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ رہتے، بیمار ہوتے تو علاج کا کوئی انتظام نہ ہوتا۔ تڑپ تڑپ کر مر بھی گئے کتنے لوگ، شہر کے نچلے طبقوں کے لوگ حد درجہ غربت کی زندگی بسر کرنے لگے تھے، غالباً سارے ملک کا یہی حال

تھا، بہار کے کھیتوں کا سارا اناج سرکاری تحویل میں جا چکا تھا، قحط کا اعلان نہیں ہوا تھا لیکن قحط زدہ علاقے موجود تھے کہ جہاں جانے کتنے افراد غذا نہ ملنے کی وجہ سے مر چکے تھے اور مر رہے تھے۔''4

حالاں کہ برصغیر جنگ میں شریک نہیں تھا لیکن افسوس پہلے سے ہی غلامی کی زد میں سانس لیتا ملک مزید لاغر بن گیا اور چاروں طرف عوام کو بھیک مانگنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس وقت کم عمری کے سبب مصنف کو حالات سمجھنے میں دقت ضرور ہوئی تھی لیکن جنگ کی تباہیوں کو پڑھ کر اور دیکھ کر جنگ سے نفرت ہونے لگی۔ بنگال قحط کی تباہی کا ان پر کافی اثر ہوا تھا کیوں کہ اس کی زد میں بہار کے بیشتر علاقے بھی شامل تھے۔ دوسری عالمی جنگ کی تباہی اور اس وقت برصغیر کے حالات پر شکیل الرحمٰن نے اپنی خودنوشت میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہار میں خاص کر اپنے علاقوں میں لوگوں کو بھوکوں مرتے بذات خود مشاہدہ کیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''1943 میں جب بنگال میں زبردست قحط پڑا تو بہار بھی گہرے طور پر متاثر ہوا۔ سڑکوں اور گلیوں میں لاغر بچوں کی بھیڑ نظر آنے لگی، ماؤں کی سوکھی چھاتیوں سے چمٹے کمزور اور نحیف بچے، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے پیٹ، انتہائی کمزور ہاتھ پاؤں، ہاتھوں میں بھیک لینے کے لیے پرانے برتن.....ایسے جلوس دیکھتا تو لرز اٹھتا، کئی صبحیں ایسی آئیں کہ بعض گلیوں، درختوں اور گھروں کے قریب ان کی لاشیں ملیں، کبھی کبھی اختلاف اس بات پر بھی ہوا کہ مرنے والا ہندو تھا یا مسلمان، جب تک وہ انسان تھا اسے اپنا پیٹ کاٹ کر کسی نے نہیں دیا، مر گیا تو ہندو اور مسلمان ہو گیا اور لاش کا مسئلہ مذہبی بن گیا، زندگی کا مسئلہ مذہبی تھا اور نہ سماجی۔۔۔''5

یہ بات واضح کر دوں کہ اس وقت برصغیر میں فرقہ واریت اپنے عروج پر تھی۔ کیوں کہ دو قومی نظریے نے دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا اور تقسیم ہند کا معاملہ طول پکڑ چکا تھا۔ اس تعلق سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان چشمک مسلسل جاری تھی۔ دونوں فرقے (ہندو مسلمان) ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن چکے تھے اور تقسیم ہند کی آڑ میں کچھ کٹر ہندو مبلغین کو مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرنے کا موقع مل گیا جس سے نفرت بڑھتی ہی گئی۔ اس نفرت کی زد میں ہر خاص و عام آیا، وہ لوگ بھی جو گاؤں و دیہات سے تعلق رکھتے تھے جن کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ ملکی سیاست میں کیا کچھ ہو رہا ہے، مذہبی تعصب کی بنا پر ان کو بھی نہیں بخشا گیا۔ بہر حال جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد وہ

سپاہی جو بھاگ کر یا بخوشی برطانوی فوج میں شامل ہوئے تھے،ان میں سے اکثر واپس آئے تو بیماریوں میں گھرے ہوئے تھے،حکومت نے ان کے علاج یا کسی بھی طرح کی کوئی مدد نہیں کی۔شکیل الرحمٰن نے اپنے ایک دوست نقی میاں کا ذکر اسی حوالے سے کیا ہے جو جنگ کے بعد بیماریوں میں مبتلا ہو کر واپس آئے اور صحیح علاج نہ ہونے پر بیماری میں ہی انتقال کر گئے۔

مصنف نے ''آشرم'' میں انگریزوں کے مظالم کا ذکر بھی کیا ہے۔خصوصی طور پر بہار کے کاشت کاروں پر انگریزوں نے جو ظلم رواں رکھے تھے اس کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے اناج کو لوٹا جاتا یا پھر انتہائی کم داموں میں خرید کر دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا۔انگریزوں کو اس تجارت میں کافی فائدہ ہوتا تھا۔اسی طرح مصنف نے بہار کے اس گول گھر کا بھی تذکرہ کیا ہے جس میں انگریز غریب کسانوں سے اناج وصول کر کے جمع کرتے۔بہار کے کسانوں کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا گیا۔بقول شکیل الرحمٰن صرف گول گھر سے بہار میں برطانوی حکومت کے ظلم وستم اور سفاکانہ رویے کو سمجھا جا سکتا ہے۔انگریزوں نے جن چاولوں اور افیون کی تجارت شروع کی تھی انہیں دوسرے ممالک بھیجتے تھے۔اس کے متعلق اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''بہار سے چین،افیون بھیجنے کا ایک طویل سلسلہ قائم رہا ہے۔اچھے چاول اسکاٹ لینڈ جاتے رہے ہیں،انگریزوں نے افیون اور چاول کی تجارت کر کے بڑا فائدہ حاصل کیا اور بہار کے کسانوں اور کاشت کاروں کو ہمیشہ غربت کی زندگی نصیب ہوئی۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہار کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور جس چیز کی تجارت میں فائدہ دیکھا اُسے حاصل کرتے رہے۔اچھے چاول جو بہار کے مختلف علاقوں سے حاصل کیے جاتے اسکاٹ لینڈ جاتے رہے،یہی وجہ ہے کہ اسکاٹ لینڈ میں ایک چھوٹے سے قصبے کا نام آج بھی پٹنہ ہے،یہ چاول وہیں پہنچتے تھے۔''6

1942 میں بھارت چھوڑو تحریک شروع ہوئی۔اس وقت مصنف کلکتہ میں تھے۔اس تحریک کے زیر اثر جو تباہیاں برپا ہوئیں اس کی تفصیل بھی خودنوشت میں موجود ہے۔اس تعلق سے اپنے شہر کا ذکر کیا ہے۔موتیہاری ریلوے اسٹیشن پر انگریز کیمپ، بہار کے لیڈروں کی گرفتاریاں،عوام کا غصے میں سرکاری خزانوں کو نقصان پہنچانا وغیرہ واقعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ان کو اخباروں سے اپنے شہر اور بہار کی خبریں معلوم ہو رہی تھیں۔شکیل الرحمٰن بزرگوں کی محفلوں سے اور اخبار میں شائع ہونے والے سیاسی حالات کا مطالعہ کرتے رہے اور بالآخر اسی کے زیر اثر کانگریس پارٹی کے حمایتی

بن گئے۔ کانگریس کے چھوٹے بڑے جلسوں میں شرکت بھی کرتے اور ایک بار ایسے ہی کسی جلسے میں آزادی اور انگریزوں کے خلاف ایسی ولولہ انگیز تقریر کی کہ اس کے بعد باقاعدہ جلسوں میں خطاب کرنے کے لیے مدعو کیے جانے لگے۔ پہلے ہی ذکر آچکا ہے کہ 1940 تک ملک میں فرقہ واریت کافی بڑھ گئی تھی، اس ضمن میں شکیل الرحمٰن نے خودنوشت میں چند واقعات بیان کیے ہیں، جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا۔

ملک میں ہندوؤں کی اکثریت تعصب کی بنیاد پر اس بات پر زور دینے لگی تھی کہ ہم ہزاروں سال سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دراصل کچھ کٹر اور تعصب پسند لوگ مسلم حکمراں اور ان کے دور کو بھی غلامی کا نام دے کر نفرت کی ہوا کو بھڑکانے میں لگے ہوئے تھے۔ یہ تصور عام لوگ جو پڑھے لکھے نہیں تھے، ان میں تیزی سے گھر کر رہا تھا۔ جب کی حقیقت یہ ہے کہ اسی دور میں ملک کی ترقی ہر لحاظ سے عروج پر تھی۔ اس ہزار سالہ سنہرے دور کو اکثر تاریخ دانوں نے مسلم دشمنی کے نام پر مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ مسلمانوں نے اس سرزمین کو اپنا مانا، حکومت قائم کی اور اس کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی، یہیں کی تہذیب و تمدن میں رچ بس گئے۔ یہ تو انگریز تھے جو یہاں تجارت کی غرض سے آئے اور دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹ کر غلام بنا دیا۔ بہر کیف مصنف کو کلکتہ میں رہتے ہوئے اور ڈاکٹر شیاما پرشاد کے مطب میں بیٹھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک میں فرقہ پرستی بڑھتی جا رہی ہے، ہندو مسلم دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''ڈاکٹر شیاما پرشاد، ورما جی کے مطب میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ محسوس کر رہا تھا کہ ملک کی سیاست فرقہ پرستی کی سیاست بنتی جا رہی ہے، کچھ ایسے لوگ بھی آجاتے جو مسلمانوں کے خلاف بولتے اور گنیش بابو اور ڈاکٹر صاحب دونوں ایسے لوگوں سے سخت اختلاف کرتے ہوئے انہیں سمجھاتے لیکن ان کی سمجھ میں بہت کم آتا اور ایسا لگتا جیسے وہ ان کی باتیں سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے، ایسے لوگوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی، زندگی میں غالباً پہلی بار وہیں ایک پڑھے لکھے فرقہ پرست استاد کی زبان سے سنا، ہم مسلمانوں کے زمانے سے غلام ہیں، مسلمانوں نے ہم پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں، مندروں کو توڑا ہے، انگریزوں کے ساتھ انہیں بھی نکال دینا چاہیے، جائیں یہ سب عرب کی اور، اسے افسوس ہوا کہ ایسی باتیں ایک پڑھا لکھا استاد کر رہا ہے، اب وہ بہت کم وہاں جاتا، اسے فرقہ پرستی پسند نہ تھی۔''7

مسلم لیگ اور کانگریس کی سرگرمیوں، تحریک آزادی کے ساتھ مسلم لیگ کی پاکستان کی مانگ کا تذکرہ بھی خودنوشت میں ملتا ہے۔ مصنف کو دونوں پارٹیوں سے اور ان کی سرگرمیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی بلکہ ان کا ایک ہی خواب تھا ملک کی برطانوی سامراج سے آزادی۔ چناں چہ وہ اسی جذبے کے تحت لوگوں کے درمیان تقریر کرتے تھے۔ لیکن مسلم لیگ کی پاکستان کی مانگ اور ملک کی تقسیم انہیں بالکل پسند نہ تھی۔ پاکستان کا نظریہ کب اور کہاں سے آیا اس سوال کے جواب میں اقبالؔ کے اس خطبے کے تعلق سے لکھتے ہیں جس میں انہوں نے ایک الگ مسلم ملک کی تجویز پیش کی تھی اور اسی تجویز کو بعد میں محمد علی جناح نے آگے بڑھایا۔ اسی طرح انہوں نے سرسید کی علی گڑھ تحریک پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور ان کے اس خیال کو کہ ہندو مسلم دونوں ہم وطن ہونے کے ناطے ایک قوم ہیں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہی محبت اور اخوت دوقومی نظریے کے سبب ختم ہوگئی، نفرتیں اتنی بڑھ گئیں کہ ملک ہی تقسیم ہوگیا۔

مسلم لیگ کے قائدین جو پاکستان کی حمایت میں مسلمانوں کو جنت ارضی کا خواب دکھا رہے تھے وہی تقسیم ہند کے بعد حالات خراب ہونے پر اپنی جان بچا کر پاکستان جا چکے تھے ان کروڑوں مسلمانوں کو یہیں آگ میں جلتا چھوڑ کر۔ یہ صحیح ہے کہ بیشتر مسلمانوں نے حب الوطنی کے سبب ہندوستان میں رہنا پسند کیا لیکن اکثریت ان لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے مسلم لیگ کی حمایت میں ہندوؤں سے دشمنی مول لی تھی، اور تقسیم کے بعد انہیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا لیکن تب پچھتاوے سے کیا حاصل، جب چڑیا سارا کھیت چگ گئی ہو۔ قاضی جلیل عباسی نے اپنی خودنوشت ''کیا دن تھے'' میں لکھا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد وہ قائدین یہاں کے مسلمانوں کی پرواہ کیے بغیر ملک چھوڑ کر جا چکے تھے جن کا ساتھ وہ دے رہے تھے۔ شکیل الرحمٰن نے بھی ایک رحمٰن صاحب کے کردار کے توسط سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''آزادی کے بعد شہر میں فرقہ پرستی کو نقطۂ عروج پر پہنچا کر رحمٰن صاحب 1947 ہی میں پاکستان چلے گئے اور اپنے ان تمام بچوں کو بھول گئے کہ جنہیں انہوں نے 'اسلام کا سپاہی' بنایا تھا اور سبز رنگ کے 'بیج' پر چاند ستارہ بنا کر ان کے کلیجوں پر ٹھونک دیا تھا، یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، ان پر کیا گزری، کس طرح مرے اور کس طرح زندہ رہے۔''8

1946 میں مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی نامنظوری کے بعد ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا، کلکتہ میں بھی اسی دن بڑے پیمانے کا ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں ہزاروں مسلمان جمع ہوئے تھے۔ کسی نے وہاں افواہ پھیلا دی کہ مسلم لیگ

کانگریس اور ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں اور جب وزیر اعلیٰ نے سرکاری تعطیل کا اعلان کیا تو لوگوں کو یقین ہو گیا، بھاری تعداد میں ہندو گلی نکڑ پر جمع ہو گئے اور جیسے ہی مسلمان جلسے کے بعد گھروں کی واپسی کے لیے سڑکوں پر آئے انہوں نے حملہ کر دیا۔ ہزاروں لوگ مارے گئے، اس فساد کا ذکر بیشتر خودنوشت نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ اسی فساد کی آگ پورے شمالی ہندوستان میں پھیل گئی جو تباہی ہوئی اس کا صحیح اندازہ آج تک نہیں لگایا جا سکا۔ ہزاروں مسلمانوں کو صرف مذہب کے نام پر بہ یک وقت تہہ و تیغ کیا گیا۔ شکیل الرحمٰن نے بھی اپنی خودنوشت ''آشرم'' میں 1946 کے فسادات کا تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''16 اگست 1946 کو مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا نعرہ دیا، کلکتہ کہ جہاں لیگ کی حکومت تھی، لہو میں ڈوب گیا، فساد کی دلخراش خبریں آتی رہیں، دو قوموں میں تقسیم شہر، اب کسی وقت بھی فسادات سے قریب ہو سکتا تھا۔ فسادات کے خوف سے ہندو مسلمان دونوں سہمے ہوئے تھے۔ شہر کے بعض لوگوں نے کمیٹیاں تشکیل کیں اور محلوں میں گھوم گھوم کر اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی، اس کے شہر میں فساد نہیں ہوا۔ بہار، یوپی اور مشرقی بنگال کے کئی علاقوں میں فسادات ہوئے۔۔۔''9

15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوا اور ملک بھی تقسیم ہو گیا۔ اسی سال شکیل الرحمٰن پٹنہ یونی ورسٹی سے مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن چاروں طرف ماحول بہت کشیدہ تھے۔ پٹنہ پہنچے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بہار بھی فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ ان کی جائداد لوٹی گئی، ان کے بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا، مکانوں کو نظر آتش کیا گیا۔ ٹرینوں کو روک روک کر مسلمانوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا، چاروں طرف بے گناہوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ پوری رات لوگ جاگ کر گزارتے، رات کے سناٹوں کو چیرتی ہوئی مظلوموں کی دلخراش چیخیں اور ہر مہادیو یا نعرۂ تکبیر اللہ اکبر نعرے لوگوں کو لرزا دیتیں۔ مصنف نے ان تمام واقعات کا ذکر کیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد کے فسادات کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پورے منصوبے کے تحت کرائے گئے تھے اور حکومت جیسے اس وقت ختم ہو گئی تھی کیوں کہ جس طرح سے بلوائی موت کا ننگا ناچ کھیل رہے تھے اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا۔ جلوسوں کی شکل میں ہندو گھروں سے نکلتے اور نعرے لگاتے ہوئے مسلم محلے پر حملہ کر دیتے، لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ انسانیت کے قاتلوں نے چاروں طرف آگ لگا رکھی تھی۔ اس ہندو مسلم فسادات نے شکیل الرحمٰن پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ پٹنہ، گیا، نوادہ، چھپرہ وغیرہ شہروں کی تباہی نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا

تھا۔

مصنف کے خاندان کے اکثر افراد جان بچا کر پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ان کے ننہال کے تمام لوگ بھی جا چکے تھے۔ان سے بھی ضد کی گئی کہ وہ بھی پاکستان چلے جائیں لیکن وہ نہیں گئے،ان کو اپنی دھرتی اور وطن سے محبت تھی۔ ان کی بہن ہجرت کر کے کراچی چلی گئی تھیں جن سے وہ کبھی نہیں مل سکے۔فسادات اور ہجرت کے واقعات نے انہیں بہت حساس بنا دیا،ان کے بیشتر چاہنے والے جا چکے تھے،ان کی یادوں کو کبھی دل سے بھلا نہ سکے۔ بہر حال جب فسادات میں تھوڑی کمی آئی تو شکیل الرحمٰن اپنے دوستوں کے ساتھ رفیوجی کیمپوں میں گئے جہاں پناہ گزینوں کی مدد بھی کی۔اس سلسلے میں خودنوشت کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''حالات سنبھل گئے تو پٹنہ کے کئی رفیوجی کیمپس میں اور اپنے نئے دوستوں کے ساتھ ان کی مدد کرنے لگا۔ اپنے داخلے کا معاملہ بھول گیا، کچھ نوجوان دوستوں کے ساتھ 'گیا' اور 'نوادہ' بھی گیا اور جلے ہوئے مکانوں اور عورتوں اور بچوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے کنوؤں کو دیکھ کر لرز اٹھا، یہ اس کا انتہائی بھیانک تجربہ ہے کہ جسے آج تک بھول نہیں سکا ہے،بعض حالات میں انسانیت مر جاتی ہے۔''10

لیکن کچھ عرصے کے بعد جب شرنارتھی دوسرے علاقوں سے بہار پہنچے اور اپنے اوپر بیتے حالات مقامی لوگوں کو سنائے تو ان کے جذبات بھڑک گئے جس کے بھیانک نتائج سامنے آئے،اور پھر سے قتل و غارت گری شروع ہو گئی۔یہی حال پاکستان میں بھی ہوا۔اس وقت لوگوں کو متحد کرنے کے لیے گاندھی جی کے علاوہ دوسرے لیڈروں نے بہار کا دورہ کیا تھا۔اس ضمن میں شکیل الرحمٰن نے گاندھی جی اور خان عبدالغفار خاں کا ذکر کیا ہے۔ان دونوں نے عوام کے درمیان جا کر فرقہ پرستی اور حکومت کے خلاف تقریریں کیں، بقول مصنف ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی۔امن و شانتی بنائے رکھنے کے لیے پٹنہ کے گاندھی میدان میں پراتھنا سبھا کا انعقاد کیا گیا جہاں گاندھی جی کو دیکھنے اور سننے کے لیے لاکھوں افراد جمع ہوتے،گاندھی جی کی محبت اور عقیدت لوگوں میں موجود تھی اس لیے ان کی تقریروں کا اثر لوگوں پر ہوا جس کے نتیجے میں بہار کے فسادات میں بہت کمی آئی۔

''آشرم'' میں تقسیم ہند کے بعد بہار میں ہونے والے کشت وخون،لوٹ مار اور مسلم خواتین کی بے حرمتی کا تذکرہ بڑے دلسوز انداز میں ہوا ہے۔1946 کے فسادات اور تباہیوں سے متاثر ہو کر مصنف نے ایک ڈراما ''ملاپ'' کے نام سے لکھا تھا جو 14 اگست 1947 کی رات میں اسٹیج ہوا جس میں شکیل الرحمٰن نے اداکاری بھی کی تھی۔اس کے بعد تقسیم

اور فسادات پر کئی مضامین و افسانے بھی تخلیق کیے۔

مختصر یہ کہ شکیل الرحمٰن کی مذکورہ خودنوشت میں ان کی ذاتی زندگی کے حالات بھی ملتے ہیں اور اس عہد کے سیاسی وسماجی مسائل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ان کی پیدائش سے لے کر ہوش سنبھالنے تک ہندوستان کے سیاسی افق پر بے شمار تبدیلیاں آئیں، جس کا اثر ان پر بھی ہوا۔ 1940 کے بعد انہوں نے جدوجہد آزادی سے متعلق تحریکوں و بغاوتوں کا ذکر، اس سلسلے میں سیاسی رہنماؤں کی کارکردگیاں، دوسری عالمی جنگ کے خطرناک نتائج، دو قومی نظریہ، فرقہ پرستی، فسادات، آزادی اور تقسیم ہند سے متعلق انگریزوں کے مختلف مشن و اقدام، مسلم لیگ و کانگریس کے درمیان تنازعات، تقسیم ملک کی مانگ اور نتیجے میں پیدا ہوئی نفرتیں، تقسیم کے بعد ہونے والی تباہیوں و بربادیوں کا بیان شکیل الرحمٰن نے اپنی خودنوشت ''آشرم'' میں کیا ہے۔ حالاں کہ ان تمام واقعات کے بیان میں تاریخی ترتیب بالکل نہیں ہے لیکن کتاب کا یہ حصہ تاریخی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔

حوالہ جات

1۔ مشمولہ روشنائی (سہ ماہی)، شمارہ 46، (ڈاکٹر ممتاز خاں، آشرم ایک تجزیاتی مطالعہ)، جولائی تا ستمبر 2010، کراچی، ص: 225

2۔ شکیل الرحمٰن، آشرم، عرفی پبلی کیشنز، گوڑگاؤں، ہریانہ، 2011، ص: 72

3۔ ایضاً، ص: 103

4۔ ایضاً، ص: 102

5۔ ایضاً، ص: 104

6۔ ایضاً، ص: 114

7۔ ایضاً، ص: 132

8۔ ایضاً، ص: 139

9۔ ایضاً، ص: 147

10۔ ایضاً، ص: 153

آدا جعفری: جو رہی سو بے خبری رہی

سنہ اشاعت: 1994

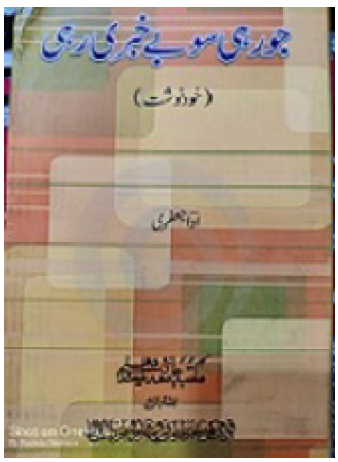

جو رہی سو بے خبری رہی (آداؔ جعفری)

جدید شعر و ادب کے معماروں میں آداؔ جعفری ایک امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ اس وقت ادب میں مرد شعرا کو ہی مقبولیت حاصل تھی۔ خواتین شاعرات مشاعروں کی زینت بنتی تھیں، ان میں باقاعدہ اصل زندگی اور جدید رجحان سے متاثر ہو کر شاعری کرنے والوں کی تعداد نہ کے برابر تھی۔ آداؔ نے اس رواج کو توڑا اور اپنا تخلیقی سفر کچھ اس انداز سے شروع کیا کہ بہت جلد ان کے اشعار کو مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ اپنے مخصوص رجحانات اور شعری رویے کی بدولت ادب میں اپنا الگ مقام بنالیا۔ ان کی شاعری کا سوز و گداز، دھیما پن اور منفرد لب ولہجہ باقی تمام ہم عصر شاعرات سے انہیں ممتاز کرتا ہے۔ ادا جعفری 22 اگست 1924 کو اتر پردیش کے بدایوں شہر کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ خاندانی نام عزیز جہاں تھا، تین سال کی تھیں کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ پرورش ننہال میں ہوئی۔ والد کی شفقت سے محرومی کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوا اور وہ وقت سے پہلے سنجیدہ ہو گئیں۔

ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن سے ہی حساس اور نازک طبع تھیں۔ تعلیم گھر ہی پر ٹیوٹر کے ذریعہ ہوئی۔ میٹرک اور ایف اے کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا۔ باقاعدہ کالج جا کر تعلیم حاصل نہ کر پانے کا ان کو ہمیشہ ملال رہا۔ بچپن سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، نو سال کی عمر میں پہلا شعر کہا، تیرہ سال کی عمر سے مشق سخن کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی نظمیں ادا بدایونی کے نام سے شائع ہونے لگیں۔ 1947 میں نورالحسن جعفری سے شادی کے بعد ادا جعفری کے نام سے لکھنے لگیں۔ چھ شعری مجموعے ان کی جنبش قلم کی شاہد ہیں، ''میں ساز ڈھونڈتی رہی، شہر درد، غزالاں تم تو واقف ہو، ساز سخن بہانہ ہے، حرف شناسائی، موسم موسم۔'' انہوں نے جاپانی صنف ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی اور افسانے بھی لکھے اس کے علاوہ انہوں نے قدیم اردو شعرا کے حالات بھی قلم بند کیے۔ اپنی خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کے نام سے لکھی یہ 1995 میں مکتبہ دانیال کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ ان کو آدم جی ایوارڈ کے ساتھ حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز سے نوازا۔ تقسیم ہند کے بعد 1948 میں پاکستان چلی گئیں۔ شوہر کے ساتھ مختلف ممالک کی سیر کی اور وہاں کی سیاسی، سماجی و تہذیبی پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا۔ 12 مارچ 2015 کو کراچی، پاکستان میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ادا جعفری کی خودنوشت سب سے پہلے جولائی 1995 میں کراچی سے شائع ہوئی۔ راقمہ کے پاس اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن موجود ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو کے اشتراک سے مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے 1911 میں شائع ہوا۔ 372 صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کا عنوان مصنفہ کے شعری ذوق کا پتہ دیتا ہے۔ یہ کتاب 29 ابواب میں تقسیم ہے۔ ابواب بندی کرتے ہوئے آداؔ نے بیشتر ابواب کے عنوانات بھی خوبصورت مصرعوں کی صورت میں دیے ہیں۔ یہ

ان کی شعری وابستگی اور تخلیقی شعور کا ثبوت ہے کہ ایک ایک مصرعہ پورے دور کی عکاسی اور مخصوص واقعات کے لیے علامت بن گیا ہے۔خودنوشت کے ابتدائی ابواب ان کے ذاتی حالات زندگی سے متعلق ہیں۔ان کے مطالعے سے نہ صرف آداجعفری کے بچپن کے ابتدائی مشاغل اور حالات کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس دور کے تہذیبی نقوش بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔انہوں نے بدایوں کی تاریخی اہمیت، بزرگوں کے مزارات اور اپنے ننہال کی بڑی حویلی، گھر کے افراد، نوکروں کی تعداد وغیرہ کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔

آداجعفری کا تعلق بدایوں کے ٹونک والا خاندان سے تھا۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ قدامت پسندی، مذہبی احکام کی پابندی، رسم ورواج کی پاسداری وغیرہ جیسی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔لیکن وہ خود کو اس ماحول میں محفوظ و مستحکم سمجھتی تھیں۔اس خودنوشت میں اداجعفری کی دو تصویریں نظر آتی ہیں۔پہلی تصویر بدایوں کی الجھے سلجھے بالوں والی کمسن ،تنہا تنہا اور اداس لڑکی کی ہے جس کی پوری دنیا اس پھاٹک کے اندر آباد تھی جسے ''ٹونک والوں کا پھاٹک'' کہا جاتا تھا۔ جہاں وہ اپنے فن کی دنیا تلاش کرنے میں سرگرداں تھیں۔ دوسری تصویر اس آدا کی ہے جس کے آنچل میں زندگی نے ساری خوشیاں ڈال دی تھیں۔ جسے انہوں نے اپنا دوسرا جنم کہا ہے۔دونوں تصویریں مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں اور ایک میں دوسرے کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔آدا اپنی داستان حیات رقم کرتے ہوئے قارئین کو اپنی ظاہری و باطنی دونوں دنیا کی سیر کرواتی ہیں۔ بدایوں کے قصباتی ماحول میں متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں کو گھر سے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ چہار دیواری میں سانس لینے والی آدا نے اپنے روز وشب کے حالات ایک ڈائری میں لکھنا شروع کیا تھا، 1947 کے ہنگامے میں وہ ڈائری ضائع ہوگئی لیکن ان دنوں کی یادیں ان کے ذہن سے محو نہیں ہوسکی اور وہ یادیں خودنوشت کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔

''جو رہی سو بے خبری رہی'' آداجعفری کی ایسی خودنوشت ہے جسے ایک عورت کے احساسات وخیالات کی سچی ترجمان قرار دیا جاسکتا ہے۔اس میں ایک خاص زمانے کی تہذیب، طرز فکر و معاشرت کی عکاسی ملتی ہے۔ بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی جو بڑی حویلی کے نام سے مشہور تھی، کی اونچی دیواروں اور مختلف پابندیوں کے درمیان پرورش پانے والی ڈری سہمی، حساس وذہین لڑکی اپنے عہد کی ایک بڑی شاعرہ بننے تک کے مراحل کیسے طے کیے، ان کی تفصیل زیر نظر کتاب میں ملتی ہے۔اس کے علاوہ جو چیز اس کتاب کو منفرد کرتی ہے وہ ان کا انداز بیان ہے۔انہوں نے اپنی زندگی سے جڑے حالات وواقعات کو بڑی سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس خودنوشت کے متعلق احمد ندیم قاسمی یوں رقم طراز ہیں:

''اردو میں خودنوشت سوانح عمریوں کی کمی آہستہ آہستہ دور ہو رہی ہے اور اردو کی بڑی و محترم شاعرہ ادا جعفری کی خودنوشت اس امر کا ایک تازہ اور ٹھوس ثبوت ہے۔ انہوں نے بچپن سے لے کر اب تک کے حالات اتنے سلیقے سے اور اتنی سچائی سے رقم کیے ہیں کہ جو رہی سو بے خبری رہی کو آئندہ کی خودنوشتوں کے لیے مینارۂ نور قرار دیا جا سکتا ہے۔''1

آدا جعفری کی اس خودنوشت میں مختلف حالات و واقعات کے ساتھ برصغیر کی تقسیم، اس کے اثرات اور بدلتی ہوئی معاشرتی قدروں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ یہ خودنوشت اس تہذیب کی تاریخ بھی ہے جس کا اب شاید نشان تک باقی نہیں رہا۔ جو اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ آدا نے اپنی ابتدائی زندگی اور اس دور میں پیش آنے والے واقعات و حادثات پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ خودنوشت ایک طرح سے اپنے وقت کی تاریخی مرقع ہے۔ اس خودنوشت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ خانم لکھتی ہیں:

''ادا نے جو رہی سو بے خبری کے عنوان سے خودنوشت لکھی، اس کے مطالعہ سے مشرق و مغرب کی تہذیب و ثقافت، تقسیم ملک کے خونی مناظر، نئی مملکت پاکستان قیام کے بعد درپیش مسائل، ایک قوم کے آپسی اتحاد و ملت اور آج کے لہولہان پاکستان کی پوری تاریخ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔''2

قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں جو انسانیت سوز فسادات ہوئے ان کا حسیاتی تذکرہ نہایت دلسوز انداز میں کیا ہے۔ اس زمانے میں چاروں طرف جو خوف و ہراس پھیلا تھا اس سے وہ خود دوچار ہوئیں تھیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں محبتیں کس طرح نفرتوں میں بدل جاتی تھیں۔ بھولی بھالی لڑکیوں کے بے آبرو ہونے کے قصے اپنے کانوں سے سنے۔ اس سلسلے میں خودنوشت کا باب ''میں آپے رانجھا ہوئی'' کا مطالعہ لرزا کر رکھ دیتا ہے۔ ''دشت میں سامنے تھا خیمۂ گل'' کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے اس میں انہوں نے تقسیم ملک کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا ہے ان کا ماننا ہے کہ اُتار چڑھاؤ برداشت کر کے ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ لکھتی ہیں:

''1947 اور اس کے آس پاس کے سال بھی کوئی ایسا ہی دہکتا ہوا الاؤ ساتھ لائے تھے اور وہ جو خوابوں کے صورت گر تھے وہ آگ کو گلزار بنانے کے جذبوں سے آشنا تھے۔ بے شک بہت سی آنکھیں بے نور ہوئیں، بہت سے بدن چکنا چور ہوئے مگر خواب کھرے تھے۔ ان خوابوں کو کوئی گزند نہ پہنچا۔''3

ادا جعفری نے پہلی جنگ آزادی سے لے کر ملک کی تقسیم تک کے تمام حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے۔ تحریک آزادی کی ابتدا 1857 میں غیر واضح طور پر ہوگئی تھی لیکن دوسری جنگ عظیم تک یہ تحریک اور مضبوط ہو کر مطالبے تک پہنچ گئی اور اسی تحریک آزادی کی کوکھ سے تحریک پاکستان نے اس وقت جنم لیا جب مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ وہ برصغیر میں اقلیتی فرقہ بن کر رہ جائیں گے۔ آدا نے ان تمام امور پر روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے پاکستان کا مطالبہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا رہا۔ چاہے وہ الہ آباد (موجودہ پریاگ راج) میں ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس میں اقبال کا دوقومی نظریہ ہو یا پھر لسانی تفریق ہو۔

1930 میں اقبال نے پہلی بار مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں پاکستان کے خدوخال واضح کیے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مسلم ملک کا مطالبہ جائز ہے۔ اسی واقعے کی طرف جوش، آل احمد سرور وغیرہ نے بھی اپنی خودنوشت میں اشارہ کیا ہے۔ مارچ 1940 میں لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ سے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی بڑھ گئی۔ ایک واضح نصب العین مسلمانوں کے سامنے آچکا تھا۔ لیکن ملک میں تحریک پاکستان کی مخالفت بھی اسی شدومد سے ہوئی۔ پورے ملک میں ہنگامے اور فسادات شروع ہو گئے تھے۔ لیکن یہ تحریک عام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرتی رہی اور لوگوں کے جوش اور جذبے کو تقویت ملتی رہی۔ ان کی بڑی حویلی میں بھی اس تحریک نے دستک دی، خاندان کے لوگ بھی مسلم لیگ کے حمایت میں آگے آئے اور پاکستان کا قیام ان سب کے لیے بھی مقصد حیات بن گیا۔ اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

> ''میری یاد میں 45-1944 کا زمانہ ہے جب ملک کی سیاست اور تحریک آزادی سے الگ تھلگ رہنے والا یہ تغیر نا آشنا خاندان، جس کے مزاج میں روایت پرستی رچی ہوئی تھی اور جسے صرف اپنے ہی نقشِ قدم پر چلنے کی عادت تھی، ایک سیاسی جماعت مسلم لیگ سے جذباتی اور عملی دونوں لحاظ سے وابستہ ہو چکا تھا۔ ہمارے گھر میں پاکستان کا قیام سب کے لیے مرکز نگاہ اور مقصد حیات بن گیا تھا، دنیاوی حق بھی اور دینی فریضہ بھی۔''4

بدایوں شہر میں ہندوؤں کے مقابلے مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی لیکن آس پاس کے دیہات میں رہنے والے ہندو، مسلمانوں کے گھروں میں بحیثیت ملازم کام کیا کرتے تھے۔ ان کے درمیان کوئی نفرت کا جذبہ نہیں تھا سب مل جل کر رہتے لیکن پاکستان کی منظوری کے بعد ان میں اور رشتوں میں کڑواہٹ آنے لگی۔ آدا کے ننہال میں بہت سے ایسے ملازم تھے جو ہندو تھے۔ جب ماحول میں کشیدگی آئی تو ان ملازموں نے بھی دوری اختیار کر لی، سب خوف زدہ تھے کیوں

کہ غم و غصے کی حالت میں انسان اچھے و برے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''نانا کو بہت زیادہ پریشان ہم نے ان دنوں دیکھا جب ان کے ہندو منشی نے بغیر کسی وجہ کے اور بغیر اطلاع دیے ہوئے ملازمت ترک کر دی۔ ان کا برتاؤ ملازمین کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا تھا۔ ایک محنتی اور وفادار ملازم کا یہ طرز عمل گویا عمومی طور پر لوگوں کی بدلتی ہوئی سوچ کا مظہر تھا۔''5

1946 میں تحریک پاکستان، مسلم لیگ اور کانگریس کی سرگرمیوں، ملک کے مختلف شہروں میں فسادات، میرٹھ کے قریب گڑھ مکتیشر کے میلے میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد پورا ملک انتقام در انتقام کا ایک ایسا دائرہ بن گیا تھا جس میں انسانیت کا خون اور قتل عام ہو رہا تھا۔ مذہب جو انسانیت سکھاتا ہے اسی کے نام پر خون کی ہولی بڑے خوفناک انداز میں کھیلی جا رہی تھی۔ چاروں طرف غارت گیری کا بازار گرم تھا۔ ملک کی آزادی تک یہ تباہی و بربادی جاری رہی بلکہ اس کے بعد جو انسانیت سوز فسادات اور قتل عام ہوئے، اس کی یاد بھی اذیت ناک ہے۔ ملک غلامی سے آزادی چاہتا تھا اور اس نے آزادی حاصل بھی کی، ایک قوم اپنے لیے آزاد ملک کا خواب دیکھ رہی تھی اور وہ پورا بھی ہوا لیکن اس خواب اور اس کی تعبیر میں انسانوں پر کیا بیتی بیان کرنا بھی مشکل ہے۔

اس پُر آشوب ماحول میں اعتماد اٹھ چکا تھا، محبتیں نفرتوں میں بدل گئیں تھیں۔ رات کے پہرا گر گلی کوچوں سے لوگوں کی کوئی آوازیں آتیں تو لوگ سہم جاتے، مائیں اپنی جوان بیٹیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتیں، باپ اپنے گھر کے در و دیوار کو دیکھ کر بے بس ہو جاتے۔ ان حالات میں بدایوں اور لکھنؤ کچھ حد تک محفوظ تھا لیکن لوگوں میں اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ حالات دگرگوں تھے اس وقت کی کیفیت آدا نے درج ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:

''بدایوں میں خدا کا شکر ہے خوں ریزی اور غارت گیری کے ہولناک مظاہرے نہیں ہوئے مگر اندیشے دلوں کو کھرچ رہے تھے۔ وسوسے پرانی رفاقتوں کو نیم جان کر رہے تھے، دل لرز رہے تھے۔ دوسرے شہروں میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ لکھنؤ شہر بھی فسادات کی وبا سے بچا رہا۔ مگر وہاں بھی خوف کسی آفت سماوی کی طرح ہر جانب فضا پر چھایا ہوا تھا۔ مذہب کے نام پر انسانیت پا بہ جولاں تھی۔ پورے ملک میں آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک چنگاری کہیں بھی اور کسی بھی وقت پہنچ کر بے پناہ ہو سکتی تھی۔ ذہن میں خوف، دل میں بے اعتباری اور آنکھوں میں بدگمانی جنم لے رہی تھی۔''6

تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں ملک میں برپا ہونے والے ہولناک فسادات و حادثات پر آداؔ جعفری نے تفصیل سے لکھا ہے۔ دراصل اس زمانے میں جو خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا انہوں نے خود محسوس کیا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ذرا سی بات پر محبتیں کس طرح نفرتوں میں بدل جاتی تھیں۔ آزادی کے مہینوں بعد بھی خوف بدستور جاری تھا۔ دسمبر 1947 میں ان کے شوہر کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ ان دنوں وہ اپنی بہن کے گھر لکھنؤ میں قیام پذیر تھیں۔ ان کی بہن کے بچے جب تک اسکول ہوتے وہ لوگ پریشان رہتے۔ حالاں کہ لکھنؤ میں کوئی فساد نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت کون جانتا تھا کہ کب کیا ہو جائے کیوں کہ ہر جگہ خیر سے زیادہ شر کے امکانات نظر آ رہے تھے۔

جس گھر میں ان کی بہن رہتی تھیں اس کے دوسرے حصے میں مالک مکان کا خاندان جو کہ ہندو تھے وہ بھی رہتے تھے۔ دونوں گھروں کے ڈرائینگ روم میں ایک دروازہ تھا جو سارا دن کھلا رہتا تھا ان سے بے حد دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن حالات بدلے اور دونوں خاندانوں کے درمیان ایک بدگمانی کی چادر پھیلتی گئی۔ دونوں کے درمیان سب سے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ رات کو ڈرائینگ روم کا درمیانی دروازہ کس طرح چپکے سے بے آواز بند کیا جائے کہ دوسرے کی دل آزاری نہ ہو اور کھلے دروازے کو بھول جانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ بدگمانیوں کا دور دورہ تھا لیکن انہی گھنیرے سیاہ بادلوں میں کہیں کہیں نقرئی لکیر بھی چمک اٹھی تھی۔ انسانیت کچھ میں زندہ تھی۔

آداؔ نے اپنی خودنوشت میں متعدد ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جس میں ہندوؤں نے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی حفاظت کی۔ رات کے گیارہ بجے آٹھ مہینے کے بچے کی طبیعت خراب ہوئی، ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا لیکن فسادات کے سبب گھر سے نکلنا مشکل۔ فون کی ڈائرکٹری سے ڈاکٹر کو فون کیا گیا اور ان سے اجازت مانگی گئی لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ آپ مریض کی کیفیت بتا دیں میں دوا اور انجکشن لے کر آ جاتا ہوں کیوں کہ آپ لوگ کا آنا خطرے سے خالی نہیں۔ جس وقت وہ ہندو ڈاکٹر ان کے گھر سے واپس لوٹا رات کا ایک بج چکا تھا۔ اسی طرح انہوں نے رابعہ کی کہانی بیان کی جس کی آبرو ایک سکھ جوان نے ساری رات پہرہ دے کر بچائی اور جب اسے گھر پہنچانے کی بات ہوئی تو رابعہ نے کہا کہ مجھے گھر مت لے جاؤ، اب تک میرے غائب ہونے کی خبر پھیل چکی ہوگی لوگ باتیں بنائیں گے، مجھے بے آبرو ہونے سے بچا لو، تم مجھ سے شادی کر لو۔ اس سکھ نے رابعہ سے شادی کر کے اپنی عزت بنالی تھی بعد ازاں رابعہ اس دشمن نما محسن کے تین بیٹیوں کی ماں بنی۔

مذکورہ خودنوشت کے باب ''میں آپے را نجھا ہوئی'' میں آداؔ نے ان لڑکیوں کے دکھ درد، محرومی اور بے بسی کو بیان کیا ہے جو فسادات میں اغوا کی گئی تھیں اور جن کی عزت و آبرو مٹی میں مل چکی تھی۔ تقسیم ہند کی خوں ریز تباہی میں انسانی

رشتوں کے تقدس و عظمت پامال ہو گئے تھے۔ عصمتیں تار تار ہو گئی تھیں، انسانیت بے معنی ہو چکی تھی، جب یہ حیوانی طوفان تھم گیا تو ان بدنصیب اغوا شدہ لڑکیوں کی بازیابی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں جنہیں اپنوں نے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ لڑکیوں کے اس دوہرے درد و غم کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اس ہجوم میں سب نابینا نہ سہی مگر ایسے ماں باپ بھی سامنے آئے جن کی آنکھیں اپنی مجبور اور مظلوم بیٹی کی پہچان سے عاری ہوئیں۔ جو اس تار تار آنچل کا بوجھ اٹھانے پر محبت اور شفقت کے کسی رشتے کو آمادہ نہیں کر سکے۔ جب بے بسی گناہ بن گئی اور بے کسی کفارہ نہ بن سکی۔''7

کچھ لڑکیاں ان میں ایسی بھی تھیں جنہوں نے اپنے خاندان کی عزت و ناموس کا احترام کرتے ہوئے خود کو زندہ درگور کر لیا تھا۔ اپنی عزت و آبرو گنوانے کے بعد ان میں اپنوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رہی تھی نہ جانے کتنی لڑکیاں اپنوں کی عزت بچانے کے لیے زندہ لاش بنی ہوں گی، نہ جانے کتنی بیٹیاں جن کو اپنوں نے ٹھکرایا، سماج میں انہوں نے اپنا بوجھ کس طرح اٹھایا ہوگا۔ وہ قصوروار نہ ہو کر بھی قصوروار سمجھی گئیں۔ تقسیم ملک کے وقت سفاکیت کا جو خطرناک کھیل کھیلا گیا وہ انسانی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔

جنوری 1947 میں ادا جعفری کی شادی نورالحسن سے ہوئی۔ ان کے شوہر کی ملازمت آگرہ میں تھی۔ قتل و غارت گیری کے اس ماحول میں بیوی کو ساتھ لے جانا خطرے سے خالی نہ تھا کیوں کہ بلوائیوں کے حملوں سے ٹرینیں وغیرہ بھی محفوظ نہیں تھیں۔ نور آدا کو بدایوں چھوڑ آگرہ واپس گئے اور وہاں سے ایک ہندو دوست کو ساتھ لے کر بدایوں آئے۔ آدا نے اس دشوار گزار سفر کی روداد بھی بیان کی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد دسمبر میں نور پاکستان چلے گئے اور مارچ 1948 میں آدا بھی پاکستان چلی گئیں۔ اس ہنگامی سال میں صرف اگست مہینے میں ایک دن ایسا آیا جو سبھی کے لیے عافیت کا دن تھا۔ 15 اگست یوم آزادی کا دن، جو خوشیوں سے بھرپور تھا۔ اس دن کوئی بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ کوئی رنجش یا کدورت نہیں تھی، لوگ بے خوف و خطر سڑکوں پر نکل کر آزادی کا جشن منا رہے تھے۔ لیکن یہ خوشی دوسرے دن ہی ماتم بدل گئی۔ جب لٹ لٹا کر سکھوں کے قافلے ہندوستان پہنچنے لگے تو فسادات شدت اختیار کر گئے۔

تقسیم ہند برصغیر کا بہت بڑا فیصلہ اور حادثہ تھا۔ مسلمانوں کا وہ خواب جس کے حقیقت بننے میں ہزاروں قربانیاں پیوست ہیں۔ شرنارتھیوں اور مہاجروں پر کیا کچھ نہیں بیتی۔ اولاد، جان، مال، آبرو سب کچھ تو لوٹا گیا تھا بعض مکینوں کے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ایسے خاندانوں میں اگر ایک دو افراد بچ بھی گئے تھے تو ان کے پاس سوائے بدن کے کپڑے

کے کچھ نہ تھا۔ انہوں نے ساری عمر اپنے زخموں کو بھلانے میں ہی گزار دی۔ ان کی قربانیوں کی گواہی تاریخ کے اوراق ہمیشہ دیتے رہیں گے۔

30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کا قتل ہوا اس وقت آدا اپنی بہن کے گھر لکھنؤ میں ہی تھیں۔ پورے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ جواہر لعل نہرو نے ریڈیو پر پہلا اعلان کیا کہ ''گاندھی جی کو کسی پاگل نے قتل کر ڈالا ہے۔'' مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیل گیا کہ قاتل کوئی مسلم نہ ہو ورنہ ایک قیامت برپا ہو جائے گی اور اس ملک میں ان کا جینا دوبھر ہو جائے گا کیوں کہ وہ پہلے ہی شک و شبہات کے گھیرے میں تھے۔ پہلے قاتل کا نام اعلان نہ کر کے پنڈت نہرو نے افراتفری مچادی تھی۔ آدا جعفری لکھتی ہیں:

> ''نہرو نے قاتل کے لیے پاگل کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ کیا کوئی احتیاط مدنظر تھی۔ کیا بھارت کے وزیر اعظم فسادات کی آگ میں مزید ایندھن جھونکنے سے گریز کی کوشش کر رہے تھے۔ کیا واقعی وہ کوئی مسلمان شخص ہی تھا؟ اگر ایسا ہے تو اب انتقامی کارروائی کا سیل بلا کہاں جا کر رکے گا۔ پے بہ پے سوال جو ہونٹوں تک نہیں آئے ایک بڑے لیڈر کی سفاکانہ موت کے احساس کو بھی دھندلا گئے تھے۔ اس وقت جو حال اس گھر میں ہمارا تھا وہی حال پورے بھارت میں ہر مسلمان کا تھا اور کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ اس وقت حرف دعا بھی بے معنی ہو چکا تھا۔'' 8

جب تک ریڈیو پر قاتل کے نام کا اعلان نہیں ہوا تھا مسلمانوں کے ذہن و دل پر صدیاں بیت چکی تھیں اور جب یہ پتہ چلا کہ گاندھی جی کا قتل ایک مراٹھی ہندو نے کیا ہے تو مسلم قوم نے سکون کا سانس لیا ورنہ تب تک ان کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ کچھ ایسی ہی بے بسی اور خوف کا ذکر جوشؔ نے بھی اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ اگر پنڈت نہرو قاتل کے اعلان میں ذرا بھی دیر کرتے تو ملک میں قیامت آجاتی۔

آدا جعفری نے قیام پاکستان سے لے کر خودنوشت لکھنے تک وہاں کے سیاسی و سماجی حالات کا جامع تجزیہ بھی اپنے مخصوص اسلوب میں کیا ہے۔ وہاں مہاجرین کی مشکلوں و پریشانیوں کے ساتھ ان کے رہنے کے انتظامات پر بھی گفتگو کی ہے۔ آدا کو بھی وطن چھوڑنے اور پہلے بچے کھونے کا گہرا صدمہ لگا تھا۔ ''شہر عزیزاں'' کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں انہوں نے پاکستان میں اپنے پہلے گھر، شہر، دوست و احباب، وہاں کے رہن سہن وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ فوجی حکمرانوں جنرل ایوب خان، جنرل یحیٰ خان اور جنرل ضیاء الحق کے ادوار کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم خاصا بے

باک نظر آتا ہے۔ وہ ان تمام حکومتوں کو بندوں کی خدائی اور کبریائی کے اذیت ناک مظاہرے قرار دیتی ہیں اور ان حکومتوں کی جانب سے روا رکھے گئے ظلم و ستم کو برداشت کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہیں۔ اس ضمن میں حق گوئی کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔

آدا جعفری نے مشرقی و مغربی پاکستان کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور اس میں ملوث اشخاص کا ذکر بڑے بے لاگ پن، دلسوزی اور دردمندی سے کیا ہے۔ اپنے ملک کے حالات ان سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ لیکن اس کے اظہار میں انہوں نے طنز و استہزا اور نفرت کو راہ نہیں دی ہے بلکہ اس کے برعکس میانہ روی، انصاف پسندی اور ہمدردی کا لہجہ اپنایا ہے جو کہ قابل ستائش ہے۔ اس کے علاوہ قرارداد پاکستان ہو، تحریک آزادی ہو، تقسیم ہند ہو یا فرقہ واریت کا معاملہ ہو سب کے تئیں ان کا رویہ ایک ذمہ دار اور حساس فرد کا رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہنگامہ آرائی، قتل و خون اور بے کسی و لاچارگی کی وہ نہ صرف عینی شاہد تھیں بلکہ اس تجربے کی شریک بھی تھیں۔ دسمبر 1995 کے خون میں ڈوبے کراچی شہر کی کراہوں کو بھی ان کے قلم نے محسوس کیا ہے۔

خودنوشت کے باب ''شہر کو سیلاب لے گیا'' میں آدا جعفری نے پاکستان کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو زبان کے نام سے شروع ہوا اور نتیجتاً مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ ہندو پاک کی تقسیم کا سانحہ ابھی تازہ ہی تھا کہ مشرقی پاکستان کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اس وقت مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے اکثریتی حصہ تھا اور یہاں کے مقابلے میں عام سیاسی بیداری بھی وہاں زیادہ تھی۔ ان کا احتجاج سیاسی اور اقتصادی تسلط کے خلاف تھا مگر قضیہ زبان کے نام پر شروع ہوا۔ وہی زبان جس کا وجود، وجود پاکستان کے جواز میں شامل تھا۔ اسی زبان کے نام پر دلوں میں میل آنا شروع ہوا۔''9

1948 میں جب قائداعظم نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تو وہاں کی عوام نے واضح الفاظ میں ان سے دو قومی زبانوں کا مطالبہ کیا لیکن مسٹر جناح کو قیام پاکستان کے بنیادی ستونوں میں سے کسی ایک کی بھی شکست دیکھنا گوارہ نہیں تھی چناں چہ انہوں نے ان کے مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا اور مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ ''قومیں اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہیں، پاکستان کے وفاق کی شناخت کے لیے ایک قومی زبان ضروری ہے۔ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔'' اس کے بعد وہاں مظاہرے اور فساد شروع ہوئے۔ زبان کے نام پر پاکستان میں جو اولین فسادات ہوئے ان کی یادگار ڈھاکہ میں ''شہید مینار'' کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ لوگ پہلی بار زبان کے نام پر بنگال میں

متحد ہوئے تھے۔ آدا کا ماننا تھا کہ اگر جناح کو زندگی مہلت دیتی تو مشرقی پاکستان میں وہ سب کچھ نہ ہوتا، جو بعد میں وہاں ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس مطالبے کی بنیادی وجوہ کا ادراک نہ رکھتے اور تدارک نہ کرتے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے اختلافات کا پس منظر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہاں ان کے دوست احباب تھے جن سے وہ ملنے جایا کرتی تھیں لیکن اختلافات کے بعد سب کے دلوں میں میل آ گیا تھا، اس کی وجہ بھی پیش کی ہے۔ 1951 میں جناح کے ساتھی اور پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی شہادت پر افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے سیاسی منظر نامے کو بڑے پر درد انداز میں پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''کرائے کے قاتل کو تو افشائے راز کے خوف سے اسی وقت مار دیا گیا تھا۔ مگر جو گولی اس کے پستول سے نکلی تھی اس کا سفاکانہ سفر جاری رہا۔ اقدار مجروح ہوتی رہیں، آدرش دم توڑتے رہے، انسانیت قتل ہوتی رہی اور پاکستان میں سیاست کرسیوں کی تقسیم تک محدود ہو کر رہ گئی۔''10

آدا جعفری نے پاکستان میں لگائے گئے مارشل لا کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ انہوں نے پاکستان کے سیاسی مسائل اور حکمرانوں کی شخصیت، ان کی خامیوں اور خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ایوب خان کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ان کی شخصیت باوقار تھی، خوش خلق بھی تھے لیکن ہر آمر کی طرح وہ بھی اپنی ذات کے عشق میں مبتلا تھے۔ حکومت کی پالیسیوں کے ساتھ سرکاری ملازمین کے کاموں اور ان کی شخصیت کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ چوں کہ ان کے شوہر سرکاری محکمہ میں تھے اس لیے انہیں حکومت کی پالیسیوں سے زیادہ واقفیت تھی۔

مختصر یہ کہ آدا جعفری اپنی خودنوشت میں نہ صرف اپنے نجی حالات و واقعات کو پیش کرتی ہیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی و معاشی پہلوؤں پر بھی کھل کر اظہار خیال کرتی ہیں۔ اردو ادب میں صنف خودنوشت کی فہرست میں زیر نظر خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

حوالہ جات

1۔ احمد ندیم قاسمی، (تبصرہ جو رہی سو بے خبری رہی)، مشمولہ، ادا جعفری: شخصیت اور فن (مرتبین، فرمان فتح پوری، امراؤ طارق)، ایجوکیشنل پریس، کراچی، 1998، ص: 32

2۔ ڈاکٹر فوزیہ خانم، آپ بیتیاں ٹیڑھی پسلیوں کی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2017، ص: 107

3۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2011، ص: 95

4۔ ایضاً، ص: 97

5۔ ایضاً، ص: 98

6۔ ایضاً، ص: 99

7۔ ایضاً، ص: 104

8۔ ایضاً، ص: 101

9۔ ایضاً، ص: 227

10۔ ایضاً، ص: 238

اطہر حسین صدیقی: میں کیا میری حیات کیا

سنہ اشاعت: 2003

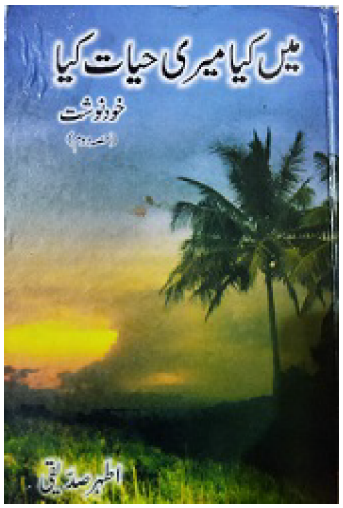

میں کیا میری حیات کیا (پروفیسر اطہر صدیقی)

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ سائنس کے پروفیسر اطہر حسین صدیقی 26 دسمبر 1931 کو سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء واجداد کی رہائش مرادآباد میں تھی۔ والد ملازمت کے پیش نظر سہارنپور آ کر بس گئے۔ ان کے والد آزادی سے پہلے انسپکٹر آف گورنمنٹ دفاتر ہو گئے تھے، اس ملازمت سے 1950 میں 55 برس کی عمر میں سبکدوش ہوئے۔ اطہر صدیقی پانچ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ ابتدائی تعلیم سہارنپور میں ہی حاصل کی۔ 1946 میں گورنمنٹ اسکول، سہارنپور سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بریلی کالج میں داخلہ لیا چوں کہ ان کے والد کی اس وقت بریلی سرکل میں پوسٹنگ تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے والد مزید تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ بھیجنے کے خلاف تھے، اس لیے ان کا داخلہ بریلی کالج میں ہو گیا۔ وہاں ہاسٹل میں رہتے ہوئے ایک سال تعلیم حاصل کی، لیکن سیر و تفریح اور آوارہ گردی کی وجہ سے امتحان میں بہت کم نمبر آئے۔ نتیجہ دیکھ کر وہ بہت دل برداشتہ ہو گئے اور واپس بریلی جانے سے صاف انکار کر دیا پھر انٹرمیڈیٹ کی بقیہ تعلیم علی گڑھ سے مکمل کیا۔ بی ایس سی، ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی علی گڑھ سے حاصل کی۔

1947 میں آزادی کے بعد مع خاندان مرادآباد چلے گئے تھے۔ 1950 میں والد کی سبکدوشی کے بعد معاشی پریشانیوں کے سبب بی ایس سی کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنا دشوار ہو گیا چناں چہ انہوں نے پہلے کلرک نوکری کی، بعد ازاں مسلم کالج مرادآباد میں بحیثیت سائنس ٹیچر کے خدمات انجام دیں۔ جب مالی حالت کچھ حد تک ٹھیک ہوئی تو انہوں نے 1951 میں پھر سے علی گڑھ کا رخ کیا اور ایم ایس سی- علم حیونات (Zoology) میں داخلہ لے لیا۔ 1953 میں انہیں پوری سائنس فیکلٹی میں ٹاپ کرنے پر یونی ورسٹی گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ اُسی سال وہ شعبہ سائنس میں لکچرر مقرر ہوئے۔

لکچرر رہتے ہوئے انہوں نے ریسرچ کا کام بھی شروع کر دیا اور 1956 میں اپنی تھیسس مکمل کر کے جمع کر دی۔ اس کے بعد ریسرچ کے سلسلے میں امریکہ کی مختلف یونی ورسٹیوں میں درخواست دی۔ وہاں سلیکشن ہونے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی سے تین سال کی چھٹی لے کر امریکہ روانہ ہوئے۔ امریکہ جانے سے پہلے ذکیہ سے 1956 میں شادی بھی کی، جو بعد میں علی گڑھ وومنس کالج میں بحیثیت پرنسپل اپنی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے واپسی کے بعد 1961 میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں ریڈر منتخب ہوئے۔ 1964 میں نائیجیریا میں ساڑھے تین سال ملازمت کی، اسی طرح لیبیا کی الفاتح یونی ورسٹی میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ کے شعبہ سائنس کے پروفیسر، صدر پھر ڈین مقرر

ہوئے۔ جولائی 1994 میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اطہر صدیقی نے پوری زندگی درس و تدریس میں گزار دی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے پڑھنا اور پڑھانا بہت پسند ہے۔ ان کی نگرانی میں کئی نامی گرامی ہستیوں نے اپنا ریسرچ کا کام مکمل کیا ہے، ان میں شمیم جیراجپوری کا نام سرفہرست ہے۔

شعبہ سائنس سے تعلق رکھنے کے ساتھ ہی اطہر صدیقی کو اردو زبان و ادب سے بے حد شغف رہا ہے۔ انہوں نے مختلف خاکے اور سفرنامے لکھ کر اپنی ادبی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ اردو ادب میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''میں کیا میری حیات کیا'' ہے جو ان کی خودنوشت ہے۔ جس میں اپنی زندگی میں ہونے والے حالات و واقعات کو دلچسپ پیرائے میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ ایک سائنٹسٹ کی خودنوشت اتنی دلچسپ ہوسکتی ہے اس کا امکان خود مصنف کو بھی نہیں تھا۔ اس خودنوشت کے منظر عام پر آنے کے بعد قارئین میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ راقمہ کے پاس اس خودنوشت کا دوسرا ایڈیشن موجود ہے جو مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی سے 2008 میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا ایڈیشن 2003 میں منظر عام پر آیا تھا۔ بعد ازاں اس خودنوشت کی مقبولیت کے بعد دوسری طباعت اضافے اور تصحیح کے ساتھ ہوئی۔ اس سلسلے میں اطہر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''آج سے پانچ سال پہلے میری خودنوشت میں کیا میری حیات کیا شائع ہوئی تو اس کا امکان کم تھا کہ قارئین کو مجھ جیسے گمنام شخص کی خودنوشت پسند آئے گی اور اس کی طبع دوم کی نوبت بھی آجائے گی۔''1

تقریباً تین سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل مذکورہ خودنوشت کو 13 ابواب میں منقسم کیا گیا ہے جس میں ذیلی عنوانات بھی شامل ہیں۔ عنوان پڑھ کر پورے متن کے سیاق کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ پروفیسر قاضی عبدالستار اس خودنوشت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اس کتاب کی ایک منفرد خصوصیت اس کا تنوع ہے۔ ایک سے زیادہ خاندانوں کے افراد اور ان سے متعلق اشخاص، ان کی صورت و سیرت کا تماشا، ان کے زریں اور سفالی خواب ان کی سنہری اور خاکی تعبیریں۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے باطن کا ابلق نظارہ، سر ضیاء الدین سے محمود الرحمٰن تک تمام وائس چانسلر کی حق و باطل کے کانٹے پر تلی ہوئی کارگزاریاں جن سے عبرت بھی حاصل کی جاسکتی ہے اور نصیحت بھی۔ امریکہ میں قیام کا بیان عجیب و غریب ہے ایک سپر پاور کے غرور و تکبر کی جھلک، اس کے عام شہریوں کی دردمندی، دلاسائی،

دریا دلی، میز بانی اور سخاوت کے ساتھ اس ملک کی دولت و ثروت پڑھنے والے کو ایسا افسانہ معلوم ہوتی ہے جس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔''2

مذکورہ خودنوشت کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں اطہر صدیقی کی ذات اور ان کی زندگی میں ہونے والے گونا گوں واقعات کی تفصیل ملتی ہے۔ دوسرے حصے میں اپنے ان تمام سفر کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں طے کیے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی کے چھ اہم اشخاص کا خاکہ پیش کیا ہے جس میں ان کی والدہ اور علی گڑھ کے مختلف وائس چانسلروں پر لکھا گیا خاکہ اپنی مثال آپ ہے۔ اطہر صدیقی اپنی خودنوشت میں آبائی وطن سہارنپور کی تہذیب و تمدن کا تفصیلی ذکر کیا ہے اس کے علاوہ مختلف شخصیات کے خاکے، ملکی اور غیر ملکی سفر ناموں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ساتھ ہی ملک کے سیاسی حالات پر بھی طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اس خودنوشت میں حقیقت نگاری کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے دوست واحباب کا ذکر کیا ہے اس میں اپنی بیوی کے بھائی عثمان سے ناراضگی اور ان کی دوہری شخصیت کا ذکر کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ کچھ ایسے کردار بھی سامنے آئے ہیں جن کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی برملا اظہار کیا ہے۔ بہر حال یہ خودنوشت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اپنی خودنوشت کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں کیا میری حیات کیا، اس ایک جملے سے میں قاری کو اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی وہ پڑھنے جا رہا ہے اس کا حقیقت سے بہت قریب کا تعلق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ حقیقتوں کو میں نے تحریر میں لانے سے گریز کیا ہو اس لیے کہ انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔ اور کچھ حقیقتوں سے گریز کر جانے میں کچھ اپنی اور کچھ اپنے مہربانوں کی پردہ داری منظور ہو۔ ایک سائنس کے طالب علم کو ویسے بھی حقیقت پسندی کی عادت پڑ جاتی ہے اور اس سے مفر نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ میری تحریر خشک اور بے مزہ ہو اور اس میں وہ بات نہ ہو جو ایک اچھے اور دلچسپ نثر نگار کی تحریر میں پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ کسی بھی گہرائی خیال یا گیرائی بیان سے مبرا ہو۔ لیکن جو کچھ بھی صفحہ قرطاس پر موجود ہے وہ حقائق پر مبنی زندگی کے اہم واقعات ہیں۔''3

اطہر صدیقی 1931 میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت ہندوستان میں بڑی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے سیاسی میدان میں گاندھی جی شامل ہو چکے تھے۔ ملک کی دو بڑی پارٹیوں ''کانگریس'' اور ''مسلم لیگ'' کے درمیان تناؤ جاری ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کی جانب سے نئے ملک کی مانگ شروع ہو چکی تھی۔ اس پر سے طرّہ یہ کہ ملکی عوام پر

انگریزوں کے مظالم بھی بڑھتے جا رہے تھے۔جلیاں والا باغ جیسے دلسوز حادثے نے لوگوں کو مشتعل کر رکھا تھا۔ایسے نامساعد اور پرسوز ماحول کا اثر تمام ہندوستانیوں پر پڑنا لازمی ہی تھا۔

1944-45 کا زمانہ سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔حالات کو دیکھتے ہوئے اطہر صدیقی کو اس بات کا احساس تھا کہ مسلمانوں کو بھی سیاست میں پورے حقوق حاصل کرنے کا حق ہے اور اس لحاظ سے جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے حقوق کو نہ صرف اندیکھا کیا جا رہا ہے بلکہ انہیں حاشیے پر لانے کی بھی بھرپور کوشش ہو رہی تب مسلمانوں کے الگ ملک کی مانگ کو صحیح سمجھ رہے تھے۔لیکن وہ مسلم لیگ کی پالیسیوں کے خلاف تھے۔مصنف اپنی طفلی میں ساتھیوں کے ساتھ مل کر ''بن کے رہے گا پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان، لے کے رہیں گے پاکستان'' جیسے نعرے لگایا کرتے تھے۔اس وقت مسلم لیگ کا دور دورہ تھا۔مصنف کے خاندان کے افراد بھی مسلم لیگ کی حمایت کرتے تھے اور پاکستان کی مانگ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔نئے ملک کے لالچ اور خواب نے مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیا تھا۔اس کے علاوہ نہرو رپورٹ نے بھی مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی تھی کیوں کہ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز کیا گیا تھا۔مسلم قوم کو ہندوستان میں اپنا مستقبل خطرے میں دکھائی دینے لگا۔اس وقت مسلمانوں کے ناپختہ ذہن میں ایک بات گھر کر گئی تھی کہ اب ہر حال میں پاکستان بننا چاہیے کیوں کہ ان کو لگتا تھا کہ ایک مسلم ملک میں ان کا مستقبل بہتر ہو سکتا ہے، اپنا ملک ہوگا، جہاں ہر قسم کی آزادی ہوگی، قوم کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا اور وہ ترقی کر سکیں گے۔اس وقت مسلم قوم میں بڑی بڑی بحثیں ہوا کرتی تھیں کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔اپنے تحفظ کی خاطر انہیں ایک نئے مسلم ملک کی بنیاد ہی واحد حل نظر آ رہا تھا۔اس وقت اچھے برے کی تمیز ہی نہیں رہ گئی تھی۔اطہر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''میرے بڑے بھائی مسلم لیگ کے جلسوں میں جاتے تھے اور ہم بچہ لوگ بھی مسلم لیگ کی سیاست سے ہمدردی رکھتے تھے۔مجھے یاد آتا ہے کہ سہارنپور میں آئے دن سڑکوں پر مختلف سیاسی پارٹیوں کے جلوس نکلا کرتے تھے۔کبھی احرار پارٹی کے، کبھی خاکسار پارٹی کے۔ مسلم لیگ کے جلوسوں میں تو ہم خود ہی شریک رہتے تھے۔ایک سیاسی بحران تھا جس کی لپیٹ میں سب ہی بڑے چھوٹے پھنسے ہوئے تھے۔کسی کو بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ مسلمانوں کے لیے کیا صحیح ہے کیا غلط۔جو مسلمان نیشنلسٹ تھے وہ کانگریس کے ساتھ تھے اور پاکستان کی تحریک کے مخالف تھے۔مسلمان کانگریسی لیڈروں میں مولانا ابوالکلام

آزاد ایک ایسے سیاسی لیڈر تھے جو دل و جان سے ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔''4

محمد علی جناح جو اپنے شروعاتی دور میں سیکولر خیالات کے حامی تھے، ہندو مسلم اتحاد میں یقین رکھتے تھے۔ان کی اس سوچ کی قائل سروجنی نائڈو بھی تھیں وہ کہتی تھیں کہ جناح ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے سفیر ہیں۔لیکن ملک کی سیاسی تبدیلوں کی وجہ سے وہ بھی بدل گئے اور پاکستان کی مانگ پر زور دینے لگے۔آخر کار انہوں نے کانگریس جیسی پرانی سیاسی پارٹی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور پاکستان بنوا ہی لیا۔

برصغیر میں دوقومی نظریے نے دونوں قوموں کے بیچ خلیج پیدا کیا۔حالاں کہ دوقومی نظریہ پیش کرنے میں جناح کا نام آتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ویر ساورکر نے اپنی کتاب ''ہندوتو'' میں سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔اس کے علاوہ 30 ستمبر 1937 کو ہندو مہاسبھا میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں دوقومیں ہیں، ہندو اور مسلمان۔اس فلسفہ کے مطابق دو الگ قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔جب کہ مسٹر جناح دونوں قوموں کے متحد ہونے کے خواہاں تھے۔لیکن بعد میں کانگریس کی پالیسیوں سے دل برداشتہ ہو کر پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔حالاں کہ اقبالؔ نے مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں بھی ایک الگ ملک کے تصور کی طرف اشارہ کیا تھا۔جسے بعد میں بنیاد بنا کر مسلم لیگ نے پاکستان کی مانگ کی۔لیکن آج تقسیم کے لیے صرف مسلمانوں کو خطاوار سمجھا جا رہا ہے جب کہ حقیقت کچھ اور ہے۔اس سلسلے میں اطہر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''پاکستان بنانے یا ملک کو تقسیم کر دینے کی بات سب سے پہلے 1937 میں الہ آباد میں منعقدہ ہندو مہاسبھا کی آل انڈیا کانفرنس میں پیش کی گئی تھی۔میرے نزدیک ہندوستان کی سالمیت کے مدنظر پاکستان بنوانے کی تجویز ہی ایک غلط خیال تھا۔اس پر سے دوقومی نظریے نے اس میں زہر گھول دیا۔گاندھی جی اس تقسیم کے سخت مخالف تھے اور اگر ایک دو سال اور آزادی نہ ملی ہوتی تو شاید ملک تقسیم ہونے سے بچ جاتا۔میرے نزدیک مسلمانوں کو ملک کی تقسیم کا بلا شرکتِ غیرے ذمہ دار ٹھہرانا ناانصافی ہوگی۔ملک کی تقسیم میں جتنا ہاتھ جناح اور مسلمانوں کا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی نہرو، پٹیل اور کانگریسی لیڈروں کا ہے۔''5

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ملک کی تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان ہندوستانی مسلمانوں کا ہوا، خاص طور سے اس سے بڑا سانحہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بھائی بہن جدا ہو گئے، والدین سے اولاد جدا ہو گئیں، کہیں کہیں تو میاں

بیوی تک بٹ گئے، خاندان ٹوٹ گئے۔ کوئی یہاں رہ گیا تو کوئی وہاں چلا گیا۔ دونوں ملکوں کے تفرقات نے خونی رشتوں کو پامال کر دیا۔ دوفریق ملکوں کی وجہ سے خونی رشتے ایک دوسرے کے دشمن قرار پائے گئے۔ سگے بہن بھائیوں کو ایک دوسرے سے ملنے ایک عدد پاسپورٹ اور مشکل سے ملنے والے ویزا کی ضرورت لازمی ہوگئی۔

جس قومی نظریے کے تحت ملک تقسیم ہوا وہ وقت کے ساتھ غلط ثابت ہوا۔ اس کے ثبوت میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگیں اور بنگلہ دیش کے قیام کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جہاں آج سالوں بعد کئی لاکھ بہاری مسلمان بے گھر اور بے وطن پڑے ہوئے ہیں۔ جنہیں نہ بنگلہ دیش ہی اپنانے کو تیار ہے اور نہ ہی پاکستان ان کو واپس لینے کو آمادہ ہے۔ وہ لوگ مہاجروں کی طرح رفیوجی کیمپوں میں اپنی حالتِ زار پر آنسو بہانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے اطہر صدیقی کا ماننا ہے کہ اگر مسلمانوں کے تحفظ کا نظریہ صحیح ہوتا تو مسلمان چاہے کہیں کا بھی ہو وہ قابل قبول ہوتا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ خودنوشت میں بحث کی ہے اور اپنی رائے بھی دی ہے۔

آزادی کی خوشی اپنی جگہ تھی لیکن دوسرے ہی دن ان خوشیوں پر ایسا گرہن لگا کہ آج تک اس کا اثر باقی ہے۔ ملک کی تقسیم اور اس کے اثرات بڑے خوفناک ثابت ہوئے۔ اطہر صدیقی نے اپنی خودنوشت میں اس سلسلے میں دو عنوانات ''سیاسی پس منظر'' اور ''تقسیم ملک وفسادات'' قائم کیے ہیں جن میں بڑی تفصیل کے ساتھ تمام حالات کا جائزہ لیا ہے، ساتھ ہی اپنے نقطۂ نظر سے بھی قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ ملک کی تقسیم کا اعلان ہوتے ہی پاکستان سے ہندو اور ہندوستان سے مسلمانوں نے ہجرت کرنی شروع کر دی۔ پاکستان سے آئے شرنارتھی پنجاب اور اس کے قریب اضلاع میں پہنچ کر بستے جا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے مقامی ماحول بھی متاثر ہو رہا تھا، فرقہ واریت بڑھ رہی تھی۔

اطہر صدیقی لکھتے ہیں کہ سہارنپور بہت پرسکون شہر تھا جہاں کوئی فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے تھے۔ لیکن تقسیم کا اعلان ہونے کے بعد اس شہر کی فضا میں بھی نفرت کی بو آنے لگی اور تناؤ روز بروز بڑھتا گیا۔ اس شہر کے شمالی اضلاع میں جب فسادات شروع ہوئے تو وہاں کے مسلمان لٹ لٹا کر سہارنپور پہنچنے لگے۔ مصنف نے اس وقت سہارنپور کے ایک فساد کا ذکر کیا ہے جو جین مذہب کے ایک تیوہار پر رونما ہوا تھا۔ اس شہر میں یہی فساد 1947 کے فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد بن گیا۔ ہوا یوں تھا کہ جینیوں کے جلوس میں کسی نے افواہ اڑا دی کہ گوشت کا لوتھڑا پھینکا گیا ہے بس یہی افواہ فساد کی وجہ بنی۔ دو تین دن کے اندر شہر کی حالت کافی خراب ہوگئی اور قتل وغارت گیری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس وقت شہر کے حالات اور مسلم علاقے میں کیسے حفاظتی تدابیر اپنائی گئیں؟ کس طرح لوگوں کا چین وسکون برباد ہو چکا تھا مصنف نے مذکورہ خودنوشت میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

دراصل جین مذہب کے لوگ اہنسا پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے تحت وہ کسی جاندار کو مارنا پاپ سمجھتے ہیں۔ اس افواہ نے ان کو مذہبی ٹھیس پہنچائی۔ اس واقعے کے بعد وہ بھی بدل گئے اور ہنسا (تشدد) پر اتر آئے۔ جو لوگ کسی جاندار کو مارنا حرام سمجھتے تھے ان کے ہاتھ میں ترشول اور تلوار آ گئی تھی۔ ایک ہی دن میں سارا ماحول بدل گیا تھا۔ ایک عرصے سے ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اطہر صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''پڑوس میں جینیوں کے گھر تھے اور بیچ کی دیوار دو فرقوں کو اور ان کے گھروں کو الگ کرتی تھی۔ یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا کہ وہ لوگ جو کسی بھی جاندار کو مارنے نہیں دیتے تھے وہ کیسے ہاتھوں میں تلواریں اور ترشول لیے ہوئے تھے۔۔۔ رات بھر کی حرکات کی رپورٹ پولیس کو ہو گئی اور اگلے دن پولیس ہمارے محلے میں پہنچ گئی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے اور کھڑکیوں و بالکنیوں سے پولیس کو محلے کی سڑکوں اور گلیوں میں گشت کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جوالا پور سے آئے کچھ مسلمان پناہ گزیں ایک کمرہ پر مشتمل جگہ پر رہ رہے تھے، ان میں سے ایک شخص کمرے کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا اور اتفاق سے اس کی داڑھی بھی اس کے مسلمان ہونے کا اشتہار دے رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے اپنے سپاہی کے ہاتھ سے بارہ بور کی بندوق لی اور میری آنکھوں کے سامنے اس غریب کو چند گز کے فاصلے سے شوٹ کر دیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ قتل میرے ذہن میں آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسے اس دن ہوا تھا۔ وہ شخص زمین پر گر گیا تھا اور اس کے جسم سے خون بہہ کر سڑک پر پھیل گیا تھا۔ ہر طرف ایک سناٹا، خوف، دہشت اور ہو کا عالم طاری ہو گیا تھا۔''6

اس بے گناہ شخص کا قتل اور اس کی بیوہ کی لاچاری، بے بسی اور آنسوؤں نے مصنف کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ روزمرہ کی اشیا کی قلت اور پریشانی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ایسے ہی سوگوار ماحول میں آزادی کا دن بھی آیا۔ کئی سالوں سے لگائے جانے والا نعرہ ''لے کے رہیں پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان'' شرمندۂ تعبیر ہو چکا تھا اور مسلم قوم کے نام پر ایک نیا ملک دنیا کے نقشے پر متعارف ہوا۔ اطہر صدیقی کے خاندان کے تمام افراد ایک ایک کر کے اسپیشل ٹرین سے پاکستان چلے گئے تھے۔ حالاں کہ اس وقت ٹرین سے پاکستان جانا بے حد خطرناک تھا کیوں کہ پوری پوری ٹرین لاشوں اور خون سے لت پت سرحد پار پہنچ رہی تھیں۔

وہ دن بھی آیا جب ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ ایک دن کے لیے ہی سہی ساری نفرتیں، کدورتیں

مٹ گئی تھیں۔لوگ آپس میں مل جل کر آزادی کا جشن منا رہے تھے، بلا خوف وخطر سڑکوں پر ریلیاں نکل رہی تھیں۔لیکن یہ خوشی اتنی مختصر اور عارضی تھی کہ اگلے دن ہی سرحد کے دونوں طرف سے لوٹ مار کی خبروں نے لوگوں کو مشتعل کر دیا اور وہ قیامت برپا ہوئی جس کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔اطہر صدیقی لکھتے ہیں:

''پندرہ اگست آئی اور ہندوستان کے لیے آزادی کا پیغام لائی لیکن کس طرح؟ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا، ملک دو حصوں میں بٹ گیا،قتل وغارت گیری کی ایسی مثالیں دنیا میں کہیں نہیں ملیں گی، لاکھوں لوگوں کی جانیں گئیں، ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں، بے عزت ہوئیں اور کتنی ہی جوان لڑکیاں اغوا ہو گئیں، کتنے معصوم بچے یتیم ہو گئے یا جان سے مار ڈالے گئے۔بھوک پیاس سے بلک بلک کر کوئی بچہ کھانا یا پانی مانگتا تھا تو دشمن چلو بھر خون اٹھا کر دیتا تھا کہ لو اپنی پیاس یا بھوک اس سے مٹا لو!!!''7

پاکستان بن جانے کے بعد مصنف کے بقیہ خاندان کے لوگ ہجرت کر گئے صرف ان کے والدین اور ایک بہن یہاں رہ گئی تھیں۔ یہ لوگ سہارنپور کی فضا سوگوار ہوتے دیکھ اپنے آبائی شہر مرادآباد ہجرت کر گئے۔اس وقت وہ لوگ اپنے ہی ملک میں مہاجر بن گئے۔اطہر صدیقی نے ملک کی آزادی،تقسیم،اس کے اثرات،فسادات اور قتل وغارت گیری پر بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ملک تقسیم ہو گیا تھا اور پندرہ اگست کو ہم ایک آزاد ملک کے شہری بن گئے تھے۔فسادات کے قتل وخون کے ساتھ ملی ایسی آزادی میرے ناپختہ ذہن میں کچھ سمجھ نہیں آئی۔ یہ کیسی آزادی تھی کہ ہندو مسلمان کا اور مسلمان ہندو کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ایک دوسرے کی طرف سوائے بدگمانیوں کے ذہن میں اور کچھ آتا ہی نہیں تھا،خاص طور سے مجھ جیسے انسان کے لیے جس نے بچپن سے لے کر اب تک ایک تکثیریتی سماج میں ہندو مسلم بھائی چارے اور آپسی امن وآشتی کے ماحول میں زندگی گزاری تھی۔ان حالات سے سمجھوتہ کرنے میں بہت وقت لگا لیکن زندگی کو تو بہر حال جاری وساری رہنا تھا۔''8

اطہر صدیقی نے باری میاں جن کا خاندان علی گڑھ میں آکر مقیم ہو گیا تھا،ذکر کیا ہے۔ان کے والد کو فسادیوں نے قتل کر دیا تھا جس کے بعد ان کا بھرا پورا خاندان لٹ لٹا کر علی گڑھ آکر بس گیا تھا۔ یہاں مصنف ٹیوشن پڑھانے جایا کرتے تھے۔اس خودنوشت میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کا بھی ذکر ملتا ہے۔1971 میں اپنی بہن کی یتیم بیٹی کی

شادی میں شریک ہونے کے لیے مصنف پاکستان گئے۔اسی درمیان ہندوستان اور پاکستان میں جنگ شروع ہوگئی، شادی کے بعد کس عذاب سے گزر کر وہ ہندوستان پہنچے اس کی بھی تفصیل خودنوشت میں ملتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''میں لڑائی کے دوران پاکستان سے نکل آیا تھا۔یہ کیسے ممکن ہوا اور کیوں کر ہوا میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔سوائے اس کے کہ میں ایک نیک کام کرنے یعنی ایک یتیم بچی کی شادی کے وقت اس کے سر پر ہاتھ رکھنے پاکستان گیا تھا اور میری بیوہ بہن و ماں کے دل کی گہرائیوں سے نکلی دعائیں شامل حال تھیں اور ایک مافوق الفطری طاقت نے مجھے لڑائی کے دوران کراچی سے نکال دیا تھا۔''9

1971 کی لڑائی میں ہی پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے اور بنگلہ دیش وجود میں آیا۔مولانا آزاد نے ملک کی تقسیم پر ہی یہ پینشن گوئی کی تھی کہ بہت جلد پاکستان کے ٹکڑے ہوں گے۔اس سلسلے میں اطہر صدیقی لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب India Wins Freedom میں پاکستان کی سالمیت کو 25 سال سے زیادہ نہیں دیے تھے۔ان کی پینشن گوئی اس قدر صحیح ثابت ہوسکتی ہے اس پر تعجب ہوتا ہے۔بنگلہ دیش ملک کی تقسیم اور آزادی کے پورے 25 سال بعد وجود میں آیا۔نہ صرف یہ کہ پاکستان اس جنگ میں بری طرح پسپا ہوا، ملک کے دو حصے ہوئے، 95 ہزار جنگی قیدی تقریباً ایک سال تک ہندوستان کی ہراست میں رہے۔اگر سیاست داں اپنی گندی سیاست کا کھیل نہ کھیلیں تو دونوں ملک سکون سے اچھے پڑوسی ملکوں کی طرح رہ سکتے ہیں، لیکن ایسا کب ممکن ہوسکتا ہے۔''10

اطہر صدیقی ملک کی تقسیم جن حالات اور بے سروسامانی میں ہوئی اس کو صحیح نہیں مانتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ تقسیم بہت غلط تجویز تھی، تمام مسائل کا حل تقسیم میں مضمر سمجھ کر لوگوں نے بہت بڑی غلطی کی، جب کہ اس وقت کوئی درمیانی راستہ نکال کر بعد میں ہونے والے خون خرابے کو روکا جا سکتا تھا بلکہ آج بھی جو تنازعے ہو رہے ہیں وہ بھی نہیں ہوتے۔دنیا یک جہتی کی طرف جاتی ہے نہ کہ اپنے ہی ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔حالاں کہ گاندھی جی بھی اس تقسیم کے مخالف تھے اگر کچھ سال آزادی نہیں ملی ہوتی تو ممکن تھا کہ ملک تقسیم نہ ہوتا۔اسی پاکستان کی مانگ کرنے والے سیکولر مزاج والے مسٹر جناح بھی دو چار سال اور زندہ ہوتے تو دونوں ملک کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔

بہر کیف مختصر یہ کہ اطہر صدیقی اپنی اس خودنوشت میں نہ صرف اپنی ذات اور شخصیت کو کھل کر بیان کیا ہے بلکہ

اس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی پہلو پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔

حوالہ جات

1۔ اطہر صدیقی، میں کیا میری حیات کیا، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 2003، ص: 1
2۔ ایضاً، ص: 7
3۔ ایضاً، ص: 8
4۔ ایضاً، ص: 74
5۔ ایضاً، ص: 74
6۔ ایضاً، ص: 85
7۔ ایضاً، ص: 86
8۔ ایضاً، ص: 88
9۔ ایضاً، ص: 238
10۔ ایضاً، ص: 236

پروفیسر ساجدہ زیدی: نوائے زندگی

سنہ اشاعت: 2012

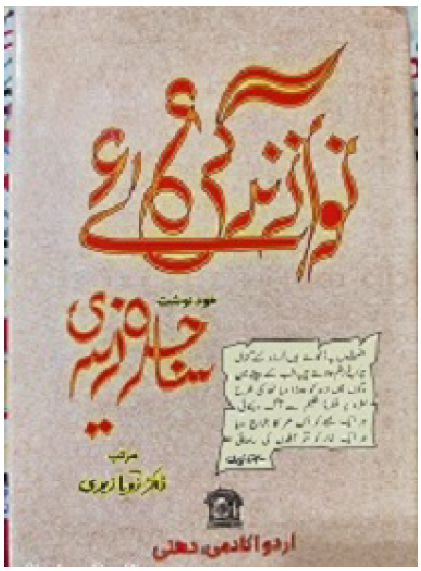

نوائے زندگی (پروفیسر ساجدہ زیدی)

ساجدہ زیدی نے ادبی دنیا میں بحیثیت شاعرہ، ناول نگار، ڈراما نگار، نقاد، محقق و مترجم اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ وہ آزاد نظم میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ میرٹھ کے ایک روشن خیال خاندان میں 18 مئی 1926 کو پیدا ہوئیں۔ ان کے دادا شاعر تھے اور والد سید محمد مستحسن زیدی میرٹھ کے مشہور بیرسٹر تھے جنہوں نے کیمبرج سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ان کی والدہ مولانا حالؔی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ بھی ایک شاعرہ تھیں۔ انہوں نے مذہبی نظموں کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، مرثیے، نوحے وغیرہ لکھے ہیں، ان کی شاعری کا مجموعہ پہلے ''چمنستان ادب'' کے نام سے شائع ہوا۔ بعد ازاں ترمیم شدہ ایڈیشن ''چراغ تہہ داماں'' کے نام سے منظر عام پر آیا، جو مذہبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔ ساجدہ کی کل پانچ بہنیں تھیں، جن میں زاہدہ زیدی نے بھی ادبی دنیا میں اپنا الگ مقام بنایا۔

ساجدہ زیدی ابھی نو سال کی ہی تھیں کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تایا نے ان کے والد کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ خودنوشت سے کچھ ایسے شواہد ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد اپنے بھائیوں کی سازشوں کا شکار ہوئے تھے۔ ان کی والدہ مختار فاطمہ زیدی اپنی بیٹیوں کو لے کر میکے پانی پت منتقل ہو گئیں۔ ساجدہ زیدی نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کی اور نویں جماعت کے بعد ان کی تمام تر تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے بعد ان کی شادی رام پور کے قیصر حسین زیدی سے ہوئی، جو مسلم یونی ورسٹی میں لکچرر تھے۔ شادی کے بعد بھی انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اسی دوران ان کے دو بیٹے سلمان و علی اور دو بیٹیاں زویا و صبا پیدا ہوئیں۔ 1955 میں علی گڑھ کے شعبہ تعلیمات میں بحیثیت لکچرر ان کا تقرر ہوا اور وہیں سے پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئیں۔ دوران ملازمت انہوں نے لندن سے 1966 میں تخلیق کی نفسیات میں اعزاز کے ساتھ ایم فل کی ڈگری بھی حاصل کی۔

اس کے علاوہ ساجدہ زیدی مختلف سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں مثلاً UGC,NCERT,NCPUL وغیرہ میں اعزازی عہدوں پر فائز رہ کر ملک و قوم بالخصوص تعلیم و نفسیات اور اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے چکی ہیں۔ تعلیم، سیاحت اور دیگر کلچرل مقاصد کے تحت انگلینڈ، فرانس، جرمنی، اٹلی، سویڈن، ہالینڈ، کینیا، آسٹریلیا، عرب اور سوویت یونین کے مختلف ممالک کا سفر بھی کیا۔ ملک کے طول و عرض اور بیرون ملک کے متعدد علمی و ادبی سمیناروں میں شرکت کی، مقالات کی پیش کش اور صدارتی فرائض بھی انجام دئے۔ ان کی علمی و ادبی صلاحیت کا اعتراف ہر موقع پر ہوتا رہا۔ لیکن ان کی تخلیقی خدمات خاص طور پر اردو ادب میں جس کی حق دار تھیں اس کی قدر نہیں کی گئی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ رہی ہو کہ ان کا تعلق براہ راست اردو دنیا سے نہیں تھا۔ غالب ایوارڈ ان کے ایک ڈراما کو ملا، اس کے علاوہ کسی دوسری

تخلیقات پر کوئی انعام نہیں ملا۔ ساجدہ زیدی کو اس ناانصافی کا خوب اندازہ تھا جس کا ذکر وہ خودنوشت میں کبھی اشارتاً اور کبھی بڑی بے باکی سے کرتی ہیں۔ اس تعلق سے خودنوشت کے باب ''کچھ زمینی حقائق'' میں لکھتی ہیں:

''ایک بدبختانہ حقیقت یہ بھی ہے کہ انعامات کی غیر منصفی نے ادبی کرپشن کو فروغ دیا اور داد دہش کی بدعنوانیوں نے ایک ایسی ذہنیت پیدا کی ہے جس نے قابل رحم حد تک ادبی وقار کو دھکا پہنچایا ہے اور انفرادی خودی کو پسپا کیا ہے۔''1

لیکن یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور اردو ادب سے بے پناہ محبت تھی کہ اپنے مفاد کی پروا کیے بغیر تا عمر اردو کی خدمت کرتی رہیں۔ انہیں انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اگر وہ انگریزی زبان کی اتنی خدمت کرتیں تو یقیناً ان کی قابل قدر ستائش ہوتی اور عالمی سطح کے انعامات بھی ملتے۔ پانچ شعری مجموعے (جوئے نغمہ، آتش سیال، سیل وجود، آتش زیر پا، پردہ ہے ساز)، دو ناول (موج ہوا پیچاں، مٹی کے حرم)، ایک منظوم ڈراما (سرحد کوئی نہیں)، دو تنقیدی مضامین کے مجموعے (تلاش بصیرت، گزرگاہ خیال)، تراجم ڈرامے (چاروں موسم کے نام سے جو انگریزی، جرمن، فرانسیسی ڈراموں کا اردو ترجمہ ہے) اور تعلیم و انسانی نفسیات پر دو انگریزی اور دو اردو میں چار ضخیم کتابوں کے ساتھ خودنوشت ''نوائے زندگی'' ان کی جنبش قلم کی شاہد ہیں۔ ان کی شاعری انگریزی، روسی، مراٹھی، اڑیا اور ہندی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوئی ہیں۔ ان کا انتقال 9 مارچ 2011 کو دبئی میں ہوا اور علی گڑھ میں سپرد خاک ہوئیں۔

ساجدہ زیدی کے انتقال کے بعد ان کی خودنوشت ''نوائے زندگی'' جو غیر مطبوعہ تھی، اردو اکادمی، دہلی کی سفارش پر ان کی بیٹی ڈاکٹر زویا زیدی نے بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ مرتب کیا اور بے حد مفصل و مربوط مقدمہ اور اختتامیہ بھی تحریر کیا۔ جسے اردو اکادمی نے 2012 میں شائع کیا۔ ساجدہ زیدی امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ عملی اور ادبی زندگی میں بھی فعال و متحرک رہیں۔ خودنوشت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی مسلسل تگ و دو سے عبارت تھی۔ انہوں نے ہر مشکل وقت کا سامنا ڈٹ کر ہمت کے ساتھ کیا۔ انہوں نے بے بسی و مایوسی جیسے الفاظ کو اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔ اپنی زندگی میں بے شمار نشیب و فراز دیکھے لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری۔ 1947 کے فساد میں ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا بعد ازاں وہ اور ان کے شوہر علی گڑھ آ کر از سر نو اپنی زندگی کی شروعات کی، ساجدہ زیدی نے اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا۔

انہوں نے خودنوشت میں اپنی حالات زندگی اور خاندان کے واقعات کے ساتھ ایک دور کی پوری تاریخ پیش کی ہے۔ وہ سماج کی ایک حساس، روشن خیال اور انسانی نفسیات کی نباض فن کارہ تھیں انہوں نے سماج و معاشرہ کو کھلی آنکھوں

سے دیکھا اور محسوس کیا جسے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔تقریباً650 صفحات پر مشتمل مذکورہ خودنوشت دو ابواب میں منقسم ہے۔دونوں باب میں ذیلی عنوانات کے تحت مصنفہ نے اپنی زندگی کے تمام نشیب وفراز اور واقعات کو من وعن پیش کر دیا ہے۔انہوں نے خودنوشت کے بیشتر عنوانات علامہ اقبالؔ، فیضؔ اور خود اپنے اشعار کے مصرعے سے مزین کیا ہے۔اس کتاب کے آخر میں ڈاکٹر زویا زیدی کی وہ تحریر بھی شامل ہے جس میں ساجدہ زیدی کی شخصیت، بیماری اور انتقال کی تفصیلات کے علاوہ زویا کی وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے اپنی ماں کے لیے لکھی تھیں۔زویا زیدی کی یہ تحریر ان کی والدہ کے لیے بہترین خراج عقیدت ہے۔خودنوشت پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ خانم لکھتی ہیں:

> ''یہ خودنوشت سماجی، تہذیبی، سیاسی و تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے اور ساتھ ہی اس میں بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ سے متعلق اہم معلومات بھی فراہم کی گئی ہے۔ساجدہ ماہر تعلیم بھی تھیں، انہوں نے تعلیمی نصاب کی کمیوں اور خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ اشتراکی نظریے کی حامی تھیں اس لیے ان کی تحریروں میں مظلوموں، غریبوں مزدوروں کی حمایت اور آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہو رہے سیاسی، ثقافتی، لسانی، اقتصادی استحصال کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ خودنوشت اردو ادب میں ایک اضافی حیثیت کے ساتھ خواتین کے لیے مشعل راہ بھی ہے۔''2

ساجدہ زیدی کو علمی و ادبی ذوق ورثے میں ملا تھا۔مذکورہ خودنوشت کی ابتدا انہوں نے بچپن کی حسین یادوں، والدین اور خاندان سے متعلق اہم واقعات کے تذکروں سے کیا ہے۔ والد کی وفات کے بعد میرٹھ میں نانا کے ایک مکان میں قیام پذیر ہوئیں جو ان کی والدہ کو میکے سے حصے میں ملا تھا۔اس کتاب میں انہوں نے اپنی زندگی کے تمام حالات و واقعات کو بے حد خوبصورت انداز میں یکجا کیا ہے۔جس میں تعلیم، ملازمت، تخلیقی کاوشوں کے ساتھ سماجی و سیاسی پہلو بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔اس میں انہوں نے نہ صرف اپنے نجی کوائف بیان کیے ہیں بلکہ اپنے والدین، بہنوں خصوصاً بڑی بہن صابرہ زیدی اور ہم عصروں کے تذکروں کے ساتھ مختلف ممالک کے سفر کا ذکر بھی کیا ہے۔

ساجدہ زیدی نے آزادی کے بعد ملک کی بدلتی حالت خصوصاً آزادی کے دن سے ہی ہندوستان میں ہونے والے فسادات اور خوں ریزی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔انہوں نے برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور ان کی پالیسیوں و ظلم و جبر کی داستان کو چیدہ چیدہ پیش کر کے مذکورہ خودنوشت کو تاریخی و سیاسی رنگ بھی دے دیا ہے۔ساجدہ زیدی جب علی

گڑھ کے گرلز کالج میں زیر تعلیم تھیں اور ان کا قیام یونی ورسٹی کے ہاسٹل میں تھا تب پوری دنیا دوسری جنگ عظیم میں گھر گئی تھی۔ایک طرف جنگ نے پوری دنیا میں تباہی مچائی تھی تو دوسری طرف برصغیر میں انگریزوں سے آزادی کی جد جہد، بغاوتوں وتحریکوں کا سلسلہ جاری تھا،غرض کہ چاروں طرف سیاسی ہنگامہ خیزی برپا تھی۔مصنفہ نے خودنوشت میں دوسری عالمی جنگ کی وجوہات ونتائج پر اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ نیز امریکہ کے ذریعہ جاپان کے دوشہروں ہیروشیما و ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے اور اس کی وجہ سے ہونے والی تباہیوں و ہلاکتوں کا ذکر بڑے ہی دل سوز انداز میں کیا ہے۔ برصغیر میں جنگ کے دوران اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''دوسری عالم گیر جنگ کے پانچ سال (جو میرے ہاسٹل کے قیام کا زمانہ تھا) دنیا پر بہت بھاری گزرے۔ ایشیائی کالونیوں کے نوجوان جنگ کی بھٹی میں جھونکے جاتے رہے۔ مہنگائی، غربت، بے روزگاری بڑھی، بنگال میں خوفناک قحط پڑا، اشیائے ضروری نایاب ہوئیں، زنا بالجبر عام ہوا، لاوارث دوغلی نسل کے بچے مدتوں گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔لٹھا کفن کے لیے بھی دستیاب نہ ہوا، ہندوستان اس وقت کے برصغیر ہند وپاک اور دوسرے ممالک میں زندگی بے دست و پا ہوگئی اور انسانی جانوں کا زیاں تو ہوتا ہی رہا۔''3

ایک طرف برصغیر کے ساتھ پوری دنیا خوفناک جنگوں اور سامراجی ریشہ دوانیوں سے زیر و زبر ہو رہی تھی تو دوسری سمت یہاں کی نوجوان نسل خاص کر طلبہ ان سب حالات سے بے خبر زندگی گزار رہے تھے۔علی گڑھ گرلز کالج کی طالبات بھی دنیا و مافیہا سے لاتعلق اپنی زندگی میں مگن تھیں۔ان ہی میں سے ساجدہ زیدی بھی تھیں۔انہوں سے اس ماحول کا مشاہدہ بذات خود کیا تھا اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد نتیجے پر پہنچ کر لکھتی ہیں کہ:

''یہ برٹش کولونائزز.....حکومت برطانیہ کی پالیسی بھی تھی کہ نوجوانوں میں سیاسی اور اقتصادی شعور پیدا ہونے نہ پائے لہٰذا تعلیمی اداروں کو سیاسی شعور سے دور رکھو۔'' 4

ساجدہ زیدی اس وقت 16 سال کی تھیں اور یونی ورسٹی کے قاعدے قانون، کم عمری اور خصوصاً لڑکی ہونے کے سبب جدوجہد آزادی سے متعلق کسی تحریک یا بغاوت میں حصہ تو نہ لے سکیں،لیکن ملک کے سیاسی حالات، انقلاب روس، بائیں بازو کے رجحانات، برصغیر میں انگریزوں کے خلاف کانگریس کی تحریکوں کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی کے بڑھتے رسوخ وغیرہ کا شعور آہستہ آہستہ ان کے ذہن پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ترقی پسند نظریات کے مطالعے نے سیاسی شعور سے آگاہی

کرائی۔ کچھ ایسے ہی افراتفری کے ماحول میں انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی، ساتھ ہی ادب سے گہرا لگاؤ ہونے کے سبب شاعری، مضامین، ڈرامے تحریر کرنے لگیں۔ بعد میں وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئی تھیں۔

تقسیم کے بعد ساجدہ زیدی اور ان کی بہنوں نے کافی مشکلات کا سامنا کیا۔ 15 اگست ملک کی آزادی کے دن وہ اپنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ ممبئی میں تھیں۔ آزادی کے جشن میں وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ شریک ہوئیں۔ جشن آزادی میں لوگ اس قدر سرشار تھے کہ آنے والی تباہیوں وسفاکیوں کا کسی کو اندازہ نہ تھا۔ ساجدہ زیدی لکھتی ہیں:

> ''پھر 15 اگست کی رات آئی، آپا مجی اور ماموں باچھو ٹھیک بارہ بجے شب، ہم سب کو ہمراہ لے کر سڑکوں پر نکل آئے، آزادی کا جشن منانے۔ تقریباً پورا بمبئی جشن آزادی منانے سڑکوں پر نکلا ہوا تھا۔ ہم لوگ بھی سب کے ساتھ آزادی کا گیت گا رہے تھے، رقصاں تھے، شاداں تھے۔ جوش وخروش کا عجیب عالم تھا۔ ایک وجد سا اہل ہند پر طاری تھا۔ آنے والے دنوں کی سفاکی سے بے خبر، مسلمانان ہند کی سائیکی کے ان زخموں سے بے خبر، جو ان کی تقدیر بننے والے تھے۔ تقسیم شدہ آزاد ہندوستان کی یہ پہلی رات تھی۔''5

ساجدہ زیدی نے تقسیم ہند کے بعد فسادات کی ہولناکیوں اور اس کے اثرات کا ذکر خودنوشت کے ابواب ''یہ داغ داغ اجالا، ہم کہ تاریک راہوں میں مارے گئے، جہد حیات کی ابتدا اور ایک دور کا اختتام'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ آزادی کے دن وہ مع اپنی بہنوں و والدہ کے ساتھ ممبئی میں تھیں۔ دوسرے دن جب چاروں طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں تو ان بہنوں نے اپنی والدہ کو ممبئی میں ہی چھوڑ کر دہلی روانہ ہوگئیں۔ ساجدہ زیدی کا گھر قرول باغ میں تھا۔ ان لوگوں کے دہلی پہنچے کچھ دن گزرے تھے کہ دہلی بھی پوری طرح فساد کی لپیٹ میں آگئی۔ اس کے گرد ونواح یوپی، پنجاب، بہار، بنگال غرض کہ پورا ملک انسانوں کے خون سے رنگ گیا۔ لاکھوں انسانی لاشوں سے بھری ٹرینیں سرحد کے دونوں جانب آجا رہی تھیں۔ اس تباہی سے انسانوں کے دل کانپ اٹھے۔ اس وقت دہلی میں 24 گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود بلوائی اندرونی گلیوں میں گھس کر مسلمانوں کا کشت وخون کر رہے تھے۔ ساجدہ زیدی اپنے شوہر اور بہنوں کے ساتھ گھر میں قید ہوگئی تھیں۔ گھروں سے باہر نکلنا محال تھا۔ وہ سب ڈرے سہمے بلکہ ہر کوئی یہی سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی آزادی ہے جس کی قیادت گاندھی جی نے کی تھی؟ جو کہ اہنسا کے پجاری تھے، عدم تشدد اور بھائی چارگی ان کا نعرہ تھا۔ لیکن اس وقت تو بس نفرت کی آگ میں جل رہے لوگوں سے

انسانیت ختم ہو چکی تھی۔ بلوائیوں اور فسادیوں نے جو تباہی مچائی اس سے انسانیت کراہ اٹھی۔ مصنفہ نے دہلی کے فساد اور خوں ریزی خصوصاً قرول باغ کی تباہی کا ذکر خودنوشت میں کیا ہے جس کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''فلیٹ کے بالکونی نما برآمدے میں چکوں کے پیچھے کھڑے ہو کر باہر جھانکتے، سڑکیں چوبیس گھنٹے کے کرفیو کے باعث ویران رہتیں اور اکثر اس ویرانی کو توڑتا ہوا کوئی سانحہ، کسی غریب کا قتل، کسی مجروح کی چیخ، کوئی چاقو، کرپان کا وار، ہمارے دلوں کو تڑپاتا ہوا گزر جاتا۔ دو ایک دن بعد قرول باغ کے اندرونی محلے کے مکانوں سے شعلے اور سیاہ دھواں بلند ہونے لگا۔ یہ مسلمانوں کی آبادی کا علاقہ تھا۔ مکان مع مکینوں کے نذر آتش کیے جا رہے تھے۔ کبھی کوئی جلاد نما آدمی کسی مظلوم مقتول کی لاش کو کھینچتا ہوا اندرونی گلیوں سے لاتا اور سڑک کے کنارے نالے میں پھینک دیتا۔ ہم لرز اٹھتے (وہ نالہ چاردنوں کے اندر لاشوں سے پٹ گیا تھا)۔''6

سرحد کے دونوں اطراف قتل وخون کا سلسلہ جاری تھا، جس سے گھبرا کر اکثر و بیشتر ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ کافی بڑی تعداد میں لوگوں نے ہجرت کی۔ اس وقت انسانوں کی خوفناک ترین جبلت، ہلاکت، نفرت، تعصب، بربریت بے نقاب ہو رہی تھی، تہذیب کا پردہ چاک ہو رہا تھا، سیاست کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔ بیشتر خودنوشت نگاروں نے اپنی خودنوشت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ فساد اور مسلمانوں کا قتل عام سرکار کی ایما پر پورے منصوبے کے ساتھ کرایا گیا تھا۔ مثلاً گردراہ، ناقابل فراموش، شہاب نامہ، جو رہی سو بے خبری رہی، خواب باقی ہے، افسانہ در افسانہ، لاہور کا جو ذکر کیا، پردہ کھلتا ہے وغیرہ خودنوشتوں میں ایسے شواہد ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لوٹ مار قتل وغارت گری پولیس کی نگرانی میں منصوبہ بند طریقے سے ہوئی تھی۔ تاریخی کتابوں میں بھی اس تعلق سے ثبوت مل جاتے ہیں۔ بہرحال ساجدہ زیدی بھی اپنی خودنوشت ''نوائے زندگی'' میں اس تعلق سے رقم طراز ہیں:

''سخت حیرانی تھی کہ اتنا قتل وخون ہو رہا ہے اور ملک کو تقسیم کر کے اقتدار سنبھالنے والے، اہل سیاست کچھ بھی نہیں کر سکتے، کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت تو نہیں بہت عرصہ بعد مولانا آزاد کا مخفی حصہ شائع ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ سردار پٹیل نے باقاعدہ فوج و

پولیس کو آرڈر دیا تھا کہ (مسلمانوں کو) مارنے دو، فسادات میں دخل نہ دو۔ چناں چہ فوج و
پولیس آس پاس کھڑے تماشا دیکھتے رہتے تھے۔''7

فساد زدہ علاقوں میں کوئی بھی مسلمان محفوظ نہیں تھا۔ زمین، جائیداد کی کسی کو فکر نہ تھی۔ اس وقت محض اپنی جان و عزت و آبرو بچالینا ہی خوش نصیبی تھی۔ ساجدہ زیدی کے محلے قرول باغ میں جب بلوائیوں نے تباہی مچانی شروع کی تو ان کے شوہر، ان کو اور بہنوں کو ہندو کے بھیس میں بدل کر خود پنجابی زبان کا استعمال کرتے ہوئے ساجدہ زیدی کے ماموں کے گھر پہنچے۔ ان سب کو یقین تھا کہ چند روز بعد جب خطرہ ٹل جائے گا تو واپس اپنے گھروں کو آجائیں گے۔ چناں چہ وہ اپنے ساتھ محض دو جوڑی کپڑوں کے سوا کچھ نہیں لے گئے۔ لیکن بلوائیوں نے ان کے جاتے ہی گھر کو لوٹ کر نظر آتش کر دیا تھا اس طرح وہ لوگ اپنے گھر کبھی واپس نہ آسکے۔

ماموں کے گھر پہنچنے کے دو تین دن کے بعد وہاں بھی حالات خراب ہو گئے اور یہ لوگ اُس گھر میں بھی محفوظ نہیں رہے۔ چناں چہ اس بار بھی گھر کی عورتوں نے سفید ساڑی اور ماتھے پر لال بندی لگا کر اور مردوں نے بھیس بدل کر سکھ کے روپ میں گھر سے نکلے۔ ساجدہ زیدی لکھتی ہیں کہ اس وقت ہمارے پاس اپنی عزت کی حفاظت کے لیے سرخ بندیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان کے ماموں اپنے پڑوس کے ایک ہندو دوست کے گھر سب کو لے کر پہنچے۔ ابھی یہ لوگ وہاں پہنچے ہی تھے کہ ان کے گھر کو بلوائیوں نے لوٹنا شروع کیا اور پھر نظر آتش کر دیا۔ ہندو پڑوسی نے اپنے گھر ان لوگوں کو پناہ دی لیکن شام ہوتے ہوتے محلے کے غیر مسلموں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ جب آس پاس کے لوگوں کا شک بڑھ گیا کہ ان کے گھر مسلم خاندان پناہ گزیں ہیں تو میزبانوں کو آئے مہمانوں کی جان کے ساتھ اپنی جان کی بھی فکر لاحق ہوئی۔ چناں چہ ان لوگوں نے ساجدہ زیدی اور ان کے ساتھ افراد کو رات کے پہر کہیں دوسری جگہ چلے جانے کی گزارش کی۔ وہ لوگ کہاں جاتے، پوری دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا رہی تھی۔ مسلمانوں کو چن چن کر مارا جا رہا تھا، گھر باہر ان کی عورتوں کی عزت کو لوٹا جا رہا تھا۔

آخر کار انہوں نے مولانا آزاد سے مدد مانگی جن کی کوٹھی میں بے شمار مسلمان پناہ گزیں تھے۔ مولانا آزاد نے مسلح جیپ بھیج کر ان کو اپنے یہاں بلا لیا جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو انہیں اس کوٹھی کا ڈرائینگ روم دیا گیا۔ باقی کمروں میں بھی پناہ گزینوں کے کئی خاندان تھے۔ مولانا کے گھر ساجدہ زیدی، ان کے شوہر، ماموں اور بہنیں 15 دن رہے۔ مصنفہ نے خودنوشت میں اس دوران کی پریشانیوں کا ذکر جس انداز سے کیا اس کے مطالعے کے بعد دل میں ایک درد و کسک کی لہر اٹھتی ہے کہ آزاد ہندوستان کا جو حسین سپنا سب نے ایک ساتھ دیکھا تھا کیا اسے اس قدر تباہ کن ہونا تھا؟ آزادی کی

خوشی کس قدر سفاکیوں و تباہیوں کی نظر ہوگئی اور نہ جانے کتنے لوگ اپنا سب کچھ گنوا کر پریشانیوں اور مصیبتوں کا شکار ہوئے۔ بہر کیف ساجدہ زیدی پناہ گزینوں کی طرح رہتے ہوئے لوگوں کے دکھ اور مولانا آزاد کے ذریعے اتنے بڑے مجمع کے رہنے اور کھانے پینے کا منظّم انتظام کرنے کے ساتھ وہاں موجود لوگوں کے درد و کرب کو دیکھ کر مولانا آزاد کی پریشانی و بے چینی کا ذکر بڑے پر درد لہجے میں کیا ہے۔ وہاں پہلے پہل کھانے میں سبزی، گوشت، دال، چاول، روٹی سب ملتا تھا لیکن بعد میں راشن جب ختم ہونے لگا تو صرف دال چاول اتنی مقدار میں ملتا تھا کہ روح و جسم کا رشتہ برقرار رہے۔ شہر میں کرفیو اور خوں ریزی کے باعث سامان مہیا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہاں کے شب و روز کے متعلق ساجدہ زیدی تفصیل سے لکھتی ہیں۔ درج ذیل اقتباس سے اس وقت کے حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ''ہمارے چہروں پر شاید بھوک لکھی تھی کہ ایک دفعہ ہم نے ساڑیوں میں کلف لگانے کے لیے بیرے سے چاول کی پیچ لانے کا کہا تو اس نے ٹرے میں خوبصورت جگ و گلاسوں کے سیٹ اور نمک دانوں کے ساتھ ایسی نفاست سے پیچ پیش کی کہ ہم بھوکے لوگ اب چاول کی پیچ بھی پی کر گزارہ کریں گے۔ یاد پڑتا ہے کہ دوبارہ وہ اسی طرح لایا تو ہم نے تھوڑی تھوڑی پی بھی تھی، بھوک دن رات لگی رہتی تھی۔ مولانا کے دولت خانے پر ہم پندرہ سولہ دن رہے۔ دو بہنیں نہاتیں اور دو کپڑے دھو کر سکھاتیں۔ باری باری یہی عمل دہرایا جاتا اور یہی چھوٹے ماموں جان اور قیصر کے درمیان ہوتا۔ بارشیں موسلا دھار ہو رہی تھیں۔ شاید قدرت کو سرزمین ہندو پاک سے خون ناحق کے دھبے دھونا منظور تھا۔ (لیکن یہ خون تو اس سرزمین سے کبھی نہ دھل سکا، آج بھی بہایا جا رہا ہے) رات کو خنکی ہو جاتی تو ہم ڈرائنگ روم کے بڑے بڑے دریچوں سے قیمتی ریشم کے پردے اتار کر اوڑھ لیتے اور صبح کو انہیں ٹانگ دیتے تھے۔ قیمتی برتنوں میں مہذب بیروں کا سرو کیا ہوا، ابلا ہوا دال چاول کھاتے، ایک ہی ساڑی میں گزارہ کرتے، اپنی قسمت پر رشک کرتے اور مولانا کی عنایتوں کے ممنون ہوتے جنہوں نے اس عالم آشاب میں ہمیں پناہ دی اور حتی المقدور ہر آسائش مہیا کی تھی اور خدائے پاک و برتر کا شکر ادا کرتے جس نے ہماری جانوں اور عزت و آبرو کی حفاظت کے وسائل مہیا کیے تھے۔''8

اقتباس طویل ضرور ہو گیا ہے لیکن اس سے مولانا کے گھر پناہ گزینوں کی مشکلات اور ان کے لیے مولانا کے

انتظامات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ دن بھر میں ایک بار ضرور پناہ گزینوں کے درمیان آتے، ان کو حوصلہ دیتے اور اپنی طرف سے حتی الامکان مدد کا وعدہ بھی کرتے۔ لیکن لوگوں کی حالت دیکھ کر وہ اندر سے بے حد مغموم تھے۔ کیوں کہ تقسیم ہند و تبادلۂ آبادی ان کی مرضی کے خلاف تھی۔ انہوں نے پہلے ہی کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں اور مہاتما گاندھی کو تقسیم ہند سے ہونے والی تباہی سے آگاہ کیا تھا۔ گاندھی جی نے ان سے کہا تھا کہ تقسیم ان کی لاش پر ہوگی لیکن بعد میں پنڈت نہرو، سردار پٹیل کے ساتھ گاندھی جی بھی تقسیم کے لیے رضامند ہو گئے۔ انہوں نے اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں بڑی تفصیل کے ساتھ تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیا ہے۔ بقول مولانا آزاد ''سردار پٹیل ہی تقسیم ہند کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔'' تقسیم کے بعد مسلمانوں کے قتل عام پر ساجدہ زیدی نے ان کی ہی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''بہت عرصے بعد مولانا کی خودنوشت کا وہ حصہ زیر مطالعہ آیا جس کو مولانا کی ہدایت کے مطابق آزادی کے تیس سال بعد شائع کیا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس حصے میں یہ واقعہ کم و بیش اس طرح بیان کیا ہے کہ 'سردار پٹیل کے زیر ہدایت مسلمان کیڑے مکوڑوں کی طرح مارے جاتے رہے اور فوج و پولیس نے انہیں بچانے کی قطعاً کارروائی نہیں کی۔ اور یہ بھی کہ، خود میرے گھر (مولانا کے) دہلی کے شرفا کے اعلیٰ خاندانوں کے متعدد افراد لٹ کر آئے اور پناہ گزیں ہوئے۔ جن کے پاس ان کپڑوں کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے، کچھ نہ تھا۔''9

آزادی کے بعد سرحد کے دونوں جانب تباہی جاری تھی، لوگ بے گھر، عورتیں بیوہ اور جوان لڑکیاں بے حرمت ہو رہی تھیں۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ ہجرت کر رہا تھا اور ایک نئی مخلوق دونوں اطراف جنم لے رہی تھی۔ ان کے لیے پناہ گزیں، رفیوجی، شرنارتھی، مہاجر جیسے نام سامنے آئے۔ ان لوگوں کا زیر آسمان کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ساجدہ زیدی اور ان کی بہنوں کو مولانا آزاد کے یہاں رہتے ہوئے معلوم نہیں تھا کہ ان کا اپنا گھر جو پانی پت میں ہے، لٹ چکا تھا اور خاندان کے تمام افراد پاکستان چلے گئے ہیں۔ ان کا وہ گھر جو ان کی والدہ کو اپنے میکے سے ملا تھا اور جسے انہوں نے بڑی چاؤ سے سجایا سنوارا تھا اس گھر پر شرنارتھیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''دہلی میں، پانی پت میں، رامپور میں، قرول باغ میں میرا چھوٹا سا فلیٹ، ماموں جان کا گھر، اماں کا پانی پت کا گھر، میرے سسر سید نظیر حسین زیدی کا گھر سب لٹ چکے تھے۔ غیروں کے قبضے میں تھے۔ اب کوئی ہمارا گھر نہیں تھا۔ آزاد جمہوریت ہند میں ہمارے

سروں پر سے سایہ اٹھ چکا تھا۔ مولانا کے رہائش گاہ کے دوران قیام ہم اس علم وخبر سے قطعاً محروم تھے کہ اس بار ہم مکمل طور پر لٹے ہیں، اب ہمارا آزاد مملکت ہند میں کہیں کوئی گھر نہ تھا، کہیں کوئی چارہ جوئی نہ تھی۔ سر چھپانے وتن ڈھانکنے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ کہیں انصاف نہ تھا اور ہم نوجوان لڑکیاں تھے۔ نوعمر لڑکیاں اور دو مسکین مرد!۔۔۔۔''10

تقسیم ہند کی خوں ریزیوں اور تباہیوں پر بے شمار ادیبوں نے اپنی تخلیقات پیش کر کے ڈھیر لگا دیے لیکن کوئی بھی اس تباہی کے بعد لگنے والے صدمے کی گہرائی کو نہ ناپ سکا۔ ساجدہ زیدی نے بھی کئی نظمیں اس موضوع پر تخلیق کیں، خودنوشت میں بھی ان کا یہ درد جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ وہ خودنوشت میں متعدد جگہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ آزادی کے بعد بھی آج تک یہاں مسلمان محفوظ نہیں ہیں۔ شک وشبہ کی بنیاد پر آج بھی ان کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ آزادی کے دن سے ہونے والے فسادات اور موجودہ دور تک مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے خود سے سوال کرتی ہیں کہ کیا اسی کا نام آزادی ہے؟ کیا یہی جمہوریت ہے؟ کیا مسلمانان ہند نے ایسی ہی آزادی کے لیے اپنی جان و مال کی قربانیاں دی ہیں؟ آخر مسلمان ہلاک کیوں کیے جا رہے ہیں؟ لیکن ہم سب کی طرح ان کو بھی اپنے ان سوالوں کا جواب نہیں مل سکا۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی نفسیات جس طرح مجروح ہوئی ہے اس صدمے سے آج تک وہ جاں بر نہ ہو سکے کیوں کہ حکومت ہند کی طرف سے ان کی حفاظت کے لیے کوئی صورت ہی پیدا نہیں کی گئی۔

ہندوستان کے باقی خطوں کو چھوڑیے محض کشمیری مسلمان کے حالات ہم سب کے سامنے ہیں۔ حالاں کہ یہ بر بریت ملک کے بقیہ حصے میں بھی آئے دن دیکھی جاتی ہے۔ لیکن اس کا حل ڈھونڈنے کے بجائے مسلمانوں کو ہی غدار کہہ کر تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور اس تشدد کو باقاعدہ فروغ بھی دیا جا رہا ہے۔ ساجدہ زیدی نے خودنوشت کے بیشتر حصے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آزادی کے بعد آج بھی فسادات کے نام پر مسلمانوں کا قتل عام ہنوز جاری ہے۔ ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی بڑے دھڑلّے سے کی جا رہی ہے۔ مسلمانان ہند آج بھی بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ساجدہ زیدی کشمیر کے حالات اور مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اور آپ سے کیا کہوں 1947 میں ہندوستان آزاد ہو گیا، مسلمان برباد ہو گئے اور یہ کشمیری آج بھی آزادی آزادی چلا رہے ہیں۔ آزادی، انصاف اور قومی تشخص کا اعتراف اور خودارادیت آج بھی ان سے کوسوں دور ہیں۔ اب یہ وادی فوجی ٹرکوں، فوجی

بوٹوں اور گولیوں کی آوازوں سے گونجتی ہے۔ چڑیوں کے نغمے اور چشموں کی موسیقی بارود کی وحشت ناک گھن گرج میں کھو گئی ہے۔ کشیدہ کار اور دست کار آج بھی ان ہی نیم تاریک گپھاؤں میں اتنی ہی عسرت زدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ دولت و ترقی کی چمک دمک سے بہت دور۔۔۔''11

ساجدہ زیدی نے تقسیم ہند کے بعد ملک اور مسلمانان ہند کی ابتر حالت کا ذکر باب ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے حصہ اول و دوم، مسلمانان ہند اپنی جمہوری حکومت میں'' میں کیا ہے، اس کے علاوہ پوری دنیا میں مسلمانوں پر ہو رہے ظلم و ستم کو بھی ''اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے'' میں بیان کرتی ہیں۔ مولانا آزاد کے گھر سے نکلنے کے بعد آنے والی پریشانیوں اور خاندان کے لوگوں خصوصاً مولانا حالؔی کے پورے خاندان کا جبراً ہجرت کر جانا، یہ تفصیلات باب ''جہد حیات کی ابتدا'' میں ملتی ہے۔ آزادی کے بعد لوگ خصوصاً مسلم قوم عجیب ذہنی پریشانی سے گزری اور آج تک وہ اس ٹروما (Trauma) سے نہیں نکل سکی۔ کیوں کہ اس سے نکلنے کی کوئی سبیل ہی پیدا نہیں کی گئی۔ وہ اقتصادی طور پر لوٹے گئے، نفسیاتی و تہذیبی سطح پر بھی شدید صدمات سے دو چار ہوئے۔ اہل ثروت اور معمولی کھاتے پیتے گھرانوں کی زمینیں و جاگیریں، زمینداری کے خاتمے کی نذر ہو گئیں، جو ان کی فراغت و آمدنی کا واحد ذریعہ تھیں۔ زمینوں کے ساتھ ایسے لوگوں کی عزت و وقار بھی چلا گیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زمینداری کے خاتمے کا فیصلہ اور نفاذ ہی مسلمان شرفا صاحب حیثیت اور اہل جائیداد کی اقتصادی حیثیت و عزت اور وقار کو مٹی میں ملانے کے لیے ہوا تھا۔ مسلمانوں کی معاشی حالت و زمینداری کے خاتمے کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے ساجدہ زیدی اپنی خودنوشت میں رقم طراز ہیں:

''جب وہ (زمیندار) طبقہ بے گھر، بے زمین، بے روزگار یعنی بے نیل و مرام ہو گیا تو وہ اقدار اور ثقافت بھی گئی جس پر ان کے شب و روز کا دارومدار تھا۔ ان کی اکثریت سر اٹھانے کے قابل نہ رہی۔ یہ حال صرف بڑے زمینداروں کا ہی نہیں بلکہ ہماری طرح کے متوسط طبقے کے مزارعوں اور عام مڈل کلاس کا بھی ہوا۔ جب جان و مال و عزت و آبرو دونوں ہاتھوں سے لوٹی جا رہی تھی تو گھر، زمینیں اور اسباب کیسے محفوظ رہتا۔ سب کچھ لوٹا جاتا رہا۔ علاوہ ازیں نادار مسلمانوں، کروڑوں عوام کے پاس صرف ان کا ہنر تھا، دست کاری تھی۔ کوزہ گری سے لے کر بنارسی ساڑیوں کی ریزہ کاری تک، وہ سب ہنر اور ان کا آرٹ رفتہ رفتہ پلاسٹک کلچر کے ریلے میں بہہ گیا۔ ان کے ہتھ کرگھے ویران ہو گئے۔''12

تقسیم ہند کے بعد ملک تو آزاد ہوا لیکن چمنِ روزگار میں ایسی ہوا چلی کہ دھیرے دھیرے تمام اعلیٰ روایتی اقدار منتشر ہو گئیں۔ خاندان تقسیم ہوئے، محبتیں تقسیم ہوئیں، رشتوں کی پائیداری اور صدیوں سے چلی آ رہی تہذیب وتمدن کا شیرازہ بکھر گیا۔ مسلمانوں میں صاحب حیثیت، شرفا اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک بڑا حصہ حالات کا اندازہ لگا کر، اپنی مرضی سے، اپنا مستقبل سنوارنے اور محفوظ رہنے کی غرض سے ملک خداداد پاکستان ہجرت کر گیا۔ لیکن مسلمانوں کے ہی ایک بڑے طبقے کو زور وزبردستی، لوٹ مار کے بعد دربدر کی خاک چھاننے کے لیے ہندوستان سے نکال دیا گیا۔ یہ غربا و مظلومین اور بے بسوں کا طبقہ تھا جو ہجرت کے لیے تیار نہیں تھا لیکن حالات کی ستم ظریفی نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ان لوگوں نے ہی بلوائیوں کے حملے سہے، راستے کی سعوبتیں بھی سہیں، لوٹے گئے، ان کی خواتین کی عزت کو پامال کیا گیا، ان کے بچے یتیم ویسیر ہو کر دربدر کی خاک چھاننے لگے۔ ان بے نیل ومرام قافلوں پر سرحد پار پہنچتے پہنچتے نہ جانے کیا کیا بیتی، کتنے پہنچے اور کتنے راستے میں ہی دفن ہو گئے۔ اس کا صحیح اندازہ آج تک نہیں لگایا جا سکا۔ بہر کیف ایک لرزہ خیز زلزلہ تھا جس نے لوگوں کو شدید ذہنی جھٹکے دیے، اس سے لگنے والے زخموں سے آج تک خون رِس رہا ہے۔ خود ساجدہ زیدی کا پورا ننہال ودوسرے عزیز واقارب جو پانی پت یا دوسرے مقامات پر قیام پذیر تھے، سب کے سب پاکستان کی سرحد پر جبراً ہنکا دیے گئے۔ جو مسلمان یہاں رہ گئے وہ آج تک خوار ہو رہے ہیں۔ مصنفہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''ہندوستان میں جو کروڑوں غریب اور نچلے متوسط طبقے کے مسلمان اس ہجرت اور خوں ریزی سے بچ رہے، وہ سدا سدا کے لیے خوار ہوئے، ہر محاظ پر ہزیمت سے دوچار ہوئے اور تقسیم کے آج انسٹھ سال بعد بھی فرقہ وارانہ فسادات کی خوں ریزیوں کا شکار ہیں۔ خوار ہیں، انصاف، مساوات اور چارہ جوئی کے طلبگار ہیں لیکن امیدوار نہیں۔''13

ساجدہ زیدی نے اپنی خودنوشت ''نوائے زندگی'' میں ہندوستان میں اردو زبان کے ساتھ بے رخی ودوہرے رویے پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ جس قوم کی تہذیب، زبان اور اس کی پہچان باقی نہ رہے تو وہ قوم پسماندہ اور بانجھ ہو جاتی ہے۔ 1953 میں جب صوبوں کی لسانی تقسیم ہوئی تو اردو جو شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے جہاں کی پیداوار تھی، وہاں سے بہ یک وقت جنبش قلم نکال کر پورا علاقہ یعنی یوپی، بہار، پنجاب وغیرہ کو ہندی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ حالاں کہ یہ وہی خطے ہیں جہاں اردو زبان پہلی ذریعہ تعلیم تھی اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اسے کھلے دل سے اپنایا۔ لیکن جب اسی زبان کو مسلمان کے ساتھ جوڑ کرنا انصافی کی گئی تو مسلمانوں کو صدمہ پہنچا۔ وہ آج بھی اپنی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی مانگ کر رہے ہیں۔ جب کہ اردو کی جگہ سنسکرت کو لازمی

قرار دیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سنسکرت زبان کی لازمی تعلیم ہونے کے باوجود بھی آج تک کوئی قابل قدر شاعر یا ادیب پیدا نہیں ہوا، نہ صحافت کے لیے اور نہ ہی یہ بول چال کی زبان بن سکی۔ افسوس مذہبی تعصب کی بنا پر اردو کے ساتھ دوہرا رویہ اختیار کیا گیا جو کہ بول چال کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شیریں زبان بھی ہے اور اس میں وافر تعداد میں ادبی ذخیرہ بھی موجود ہے۔ لسانی مسئلوں اور وہ تمام صورت حال و رویے جو اردو کے ساتھ برتے گئے ان پر مصنفہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کو اقلیت کا نام دے کر پسماندہ قوم قرار دیا گیا۔ جب حکومت اور اقتدار میں بیٹھے نام نہاد لوگ کسی قوم کو ہر موقعے و موڑ پر اسی خطاب سے یاد کرتے ہیں تو وہ قوم واقعی پسماندہ ہو ہی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی صورت حال بھی قائم کی جاتی ہے کہ اس قوم کو سر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ حالاں کہ یہ وہی مسلمان ہیں جو آزادی سے پہلے صدیوں تک ملک میں گنگا جمنی تہذیب قائم کی اور اسے سنوارنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، ملک کو معاشی اعتبار سے دنیا کے سامنے سونے کی چڑیا بنا کر پیش کیا لیکن ان ہی کروڑوں مسلمانوں کو ان کے ہی ملک میں اقلیت کا نام دے کر پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ ان تمام حالات و واقعات پر ساجدہ زیدی کا قلم بڑی بے باکی سے چلا ہے اور اس کے بیان میں لہجے کی کاٹ کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خودنوشت کا بیشتر حصہ ایسے ہی مواد پر مشتمل ہیں۔ بہر کیف ان بنیادی باتوں کے علاوہ جس طرح مختلف سازشوں و پالیسیوں کے سبب مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''خوں ریزی، مساوات کے نام پر قتل و خون، نسل کشی، آتش زنی، لوٹ، ریپ، اغوا، سب کچھ، بھونڈی ملیانہ، گجرات، میرٹھ، گاہے گاہے پھوٹ پڑنے والا نفرت و تعصب کا زہر، سیاسی شعبدہ بازیوں کے ذریعہ مسلمانوں کی تذلیل، انہیں پس ماندہ رکھنے کی مسلسل سیاسی سازش اس بنیاد کے شاخسانے ہیں۔ نہتوں پر وار کرنا آسان ہے، جن کی تہذیب و زبان لوٹ لی جائے، ان کی تذلیل بھی آسان ہے اور حق تلفی بھی۔ چناں چہ وقت گزرنے پر سیاسی بے حسی، بے غیرتی اور شعبدہ گری نے ہندوتوا اور آر ایس ایس ذہنیت والی فاشسٹک سیاست کو فروغ دیا اور رفتہ رفتہ جمہوری اور سیکولر حکومتوں نے مسلمانان ہند کو تعلیم، روزگار، ملازمتیں، اقتصادیات، ہر محاذ پر حاشیہ ڈال دیا جس حالتِ زار پر روز افزوں اضافہ ہوا۔''14

تقسیم ہند کے بعد بڑی برق رفتاری کے ساتھ بدلاؤ آیا خصوصاً بڑے شہروں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہاں کی تہذیب وتمدن بھی بدل گئی۔ ان امور پر بھی مصنفہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ملک میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں مسلم قوم کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا ہے اس پر وہ خوب لکھتی ہیں۔ خودنوشت کے اواخر کے باب ایسے ہی مواد کے لیے مختص ہیں جن کے عنوان سے ہی مصنفہ نے اپنے قاری کو پورے متن سے آگاہی کرادی ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد ہونے والے یک طرفہ فساد کا ذکر بھی ملتا ہے خصوصی طور پر بابری مسجد کا انہدام، گجرات فساد وغیرہ۔ یک طرفہ فساد کے نام پر جس طرح مسلم کشی ہو رہی ہے اور ان کے خلاف سیاسی سطح پر جس طرح سے سازشیں کی جا رہی ہیں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ساجدہ زیدی لکھتی ہیں:

> ''ایک طرف فسادات کے نام پر ہندوستان کے شہروں میں مسلم کشی ہوتی رہی اور دوسری طرف حکومت کے ایوانوں میں گہری سازشیں رچی جاتی رہیں کہ جو یہ پندرہ کروڑ مسلمان یہاں رہ گئے ہیں ان کا سرکس طرح کچلا جائے۔ منافقین سیاست نے مسلمانوں کے خلاف کئی طرح کی منصوبہ بند سازشیں چلائیں، نہایت چالاکی اور نفاست کے ساتھ۔ مثلاً زمینداری ابولیشن، لسانی صوبے، سہ لسانی فارمولا، صنعتی ترقی ان میں سے ہر محاذ کی تہ، خصوصاً اس کے نفاذ میں مسلم تہذیب وثقافت کا زوال مضمر تھا۔۔۔''15

ان سب کے علاوہ، ہندوستان کے جن ریاستوں کا جبراً الحاق عمل میں لایا گیا تھا اور نتیجے میں جو تباہی وہاں ہوئی تھی اس تعلق سے بھی ساجدہ زیدی لکھتی ہیں۔ جو مسلمان آزادی سے پہلے اپنے ہنر پر گزارہ کرتا تھا صنعتی ترقی کے سبب وہ بے روزگار ہو گیا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے حکومت ہند کی طرف سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ مسلمانوں کے اقتصادی طور پر پیچھے ہونے اور احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بنی کہ ان کی زمینوں کے ساتھ کاریگری بھی چوپٹ ہو گئی۔ اس تعلق سے ساجدہ زیدی نے خودنوشت میں بڑی بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف خودنوشت میں بلکہ اپنی دیگر تخلیقات میں بھی اس موضوع پر بحث کی ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کو جس طرح سے شک وشبہ کی بنیاد پر نشانہ بنایا جا رہا ہے اس سے بھی وہ ترقی کے بجائے تنزلی کا شکار ہیں۔ یک طرفہ فساد کے نام پر ان کے قتل عام اور فرقہ وارانہ منافرت پر مصنفہ کا یہ طویل اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''1947 میں تقسیم ہند کے اولین خوں ریز فسادات کے بعد 'آزاد مملکت ہند' کے طول وعرض میں روز اول ہی سے فسادات کے نام پر قتل وغارت گیری اور لوٹ مار کا ایک

لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مذہبی تعصب بڑھتا رہا، فرقہ وارانہ منافرت رفتہ رفتہ بے لگام ہوتی رہی۔ ہر فساد میں مسلمانوں کا روزگار متاثر اور کارخانے مجروح ہوتے رہے۔ اس طرح سے مسلمانوں کی معاشی کمر ٹوٹتی رہی۔ پھر یہ سلسلہ حادثاتی نہیں بلکہ منصوبہ بند طریقے سے ہونے لگا۔ مثلاً پیتل تانبے کے خوبصورت ظروف کے مرادآبادی کاروبار نے جب بے مثال ترقی کی، بیرون ملک ان مرادآبادی ظروف کی مانگ بڑھی تو مرادآباد میں زبردست فساد پھوٹ پڑے۔ عیدگاہوں میں نمازیوں پر جان لیوا حملے ہوئے۔ بے شمار جانیں بھی گئیں، نوجوان، بچے، بوڑھے، خواتین پر اور کارخانوں پر بے دریغ حملے بھی ہوئے اور کاروبار بھی مٹی میں مل گیا۔ یہی حال کشمیر میں ہوا، یہی لکھنؤ میں، یہی میرٹھ میں، یہی گجرات میں۔ جہاں جہاں مسلمان محنت و جانفشانی کی بنا پر معاشی اعتبار سے سر اٹھاتے رہے، وہاں وہاں فسادات کے نام پر مسلمانوں کے مکانات، دکانیں، کارخانے یہاں تک کہ بنکروں کے کرگھے تک نذر آتش ہوتے رہے۔'' 16

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح مسلمانوں کو معاشی، اقتصادی و سماجی اعتبار سے پیچھے کرنے میں منصوبہ بند طریقے سے چالیں چلی گئیں۔ لیکن آج تک کوئی فسادی یا حملہ آور گرفتار نہ ہوا بلکہ اگر گرفتاری عمل میں آئی بھی تو مسلمانوں کو ہی جیل میں ٹھونسا گیا۔ ساجدہ زیدی آزادی سے قبل و بعد مسلمانوں کے تئیں ہونے والی نا انصافی پر تفصیل سے لکھتی ہیں اور سیاست دانوں کے خلاف بلا خوف و جھجک اپنی رائے بھی دیتی ہیں۔ بیسویں صدی کے اواخر سے لے کر اکیسویں صدی کی ابتداء تک، جب تک زندہ رہیں، قوم کے ساتھ ناانصافی جب جب ہوئی، مذہبی تعصب جب بھی بڑھا اور خون کی ہولی کھیلی گئی تب تب ساجدہ زیدی کا قلم اس ظلم و بربریت کے خلاف چلتا رہا۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے سیاسی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں مہاجر کے حالات اور درد و کرب کو بھی پیش کیا ہے جو اپنی زمین اور وطن کو نہیں بھلا سکے۔ خصوصی طور پر وہ لوگ جن کے خاندان تقسیم ہو گئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان بڑھتے خلیج کی بہ نسبت ان کا ملنا بھی دشوار ہے۔ مختصر یہ کہ ساجدہ زیدی کی خودنوشت ''نوائے زندگی'' ایک پورے عہد کا مرقع ہے۔ اس میں مصنفہ کے نجی، علمی و ادبی حالات، خاندان کے افراد کے ذکر کے ساتھ ہم عصروں کا بیان ہی نہیں ملتا بلکہ سیاسی، سماجی و معاشی اعتبار سے یہ ایک بھرپور کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد یقیناً معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حوالہ جات

1۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی (مرتب ڈاکٹر زویا زیدی)، اردو اکادمی، دہلی، 2012، ص: 605
2۔ ڈاکٹر فوزیہ خانم، آپ بیتیاں ٹیڑھی پسلیوں کی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2017، ص: 157
3۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی (مرتب ڈاکٹر زویا زیدی)، اردو اکادمی، دہلی، 2012، ص: 107
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً: ص: 127
6۔ ایضاً: ص: 129
7۔ ایضاً: ص: 130
8۔ ایضاً: ص: 135
9۔ ایضاً: ص: 133,34
10۔ ایضاً: ص: 136
11۔ ایضاً: ص: 98
12۔ ایضاً: ص: 139
13۔ ایضاً
14۔ ایضاً: ص: 141
15۔ ایضاً: ص: 547
16۔ ایضاً: ص: 559

رتن سنگھ: بیتے ہوئے دن

سنہ اشاعت: 2013

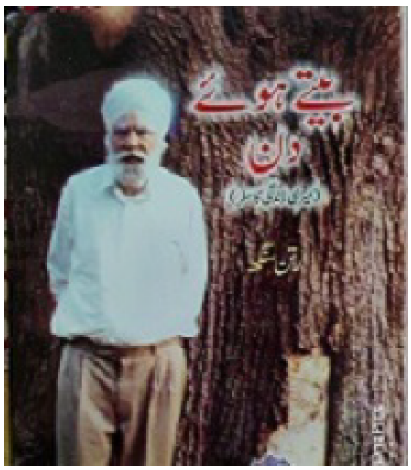

بیتے ہوئے دن (رتن سنگھ)

تقسیم کے تجربے کے تحت کہانیاں لکھنے والے مشہور و معروف فکشن نگار رتن سنگھ ادبی دنیا میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اردو، ہندی اور پنجابی میں ان کی بے شمار تخلیقات منظر عام پر آ چکی ہیں، جن میں افسانے، ناولٹ، نظمیں اور تراجم کتابیں بھی شامل ہیں جو پنجابی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''بیتے ہوئے دن'' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ تقریباً 250 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 2005 میں منظر عام پر آئی لیکن راقمہ کے پاس جو ایڈیشن ہے وہ اردو اکادمی دہلی سے 2013 میں شائع ہوا۔ مختلف عنوان قائم کر کے رتن سنگھ نے اپنی روداد زندگی کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ وہ 15 نومبر 1927 کو مغربی پنجاب کے گاؤں داؤد، تحصیل نارووال (سیالکوٹ پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں سے حاصل کی، لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے کیا۔ ابتدا میں 1946 میں بحیثیت کلرک ریلوے میں ملازمت شروع کی جو ہجرت کے بعد یعنی 1962 تک جاری رہی۔ پھر آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور کئی ریڈیو اسٹیشنوں کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ ان کا انتقال 2 مئی 2021 کو نوئیڈا میں ہوا۔

رتن سنگھ اردو کے ان فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ہجرت کے درد و کرب کو شدت سے محسوس کیا۔ اسی درد کو اپنے نوک قلم سے صفحات کے صفحات سیاہ کر دیے ہیں لیکن اپنے درد کی ٹیس کو ختم نہ کر سکے۔ ان کے افسانے ہو یا ناول، شاعری ہو یا دیگر تخلیقات ہو، تقسیم ہند اور اس کے لرزہ خیز نتائج کبھی براہ راست تو کبھی بلا واسطہ خود بخود سرایت کر گئے ہیں، کیوں کہ اس دور کا انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ ان کی خودنوشت میں بھی یہ درد و کرب بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اپنی مٹی، اپنا گاؤں اور گھر جہاں پیدا ہوئے تھے، تا عمر نہیں بھلا سکے۔ انہوں نے انتہائی نپے تلے انداز میں نہ صرف اپنے نجی احوال اور معاصرین کا تذکرہ کیا ہے بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی و معاشی اور اپنی ادبی سرگرمیوں کو بھی پیش کیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد چاروں طرف پھیلی تباہی اور قتل و غارت گری کے سبب ان کا خاندان سیالکوٹ سے ہندوستان آیا تھا۔ ہجرت کے اس درد کو وہ ہمیشہ محسوس کرتے رہے اور اسے پیدائش کے بعد ناف کاٹنے کے درد سے تشبیہ دی ہے، لکھتے ہیں:

> ''مجھے لگتا ہے کہ میری ناف دوبارہ کاٹی گئی۔ پہلی بار اس وقت جب ماں سے الگ کیا گیا تھا اور دوسری بار اس وقت جب مادر وطن سے میرا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کٹ گیا تھا۔ مادر وطن سے ناف کٹنے کے درد کو میں نے اپنے تن بدن میں ہمیشہ محسوس کیا ہے، جب بھی

یہ درد جا گتا ہے میں بلک بلک کر روتا ہوں۔''1

1946 کا زمانہ ہندوستان کے لیے بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ پورے ملک میں فسادات برپا تھے۔ اسی سال رتن سنگھ ریلوے میں ملازم ہوئے انہوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں ان فسادات کا ذکر کیا ہے۔ ان کی پوسٹنگ لاہور میں تھی، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹرین سے روزانہ صبح لاہور جاتے اور شام اپنے گاؤں واپس آ جاتے۔ جس راستے سے ان کا آنا جانا تھا ایک دن اسی راستے میں بم دھماکہ ہوا، جس کی زد میں بے شمار لوگ آئے۔ اس واقعے کا ذکر انہوں نے نہ صرف خودنوشت میں کیا ہے بلکہ ان کی تخلیق ''ہڈ بیتی'' میں بھی اس واقعے کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح اس ٹرین کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جس میں ایک دن وہ سوار ہو کر لاہور جا رہے تھے لیکن اپنے ساتھیوں کو اس ٹرین میں نہ پا کر لاہور سے کچھ اسٹیشن پہلے ہی اتر گئے۔ اس ٹرین میں سوار تمام سکھوں کا شاہدرہ (لاہور سے پہلے کا علاقہ) پہنچنے پر بلوائیوں نے قتل کر دیا تھا۔

اسی طرح مذکورہ خودنوشت میں چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے ہندوستان کی سیاسی ہلچل، فسادات کی تباہیاں، تقسیم ہند کے اثرات، ہجرت کے کرب اور شرنارتھیوں کی پریشانیوں کو بیان کیا ہے۔ جب رتن سنگھ ہندوستان پہنچے تو یہاں پر کیمپوں میں پناہ گزینوں کی مشکلات اور معاشی مسئلے کو بذات خود مشاہدہ کیا جسے انہوں نے خودنوشت میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے باعث جب قتل و غارت گری ان کے گاؤں میں بھی شروع ہو گئی تو ان کے گاؤں کے بیشتر لوگوں نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہندوستان آ گئے۔ ہجرت کے وقت جو کچھ بھی رتن سنگھ پر بیتی یا جو انہوں نے اس وقت محسوس کیا تھا اس کا تذکرہ خودنوشت میں تفصیل سے کرتے ہیں۔ اس احساس کے متعلق ایک انٹرویوں میں پوچھے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''نمبردار مراد علی گھر کے آنگن میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا ابھی چلو، سب ہندو بازار میں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ سارا گھر اس پل کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں پہلی منزل والے پسار کے پیچھے والے کمرے میں گیا، اس کی در و دیوار کو حسرت سے دیکھا، اس کی بو باس کو سانسوں میں بسایا اور نیچے اتر آیا۔ گاؤں سے لے کر راوی کے پاٹ تک ڈیڑھ میل کے فاصلے میں کچھ لوگوں کو لاٹھیاں ماری گئیں لیکن ہمارے گھر کے کسی فرد کو کچھ نہیں کہا۔ ہم اس مستری نہال کے پڑ پوتے تھے جس کی نیکی گاؤں والوں کے دلوں میں زندہ تھی، وہی ہمارے کام آئی۔ ہمیں پہلے پور میں ناؤں پر بٹھا کر اس پار یعنی ہندوستان پہنچا دیا۔''2

رتن سنگھ اپنی خودنوشت میں آزادی کے بعد ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔آزادی کے بعد انہوں نے اقتدار میں رہنے والے سیاست دانوں کا قتل خصوصاً اندرا گاندھی کے قتل کا ذکر کیا ہے۔اس وقت سماج میں عام سکھ کا جینا مشکل ہو گیا تھا،رتن سنگھ کے ساتھ بھی اسی کے پیش نظر برا سلوک کیا گیا تھا جس کی تفصیل خودنوشت میں موجود ہے۔علاوہ ازیں ملک کی اقتصادی وسماجی بدلاؤ پر بھی بحث کرتے ہیں۔مختصر یہ کہ رتن سنگھ کی دیگر تخلیقات کی طرح ان کی خودنوشت میں بھی تقسیم اور اس کے نتائج کے ساتھ اپنے عہد کی سیاسی سرگرمیاں جلوہ گر ہیں۔

حوالہ جات

1۔ رتن سنگھ، بیتے ہوئے دن،اردو اکادمی، دہلی،2013،ص:13
2۔ مشمولہ ماہنامہ چہارسو،راولپنڈی، مدیر سید ضمیر جعفری،نومبر 2010،ص:11

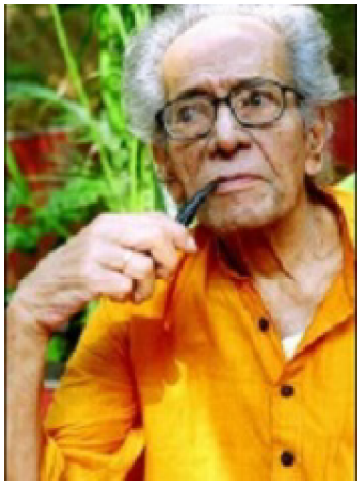

حبیب تنویر: پردہ کھلتا ہے

سنہ اشاعت: 2013

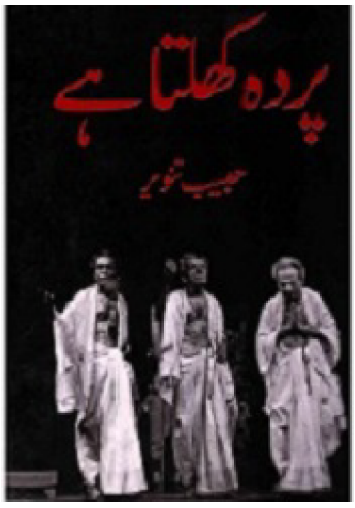

پردہ کھلتا ہے.....(حبیب تنویر)

مشہور ڈرامہ نگار حبیب تنویر کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہندی فلموں کے اداکار، ڈرامہ نگار، تھیٹر ڈائریکٹر تھے جنہوں نے راہی، فٹ پاتھ، چرن داس چور، گاندھی، یہ وہ منزل تو نہیں، ہیرو ہیرالال، پرہار، منگل پانڈے، بلیک اینڈ وہائٹ وغیرہ نامی فلموں میں کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک مفکر، شاعر، ادیب اور سیاست داں بھی تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور صحافی کے کیا تھا۔ بعد میں ڈرامہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور آخری دم تک اسی پر کام کرتے رہے۔ شاعری اور موسیقی سے خاص شغف تھا۔ جس کی جھلک ان کے ڈراموں میں ملتی ہے۔ وہ اردو کے ایک اچھے شاعر تھے اور اپنا کلام بڑے عمدہ انداز میں سناتے تھے۔ جس میدان میں جاتے اپنا نقش مرتسم کر دیتے۔ پہلے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں ممبئی میں اِپٹا سے منسلک ہو گئے، فٹ پاتھ فلم میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا، بے شمار ڈرامے اسٹیج کیے۔ 1950 میں جب پارسی تھیٹر ختم ہو گیا اور تھیٹر میں کوئی خاص اسکوپ نہیں رہ گیا تھا تب انہوں نے اپنے کیریئر کے لیے تھیٹر کا انتخاب کیا اور ثابت قدمی کے ساتھ اس پر قائم رہے۔

حبیب تنویر کی مشہور ترین تخلیقات میں ''آگرہ بازار'' اور ''چرن داس چور'' شامل ہیں۔ 1954 میں قدسیہ زیدی کے ساتھ ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے مونیکا مسرا کے ساتھ مل کر 1959 میں نیا تھیٹر کے نام سے ایک ڈرامہ کمپنی قائم کی۔ مونیکا مسرا کے ساتھ انہوں نے بعد میں شادی کر لی۔ 1972 میں راجیہ سبھا کے رکن بنائے گئے۔ انہیں سب سے زیادہ یاد اس لیے کیا جائے گا کہ انہوں نے اپنے ڈراموں میں بڑے ناموں کے بجائے لوک فنکاروں کا استعمال کیا اور ان گلیوں و بازاروں کو ہی اسٹیج بنایا جن کی کہانی وہ بیان کر رہے تھے۔ یہ تجربہ سب سے پہلے آگرہ بازار سے کیا جو اٹھارہویں صدی کے شاعر نظیر اکبر آبادی کی زندگی اور ان کی تخلیقات پر مبنی ہے۔ نظیر اکبر آبادی خود عام لوگوں کے بارے میں ان ہی کے الفاظ میں لکھتے تھے۔ اس ڈرامے کے لیے حبیب تنویر نے روایتی انداز سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے دہلی کے مقامی لوک فنکاروں اور اسٹریٹ آرٹس کو استعمال کیا۔

حبیب تنویر نے 1955 میں برطانیہ کی رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس میں تربیت حاصل کی اور یورپ میں مختلف ہدایت کاروں کے کام کا مطالعہ کیا۔ وہ سب سے زیادہ متاثر جرمن تمثیل نگار برتولت بریخت کے کام سے ہوئے تھے۔ ہندوستان لوٹنے پر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ جب تک اپنی ثقافتی روایات کا بھرپور استعمال نہ کیا جائے گا تب تک سماجی اعتبار سے بامقصد اور فنی اعتبار سے دلچسپ تھیٹر ممکن نہیں ہے۔ یہیں سے اس سفر کا آغاز ہوا جو آگے چل کر ان کے منفرد اور انقلابی انداز اور ہدایت کاری کی پہچان بن گیا۔ ان کی ہدایت کاری میں سب سے اہم موڑ 1970 کے بعد

آیا جب انہوں نے آگرہ بازار کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہوئے اپنی کمپنی نیا تھیٹر کے فن کاروں کو، جن میں سے زیادہ تر کا تعلق چھتیس گڑھ سے تھا، اپنی مقامی زبان میں مکالمات ادا کرنے کی آزادی دی۔ چرن داس چوران کا سب سے مقبول ڈرامہ ثابت ہوا جو تقریباً تین دہائیوں تک ہندوستان اور یورپ میں اسٹیج کیا گیا۔

ہندوستان کا یہ مشہور ڈرامہ نگار اور تھیٹر ڈائریکٹر 1 ستمبر 1923 کو رائے پور میں پیدا ہوا اور 8 جون 2009 بروز پیر کو بھوپال میں وفات پائی۔ اصل نام حبیب احمد خاں تھا اور گھر میں بابا کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے کل گیارہ بھائی بہن تھے جس میں سے سات حیات رہے۔ ان کے والد محمد حیات خاں یوسف زئی اپنے والد کے ساتھ پیشاور سے رائے پور آئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی، دوبارہ اپنے شہر واپس پلٹ کر نہیں گئے۔ حبیب تنویر کی ابتدائی تعلیم رائے پور کے لاری میونسپل ہائی اسکول سے شروع ہوئی۔ ناگپور کے مورس کالج سے بی۔ اے کیا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا جسے وہ مکمل نہ کر سکے اور ممبئی چلے گئے۔ وہاں ہندی فلموں کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ یہیں سے ان کی ڈرامہ نگاری اور اداکاری کی شروعات ہوتی ہے۔ وہ ملک کے مختلف اعزازات سے نوازے گئے۔ ان کو 1982 میں پدم شری اور 2002 میں پدم بھوشن کا خطاب بھی ملا۔

حبیب تنویر نے اپنی خودنوشت اس وقت لکھنا شروع کی جب ان کی زندگی کا کم ہی حصہ باقی تھا، اس لیے اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے۔ اپنی خودنوشت کو وہ تین جلدوں میں لکھنے والے تھے گویا ان کو یہ اعتماد تھا کہ وہ اپنی کتاب مکمل کر لیں گے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ان کی خودنوشت کا نام پہلے ''مٹ میلی چدریا'' تھا جو بعد میں ''پردہ کھلتا ہے'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ان کی خودنوشت کا عنوان بھی ڈرامائی ہے اور ان کے ڈرامائی حس کو پیش کرتا ہے۔ محمود فاروق نے مذکورہ خودنوشت کا انگریزی ترجمہ Habib Tanvir Memoirs کے نام سے کیا ہے جس میں انہوں نے ایک طویل دیباچہ بھی لکھا ہے۔ حبیب تنویر نے، حبیب احمد کی ترغیب پر خودنوشت لکھنے کا قصد کیا جنہوں نے اپنے اردو روزنامے ''ندیم'' میں چند باب کالم کی صورت میں شائع کیے تھے۔ بعد میں یہ کتابی صورت میں 2013 میں دلی کتاب گھر، دہلی سے منظر عام پر آئی۔ تقریباً 450 صفحات کی اس خودنوشت میں انہوں نے بے شمار چھوٹے چھوٹے ابواب قائم کیے ہیں۔

حبیب تنویر کی زندگی میں بے شمار نشیب و فراز آئے، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ انسان نیکی و بدی کا مجموعہ ہے۔ اس صورت کے پیش نظر کوئی خودنوشت تخلیق کی جائے اور اس میں ایسے واقعات کا انتخاب کرنا پڑے جن کا مصنف کی ذات پر گہرا اثر پڑتا ہو، بہت دشوار ہوتا ہے مگر ایمانداری یہی ہے کہ انہیں لکھ دیا جائے۔ جیسا کہ حبیب تنویر نے اپنی

سرگذشت میں کچھ واقعات کا ذکر بلا کسی ہچکچاہٹ کے لکھ دیا ہے، حالاں کہ اس حق گوئی کی وجہ سے کئی اشخاص صدمے کی زد میں آئے، مگر انہیں کب پروا تھی، وہ خودنوشت کے معیار سے بخوبی واقف تھے اور اسے گرنے نہیں دیا۔ ان کے اسی عزم کے نتیجے میں ایک اچھی خودنوشت ہمارے سامنے ہے جس میں نیا اسلوب، طرز تحریر اور نیا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنی حقیقت نگاری پر قائم رہتے ہوئے خودنوشت کے پیش لفظ میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''اچھائیوں برائیوں کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ ہر انسان میں کمیاں اور خوبیاں دونوں پائی جاتی ہیں۔ رہا سوانح حیات کا معاملہ تو یہ ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ ویسے میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے، دوست و احباب، بیوی، بچے سبھی جانتے ہیں کہ مجھ پر کیا کیا گزری۔ تقریباً ساری واردات، سارے معاملے، معاشقے طشت از بام ہیں۔ جو جو باتیں میں نے لکھ دی ہیں ان سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اپنی یادداشت کی حد تک میری حتی الامکان یہ کوشش رہی ہے کہ راست بازی سے گریز نہ کروں، نہ اپنے بارے میں نہ دوسروں کے بارے میں۔ میرا مقصد کسی کو زک پہنچانا، کسی کا دل دکھانا ہرگز نہیں۔''1

مذکورہ خودنوشت میں ان کی ماں، بہن بھائی، ان کے کالے ماموں، بانس والے ماموں، ان کی نانی کے ایک بھائی پولیس میں اور ایک بھائی کانگریس میں، رائے پور کی مسجدیں، میلادیں، آدی باسیوں کے ساتھ ان کا میل جول، ان کا آس پاس کے جنگلوں میں گھومنا، تھیٹر کے جانب راغب ہونا، ناگپور جانا اور وہاں کی مصروفیات، علی گڑھ جانا پھر وہاں سے ممبئی جانا، ہدایت کاری، ڈرامہ نگاری، سماجی و سیاسی حالات وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ بدقسمتی سے 1955 یا اس کے بعد کا احاطہ کرتے ہوئے یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے کیوں ان کی زندگی نے وفا نہ کی کہ وہ کتاب مکمل کر لیتے۔ لیکن پھر بھی تھیٹر، اردو ادب اور ہندوستانی فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے یہ کتاب ایک بیش قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کتاب کا اردو، انگریزی کے علاوہ ہندی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

اس خودنوشت میں جہاں حبیب تنویر کی زندگی سے پردہ اٹھتا ہے وہیں وہ اپنے ہم عصروں اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ سماجی اعتبار کے علاوہ سیاسی حالات کا بھی تذکرہ مذکورہ کتاب میں سرایت کر گیا ہے۔ ہندوستان میں 1900 کے بعد جو سیاسی تغیرات ہوئے، جو تحریکیں رونما ہوئیں، جو واقعات جنگ آزادی میں پیش آئے ان سب کے تذکروں سے حبیب تنویر کیسے اپنا دامن بچا لیتے۔ جس ماحول میں وہ رہے ان کی شخصیت کو نکھارنے میں اس کا بھی رول رہا ہے۔ بہر حال انہوں نے اختصار کے ساتھ ہی جنگ آزادی سے متعلق کچھ اہم واقعات کی طرف اشارہ

کیا ہے۔اس وقت ملک کے حالات سے ہر کس و ناکس واقف تھا اور تقریباً تمام ادیبوں کی تخلیقات میں ان کا ذکر دانستہ طور پر آ ہی گیا ہے۔خودنوشت ''پردہ کھلتا ہے'' بھی ایسے واقعات سے بری نہ رہ سکی۔

خودنوشت کا کچھ حصہ ہندوستان کی ان تاریخی موڑوں کے نام مختص ہے جن میں اہم واقعات رونما ہوئے تھے۔ مثلاً 1942، 1946، تقسیم ہند وغیرہ۔1942 میں گاندھی جی نے بھارت چھوڑو تحریک شروع کی تھی جس کے نتیجے میں پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔بدیسی سامان کو لوگ ترک کر رہے تھے، کہیں کہیں ریل کی پٹریاں تک اکھاڑی گئیں، لوگ انگریزوں کے دیے گئے خطابات کے ساتھ نوکریوں کو چھوڑنے لگے۔ان کے خلاف سڑکوں پر جلوس نکالے جاتے تھے۔اس تحریک کو انگریزوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر بڑی بے دردی سے کچل دیا۔ملک کے لیڈروں کے ساتھ نہ جانے کتنے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔حبیب تنویر اس وقت ناگپور کے مورس کالج میں زیر تعلیم تھے اور وہ کالج کے ہاسٹل میں ہی قیام پذیر تھے۔اس افراتفری میں ہاسٹل بھی خالی کرا دیا گیا تھا۔چاروں طرف مار کاٹ، لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی تھی۔اس تباہی کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے یہ تحریک ختم کر دی تھی۔ان تمام حالات و واقعات کی تفصیل خودنوشت ''پردہ کھلتا ہے'' میں ملتی ہے۔

1946 میں برصغیر کی تقسیم پر مہر لگتے ہی جو فسادات شروع ہوئے ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔اُس سال حبیب تنویر ممبئی میں تھے، کلکتہ، بہار، نواکھلی کے ساتھ ممبئی میں بھی بغاوت اور فسادات نے تباہی مچائی تھی۔اس سے پہلے ممبئی میں 18 سے 22 فروری 1946 کو رائل انڈین نیوی کے ملازمین خراب کھانے اور انگریز افسروں کے برے رویے کی وجہ سے بھوک ہڑتال شروع کر دی جو کہ بغاوت کا روپ دھار لیا۔ملک کے تمام بڑے شہروں میں موجود جہازیوں اور فوجیوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔یہ بغاوت ساحلوں پر موجود بیس ہزار جہازیوں تک پھیل گئی تھی۔کراچی میں بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجے جانے والے بلوچ سپاہیوں نے ہم وطنوں پر گولی چلانے سے صاف انکار کر دیا۔اس کے بعد یہ ذمہ داری انگریز فوجیوں کو دی گئی ان کی کارروائی کے نتیجے میں چھ جہازی اور 30 کے قریب زخمی ہوئے۔اگلے دن کراچی میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مقامی شاخ کی قیادت میں ہڑتال کی گئی۔کراچی کے عیدگاہ میدان میں دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 30 ہزار کے قریب شہری اکٹھے ہوئے جن پر پولیس نے فائرنگ کر دی۔جس میں بہت سارے لوگ زخمی ہوئے۔اسی طرح بمبئی میں بھی ایک لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔اس بغاوت میں انگریزوں کا بھی کافی نقصان ہوا۔اس وقت ممبئی کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے حبیب تنویر لکھتے ہیں:

''کراڈ فورٹ مارکیٹ سے محمد علی روڈ بلکہ اس سے آگے پریل اور دادر تک لوگوں کا گھروں

سے نکلنا قطعی بند تھا۔ ملوں، کارخانوں کا بھی یہی حال تھا۔ ٹیکسٹائل، فیکٹریز جو اس زمانے میں بمبئی کی بہت بڑی اور مخصوص انڈسٹری تھی، ٹھپ پڑی تھیں۔ مزدور جو بمبئی شہر میں لاکھوں کی تعداد میں تھے، اپنی چالوں میں بند تھے۔ چاروں طرف ایک سناٹا، ہو کا عالم، ایک گورستان کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں پر بھی سڑکوں پر چلتے پھرتے آدمی دکھائی نہیں دیتے تھے کیوں کہ کچھ سڑکوں پر جیتے جاگتے انسانوں کو لاشوں میں تبدیل کر دینے کا کاروبار بڑے زور شور سے جاری تھا، جس کا اثر دوسری تمام سڑکوں پر بھی تھا۔ گولی باری اور قتل و غارت گیری کے بیچ سب سے جاں گداز واقعات جو سننے میں آ رہے تھے وہ انگریز عورتوں پر حملوں اور ان کے ساتھ سر بازار بلات کار کے تھے۔''2

1946 میں جہازیوں کی یہ بغاوت سارے ملابار ساحل، کوچین کی بندرگاہ تک اور شمال میں کراچی کی بندرگاہ تک پھیل گئی تھی۔ ان باغیوں نے اپنی شکایات کے ساتھ انگریزوں سے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ چناں چہ اس بغاوت کو کچلنے میں وہ ناکام ہو رہے تھے۔ جو جہازی ہتھیار بند تھے وہ تمام بڑے بندرگاہوں پر قابض تھے۔ اگر اس بغاوت کو کانگریس کے ذریعے دبایا نہیں گیا ہوتا تو ملک 1947 کے بجائے 1946 میں آزاد ہو گیا ہوتا۔ یہ بغاوت ہر طرح سے کامیاب ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن کانگریس کے بڑے لیڈروں کو اپنے سر سے آزادی کا سہرا چھنتا نظر آنے لگا تھا اس لیے وہ پورے شد و مد کے ساتھ سے اس بغاوت کی مخالفت کی۔ حبیب تنویر اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''اگر 1857 کی بغاوت کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کہیں گے تو 1942 میں ہزاروں لاکھوں نہتوں کی بغاوت کو دوسری جنگ آزادی اور ایک چھوٹے پیمانے پر جہازیوں کی بغاوت کو تیسری جنگ آزادی کہنا چاہیے۔ ان تینوں بغاوتوں میں سب سے زیادہ کامیابی کا امکان اس آخری بغاوت میں صاف جھلک اٹھا تھا۔ لیکن کانگریس کے نیتاؤں نے عین وقت پر اسے دبا دیا۔''3

مہاتما گاندھی نے یہ کہتے ہوئے اس بغاوت کی مخالفت کی کہ یہ ان کے عدم تشدد کے اصولوں کے خلاف ہے۔ کمیونسٹوں نے نہ صرف جہازیوں کی حمایت کی بلکہ فوجیوں اور عوام کو ہتھیار نہ ڈالنے کی ترغیب بھی دی۔ لیکن ملک کی دو بڑی پارٹیوں مسلم لیگ اور کانگریس نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ خاص کر کانگریس نے اس کی شدید مخالفت کی اور ہتھیار

ڈالنے پر زور دیا۔ چناں چہ ان دونوں پارٹیوں کے مخالفانہ رویے اور مزید جانی نقصان سے بچنے کے لیے بحریہ کے جوانوں نے ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ایک بغاوت کامیاب ہوتے ہوتے ناکام ہوگئی۔ اگر یہ کامیاب ہوتی تو یقیناً ہندوستان کی آزادی کا نقشہ کچھ اور ہوتا اور شاید ملک بھی تقسیم ہونے سے بچ جاتا۔

حبیب تنویر اس بغاوت کو ہندوستانی سیاست میں سب سے اہم قرار دیتے ہیں۔ بی بی سی ہندی کی ایک رپورٹ، جو کہ 21 فروری 2021 کو شائع ہوئی تھی، سے حبیب تنویر کی اس بات پر مہر لگ جاتی ہے۔ بی بی سی کی رپورٹ کو نامہ نگار ریحان فضل نے پیش کیا تھا انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اُس بغاوت اور اس کے نتائج کا ذکر کیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق 'ہندوستان کی آزادی کے سالوں بعد جب سابق برطانوی وزیر اعظم کلیمینٹ اٹیلی کلکتہ آئے تو مغربی بنگال کے گورنر کی جانب سے منعقدہ سرکاری تقریب کے دوران کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس پی وی چکرورتی نے ان کی طرف جھک کر سوال پوچھا'' آپ کی نظر میں انگریزوں کے انڈیا کو آزاد کرنے میں مہاتما گاندھی کی 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کا کتنا کردار تھا؟'' اٹیلی کے جواب نے وہاں موجود لوگوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ 'ہم گاندھی کی تحریک سے نمٹنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن ہندوستانی سکیورٹی فورسز میں بے چینی اور خاص طور پر ہندوستانی بحریہ کے جوانوں کی بغاوت نے ہمیں وقت سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا'

اگر دیکھا جائے تو برصغیر کے لوگوں کی نظر میں انگریزوں کے خلاف صرف ایک بڑی بغاوت ہوئی تھی۔ یعنی سنہ 1857 میں جب ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جسے انگریزوں نے بڑی بے دردی سے کچل کر غدر کا نام دے دیا تھا۔ لیکن برطانوی وزیر اعظم اٹیلی جس بغاوت کا ذکر کر رہے تھے۔ وہ 18 فروری 1946 کو ہوئی تھی جس میں تقریباً دو ہزار ہندوستانی بحریہ کے جوانوں نے شرکت کی اور سکیورٹی فورسز کی فائرنگ سے لگ بھگ چار سو افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اس بغاوت کی اہمیت کا اندازہ اٹیلی کے بیان سے ہوتی ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ اتنی اہم بغاوت کا ذکر بیشتر خودنوشت نگاروں نے اپنی خودنوشت میں نہیں کیا ہے۔

''تقسیم ہند'' کے نام سے ایک باب مختص ہے جس میں آزادی اور اس کے بعد کی ہولناکیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی بدنصیبی یہ رہی کہ 15 اگست 1947 کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی کے ساتھ ہی تقسیم کا دکھ بھی جھیلنا پڑا۔ اس کے بعد برصغیر میں جو حالات پیدا ہوئے وہ بڑے دردناک تھے۔ تقسیم کرنے والوں کو آنے والی خوں ریز تباہی کا اندازہ نہ تھا اور نہ ہی اسے روکنے کے لیے کوئی معقول انتظام۔ بہر حال حبیب تنویر کو بھی ملک کا بٹوارہ غلط لگا۔ اس لیے گھر والوں اور دوستوں کے لاکھ اصرار اور سمجھانے پر بھی ان کا دل پاکستان جانے کے لیے رضامند نہ ہوا۔ بعد ازاں

انہوں نے پاکستان جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کی ضد کے آگے ان کے گھر والے بھی لاکھ چاہنے کے باوجود بیٹے کے ساتھ ہندوستان میں ہی رہ گئے اور ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ حالاں کہ بگڑتے حالات کو دیکھتے ہوئے ان کے خاندان کے لوگ ہجرت کر گئے تھے۔ حبیب تنویر آزادی کے وقت ممبئی میں مقیم تھے۔ تقسیم کے بعد جو فسادات اور خوں ریزی برپا ہوئی، وہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں تک پھیل گئی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ وہ فسادات کہیں زیادہ تھا کہیں کم۔ بقول حبیب تنویر:

> ''تقسیم ہند کا زمانہ تھا ہر طرف مار کاٹ کا دور دورہ تھا۔ انقلاب کے دفتر کے اردگرد محمد علی اور بھنڈی بازار سے لے کر پریل تک لوگ تناؤ کا شکار تھے۔ کچھ مارا ماری بھی تھی، دہلی کی طرح نہ تھی لیکن تھی۔ مسلمان ناگپور سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے کراچی لشتم پشتم بھاگ رہے تھے۔ عجیب افراتفری، عجیب بے سروسامانی کا عالم تھا۔ ذاتی طور سے میں پاکستان جانے کے خلاف تھا۔ مجھے ملک کا بٹوارہ غلط لگا۔''4

حبیب تنویر کی خودنوشت ''پردہ کھلتا ہے'' میں تقریباً 1960 تک کا احاطہ ملتا ہے، یہ نامکمل ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاست پر شاید اور کچھ لکھتے لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔ اس خودنوشت میں بہت سے حقائق سے پردہ اٹھتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی واقعے یا فرد کا بیان غیر ضروری ہو گیا ہے جو کہ خودنوشت کے نامکمل ہونے پر بھی اس کی طوالت کو بڑھاتا ہے۔ اگر ان قصوں سے گریز کیا جاتا اور ہندوستان کے حالات پر نظر ثانی کی جاتی جو ان کی ساخت و پرداخت میں کارفرما تھے تو یہ خودنوشت اور بھی دلکش ہو جاتی۔ لیکن ایک بات پھر سے واضح کر دوں کہ حبیب تنویر اپنی سرگزشت کو تین حصوں میں لکھنا چاہتے تھے، شاید اس لیے ہر واقعے اور اپنے اردگرد کے افراد کا ذکر قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر حال تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ مذکورہ خودنوشت اپنی مثال آپ ہے، خاص کر تھیٹر اور فلمی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک دلکش کتاب ہے۔

حوالہ جات

1۔ حبیب تنویر، پردہ کھلتا ہے، دلی کتاب گھر، دہلی، 2013، ص: 11
2۔ ایضاً، ص: 307
3۔ ایضاً، ص: 310
4۔ ایضاً، ص: 357

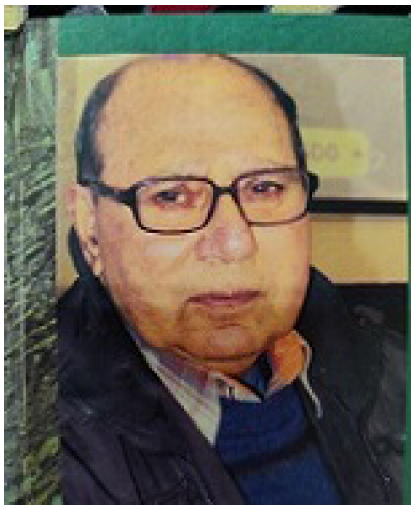

جتیندر بلو: دیکھو ہم نے کیسے بسر کی

سنہ اشاعت: 2014

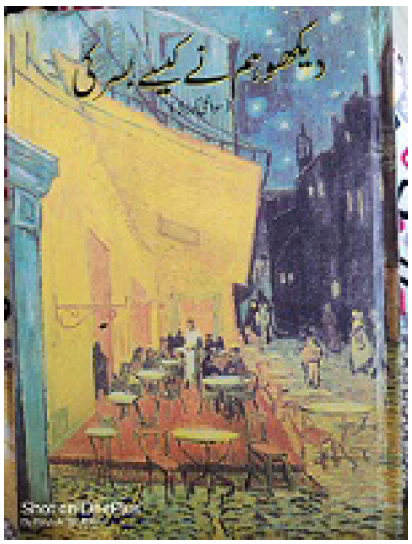

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (جتیندر بلو)

اردو ادب میں جتیندر بلو کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقات ہندو پاک کے مشہور و معروف ادبی رسائل میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ وہ 18 نومبر 1937 کو پیشاور میں پیدا ہوئے۔ خاندانی نام جتیندر دیولانبہ اور قلمی نام جتیندر بلو ہے۔ تقسیم کے بعد مع خاندان دہلی ہجرت کی، جہاں دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد تلاش معاش کی غرض سے ممبئی روانہ ہوئے جہاں وہ فلمی دنیا سے جڑ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ لندن چلے گئے، ڈھائی سال رہ کر ہندوستان واپس لوٹے تو یہاں کی معاشی حالت بد سے بدتر تھی، ملک میں ایمرجنسی لگائی گئی تھی جس کی وجہ سے سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا تھا، بالی ووڈ بھی اس سے بچ نہیں پایا، فلمیں بہت کم بن رہی تھیں ایسی بحرانی حالت میں جتیندر کا نوکری ملنا ناممکن تھا چناں چہ انہوں نے پھر سے لندن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تب سے لے کر آج تک وہ وہیں مقیم ہیں۔

جتیندر بلو نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1965 میں اپنی کہانی ''جعلی نوٹ'' سے کیا جو ماہنامہ ''شمع'' میں شائع ہوئی تھی۔ اب تک انہوں نے سو سے زائد کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات کی بوقلمونی ملتی ہے۔ تین ناول (پرائی دھرتی اپنے لوگ، مہانگر، وشواس گھات) سات افسانوی مجموعے (پہچان کی نوک پر، جزیرہ، نئے دیس میں، انجانہ کھیل، چکر، درد کی حد سے پرے، آخری پڑاؤ) اور خودنوشت (دیکھو ہم نے کیسے بسر کی) ان کے قلم کی شاہد ہیں۔

جتیندر بلو نے اپنی خودنوشت، جس کو انہوں نے سوانحی کولاژ کا نام دیا ہے، ''دیکھو ہم نے کیسے بسر کی'' کے نام سے لکھی ہے جس کی کل تین جلدیں ہیں۔ یہ 2014 میں قلم پبلی کیشنز، ممبئی سے شائع ہوئیں۔ انہوں نے اپنے بیتے ہوئے ایّام کی کہانی جستہ جستہ لکھی ہے جو کہ بلاشبہ دلچسپ ہے۔ اس میں بنا کسی لاگ لپیٹ اور بنا کسی خوف و ڈر کے موضوعات، کردار اور واقعات کو پیش کیا ہے۔ حالاں کہ اس کتاب میں زمانی و مکانی ربط و تسلسل تو نہیں ملتا لیکن یہ کولاژ ان کی زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے جس کے سحر سے قاری کا بچنا مشکل ہے۔ سوز و گداز، بے باکی اور داخلی سچائی جتیندر بلو کی شخصیت کا خاصہ ہے اور یہ بے باکی و سچائی اس خودنوشت میں جا بجا محسوس ہوتی ہے۔ دیپک بُدکی لکھتے ہیں کہ:

> ''جتیندر بلو کی تصنیف دیکھو ہم نے کیسے بسر کی، سوانحی ادب میں ایک اضافہ اور نیا تجربہ ہے۔ وہ زندگی کی قاشوں کو ایک جگسا پزل کی مانند جوڑتے ہیں اور ان میں ایک فطری ربط و ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے اسلوب کے توسل سے دلچسپ بناتے ہیں۔ ان کے یہاں

داخلی کرب بھی ملتا ہے اور معاشرے کی عکاسی بھی۔ وہ اپنے بارے میں اتنے ہی دردمند نظر آتے ہیں جتنے کہ اپنے سماج کے بارے میں۔ دراصل ان کی یہ خودنوشت ان کے دور کی داستان بن کر سامنے آتی ہے۔''1

خودنوشت کے تعلق سے یہ خیال عام ہے کہ یہ کسی شخص کی پیدائش سے لے کر مصنف کے لکھنے تک کے تمام حالات وواقعات کا بلاکم وکاست پیش کر دینا ہے۔ لیکن جتیندر بلو نے اس روایت سے انحراف کیا ہے کیوں کہ انہوں نے اپنی پیدائش یا بچپن کے حالات کو بیان نہیں کیا ہے اور نا ہی اپنے جدامجد کے بارے میں بات کی ہے، اپنی زندگی کے چند اہم واقعات اور اپنے ہم عصر دوستوں ومحفلوں کا ذکر کیا ہے جن کے سائے تلے ان کے تخلیقی سفر کا آغاز ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی خودنوشت کو سوانحی کولاژ کا نام دیا ہے، جو اپنے موضوع و پیش کش کے اعتبار سے بالکل نیا ہے۔ خودنوشت کے وہ غیر دلچسپ اجزا جو زندگی کا حصہ ہونے کے ناتے اس میں شامل ہو کر صرف واقعات کی کتھونی بن جاتے ہیں سے جتیندر بلو نے صریحاً اجتناب کیا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں دلچسپی کا عنصر شروع تا آخر قائم رہتا ہے۔ بقول الیاس شوقی:

''اپنی زندگی کے وہ چند واقعات اور وہ لوگ جنہیں اس نے اپنی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ جانا ہے یہ سوانحی کولاژ انہی موتیوں کی ایک لڑی ہے جسے اس نے اپنے جذبات کے دھاگے میں پرویا ہے۔ جتیندر بلو کی پسند وناپسند اس کولاژ میں بہت صاف اور نمایاں ہے، اس میں اس کے جذبات بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تقسیم کا جو درد اس نے سہا ہے اس کی ٹیس بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔''2

جتیندر بلو اس زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد زور وشور سے جاری تھی۔ ملک کے باشندے انگریزوں سے آزاد ہونے کے لیے اپنی جان ومال قربان کر رہے تھے۔ غرض کی ہر طرف بے چینی وبدامنی کا دور دورہ تھا۔ جتیندر بلو کا ماننا ہے کہ انگریزوں نے پورے ہندوستانی عوام کا استعمال کیا تھا، ان کا استحصال کیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے خزانوں سے اپنی فیکٹریاں اور ملیں چلائیں اپنی معاشی حالت میں کافی سدھار کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی پالیسی سے یہاں کی عوام کو بانٹا۔ مگر جب آزادی کی لہر پورے ملک میں شدت اختیار کر گئی تو وہ سمجھ گئے کہ اب اس ملک میں رہنا مشکل ہے۔ انگریزوں نے مذاہب کا استحصال اتنی چالاکی سے کیا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

ان سب کے علاوہ مصنف کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے کچھ ناقابل فراموش کام بھی کیے ہیں مثلاً تعلیم کا معیار بلند کیا، یونیورسٹیاں بنائیں، کالج بنائے، تعلیمی ادارے کھولے، ہسپتال بنائے، ریل گاڑی کی لائنیں بچھائیں ریلوے اسٹیشن بنائے۔لیکن ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔اتحاد کہیں دور کھڑا ملک کی حالتِ زار پر ماتم کر رہا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ دونوں قوموں کا ایک ساتھ رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔دوسری طرف دنیا دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں و بربادیوں سے دوچار ہوئی تھی۔معاشی حالت اتنی بدتر ہو گئی تھی کہ لوٹ مار و چوری ڈکیتی عام ہو چکی تھی۔برطانیہ بھی اس تباہی سے کیسے بچ سکتا تھا اس کے پارلیمنٹ ہاؤس تک ٹوٹے ہوئے تھے۔جتیندر بلو کے ذیل اقتباس سے برطانیہ کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر سلطنت برطانیہ کی اقتصادیات دگرگوں ہو چکی تھی۔خزانہ تقریباً خالی تھا۔بے روزگاری بڑھ رہی تھی لوٹ کھسوٹ کی ساری دولت، اسلحہ تیار کرنے اور جنگی جہاز بنانے میں جھونک دی گئی تھی۔فیکٹریاں بند پڑی تھیں۔مشینوں کو چلانے کے واسطے مردانہ ہاتھوں کی اشد ضرورت تھی مگر وہ وافر تعداد میں جنگ میں کام آ چکے تھے۔لہٰذا فیکٹریوں اور ملوں میں چمگادڑیں اڑا کرتی تھیں۔پروڈکشن بند ہونے کے سبب خزانہ خالی ہو چکا تھا۔''3

ایسی حالت میں برطانوی حکومت کا مقبوضہ ملک کو چلانا آسان نہیں تھا۔حالاں کہ برطانوی گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا لیکن ملک میں فرقہ واریت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنے تحفظ اور اقتدار کی فکر ستانے لگی۔چناں چہ اسی کے پیش نظر مسلم لیگ وجود میں آئی تھی۔ملک کی بگڑتی صورت حال کے مدنظر مسلم لیگ نے پاکستان کی مانگ کر دی۔پاکستان کا نام سنتے ہی ملک میں کیا ہوا یہ دنیا نے دیکھا ہزاروں جانیں گئیں، لاکھوں کروڑوں کا نقصان الگ ہوا۔حالات سدھرنے کے بجائے بگڑتے گئے اور انگریزوں نے ملک کے بٹوارے کو ہی غنیمت جانا اور برصغیر کو دو حصوں میں کافی عجلت میں بانٹ دیا۔جس کا نتیجہ بڑا بھیانک ہوا۔

جب ہندوستان آزاد ہوا اس وقت جتیندر بلو محض دس سال کے تھے۔ان کے معصوم ذہن پر ہجرت کا کرب اور اس وقت کے واقعات اس طرح ثبت ہیں کہ وہ آج تک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔کم عمری میں بھی ان کو اتنا احساس تو تھا کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ ملک کے سیاسی حالات کیا ہیں۔ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن جن کو ہندوستان آئے ہوئے ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے انہوں نے ملک کی تقسیم کا اعلان کر دیا کہ 14 اگست کو ایک نیا ملک

بنام پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوگا'۔ اس اعلان نے پورے ملک کو ماتم کدہ بنا دیا۔ جتیندر بلو کے شہر پشاور میں بھی لوگوں پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ کریم پورہ، رام پورہ، گنج آسیہ اور چکہ گلی جہاں ہندو اور سکھ باشندے کثیر تعداد میں آباد تھے، ان علاقوں میں زندگی تہہ و بالا ہو کر رہ گئی۔ کیوں کہ ان علاقوں کی مشترکہ آبادی پشاور شہر کی کل آبادی کے مقابلے میں کم تھی اور وہ کسی وقت بھی اکثریت کے ہاتھوں موت کا شکار ہو سکتے تھے اس لیے لوگ خوف زدہ تھے۔ جتیندر بلو لکھتے ہیں:

> ''ہر گھر کے مکینوں پر خوف طاری ہو چکا تھا اور ان کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ میرے باؤ جی کو بھی شدید جھٹکا لگا تھا۔ ان کا اندھ وشواس تھا کہ ہندوستان کے ٹکڑے ہرگز نہیں ہوں گے۔ وہ ہمیشہ کی طرح پشاور میں ہی رہیں گے۔''4

حالاں کہ 1946 میں مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں خودمختار پاکستان کی بنیاد استوار کرنے میں مستحکم اقدام اٹھانے کی بات کی تھی اس اقدام میں مسلم لیگ کا ڈائریکٹ ایکشن ڈے بھی تھا جس نے ہندوستان کی سیاست کی بساط کو ہی الٹ دیا تھا۔ اگست 1946 میں ''ڈائرکٹ ایکشن ڈے'' منایا گیا۔ کلکتہ اور اس کے گردونواح میں کافی پہلے سے نسلی و مذہبی فرقہ واریت بڑھ رہی تھی۔ ماحول میں کشیدگی تھی انگریز بھی اپنی جگہ محتاط تھے لیکن اس دن تقریباً ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلمان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یہی فرقہ وارانہ فساد کی آگ نواکھلی، بہار اور پورے شمالی ہندوستان میں پھیل گئی۔ قتل و غارت گری کا بازار ہر جگہ گرم ہو چکا تھا۔ بچوں کو نیزوں پر اچھالا جا رہا تھا۔ گاندھی جی نے یہ غیر انسانی سلوک اور بربریت دیکھی تو وہ برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے بھوک ہڑتال کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان میری لاش پر بنے گا''۔

ہندو مسلم اور سکھ ہر فرقہ کے لوگ گاندھی جی کے ہر فیصلے کا احترام کرتے تھے۔ ان کو گاندھی جی کی بھوک ہڑتال پر یقین ہو گیا تھا کہ ملک کا بٹوارہ نہیں ہوگا تب جا کر فسادات کی آگ ٹھنڈی پڑی۔ جتیندر بلو کے والد کو یہ یقین کامل تھا کہ جب تک گاندھی جی زندہ ہے تب تک ملک تقسیم نہیں ہو سکتا۔ ملک کی سیاست پر تمام اتار چڑھاؤ کے بعد بھی ان کو یقین تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے بیچ کوئی ایسا راستہ نکل آئے گا کہ صدیوں سے مختلف مذاہب کے ماننے والے ساتھ رہتے ہیں اب الگ نہیں ہو سکتے۔ لیکن جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے کیوں کہ برطانوی حکومت کا اعلان اٹل تھا کہ 14 اگست کو پاکستان معرض وجود میں آئے گا۔ اس کے علاوہ مصنف نے اس جیوتشی کا بھی ذکر کیا ہے جس نے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ ملک تقسیم ہوگا۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں کے ہندوؤں نے ہجرت کر کے ہندوستان آنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ جتیندر بلو نے بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اس وقت کے درد وغم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کرب کی ٹیس محسوس کی جاسکتی ہے۔ مصنف کے والد کا یہ یقین کہ گاندھی جی کے ہوتے ملک تقسیم نہیں ہوگا اس وقت ٹوٹ گیا جب گاندھی جی سردار پٹیل اور پنڈت نہرو کے دباؤ میں آکر بٹوارے کے متعلق خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ گاندھی جی بھی پاکستان کے لیے رضا مند ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہاں کے غیر مسلموں میں غم وغصہ تھا اور اپنا غصہ مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی لیڈروں کو گالیاں دے کر نکال رہے تھے۔ ان کو اپنے جان و مال کی فکر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ تعداد میں کم ہیں کسی بھی وقت بلوائیوں کے ہاتھوں مارے جاسکتے ہیں۔ ان کو یہ فکر لاحق تھی کہ اتنے خطرناک ماحول میں سرحد کیسے پار کریں گے۔ یہ تمام تفصیلات جتیندر بلو نے اپنی خودنوشت میں بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''باؤجی کا گاندھی جی سے مکمل اعتماد اٹھ چکا تھا۔ یوں بھی نسلی وسماجی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ باؤجی کو اپنے بچوں کی سلامتی اور ان کے مستقبل کی فکر ہر پل رہا کرتی۔ انہوں نے فوری طور پر میرے ماموں سرکاری وکیل مدن لال مہتہ ولد ڈاکٹر بہاری لال مہتہ سے رابطہ کیا۔ فوراً ہی انہوں نے ہمارے خاندان کے لیے ہوائی جہاز کے لیے نشستیں بک کروادیں۔ انگریزوں نے عوام کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ اپنے ان جہازوں کو استعمال میں لا رہے تھے جو ان کی رسد وسپلائی کے لیے مخصوص تھے۔ اُڑان کے واسطے کرایہ مہنگا تھا مگر ہر کسی کو جان عزیز تھی۔''5

جتیندر بلو کے والد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعلان کے بعد کافی پریشان رہتے تھے۔ ان کو اپنے چار بیٹوں اور کم سن بچی کی فکر لاحق تھی کہ کس طرح ان سب کو لے کر سرحد پار انجانی راہوں پر روانہ ہوں گے۔ آخر کار ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی اپنے گھر کو چھوڑ نئی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ لوگ ہوائی جہاز سے ہندوستان پہنچے۔ جہاز میں ہر کسی کو صرف ایک گٹھری لے جانے کی اجازت تھی۔ اس لیے وہ لوگ کپڑوں کی ایک ایک گٹھری اپنے ساتھ رکھی۔ گھر کے ضروری کاغذات وزیورات ایک کمبل میں لپیٹ کر والد نے لیا تھا گھر سے نکلتے وقت سب کو ایک لفافہ دیتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ اس میں ممبئی اور دہلی کے رشتہ داروں کے پتے لکھے ہیں، پربھو کا نام لے کر نکلو اور ہر مصیبت کا ڈٹ کر سامنا کرنا۔ اپنا آبائی وطن وگھر اور کل اثاثہ چھوڑتے ہوئے مصنف کے والد جس کرب سے دوچار تھے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے

ہیں کہ:

''مکان کے صدر داخلے پر تالا لگاتے ہوئے باؤ جی کا چہرہ میں بھول نہیں پاتا کہ میں ان کی ٹانگوں کے ساتھ ہی لگ کر کھڑا تھا۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھے۔ یقیناً وہ اس خیال میں رہے ہوں گے کہ صدیوں پہلے ان کے آبا واجداد، جو غزنی سے چل کر پیشاور میں آن کر آباد ہو گئے تھے، پھر اس شہر کی مٹی کو اپنی ہی مٹی تصور کر بیٹھے تھے، آج ان کی آل اولاد کو اپنا مکمل ورثہ، اثاثہ اور اپنی مٹی کو چھوڑ کر انجانی دھرتی کی طرف جانا ہوگا ورنہ مکان کی دیواریں و صحن بھی سرخ ہو جائے گا۔ چابی جیب میں ڈالتے ان کا ہاتھ رک گیا تھا۔ بولے 'اب اس چابی کو لے جانے کی کیا تُک ہے۔ مگر ساتھ تو اسے لے جانا ہی ہوگا شاید کبھی لوٹنا ہی ہو۔''6

ہجرت بھی اتنی آسان نہیں تھی۔ راستے میں بلوائیوں کے ہاتھوں لوٹ پٹ کے لوگ ہندوستان اور پاکستان پہنچ رہے تھے۔ اس کے علاوہ لوگ قتل بھی ہو رہے تھے۔ مہاجروں و شرنارتھیوں کو امید تھی کہ ایک دن وہ اپنے پشتینی مکان اور شہر میں ضرور واپس ہوں گے۔ لیکن یہ کہاں ممکن تھا جو ایک بار چلا گیا وہ واپس کبھی نہیں لوٹا۔ جتیندر بلو کا بھی خاندان جب گھر سے نکلا تو راستے میں ایک آفریدی پٹھان نے لوٹنے کی نیت سے ان کا راستہ روک لیا۔ لیکن ان کے والد نے اس سے کہا کہ ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہے ہیں جاؤ اسے لوٹ لو۔ اس آفریدی نے بھروسہ کر کے انہیں چھوڑ دیا۔ راستے میں دس سال کے جتیندر بلو بار بار ان سڑکوں کو دیکھتے رہے جہاں سے وہ اسکول کے لیے جاتے تھے۔ راستے کی دشواریوں سے بچتے ہوئے وہ لوگ اس جگہ پر پہنچے جہاں سے فوجی لاریوں نے انہیں ہوائی اڈے تک چھوڑا۔ اپنے ہجرت کے سفر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری لاری جب مسافروں سے بھر گئی تو دو مسلح فوجی جوانوں نے لاری کا پچھلا پھٹہ اٹھا لیا وہ دوسری لاریوں کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئی، ایک مسلح فوجی ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ ان سب کو ہدایت تھی کہ اگر کوئی شخص لاری کو لوٹنے کی یا قتل و غارت کی غرض سے پیش قدمی کرے تو اُسے ایک وارننگ دے کر گولیوں سے بھون ڈالو۔ سڑکوں پر آفریدی اور دوسرے قبیلوں کے پٹھان اور قبائلی کندھوں پر بندوقیں لٹکائے سرِ عام گھوم رہے تھے۔ وہ سرحد سے غیر علاقوں سے وارد ہوئے تھے انہیں علم ہو چکا تھا کہ ہندو اور سکھ لوگ موت کے

خوف سے گھبرائے ہوئے اپنے بھرے پورے گھر کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں اور اب میدان صاف ہے۔ ہوائی اڈے پر سیکڑوں کی تعداد میں ہندو و سکھ اپنے کنبوں سمیت بدحواس اور غمگین کھڑے دکھ رہے تھے۔''7

اس جہاز کی تمام سیٹیں ہٹا دی گئی تھیں تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں بیٹھ سکیں۔ یہ جہاز پشاور سے انبالہ جانے والا تھا۔ لوگ ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اپنا گھر بار، کاروبار اور اپنا کل اثاثہ چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔ ان کو تو اپنی منزل کا بھی پتہ نہیں تھا۔ مصنف نے جہاز کے اندر لوگوں کی کیفیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جب جہاز رن وے پر دوڑنا شروع کیا، تو مارے خوف کے لوگوں کی چیخیں نکل گئی تھیں اور وہ مسلسل چیخ کر اپنی اندرونی کیفیت کو ظاہر کر رہے تھے۔ کچھ لوگ سیاسی لیڈروں کو گالیاں دے رہے تھے۔ ہجرت کا کرب لوگوں کے ذہن پر گہرا ہوا اور کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی اس واقعے کو بھلا نہیں سکے۔ عورتوں کی نفسیات پر زیادہ اثر ہوا کیوں کہ بلوائیوں اور لوٹنے والوں نے ان کی عزت و آبرو کو تار تار کیا تھا، ان کا سہاگ لوٹا تھا، ان سے ان کے بچے چھینے تھے۔ جتیندر بلو بھی اس منظر اور سفر کے دوران دلدوز چیخوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے۔ بقول جتیندر بلو:

''وہ دلدوز چیخیں، جن میں عورتوں کے ساتھ مرد اور ان کے بچوں کی آوازیں بھی شامل رہی تھیں میں انہیں تقسیم کے بعد ڈیڑھ دو برس تک اپنی نیند میں وقفے وقفے سے سنتا رہا۔ وہ میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔ وہ نہایت دل شکن ہوا کرتیں اور میرا بدن پسینے سے تر بتر ہو جایا کرتا۔ اس سمے میں محسوس کیا کرتا کہ میں جہاز میں بیٹھا ہوا ہوں۔''8

وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے غموں پر مرہم تو لگ جاتا ہے لیکن اس کی ٹیس تا حیات قائم رہتی ہے۔ جتیندر بلو بھی اپنا آبائی شہر پشاور کو نہیں بھولے۔ وہ اکثر ان دنوں کو یاد کر کے رنجور ہو جایا کرتے۔ حالاں کہ وہ شہر ان سے کب کا چھوٹ چکا ہے۔ جہاں ان کے آبا و اجداد صدیوں تک مقیم رہے، ان کا بھرا پرا گھر تھا، جائداد تھی، کاروبار تھا اور سماجی رتبہ بھی تھا۔ لیکن وہ تمام اثاثہ تقسیم وطن کے پہلے دن سے سیاست کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ ہجرت کے بعد وہ لوگ انبالہ سے دہلی پہنچے۔ دہلی سے ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہاں راجندر نگر میں پاکستان میں جائداد کے عوض ایک مکان الاٹ ہوا تھا جس میں مصنف کا بچپن گزرا۔ دس سال کی عمر میں ہجرت کا جو کرب جھیلنا پڑا ان صعوبتوں کو مصنف نے اپنی خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ دیپک بُدکی نے اس خودنوشت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جتیندر بلو کی سہہ جلدی سوانح میں نہ صرف تقسیم وطن کا دلسوز منظر نامہ ملتا ہے بلکہ پس

آزادی ہندوستان اور یورپی ممالک میں تارک الوطن لوگوں کی کشمکش کا بیان بھی ملتا ہے۔''9

ملک کا بٹوارہ ہونے کے بعد خون خرابہ اس حد تک ہوا کہ دس لاکھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ایک کروڑ سے زیادہ لوگ بے گھر ہوئے اور یہ لوگ ایک دیش سے دوسرے دیش منتقل ہو گئے۔ ملک کی تقسیم صحیح تھی یا نہیں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے جتیندر بلو لکھتے ہیں:

''ملک ہندوستان کی تقسیم غیر فطری ہوئی تھی۔ جب کہ قوم ایک تھی صدیوں سے مسلم، ہندو اور سکھ اکٹھے رہ رہے تھے، زبان بھی ایک تھی۔ اِکنامی ضرور ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں میں تھی۔ انگریز اپنا کھیل الگ سے کھیل رہے تھے۔ مسلمان قوم میں زیادہ تر لوگ غریب غربا تھے، ان کی گزر بسر تنگدستی میں ہوا کرتی۔ البتہ مذہب ضرور الگ الگ تھے لیکن مذاہب نے ایسا بھیانک اور وحشت ناک موڑ اختیار کیا کہ آدمی وحشی بن بیٹھا۔ قتل وغارت گیری بلند سطح پر ہوئی۔ ملک کے ٹکڑے ہو گئے اور ایک نیا ملک پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔''10

انگریزوں نے ملک میں صرف حکمرانی کرتے ہوئے عوام پر ظلم ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے ملک میں جو ترقی کے راستے ہموار کیے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جتیندر بلو نے اپنی خودنوشت میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ انہوں نے انگریزوں کے منفی و مثبت پہلو کو بھی سامنے رکھا ہے۔ انگریزوں نے برصغیر میں تقریباً دوسو سال تک حکومت کی۔ یہاں کے خزانوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا، عوام پر بے جا ظلم کیا تھا۔ یہاں کے خزانوں کو لوٹ کر اپنی تجوریاں بھر کر امیر کبیر بنے تھے۔ جاگیردارانہ نظام قائم کر کے مجبور کسانوں کا خوب استحصال کیا۔ لیکن اس کے برعکس انگریزوں نے جو مثبت کاموں کی داغ بیل ڈالی اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے تعلیم کا معیار بلند کیا جس سے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں وجود میں آئیں۔ جدید میڈیکل سائینس کی بنیاد رکھ کر اسپتال بنائے۔ میڈیکل کالج کے ذریعے ملک کو ان گنت ڈاکٹر دیے۔ ذاتی کاروبار اور عوام کی سہولت کے لیے ریل گاڑی چلائی۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا کام یہ کیا کہ جمہوریت کا نظام قائم کیا۔ ورنہ ہر خطے میں بادشاہ، نواب، سلطان، راجہ مہاراجہ حکمراں ہوتے اور آپس میں ہی لڑتے رہتے جس سے عوام کا سکون غارت ہو جاتا۔

جتیندر بلو کا ماننا ہے کہ بٹوارے کے وقت سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوا تھا اور آج تک وہ نقصان کی

بھر پائی کر رہے ہیں۔ بڑا المیہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے لے کر اب تک ان کو ملک سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینا پڑ رہا ہے۔ ان کے مشترکہ خاندان میں سے آدھے ہندوستان میں ہیں تو آدھے پاکستان میں۔ ان کا آپس میں ملنا دشوار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''دیش کے بٹوارے میں جتنا نقصان ہندوؤں اور سکھوں کا ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کا ہوا ہے۔ انہیں خداداد مملکتِ پاکستان ضرور نصیب ہوا جو اسلام کا قلعہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف تقسیم کے وقت ساڑھے تین کروڑ مسلمان ہندوستان میں ہی رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھی ہندوؤں اور سکھوں کی طرح بہت نقصان اُٹھایا ہے۔ اول تو ان کی دیش سے وفاداری تقسیم کے اول روز سے ہی مشکوک رہی ہے۔ حالاں کہ وہ آزاد بھارت کی آئین کے رو سے تمام حقوق برابر کے پا رہے ہیں۔ دوئم ان کے مشترکہ خاندان کے افراد اور رشتہ داروں کا اِدھر سے اُدھر ہجرت کر جانا مسلمانوں کا شدید المیہ رہا ہے۔''11

ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان سے جو شرنارتھی بھارت پہنچ رہے تھے ان کی مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں آئے شرنارتھی سڑکوں پر تھے، کچھ کیمپوں اور کچھ نے لکڑی کے سہارے خیمے بنا کر رہنے پر مجبور تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنہیں جہاں کہیں زمین کا ٹکڑا دکھائی دیا اسے اپنی ملکیت بنا لیا اور اپنی مالی حیثیت کے مطابق کچی چہار دیواری بھی کھڑی کر لی۔ آنے والے لوگوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ جو کہ پشاور، مردان، پنڈی، لاہور، میاں والی، بنوں کوہاٹ، ایبٹ آباد اور کوئٹہ سے بلا کسی روک ٹوک کے سرحد پار کر رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول تھا۔ بھوک سے بچے تڑپتے رہتے تھے۔ کتنے لوگ بھوک اور وسائل کی کمی کے باعث موت کا شکار ہو رہے تھے۔ نئی نئی بیماریاں پھیل رہی تھیں، عوام کے ساتھ حکومت بھی پریشان تھی کیوں کہ بہ یک وقت اتنے وافر تعداد کے لوگوں کو ٹھکانے لگانا اور ان کو گھر دلانا آسان کام نہ تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ فسادات کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

گاندھی جی ملک کی حالت زار پر فکر مند تھے۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کی جان کو خطرہ بھی لاحق تھا۔ حکومت کو یہ خدشہ تھا کہ کوئی شرنارتھی یا کوئی بنیاد پرست ہندو گاندھی جی کو نقصان نا پہنچا دے۔ کیوں کہ ملک کی عوام گاندھی جی کے خلاف ہو گئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا پاکستان کے لیے رضامند ہونا، اس کے علاوہ گاندھی جی نے 55 کروڑ روپیہ (صحیح رقم 75 کروڑ بتائی جاتی ہے) جو تقسیم کے وقت پاکستان کا جائز حصہ تھا اسے ہندوستانی حکومت کو

ادا کرنے پر مجبور کیا کہ نئے ملک میں اس کی از حد ضرورت ہے۔جس کا ردِعمل شدید ہوا، ملک کی ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ نے گاندھی جی کی سخت مخالفت کی۔ اخبارات نے بھی اس موضوع کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔عوام پہلے ہی تقسیم کی وجہ سے نالاں تھی اس نے جلتی آگ میں گھی کا کام کیا۔دیش کی عوام گاندھی جی کے خلاف ہوتی جارہی تھی۔ایک دن گاندھی جی شرنارتھیوں کے کیمپوں کا دورہ کرنے گئے وہاں لوگ کافی غصے میں تھے۔انہوں نے گاندھی جی کی مخالفت کی۔گاندھی جی نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ آزادی پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے یہ سننا تھا کہ لوگ آپے سے باہر ہوگئے۔جتیندر بلو اس وقت کے منظر کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ سننا تھا کہ مجمع میں کھڑے ہوئے سرحدی لوگ بھڑک اٹھے،ہم یہاں بھکاریوں کی طرح پڑے ہوئے ہیں،آپ اسے آزادی کہتے ہو،شرم کرو شرم،ہم یہاں بھوکے مر رہے ہیں۔تمہارا کوئی سیاسی رہنما اِدھر سے نہیں گزرا۔ہمارے بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں، مر رہے ہیں،کوئی مدد ہم تک نہیں آئی،تم اسے آزادی کا نام دیتے ہو؟؟''12

اس واقعے نے گاندھی جی کو بہت رنجیدہ کیا۔انہوں نے حکومت سے اپیل کی کہ شرنارتھیوں کے قیام کے لیے جلد از جلد ایک نیا نگر تعمیر کیا جائے۔دو تین ماہ کے اندر نیا نگر راجندر نگر کے نام سے تعمیر ہوا جہاں شرنارتھی اپنے اپنے سامان کے ساتھ بستے گئے۔اس طرح دہلی کا راجندر نگر قائم ہوا تھا۔ملک کی آزادی کی جہاں خوشی تھی وہ ملک کی تقسیم نے پانی میں ملادی۔اس کا دکھ گہرا تھا جس کے نتائج دیرپا ثابت ہوئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان نفرت، تناؤ اور کشیدگی بڑھتی رہی جو آج تک جاری ہے۔جتیندر بلو کی خودنوشت میں نہ صرف ان کی ذات سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ ہم ہندوستان کے ایک خاص دور سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ جتیندر بلو، دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (حصہ سوئم)، کتاب دار، ممبئی، 2017، ص: 23
2۔ جتیندر بلو، دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (حصہ اول)، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، 2014، ص: 4
3۔ جتیندر بلو، دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (حصہ اول)، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، 2014، ص: 66
4۔ ایضاً، ص: 89
5۔ ایضاً، ص: 92
6۔ ایضاً، ص: 93
7۔ ایضاً، ص: 95
8۔ ایضاً، ص: 98
9۔ جتیندر بلو، دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (حصہ سوئم)، کتاب دار، ممبئی، 2017، ص: 23
10۔ ایضاً، ص: 39
11۔ جتیندر بلو، دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (حصہ اول)، قلم پبلی کیشنز، ممبئی، 2014، ص: 62
12۔ جتیندر بلو، دیکھو ہم نے کیسے بسر کی (حصہ دوم)، کتاب دار، ممبئی، 2017، ص: 13

شان الحق حقی: افسانہ در افسانہ

سنہ اشاعت: 2018

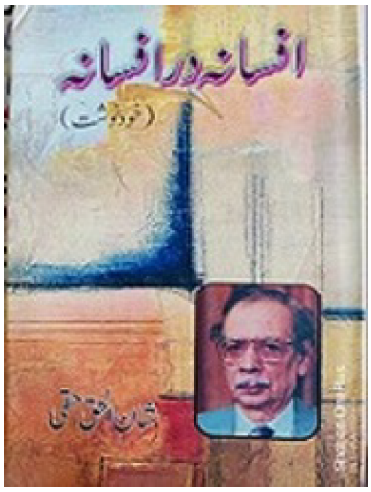

افسانہ در افسانہ (شان الحق حقی)

مشہور صحافی، ماہر لسانیات، مترجم، نقاد و محقق اور شاعر شان الحق حقی 15 ستمبر 1917 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مولوی احتشام الدین حقی دہلی کے ایک علمی خانوادے کے فرد اور اپنے وقت کے مشہور ادیب و ماہر لسانیات تھے۔شان الحق نے مڈل اور بی۔اے تک تعلیم کے مراحل پیشاور اور علی گڑھ میں طے کیے۔ایم۔اے انگریزی سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے کیا۔ان کی عملی زندگی کا آغاز 1943 میں شروع ہوا جب وہ آج کل دہلی کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔محکمۂ مطبوعات اور فلم سازی کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر بھی کام کیا۔ملازمت سے رٹائر ہونے کے بعد یونائیٹڈ ایڈورٹائز (کراچی) کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ان کے شب و روز کے بیشتر اوقات علمی، ادبی مشاغل اور فکر و فن کی گتھیاں سلجھانے میں گزرتے تھے۔ادب میں شاعری، تنقید، لسانیات، تالیف و ترتیب اور تخلیق میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔اس کے علاوہ وہ ایک بہترین لغت نویس بھی تھے۔جدید آکسفورڈ اردو انگریزی ڈکشنری ان کی ہی مرتب کردہ ہے۔رسالہ ''اردو نامہ'' کراچی کی ادارت بھی کی۔غرض کہ تخلیق سے تنقید و تحقیق تک اور بڑوں کے ادب سے بچوں کے ادب تک ہر میدان میں انہوں نے اپنے قلم کا جادو چلایا ہے۔عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، سنسکرت، ترکی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ان کی ادبی خدمات کے لیے پاکستان نے تمغۂ امتیاز اور تمغۂ قائداعظم سے نوازا۔11 اکتوبر 2005 کو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں آپ کا انتقال ہوا۔

شان الحق نے اپنی خودنوشت ''افسانہ در افسانہ'' کے نام سے لکھی ہے جو ایم۔آر۔پبلی کیشنز نئی دہلی سے 2018 میں شائع ہوئی۔تقریباً 400 صفحات کی اس خودنوشت کو انہوں نے الگ الگ باب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کا ایک عنوان بھی دیا ہے جس کو پڑھ کر مذکورہ باب کا ہلکا سا خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔خودنوشت کا مقدمہ پروفیسر خواجہ محمد زکریا نے ''افسانہ از افسانہ می خیزد'' کے نام سے لکھا ہے۔شان الحق حقی نے اردو ادب کی خدمت مختلف جہتوں میں کی ہے اور یہ تمام جہتیں اس خودنوشت میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔چوں کہ ان کے مزاج میں انکساری حد درجہ پائی جاتی تھی اس لیے انہوں نے اپنی زبان قلم سے ان کی تفصیل بہت کم دی ہے۔صرف شاعری اور تراجم کا ذکر تفصیلی کیا ہے اور اپنے باقی کام کو رواداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔افسانہ در افسانہ زمانی اعتبار سے نہیں لکھا گیا ہے اس کا اعتراف مصنف نے بھی کیا ہے۔لیکن اس کی دلچسپی اور افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔پروفیسر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

> ''اردو کی بہت کم آپ بیتیاں ہیں جو افادیت میں افسانہ در افسانہ کی برابری کر سکتی ہیں۔یہ آپ بیتی ادبی، علمی، سماجی اور تہذیبی غرض بے شمار سطحوں پر ہمیں روشنی فراہم کرتی ہے۔''1

شان الحق حقی نے اپنی خودنوشت میں تقسیم ہند اور اس کے اثرات کے ساتھ لوگوں کے جذبۂ آزادی کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے کہ شان الحق نے اپنی خودنوشت کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ''گزری ہوئی صدائیں'' کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے بچپن کی یادوں کو پیش کیا ہے۔ مختلف یادوں کے ساتھ اپنے آس پاس کے لوگوں میں آزادی کا جو جذبہ دیکھا تھا اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ 1920 کے آس پاس کا زمانہ ہے لکھتے ہیں کہ اس وقت نعت میلاد کے علاوہ اگر کوئی اور بول جو سب کی زبان پر تھا تو وہ تحریک آزادی سے تعلق رکھتے تھے۔ خودنوشت میں ایسے کئی اشعار درج کیے ہیں جو جذبہ آزادی سے بھرپور ہے۔ جیسے:

''سرکار ظالم، نہیں رکھنی نہیں رکھنی، نہیں رکھنی

آگے لکھتے ہیں ''یہاں نہیں پر جو جھٹکا آتا تھا اس میں بڑا عزم جھلکتا تھا۔ بعض لوگ مُکّا اٹھا کے نہیں رکھنی کہتے تھے..... بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو، یہ بھی بچے بچے کی زبان پر تھا۔''2

شان الحق جب پیدا ہوئے تو جنگ عظیم اول اپنے اختتام پر تھی۔ ہندوستان میں اس وقت علی برادران کی تحریک خلافت اور گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی۔ لوگ گاندھی جی کی ایک آواز پر سب کچھ چھوڑ کر دوڑے چلے آتے تھے۔ شان الحق کے پھوپھی زاد بھائی عدم تعاون تحریک شروع ہونے پر علی گڑھ سے تعلیم چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ گاندھی جی کی تلقین پر بدیسی چیزوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ نواب سر مزمل اللہ خاں کی صاحبزادی اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں کہ آئندہ اس ''نجس چیز'' یعنی بدیسی کپڑے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ اس وقت بڑے بوڑھوں کے ساتھ بچے بھی جذبۂ آزادی سے سرشار تھے۔ سب اپنی اپنی حیثیت کے مطابق انگریزی حکومت کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ہندو ہو یا مسلمان سب متحد ہو کر آزادی کی لڑائی میں خلوص نیت کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے۔ بچے ایک ساتھ مل کر انقلاب زندہ باد کے ساتھ بندے ماترم کا نعرہ لگاتے۔ 1857 کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب دونوں قومیں ایک دوسرے کے ہم دوش ہو کر برطانوی اقتدار کے مقابل آ گئی تھیں۔ محبت و اخوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مسلمانوں کا گاندھی جی کی ترک موالات تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور گاندھی جی کا خلافت تحریک کو اپنا کاز بنا لینا کوئی عجیب بات نہ تھی کیوں کہ یہ تحریک خالص اسلامی مسئلوں پر مبنی تھی۔ یہ اتحاد پھر کبھی دیکھنے کو نہ ملا۔ اسی اتحاد کا تذکرہ بیشتر خودنوشت نگاروں نے کیا ہے۔

لوگوں میں آزادی کی تمنا اس قدر گھر کر گئی تھی کہ ہر مذہب کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر آ گئے تھے لیکن کچھ شر

پسندوں کی وجہ سے یہ اتحاد ٹوٹ گیا، شدھی سنگٹھن اور تبلیغ کی تحریکیں چلیں اور فسادات پھوٹ پڑے۔ انگریزوں نے بھی ہند کی عوام کو مذہب کے بنا پر لڑا کر ایک دوسرے کے خلاف کر دیا کیوں کہ ان کی پالیسی بھی یہی تھی کہ پھوٹ ڈالو اور راج کرو۔ مصنف نے ہندو مسلم کے اتحاد اور اس کے ٹوٹنے پر اپنی خودنوشت میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''1931 کے بعد ہندو مسلم رواداری کی وہ فضا دیکھتے دیکھتے ہوا ہو گئی.....تحریک آزادی میں مسلمان لیڈر خلافت کے نام پر شریک ہوئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلم عوام کے دل میں آزادی کی لگن بھی ضرور تھی.....ہمیں اپنے ارد گرد جو ہندو نظر آتے، سیدھے سادے بے ضرر سے لوگ لگتے تھے۔ مگر عام طور پر تو یہی تأثر تھا کہ ہندو مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں، اور یہ تاثر بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہندو مسلم فساد کی خبریں آتیں تو یہی باور کیا جاتا تھا کہ ظالم ہندوؤں نے معصوم مسلمانوں کو مارا ہوگا، اور اس پر بہت خون کھولتا تھا۔ دہلی کے ایک مسلمان (خوش نویس) عبدالرشید نے شردھانند کو قتل کیا.....
> میں نے شردھانند کی ارتھی کے ساتھ ساتھ یہ نعرہ بھی سنا کہ بولو بولو شری سوامی شردھانند جی کی جے اور غازی عبدالرشید کے جنازے پر اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعرے بھی .....اس فضا میں اتحاد کی جگہ عناد کی پرورش ہوتی رہی۔ مسلمان دھڑلے سے قربانی کی گایوں کو سجا سنوار کر گلی کوچوں سے لے جاتے اور بقرعید مناتے.....فرقہ پرست ہندو بھی مسجدوں کے آگے سے باجے بجاتے ہوئے نکلتے.....کبھی کبھی مسجدوں میں سور کا گوشت بھی پڑا ہوا پایا جاتا۔''3

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں کس قدر فرقہ واریت بڑھ گئی تھی، دونوں قومیں ایک دوسرے کو مذہب کی بنیاد پر ٹھیس پہنچانے میں حد پار کر دی تھی۔ دراصل گائے ہندو دھرم کے لیے ''دیوی ماتا'' کے مانند ہے دیوی کی طرح اس کی پوجا کی جاتی ہے اب ہندو یہ کہاں برداشت کرتے کہ ان کے سامنے ہی ''گو ہتیا'' ہو رہی ہو۔ دوسری طرف سور مسلمانوں کے لیے حرام کی گئی ہے۔ مسجدوں میں اس کا گوشت ملنا فرقہ واریت کو بڑھاوا دینا تھا۔ ان سورشوں کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج قائم ہوئی وہ دن بہ دن بڑھتی ہی رہی بلکہ آج تک یہ جاری ہے۔ 1930 میں جب گاندھی جی کی رہنمائی میں تحریک آزادی شروع ہوئی تو ملک کے ہر کونے سے لوگ اس تحریک میں شامل ہو گئے اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر میدان جنگ میں کود پڑے۔

اسی سال دنیا بھر میں بے روزگاری پھیل گئی۔اس عالم گیر کساد بازاری کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا یہاں سے مال و زر انگریز کم داموں میں اپنے ملک پہنچاتے، لوگوں کو ملازمت سے نکالا بھی گیا۔جس سے بے روزگاری بڑھی، گورنمنٹ نے سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں دس فیصد کی کٹوتی کر دی، بہت ہائے ہائے مچی۔انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اس وقت ملک کی معیشت پوری طرح چوپٹ ہوگئی تھی۔ ہندوستانی عوام بھوکوں مر رہی تھی۔ برصغیر کے سیاسی افق پر جو شخصیات نمودار ہوئیں ان میں سے اکثر عقائد و مقاصد کے اختلاف سے قطع نظر بڑی عظیم شخصیتیں تھیں۔ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو بنا کسی غرض اور فائدے کے اپنے جان و مال کی قربانی دے رہے تھے کیوں کہ ان کو ہر صورت میں ہندستان کی آزادی پیاری تھی۔دوسری جنگ عظیم کے وقت انگریزوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔جنگ کے خاتمے کے بعد برطانیہ میں معاشی بحران پیدا ہوگیا۔شان الحق لکھتے ہیں:

> ''جنگ کے خاتمے پر برطانیہ کو شدید مسائل درپیش تھے۔اس کی املاک، اس کے شہر، اس کے کارخانے مسمار تھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس تک ٹوٹا پڑا تھا.....لاکھوں آدمی جنگ میں کام آچکے تھے، معیشت تباہ تھی امریکی قرضوں کا بوجھ زبردست تھا.....ادھر خود مقبوضہ ممالک کے مسائل دشوار تر ہوتے جا رہے تھے اور ان پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے افرادی قوت بھی نہ تھی.....''4

اب برطانیہ حکومت کو ایسی صورت میں اپنے ملک کو سنبھالنا تھا۔ ہندوستانی مسائل کو ختم کرنا اب اس کے بس میں نہ تھا۔اس لیے ہندوستان کو آزاد کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔اس وقت ہندوستان میں مسلم لیگ پاکستان کی مانگ کر رہی تھی۔ بعد میں ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے بھی اس پر مہر لگا دی۔جیسے ہی تقسیم کا اعلان ہوا ملک گیر فسادات شروع ہو گئے۔ ملک کی فضا سخت زہرناک ہو چکی تھی۔ ہندو مسلم دونوں ایک دوسرے کے جان کے دشمن بن گئے۔ جو کبھی ان کے قریبی ہم سائے ہوا کرتے تھے اچانک جانی دشمن بن گئے۔1946 کے فسادات کی تفصیل خودنوشت میں موجود ہے۔اس وقت شان الحق کلکتہ میں تھے اور ان فسادات کا آنکھوں دیکھا حال اپنی خودنوشت میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔درج ذیل اقتباس سے اس وقت کے حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ''16 اگست 1946 کا قتل عام رونما ہوا جب کہ ایک دن میں ہزاروں آدمی ہلاک اور بستیاں کی بستیاں اجڑ گئیں یا خاکستر کر دی گئیں۔علی پور کی وہ سڑک جہاں سے ہم آئے

تھے اس پر گنے چنے مسلمان گھر آباد تھے، سنا گیا کہ ان میں ایک بھی سلامت نہ بچا۔ نہر کے کنارے دھوبی گھاٹ تھے اور دھوبی تمام ہندو جو ایک ایک گھر سے واقف تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی نشان دہی پر ایک ایک گھر کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ چار دن ہم وہاں اور ٹک گئے ہوتے تو خاتمہ بخیر تھا۔ کم از کم تین میل خضر پور تک کوئی مفر تھا نہ جائے پناہ۔''5

شان الحق جس محفوظ مقام پر جا کر ٹھہرے لکھتے ہیں ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ جس فلیٹ میں وہ مقیم تھے وہاں آس پاس کے لوگوں سے اپنا تعارف کرانے سے بھی کتراتے تھے کیوں کہ ان کو یہ خوف تھا کہ اگر یہ علاقہ ہندوؤں کا ہوا تو وہ نہیں بچیں گے۔ وہاں کے لوگ محض فسادیوں کو انگریزی میں برا بھلا کہتے اور فرقہ واریت کی مذمت کرتے۔ لیکن ایک دن آس پاس سے نعرۂ تکبیر کی آواز آئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ 1946 میں جو فساد شروع ہوا وہ پورے ایک سال تک کم وبیش چلتا رہا۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''فساد جو ایک بار پھوٹا تو رکنے میں ہی نہ آیا۔ پورے سال بھر تک خانہ جنگی کی کیفیت رہی۔ راتیں بے چین گزرتی تھیں، ایک سمت سے برابر حملے کا خطرہ رہتا تھا۔ گھنٹوں چھت پر بیٹھے حملے کا انتظار کرتے رہتے۔ کبھی سنا جاتا کہ سکھ آ رہے ہیں، کبھی یہ کہ ہندوؤں کا ریلا گلی کے ناکے تک آ پہنچا ہے۔ کبھی کبھی تو شور اتنا قریب آ جاتا کہ ہم سمجھتے بس اب لپیٹ میں آ ہی گئے۔ چھت کی منڈیریں ادھیڑ کر اینٹیں جمع کر لی تھیں۔ یہی ہمارا واحد دفاعی ہتھیار تھا آس پاس کی چھتوں پر بھی یہی عمل ہوا تھا.....اس مرکز پر بہت سے لوگ فریاد لے کر آتے کہ ہمارے آدمی فلاں فلاں علاقے میں تھے، ان کی خیر خبر معلوم کی جائے اور زندہ ہوں تو نکالا جائے۔ کچھ فوجی ٹرک مل گئے تھے۔ ان میں بیٹھ کر بچاؤ کی ان مہموں پر میں بھی چند بار گیا۔ لیکن کہیں بھی کوئی آدمی نہیں مل سکا جسے بچا کر لایا جاتا۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ لوگ جان بچا کر بھاگ گئے ہیں لیکن قیاس یہی کہتا تھا کہ ٹھکانے لگا دیے گئے۔ راستوں پر جگہ جگہ لاشیں پڑی ہوئی دکھائی دیتیں۔ عجیب بھیانک مناظر تھے جنہیں بیان کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ آنکھ سے جو دیکھا سو دیکھا، ایک روز میں اسٹیٹس مین کے دفتر میں بیٹھا تھا، وہاں میز پر تصویروں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا جو مجھے یقین ہے کہ کبھی چھپنے نہیں پائیں۔ عجیب دل دوز مناظر تھے ان سب کا خلاصہ ایک ایسی تصویر تھی جو

اب بھی آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ دریائے ہگلی کے کنارے لاشوں کا ایک لمبا چبوترہ سا چنا ہوا تھا جو غالباً شہر کے مختلف علاقوں سے ڈھوکر وہاں دریا برد کرنے کے لیے لائی گئی ہوں گی۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں اور بچے بھی تھے اور سب مادرزاد برہنہ۔ بنگال میں افلاس کا دور دورہ تھا اور کپڑے کا کال۔ اُن تمام لاشوں کی لنگیاں، دھوتیاں، ساڑیاں اُتار کر انہیں یکسر چُم کر دیا تھا۔ معلوم نہیں کہ یہ کارروائی اِس تکمیل کے ساتھ کس مرحلے پر کی گئی ہوگی۔''6

اقتباس طویل ہو گیا ہے لیکن اس میں وہ تمام باتیں آ گئی ہیں جو اس وقت کے دلسوز مناظر کی منظر کشی کرتی ہیں، کس قدر حیوانیت پر لوگ اتر آئے تھے اندازہ لگانا مشکل ہے۔ آخر کار وہ صبح بھی آئی یعنی ایک سال بعد تقسیم کے ساتھ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ لوگ آزادی کے جشن میں خوشیاں منا رہے تھے۔ لیکن یہ خوشی عارضی تھی۔ جب ہندوستان آزاد ہوا اس وقت شان الحق کلکتہ میں ہی تھے لکھتے ہیں کہ:

''15 اگست 1947 کی صبح ہندوستان میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ وہی کلکتہ ہے جہاں کل تک خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہندو مسلمان آپس میں گلے مل رہے تھے۔ ہم بے کھٹکے ان علاقوں میں گئے جہاں سے گزرنا محال تھا۔ ہندو دکان دار ہمارے بچے کو گود میں لے کر مٹھائی کھلا رہے تھے۔ شہر میں پھول پان بٹ رہے تھے۔ آدمیوں سے لدے ہوئے ٹرک دوڑتے پھر رہے تھے اور نعرے لگ رہے تھے کہ 'ہندو مسلم ایک ہیں'.....شدید جذباتیت کا اب کوئی اعتبار باقی نہیں رہا۔ جوش و اخوت کے وہ جھاگ جو 15 اگست 1947 کو اٹھے جلد ہی بیٹھ گئے۔ ٹھہر ہی نہیں سکتے تھے کہ چاروں طرف فساد پھوٹ پڑا تھا۔''7

دہلی اور اس کے آس پاس فسادات شروع ہوئے اور ملک کے مختلف حصوں سے بھی فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں نے لوگوں کو مشتعل کر دیا۔ ہندوؤں کا ماننا تھا کہ مسلمان اپنے ملک یعنی پاکستان چلے جائیں یہاں ان کی کوئی ضرورت نہیں اسی طرح پاکستان میں مسلمان ہندوؤں کے دشمن بن گئے تھے۔ یعنی سرحد کے دونوں پار فساد ہو رہے تھے۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو گئی تھیں اور جس بربرتا کے ساتھ قتل و غارت اور لوٹ مار مچائی کی کہ انسانیت بھی شرم سار ہو گئی۔ شان الحق نے اپنی خودنوشت میں اس بربریت کا ذکر بھی بڑے دلسوز انداز میں کیا ہے۔

انہوں نے ان ٹرینوں کا بھی ذکر کیا ہے جو لاشوں سے بھری سرحد پار پہنچ رہی تھیں۔

ان فسادات میں دہلی شہر کے تمام مسلمان پرانے قلعے میں جان بچانے کے لیے پناہ گزیں ہو گئے۔ ان کی ساری جائداد، گھر بار لوٹ چکا تھا۔ ہندو پاکستان سے ہندوستان آ رہے تھے اور وہاں پر ہونے والے ظلم کی داستان سناتے تو یہاں کے ہندو غم و غصے میں بھر جاتے۔ مسلمانوں کو مارنا ان کی جائداد کو لوٹنا اپنا مقصد بنا لیا تھا یہی حال پاکستان میں بھی تھا۔ برطانوی حکومت کو جب جس وقت اور جو کچھ کرنا تھا اس نے وہی کیا اور اتنی چالاکی کے ساتھ کیا کہ کوئی اس کی طرف انگلی نہ اٹھا سکا۔ اس نے اپنا دامن ہر الزام سے بچائے رکھا جو سرخ سیاہ دھبے نظر آتے ہیں وہ دوسرے کے دامن پر نظر آ رہے ہیں۔ تقسیم کا نظریہ پیش کرنا کہنے کو تو انگریزوں نے نہیں کیا تھا لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے بلکہ ہر کسی کو پتا ہے کہ کس طرح انگریزوں نے اپنی پالیسیوں اور چالاکیوں سے یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو توڑا اور ان میں اتنی نفرت پیدا کر دی کہ مسلمانوں کو مستقبل میں اپنی حفاظت اور مفاد کے لیے الگ ملک کی مانگ کرنی پڑی اور اس تقسیم کا نتیجہ آج تک ہم بھگت رہے ہیں۔ اس سلسلے میں شان الحق لکھتے ہیں:

> ''ریڈکلف کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ جہاں جواز موجود ہو تھوڑا بہت ردوبدل کر دے۔ وہ اگر مسلم اکثریت کا تھوڑا سا علاقہ کاٹ کر ہندوستان کو نہ دیتا تو اس پر یہ الزام آ سکتا تھا کہ گویا اس نے کشمیر کی قسمت کا فیصلہ اپنے قلم سے کر دیا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر کیوں لیتا۔ لہٰذا اس کا پہلو بھی بچا ہوا ہے۔ نقصان انہوں نے اٹھایا جو ہوا کا رخ نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی ساری توجہ اپنے ہی فوری مسئلے کی طرف تھی۔ آزادی کی آمد نے اور سٹپٹا دیا تھا جو اچانک سر پر آ پہنچی تھی۔ ہمارے سیاسی شعور کو دیکھیے کہ بعض لوگ آج تک یہ کہتے ہیں کہ قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن کے دونوں ممالک کا گورنر جنرل بننے کے خواب پر پانی پھیر کر کام بگاڑ دیا۔''8

شان الحق بھی تقسیم کے بعد اکتوبر 1947 میں پاکستان چلے گئے۔ ملک کی تقسیم کو وہ صحیح مانتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ برصغیر میں جو حالات پیدا ہوئے تھے اور جو کشیدگی ہندو مسلم کے درمیان پیدا ہوئی تھی اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا الگ ملک کی مانگ کرنا درست تھا۔ تقسیم کے بعد ہر ایک چیز کا بٹوارہ شروع ہوا اس کی تفصیل مصنف نے مذکورہ خودنوشت میں دی ہے۔ ساتھ ہی جب یہاں سے مسلمان مہاجر بڑی تعداد میں پاکستان اچانک پہنچے ان کو روزگار اور مکان دینے میں جو دشواری آئی اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک ساتھ بڑی تعداد میں مسلمان پاکستان پہنچے اور وہ سب کے سب شہر میں

ہی بسنا چاہتے تھے کیوں کہ وہاں روزگار کے وسائل مل جاتے یہ ایک اہم مسئلہ تھا جو پاکستانی حکومت کے لیے دردسر تھا۔ اس وقت لوگوں کو جو جذباتی ٹھیس پہنچی اور اپنوں سے بچھڑنے اور کھونے کا جو غم تھا اس کا بھی بیان بڑے دل سوز انداز میں کیا ہے۔ جس بنیاد پر پاکستان کا قیام ہوا تھا پاکستان کے بننے کے بعد ان کو ہی بھلا دیا گیا اس کی بھی تفصیل ملتی ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان مالی بحرانی کا شکار ہوا اس کا ذکر بھی مختصراً کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بڑے دوررس نتائج سامنے آئے۔ جس کے زخم آج تک نہیں بھرے ہیں۔ بقول شان الحق:

''آزادی کے بعد نہ صرف یہاں بلکہ ساری تیسری دنیا میں جو اقدار کی زبونی اور اخلاق کا زوال نظر آیا، وہ معاشی پستی پر مستزاد ہے۔

سنتے ہیں کہ اُترے تو سہی طوق وہ لیکن کچھ اور بلائیں ہیں گلے آن کے پڑیاں

اس سے بھی زیادہ عبرت خیز وہ باہمی آویزشیں، سیاسی پیچیدگیاں اور خون خرابے ہیں جو زندگی کا معمول بن کر رہ گئے ہیں۔

چھٹے ہیں صید کیا دامِ زبوں سے کہ اب صیاد و صید افگن ہوئی ہیں

اپنی ساری علتوں کے ذمہ دار ہم خود ہیں یا ہمارے ہمسائے، کہ بٹوارے کے باوجود گویا ایک ہی کشتی میں سوار یا ایک ہی تلاطم سے دوچار ہیں.....اس میں کیا شک ہے کہ تقسیم کے وقت ہمارے دل وجگر کے بہت سارے ٹکڑے وہاں رہ گئے تھے۔''9

مختصراً اس خودنوشت میں جہاں شان الحق کی شخصیت سے پردہ اٹھتا ہے وہیں برصغیر کی سیاسی وسماجی حالات کی بھی جانکاری ملتی ہے۔ اس میں مصنف نے بہت سے اہم واقعات کو پیش کیا ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے کتابوں کی تقسیم کے مسئلے پر بھی جائزہ لیا ہے جو ہندوستان کی مرکزی لائبریریوں میں موجود تھیں اور تقسیم کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ جن کتابوں کی دو جلدیں ہیں ان میں سے ایک پاکستان کو دی جائیں گی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس واقعے کا ذکر اختر حسین رائے پوری نے بھی اپنی خودنوشت ''گرد راہ'' میں کیا ہے۔ جوشؔ نے اپنی خودنوشت میں پاکستان میں اپنی ناقدری کا جو رونا رویا ہے اس سے شان الحق نے سرے سے انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جوشؔ کی یہاں بہت عزت ہو رہی تھی نہیں معلوم کہ وہ ایسا کیوں کر گئے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے اور جوشؔ کے ان اختلافات سے بھی پردہ اٹھایا ہے جس کا ذکر جوشؔ نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ شان الحق حقی، افسانہ در افسانہ، ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2018، ص: 5
2۔ ایضاً، ص: 94
3۔ ایضاً، ص: 200
4۔ ایضاً، ص: 206
5۔ ایضاً، ص: 85
6۔ ایضاً، ص: 86,87
7۔ ایضاً، ص: 90
8۔ ایضاً، ص: 205
9۔ ایضاً، ص: 206

پچھلے صفحات پر جدو جہد آزادی اور تقسیم ہند کے اثرات سے متعلق متفرق خودنوشتوں کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد منظر عام پر آنے والی کم وبیش تمام خودنوشتوں میں مذکورہ موضوعات پر نہ صرف کھل کر بحث کی گئی ہے بلکہ مصنفین نے اپنے تجربات کی بنا پر آرا بھی پیش کی ہیں۔ دراصل 1947 کے بعد جو بھی خودنوشت شائع ہوئی اس میں تقسیم ہند کے سانحات کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔ ان خودنوشتوں میں بس فرق یہ ہے کہ کچھ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے تو کسی نے سرسری طور پر تو کسی نے اس تعلق سے محض ایک واقعے کو اپنی سرگزشت میں جگہ دی ہے۔ آگے ایسی ہی خودنوشتوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا جن میں خودنوشت نگاروں نے تحریک آزادی اور تقسیم ہند سے متعلق واقعات کو ایک یا دو ابواب میں پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں جن میں محض کسی ایک پہلو پر خودنوشت نگاروں نے اپنی بات رکھی ہے مثلاً تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کی دشمنی، ہندوستان میں مسلمانوں کی کسمپرسی، آئے دن ہونے والے فسادات وغیرہ وغیرہ۔ کچھ ایسی خودنوشتیں بھی موجود ہیں جو مکمل خودنوشت کے زمرے میں نہیں آتیں لیکن اپنی سماجی وسیاسی نوعیت کی بنا پر اس صنف میں اہم مقام رکھتی ہیں اور فن کے تقاضے کو بھی پورا کرتی ہیں۔ ان خودنوشتوں کے نام بھی اسی باب میں شامل کیے گئے ہیں ساتھ ہی جہاں تک ممکن ہوسکا ہے ان کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

ترکی کے فوجی افسر ظفر حسن ایبک نے اپنی خودنوشت جو کہ یادداشتوں پر مبنی ہے ''خاطرات'' کے نام سے لکھی تھی۔ اردو کی مشہور ویب سائٹ ریختہ ڈاٹ کام پر اس خودنوشت کا پہلا حصہ موجود ہے جو کہ منصور بک ہاؤس، لاہور سے 1964 میں شائع ہوئی۔ یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا۔ ظفر حسن نے اپنے ملک وقوم کے لیے کارہائے نمایاں خدمات انجام دیں۔ 300 صفحات پر مشتمل ان کی یہ کتاب سیاسی حالات اور وطن کی آزادی سے متعلق حالات پر مبنی ہے۔ ساتھ میں ان کی زندگی کا ابتدائی دور اور بچپن کی حسین یادیں بھی موجود ہیں۔ اس عہد میں برصغیر کے سماجی، معاشی و سیاسی حالات کو اپنی ذات کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ خصوصاً جب وہ لاہور کالج میں زیر تعلیم تھے تب طلبہ کی حب الوطنی اور آزادی کے تئیں ان کے رجحان کو مختلف واقعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔

اصل کتاب کا آغاز 1915 سے ہوتا ہے جب ظفر حسن کی قومی سیاست وملی جدو جہد کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اور ان کے ساتھی برصغیر کی آزادی کے لیے افغانستان کے بادشاہ سے مدد لینے کے لیے پہنچے لیکن ان کو کامیابی نہ ملی اور پکڑے گئے۔ بعد ازاں ان لوگوں کو سخت نگرانی میں کئی سالوں تک وہیں رکھا گیا۔ وہاں رہتے ہوئے ظفر حسن نے سیاسی وسماجی حالات کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا۔ انہوں نے مختلف واقعے کے ذریعے افغانستان کے سیاسی وسماجی حالات اور ملک کی اندرونی خلفشار پر کھل کر تبصرہ کیا ہے۔ نیز یہ خودنوشت انگریزوں کے مظالم، ان کی چالبازیوں و پالیسیوں کی

آئینہ دار بھی ہے۔ظفر حسن اور ان کے ساتھیوں نے ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے جو بھی کوششیں کی تھیں وہ تمام چیزیں خودنوشت میں موجود ہے۔ چوں کہ مذکورہ خودنوشت مصنف کی مکمل ذات کا احاطہ نہیں کرتی لیکن فن کے اعتبار سے کھری اترتی ہے چناں چہ اسے خودنوشت کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے بڑے مختصر انداز میں اپنی زندگی کے شب و روز کو آپ بیتی کی شکل میں تحریر کی۔''میرے گزشتہ شب و روز'' کے نام سے اس کتاب کو مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نے 1965 میں شائع کیا۔اس خودنوشت میں مصنف نے اپنے نجی حالات، ادبی و عملی زندگی اور معاصرین کے تذکرے کے ساتھ تقسیم ہند کے بعد ہونے والے فسادات اور ہجرت کو بھی پیش کیا ہے۔جگن ناتھ آزاد نے بھی لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ہجرت کا درد اور لاہور کی یادیں خودنوشت میں موجود ہیں۔

آغا جانی کاشمیری کی خودنوشت ''سحر ہونے تک'' اپنے آپ میں ایک منفرد کتاب ہے۔امپریل پریس دہلی سے 1966 میں شائع ہوئی تقریباً400 صفحات کی اس کتاب میں مصنف نے اپنے مخصوص انداز، بیباک اور رنگین مزاج میں اپنی زندگی کے شب و روز کو پیش کیا ہے۔جس میں اپنے دوستوں،فلم انڈسٹری سے جڑنے ،لکھنؤ اور مختلف شہروں مثلاً ممبئی کی تہذیب و تمدن کو پیش کیا ہے۔ساتھ ہی ہندوستانی سیاست کو بھی ضمنی طور پر بیان کرتے ہیں۔جس میں انگیریزوں کے مظالم، مہنگائی، ہندو مسلم فسادات، تقسیم ہند کا ذکر اپنی ذات کو پیش کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

مشہور سیاست داں اور مجاہد آزادی عبدالطیف بجنوری نے اپنی خودنوشت ''لطیف کی کہانی'' کے نام سے تحریر کی جو 1967 میں مدینہ پریس بجنور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب تحریک آزادی اور بعد کے زمانے کے سیاسی حالات پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہے۔مختلف ابواب میں منقسم تین سو سے زائد صفحات کی اس خودنوشت میں مصنف کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا ذکر ملتا ہے۔عبدالطیف 1920 سے لے کر تا عمر سیاست میں سرگرم عمل رہے۔انہوں نے نجی حالات یا گھر خاندان کے حالات سے زیادہ سیاست سے متعلق واقعات و اشخاص کا بیان کیا ہے۔ نیز تحریک آزادی سے متعلق اپنی کارکردگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے پیش کیے ہیں،جس میں ترک موالات، خلافت تحریک، شدھی و سنگھٹن، تنظیم و تبلیغ، نہرو رپورٹ، ،نمک ستیہ گرہ، جلیاں والا باغ سانحہ، سول نافرمانی کے تحت اپنی گرفتاری اور جیل کے حالات، فرقہ پرستی، فسادات، بھارت چھوڑو تحریک، تقسیم ہند، قیام پاکستان وغیرہ یہ تمام واقعات کو تفصیل سے نہ سہی ضمنی طور پر اپنی ذات کے حوالے سے بیان کیا ہے کیوں کہ وہ بذات خود ان تمام تحریکوں میں حصہ شامل تھے۔آزادی کے بعد ہندوستان میں

مسلمانوں کے حالات، تعصب پسندی، فرقہ پرستی کو بھی اشارتاً پیش کر کے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ تحریک آزادی سے متعلق اہم شخصیات جواہر لعل نہرو، گاندھی جی، ابوالکلام آزاد، علی برادران وغیرہ لوگوں سے متعلق کچھ دلچسپ معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ اس خودنوشت میں چوں کہ عبدالطیف بجنوری نے اپنی جو روداد زندگی پیش کی ہے وہ صرف سیاست سے ہی متعلق ہے انہوں نے جن حالات وواقعات اور اشخاص کا تذکرہ بھی کیا ہے ان کا بھی تعلق سیاست سے ہی ہے۔ اس لیے اسے خودنوشت کے ساتھ ایک خاص دور کے سیاسی حالات کی دستاویز بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس میں کچھ ایسے تاریخی واقعات شامل ہیں جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نواب احمد خاں چھتاری کی خودنوشت ''یاد ایام'' 1974 میں مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ ساڑھے چھ سو صفحات کی اس کتاب کو مصنف نے روزنامچوں اور یادداشتوں کی مدد سے ترتیب دی ہے۔ جس کا اندازہ خودنوشت کے واقعات اور اقتباسات سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی حالات زندگی، خاندان، بزرگوں، ہم عصروں اور اپنے اردگرد کے ماحول کو پیش کیا ہے جس میں برصغیر کی سماجی، سیاسی، تہذیبی وثقافتی پہلو سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے انگریزوں کے مظالم اور تحریک آزادی کا ذکر کیا ہے۔ نواب چھتاری 1920 سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے اور آگے ہونے والے الیکشن میں بحیثیت امیدوار جیت حاصل کی۔ انہوں نے اپنے دور کے حالات اور اشخاص کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ اس عہد کی سیاست اور ملکی حالات کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ترک موالات، خلافت تحریک، گول میز کانفرنس، انگریزوں کی پالیسی ان تمام امور پر ان کا نقطہ نظر بڑا ہی معروضی اور مدلل ہے۔ نواب چھتاری نے ہندوستان کی آزادی اور وطن کے دیگر مسائل کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، جس کا بین ثبوت ان کی خودنوشت ہے۔ اگر کسی کو برطانوی سامراج اور تحریک آزادی کے واقعات پڑھنے ہیں تو بقول وہاج الدین علوی ''نواب چھتاری کی خودنوشت کے ذریعہ اس جہاں گزراں کی سیر کر سکتا ہے۔''

اردو کے مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے اپنی خودنوشت ''اپنی تلاش میں'' کے نام سے شائع کرائی۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد 1975 میں اور آخری جلد 1982 میں منظر عام پر آئی۔ اس میں مصنف نے اپنے نجی حالات، گھر خاندان اور معاصرین کا ذکر کھل کر کیا ہے۔ دیگر خودنوشتوں کی طرح ''اپنی تلاش میں'' بھی اپنے عہد کے سیاسی حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس میں جدوجہد آزادی سے متعلق تحریکوں و بغاوتوں کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ خصوصاً خلافت تحریک، وہابی تحریک، بھارت چھوڑو تحریک اور 1946 میں بہار کے دل سوز فسادات کو کلیم الدین احمد نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی اپنی سرگزشت ''آپ بیتی'' کے عنوان سے لکھ کر اپنے ذاتی محاسن و معائب کے ساتھ گردونواح کے ماحول، آبا واجداد، تعلیم و تعلم، تصنیف و تالیف وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ 15 ابواب پر مشتمل تقریباً 400 صفحات کی اس خودنوشت کو مکتبہ فردوس لکھنؤ نے 1978 میں مصنف کے انتقال کے دو سال بعد شائع کیا۔ مذکورہ خودنوشت میں مصنف نے اپنے عہد کے تمام حالات و واقعات کو تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں تقسیم ہند سے پہلے اودھ کی تعلقہ داری و زمینداری اور اس کے خصائص کی عکاسی کے ساتھ معاشی و سماجی حالات، تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات، اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک، حکومت کے جبر کی داستان وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ عبدالماجد دریابادی بحیثیت مجاہد آزادی تحریک آزادی میں حصہ بھی لیے تھے۔ خلافت تحریک کے جلسوں میں خطابات کرتے، وہ پاکستان کے حق میں تھے لیکن مسلم لیگ کی پالیسیوں کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے خودنوشت کے باب ''سیاسی زندگی'' میں تفصیل سے سیاسی مسئلوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس پہلو سے جن شخصیتوں نے ان کو متاثر کیا ان میں علی برادران، سید محمود، چودھری خلیق الزماں وغیرہ کا ذکر خودنوشت میں موجود ہے۔

پاکستان کے ممتاز دانشور، کالم نگار اور وزیر دفاع کرنل غلام سرور کی خودنوشت ''آئینہ ایّام'' کے نام سے 1981 میں نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ مصنف کے 50 سالہ زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ 400 سے زائد صفحات کی یہ خودنوشت 24 ابواب میں مختلف عنوان کے تحت منقسم ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب مصنف کی ذات کے ارد گرد گھومتی ہے۔ مگر ساتھ ہی اپنے معاشرے کی سچی تصویر بھی پیش کرتی ہے۔ مصنف نے اپنی ذات کے علاوہ والدین، خاندان، معاصرین، اور اپنی عملی زندگی کو بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس وقت کے برصغیر کے سیاسی حالات پر بھی تبصرہ کرتے ہیں۔ اس کے آٹھویں باب ''ملکی حالات پر ایک نظر'' میں تقسیم ہند کا پس منظر، اس کے نتائج، فسادات، مہاجرین و شرنارتھیوں کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ خودنوشت کا یہ حصہ اس وقت کی سچی تصویر پیش کرتا ہے جب انسانیت کراہ رہی تھی اور ظلم و ستم کی ساری حدیں پار کر لی گئی تھیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی خودنوشت ''یادوں کا جشن'' کے نام سے سب سے پہلے پاکستان سے 1983 میں منظر عام پر آئی بعد ازاں ثمر آفسیٹ پریس دہلی سے 1986 میں دوسرا اڈیشن شائع ہوا، یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا۔ تقریباً 500 صفحات کی اس خودنوشت میں سترہ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے عہد کی سماجی، ثقافتی، معاشی زندگی کے ساتھ ہندوستان کی سیاست پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز مہندر سنگھ بیدی نے اپنی حالات زندگی، آبا واجداد، معاصرین، اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ نہ

صرف ایک اچھے شاعر بلکہ عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ان کی نثر کا جادو مذکورہ خودنوشت میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بہر کیف خودنوشت کے مختلف موضوعات سے قطع نظر سیاسی پہلو کو دیکھا جائے تو انہوں نے آزادی سے قبل برصغیر کے حالات کو پیش کرنے کے ساتھ تقسیم ہند کے بعد ہونے والی قتل وغارت گیری کا بیان بھی کیا ہے۔تقسیم ہند کے بعد جب دہلی کا امن وامان درہم برہم ہوا اور فرقہ وارانہ ہنگاموں نے شہر کی فضا کو نفرت اور بدگمانی کے غبار سے مکدور کیا تو شہر کی بگڑتی فضا کو بحال کرنے اور شہریوں میں باہمی اعتماد و یگانگت واپس لانے کے لیے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے مہندر سنگھ بیدی کو دہلی کا سٹی مجسٹریٹ مقرر کیا اور یہ اہم ذمہ داری سونپی۔مصنف نے فرقہ واریت کی آگ میں جلتی ہوئی دہلی کو اس آگ سے باہر نکالنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی تھیں جن کی تفصیلات خودنوشت میں موجود ہے۔علاوہ ازیں آزادی کے بعد بدلتی سیاست اور اردو ہندی کے قضیے کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔

مشہور فکشن نگار صالحہ عابد حسین کی خودنوشت ''سلسلہ روز وشب'' لبرٹی آرٹ پریس، دہلی سے 1984 میں شائع ہوئی۔تقریباً 330 صفحات کی یہ خودنوشت مختلف ابواب میں منقسم ہے۔مصنفہ نے اس خودنوشت میں اپنی حالات زندگی کے علاوہ اپنے عہد کے سیاسی حالات، انگریزوں کے مظالم، جدوجہد آزادی سے متعلق تحریکوں اور تقسیم ہند کے بعد ہونے والے کشت وخون کا بھی ذکر کیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ اور مشہور سیاسی رہنما شیخ عبداللہ کی خودنوشت ''آتش چنار'' 1986 میں علی محمد اینڈ سنز سرینگر، کشمیر سے شائع ہوئی۔73 ابواب میں منقسم یہ خودنوشت سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کو محمد یوسف ٹینگ نے ترتیب دیا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے اپنی سیاسی زندگی اور اس کے اتار چڑھاؤ کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں کشمیر کی خوبصورتی، سماجی، ثقافتی وسیاسی رجحانات کا ذکر بھی ملتا ہے۔دوقومی نظریہ، مسلم لیگ، کانگریس وغیرہ سیاسی پارٹیوں پر شیخ عبداللہ نے سیر حاصل بحث کی ہے۔فرقہ وارانہ فسادات، اس حوالے سے کشمیر کے حالات، اپنی پارٹی مسلم کانفرنس کو ملک گیر بنانا، نیز 1948 کے بعد کشمیر میں جو حالات وواقعات رونما ہوئے ان کو بھی تاریخی حوالوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔مصنف ریاست کشمیر کے وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں اس حوالے سے بھی تفصیلات کتاب میں موجود ہے۔

وزیر آغا شاعر ونقاد کی حیثیت سے اردو ادب میں بے حد ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ان کی سرگزشت ''شام کی منڈیر سے'' کے نام سے 1986 میں مکتبہ فکر واقبال، لاہور سے شائع ہوئی۔تقریباً 290 صفحات کی اس کتاب کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ابواب قائم کیے گئے ہیں۔جس میں مصنف نے اپنی پیدائش سے لے کر 1986 تک کے حالات و

واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ خودنوشت میں شامل تمام موضوعات کے علاوہ مصنف نے ہندوستانی سیاست پر بھی خوب لکھا ہے۔ مثلاً دوسری جنگ عظیم کا ہندوستان پر اثر انداز ہونا، تحریک آزادی سے متعلق بغاوتیں و تحریکیں، 1946 کے فسادات وغیرہ کے علاوہ آزادی و نئے ملک کی خوشی کا اظہار بھی کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس خوشی پر پانی پھیرنے والے ان فسادات کا تذکرہ بھی موجود ہے جس نے انسانیت کو پامال کر کے رکھ دیا۔ علاوہ ازیں وزیر آغا اپنی سرگزشت میں دونوں ملکوں کے درمیان رسہ کشی اور ہونے والی جنگوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔

مشہور و معروف شاعر رفعت شروش نے اپنی خودنوشت ''بمبئی کی بزم آرائیاں'' (1986) اور ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا''، ''اور بستی نہیں دلی ہے (1992)'' کے نام سے تحریر کی ہے۔ اول الذکر میں مصنف کی زندگی کے ایک اہم دور یعنی 1945 تا 1958 تک کا احاطہ کرتی ہے جب وہ ممبئی میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تھے اس دور کے اہم واقعات نیز ممبئی کی سماجی،، سیاسی، ثقافتی او ادبی زندگی کی بھرپور تصویریں بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ رفعت سروش نے اس دور میں جدوجہد آزادی سے متعلق اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چوں کہ ممبئی شہر تحریک آزادی کا ایک اہم مرکز تھا۔ خلافت تحریک ہو یا کانگریس و مسلم لیگ کے اہم اجلاس ہوں، بھارت چھوڑو تحریک ہو یا پھر بحری ملاحوں کی بغاوت ہو، غرض بیشتر سیاسی سرگرمیاں اسی شہر میں وجود میں آئیں۔ اس لیے رفعت سروش کی اس کتاب میں یہ تمام واقعات کم و بیش موجود ہیں۔ آزادی کے بعد جب پورے ملک میں قتل و غارت گیری شروع ہوئی تو ممبئی کی فضا بھی مسموم ہوئی اور فسادات نے اس شہر کو بھی لپیٹ میں لے لیا لیکن ممبئی میں اتنی تباہی نہیں ہوئی تھی جتنی شمالی ہندوستان میں تھی۔ ان واقعات کے علاوہ گاندھی جی کے قتل کے بعد ہونے والی شورشیں بھی مذکوہ کتاب میں موجود ہے۔ ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' مصنف کی نجی زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور آخر الذکر ان کی ادبی زندگی اور اپنے دہلی کے قیام سے متعلق شب و روز کے بیان کے ساتھ سیاسی، سماجی و معاشی حالات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

پروفیسر اقبال حسین نے اپنی خودنوشت ''داستان میری'' کے نام سے تحریر کی جو پہلی بار 1989 میں خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ سے شائع ہوئی۔ 560 صفحات کی اس خودنوشت میں مصنف نے اپنی حالات زندگی، آبائی شہر نیورہ (بہار)، تعلیم و تعلم، خاندان و ہم عصروں کے ذکر کے علاوہ برصغیر کے سیاسی حالات، انگریزوں کی آمد، 1946 و 1947 کے فسادات، جدوجہد آزادی سے متعلق مختلف واقعات کو بھی مختصر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس خودنوشت کی اشاعت ثانی 2000 میں عمل میں آئی۔

''ابھی سن لو مجھ سے'' کلیم عاجز کی خودنوشت ہے جو 1992 میں شائع ہوئی۔ اردو کے مشہور شاعر کی اس آپ

بیتی میں نہ صرف ان کی ذات اور دیگر چیزیں ملتی ہیں بلکہ ہندوستانی سیاست کی ایک پوری تاریخ بھی موجود ہے۔ بقیہ چیزوں کے علاوہ انہوں نے دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں، 1943 کا بنگال قحط، بھارت چھوڑو تحریک، تقسیم ہند کے متعلق سرسری جائزہ لیتے ہوئے اپنی رائے پیش کی ہے۔ نیز 1946 کے فسادات کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اسی فساد میں ان کا پورا خاندان تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ یہ درد مصنف کی تمام تصانیف کے علاوہ خودنوشت میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اردو کے مشہور شاعر مجاز کی بہن حمیدہ سالم نے بھی اپنی خودنوشت ''شورش دوراں'' کے نام سے لکھی۔ ان کا تعلق ادب سے نہ ہو کر معاشیات سے تھا۔ یہ خودنوشت ادب پبلی کیشنز، دہلی سے 1995 میں منظر عام پر آئی۔ 330 صفحات کی اس خودنوشت کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خودنوشت کا پانچواں باب ''آنچل اور پرچم کا ملاپ'' کے نام سے ہے جس میں مصنفہ نے اپنے ذاتی احوال کے ساتھ جلیاں والا باغ سانحہ، تقسیم ہند، آزادی کی خوشی اور پھر ماتم، فسادات اور گاندھی جی کے قتل کی روداد کو بھی بیان کیا ہے۔

سید محمد عقیل کی خودنوشت ''گئو دھول'' انجمن تہذیب نو، الہٰ آباد (پریاگ راج) سے 1995 میں شائع ہوئی۔ 440 صفحات کی اس خودنوشت میں آزادی سے پہلے کسانوں کے حالات، زمینداروں کے ظالمانہ رویے کے بیان کے ساتھ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی سیاست میں اتھل پتھل، جنگ کے اثرات، ٹوٹتے برطانوی سامراج، پاکستان کی مانگ، آزادی و تقسیم ہند کے فسادات بعد ازاں کشمیر کا ہندوستان میں الحاق اور کشمیریوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو بھی مصنف نے اپنی خودنوشت میں بیان کیا ہے۔

پاکستان کی مشہور شاعرہ کشور ناہید نے اپنی خودنوشت ''بری عورت کی کتھا'' کے نام سے تحریر کی۔ چودہ ابواب میں منقسم اس کتاب میں مصنفہ نے اپنی روداد زندگی عورت کے مسائل اور سماج کے نامساعد حالات کے علاوہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک میں بڑھتی مہنگائی، ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ان کی نفرت، تقسیم ہند کی خوں ریزی و غارت گیری، پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات، پاکستان و بنگلہ دیش کا بٹوارہ، ملک کی صورتحال، دوست و احباب اور اپنی زندگی سے متعلق بہت سے اہم واقعات، علمی و ادبی مصروفیات کا تذکرہ کیا ہے۔ پاکستان کے بٹوارے اور بنگال کی خوں ریزی کے ساتھ عورتوں و لڑکیوں پر ہوئے ظلم و ستم کا بیان بھی شاملِ کتاب ہے۔ 1971 میں کشور کو سرکاری طور پر بنگالیوں کے خلاف لڑنے والوں کے حق میں کتابچہ لکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا انہوں نے اپنے اس تجربات و مشاہدات کو بڑے دلسوز انداز میں پیش کیا ہے۔

سعیدہ بانو احمد کی خودنوشت ''ڈگر سے ہٹ کر'' 1996 میں سجاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوئی۔ تقریباً

300 صفحات کی یہ خودنوشت مختلف عنوانات کے تحت بارہ ابواب میں منقسم ہے۔ اس کا ساتواں اور آٹھواں باب تقسیم ہند اور اس کے اثرات سے متعلق ہے۔ مصنفہ نے ان میں ملک گیر فسادات اور پناہ گزینوں کے درد کو بیان کیا ہے۔ دراصل سعیدہ بانو اس وقت دہلی میں تھیں اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھیں۔ انہوں نے دہلی کے فسادات کو نہ صرف آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے بلکہ وہ خود لوٹ مار کی شکار ہوئیں اور ان کو اپنی جان بچانے کے لیے رفیع احمد قدوائی کے گھر دوسرے پناہ گزینوں کی طرح رہنا پڑا۔ سعیدہ بانو نے اپنی خودنوشت میں ان تمام حالات کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کے ذکر کے ساتھ 1965 کی جنگ اور اس کے اثرات کو بھی پیش کیا ہے۔

''ہجرتوں کے سلسلے'' نام سے محمد لطف اللہ خاں نے اپنی خودنوشت رقم کی ہے۔ جو کہ 1998 میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئی۔ 330 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنف کا برصغیر کے مختلف شہروں میں قیام کے دلچسپ واقعات شامل ہیں۔ ان کے نجی حالات کے علاوہ انگریزوں کی آمد کے بعد ملک کے بدلتے حالات، بڑھتی مہنگائی، دوسری جنگ عظیم، تقسیم ہند اور اس کے پس پردہ ہونے والے فسادات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ لطف اللہ خاں کی دو اور کتابیں ہیں جو بقول مصنف یہ دونوں در پردہ میری سوانح کے کچھ حصے ہیں۔ پہلی ''سُر کی تلاش'' جو کہ موسیقی سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ''تماشائے اہل قلم'' ہے جس میں اردو شاعروں اور ادیبوں کے حوالے سے لطف اللہ خاں کے مشاہدات ہیں۔

ممتاز و منفرد نظم گو شاعر اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' کا پہلا ایڈیشن 1994 میں اور دوسرا ایڈیشن 1999 میں اردو اکادمی دہلی سے شائع ہوا۔ 252 صفحات کی اس کتاب میں مصنف نے اپنی زندگی کے شب و روز کے ساتھ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی و ثقافتی حالات کو بھی پیش کیا ہے۔ اس میں دوسری چیزوں کے ساتھ تقسیم ہند کا پس منظر اور اس کے اثرات کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ آزادی کے وقت اختر الایمان ممبئی میں تھے لیکن ان کی بیوی سلطانہ اپنے مع خاندان دہلی میں تھیں۔ ان کا گھر بھی بلوائیوں کے لوٹ مار سے محفوظ نہ رہ سکا، سلطانہ کے گھر والے بڑی بے سر و سامانی میں پاکستان ہجرت کی اور وہ خود اختر الایمان کے پاس ممبئی آ گئی تھیں، اس تعلق سے پیش آنے والی پریشانیوں کا بیان مصنف نے کیا ہے۔ اس وقت کے فسادات، لوٹ مار اور حکومت کی بے توجہی کا ذکر بھی خودنوشت میں اشاروں میں ملتا ہے۔

''منزلیں گرد کے مانند'' اردو ادب کے مشہور ادیب خلیق ابراہیم خلیق کی خودنوشت ہے۔ جو 1999 میں فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹیڈ، کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ مصنف کی پیدائش سے لے کر ابتدائی 27 برسوں کے تجربات و مشاہدات

پر مبنی ہے جو کہ انہوں نے ہندوستان میں ہی گزارے تھے۔اس کے بعد 1953 میں پاکستان چلے گئے تھے۔ساڑھے سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کو 32 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس میں مصنف نے برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد بدلتے ہندوستان کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔چوں کہ مصنف کا ہجرت سے پہلے لکھنؤ سے تعلق تھا چناں چہ اس شہر کی ثقافتی، تہذیبی، سیاسی وسماجی زندگی کا بیان بڑی تفصیل سے کیا ہے۔خودنوشت کا چوتھا باب ''سیاسی صورت حال'' کے نام سے ہے جس میں انہوں نے مختلف عنوانات کے تحت برصغیر کے سیاسی حالات کو چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعہ پیش کیا ہے۔مثلاً برصغیر میں برطانوی حکمت عملی، اردو ہندی قضیہ، ہندی کی سرکاری سرپرستی، انجمن تحفظ اردو، سیاست اور فرقہ پرستی، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست، میثاق لکھنؤ، خلافت اور سوراج تحریک، شدھی اور سنگھٹن، تبلیغ و تنظیم، سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ وغیرہ۔ان عنوانات کو دیکھ کر ہندوستان کے خاص عہد کی سیاسی ہلچل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس خودنوشت کو ایک مکمل خودنوشت نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ مصنف نے اپنے سوانحی حالات کو زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا ہے۔یہاں تک کہ اپنی پیدائش، تعلیمی مراحل، عہد شباب، ازدواجی زندگی، اولاد وغیرہ کے متعلق کوئی تفصیل نہیں دی ہے۔علاوہ ازیں یہ صرف مصنف کے ایک خاص عہد یعنی ہندوستان میں گزارے شب و روز کا ہی ذکر ملتا ہے۔اس خودنوشت کے نامکمل ہونے کا احساس مصنف کو بھی تھا انہوں نے ''عرض حال'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔منزلیں گرد کے مانند لکھنوی تہذیب وثقافت اور سیاست کے ایک مخصوص دور کی ترجمان ہے۔

اردو کے مشہور ومعروف ادیب انتظار حسین بھی ان مصنفین میں سے تھے جنہوں نے ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں اور نئے ملک میں مختلف پریشانیوں سے دوچار ہوئے تھے۔انتظار حسین نے بھی اپنی روداد زندگی کو صفحہ قرطاس پر بکھیر کر دو جلدوں میں شائع کرائی۔پہلی ''چراغوں کا دھواں'' کے نام سے ہے جس میں اپنی حالات زندگی اور اس سے جڑے مسائل کو پیش کیا یہ کتاب ان کی یادوں کے پچاس برس پر محیط ہے۔یہ خودنوشت پہلی بار سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے 1999 میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا جو 2012 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔اس کتاب میں مصنف نے ہجرت کے دن سے لے کر پاکستان جانے کے بعد اپنے پچاس برسوں کے شب و روز کے ساتھ سیاسی وسماجی پریشانیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔خصوصاً ہجرت کے بعد آنے والی پریشانیوں اور مالی مشکلات کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ان کی خودنوشت کا دوسرا حصہ ''جستجو کیا ہے'' کے نام سے 2012 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔مذکورہ کتاب مصنف کی بھولی بسری یادوں کا

مجموعہ ہے جسے انہوں نے کسی صنف کے تعین کے بغیر تحریر کیا ہے۔اس لیے اس کتاب پر کبھی خودنوشت، کبھی سفرنامہ اور کبھی داستانوی رنگ میں افسانہ یا ناول گمان ہوتا ہے۔ اس میں انتظار حسین نے اپنے بچپن، شہر، گلی کوچے، اسکول، دوست واحباب وغیرہ کا ذکر غرض کہ اپنے گزرے اوقات کو ہو بہو قلم بند کیا ہے۔اس طرح یہ کتاب مصنف کے ماضی کی تلخ وخوشگوار یادوں پر مشتمل ہے۔اس میں ماضی پر نوحہ خوانی، پرانی تہذیب واقدار کے بکھرنے کا غم، اپنے وطن و مٹی سے بچھڑنے کا کرب اور ہجرت کا درد عیاں ہے۔اس کے علاوہ اس کتاب میں بھی نئی اقدار، نئے ملک، نئی سرزمین پر زندگی کے سفر کے آغاز میں درپیش مسائل کا حقیقی بیان بھی ملتا ہے۔غرض کہ انتظار حسین کی یہ دونوں کتابیں ان کی زندگی کے اہم گوشوں کو منور کرتی ہیں ساتھ ہی ملک کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی حالات کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔

بیسویں صدی کے معروف فکشن نگار رشید امجد نے ''تمنائے بے تاب'' کے نام سے 2001 میں (حرف اکادمی، راولپنڈی، پاکستان) اپنی سرگزشت شائع کرائی۔اس کتاب کو مصنف نے یادوں کا مجموعہ کہا ہے جو 330 صفحات پر مشتمل ہے۔انہوں نے اس میں اپنی حالات زندگی، سماجی، معاشی وادبی پہلو پر ہی اظہار خیال نہیں کیا بلکہ 1940 کے بعد ہندوستان کے سیاسی افق پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔اس کتاب میں بچپن کی ہی یادوں میں 1946 اور 1947 کے ہنگامہ خیز دور کا ذکر بھی موجود ہے۔تقسیم ہند کے بعد کشمیر میں جب حالات خراب ہوئے تو رشید امجد، خاندان کے ساتھ اپنے ننہال پنجاب آ گئے تھے۔ان کے والد کو یقین تھا کہ جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو واپس اپنے گھروں کو چلے جائیں گے لیکن پنڈی اور سری نگر راستہ بند ہونے کے بعد یہ لوگ کبھی واپس نہ جا سکے۔رشید امجد کے معصوم ذہن پر تقسیم ہند اور پھر ہجرت کا کرب بہت گہرا تھا جس سے وہ کبھی اُبر نہ سکے۔ان کا یہ درد خودنوشت میں جا بجا موجود ہے۔

سیاسی میدان کی مشہور ومعروف شخصیت شائستہ سہروردی اکرام اللہ کا بیسویں صدی میں سماجی خدمت اور عملی سیاست میں امتیازی شان حاصل کر کے اپنا ایک الگ مقام ہے۔انہوں نے اپنی خودنوشت پہلے انگریزی میں لکھ کر 1998 میں شائع کرائی بعد ازاں وفات سے قبل ہی اس کا اردو مسودہ تیار کر لیا تھا جو 2002 میں منظر عام پر آیا۔اس خودنوشت میں مصنفہ نے اپنی حالات زندگی، گھر خاندان کے ذکر کے علاوہ غیر منقسم ہندوستان کی سماجی وثقافتی زندگی، بر صغیر کی سیاسی ہلچل، تحریک آزادی سے متعلق واقعات وسانحات، فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم ہند کے خوں ریز اثرات کی اندوہناک تصویروں کا ذکر بھی ضمنی طور پر کیا ہے۔علاوہ ازیں پاکستان میں اپنے سیاسی اتار چڑھاؤ کو بھی مصنفہ نے پیش کیا ہے۔یہ کتاب مصنفہ کی بیشتر زندگی بلکہ فعال زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔

ملک زادہ منظور احمد کی خودنوشت ''رقص شرر'' رہبر آفسیٹ پریس، دہلی سے 2004 میں شائع ہوئی۔ جس میں مصنف نے اپنے احوال وکوائف بیان کرنے کے ساتھ اس عہد کے سماجی، معاشرتی، تہذیبی وسیاسی پہلوؤں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ سیاسی حالات میں دوسری جنگ عظیم کی تباہیاں، اس کے بعد برصغیر کی سیاسی سرگرمیاں، جدوجہد آزادی، مسلم لیگ وکانگریس کے درمیان تقسیم کو لے کر تصادم، فرقہ وارانہ فسادات غرض ان تمام موضوعات پر مصنف نے جزوی طور پر تبصرہ کیا ہے۔ ملک زادہ منظور تقسیم کے سخت خلاف تھے چناں چہ جدوجہد آزادی کے سلسلے میں کانگریس کی جانب سے مختلف مقام پر تقریریں بھی کی تھیں۔

عابدہ سلطان کی خودنوشت ''انقلابی شہزادی'' کے نام سے 2007 میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کی زندگی، شخصیت اور مزاج کے علاوہ سیاسی، سماجی وثقافتی پہلوؤں کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس میں ہندوستان کے آزاد ہونے سے قبل ریاست بھوپال، غیر منقسم ہندوستان، تحریک آزادی اور پھر تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے قیام کی داستان ہے۔ عابدہ سلطان نے ہندو پاک کے سیاسی اتار چڑھاؤ کو بھی پیش کیا ہے۔ خودنوشت میں تاریخی صداقت ہونے کے سبب اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

''ولر کنارے'' کشمیر کے معروف علیحدگی پسند اور مذہبی لیڈر سید علی شاہ گیلانی کی خودنوشت ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل یہ خودنوشت کافی ضخیم ہے۔ جلد اول 2011 میں منظر عام پر آئی جس کے کل 571 صفحات ہیں۔ یہ مصنف کی پیدائش سے لے کر 1971 کے حالات وواقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ جس میں اپنی پیدائش، تعلیم وتعلم، جماعت اسلامی سے وابستگی، دوقومی نظریہ، 1948 کے بعد تنازعہ کشمیر کے حوالے سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں نیز شیخ عبداللہ اور دیگر ہندو پاک کے لیڈروں کے سیاسی کردار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خودنوشت کا دوسرا حصہ 2012 میں شائع ہوا۔ 685 صفحات پر مبنی اس جلد میں 1971 سے 1995 تک کے حالات ملتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ سماجی، تہذیبی، اخلاقی وتمدنی اقدار کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

اردو کے مشہور شاعر، فلم نغمہ نگار ومکالمہ نگار ندا فاضلی اپنے منفرد انداز اور دل کو چھو لینے والی شاعری کے لیے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے نثر میں بھی اپنے اظہار کا انداز بقیہ مصنفین سے جدا رکھا ہے۔ ندا فاضلی نے یادداشتوں پر مبنی اپنی آپ بیتی ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' نام سے دو جلدوں میں تحریر کی ہے۔ یہ کتابیں ایم آر پبلی کیشنز دہلی سے 2016 میں منظر عام پر آئیں۔ یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا۔ کچھ نقادوں نے اس خودنوشت کو سوانحی ناول کا نام دیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ مکمل تو نہیں لیکن خودنوشت کے زمرے میں آتی ہے۔ کیوں کہ ندا فاضلی

نے اپنی ذات کو مختلف نوعیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کتابوں میں مصنف نے سیاسی، سماجی وتہذیبی منظر نامے کے ساتھ اپنی ذات اور آس پاس کے ماحول کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ دیواروں کے بیچ میں اپنی ذات کے حوالے سے اپنے عہد اور خاندان کے دیگر افراد کا مختصر تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس وقت کے ہندوستانی سیاست پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم، مہنگائی، تقسیم ہند کے وجوہات اور اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات، مہاجروں وشرنارتھیوں کی مشکلات، اپنے خاندان والوں کا پاکستان ہجرت کرنا اور خود ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرنا، دونوں ملکوں کے آپسی تنازعات، ان تمام واقعات پر ان کا قلم بڑی روانی سے چلتا ہے۔ ''دیواروں کے باہر'' میں اپنے احوال وکوائف سے زیادہ اپنے ہم عصروں اور اپنی دیگر عملی وادبی مصروفیات کا ذکر کیا ہے۔

مندرجہ بالا خودنوشتوں کے علاوہ اردو ادب میں ایسی خودنوشتیں بھی ہیں جن میں دوسرے موضوعات کے ساتھ سیاسی تذکروں میں تحریک آزادی اور تقسیم ہند کے محرکات واثرات کے متعلق کوئی واقعہ خودنوشت نگاروں نے ضمنی طور پر بیان کیا ہے۔ان کتابوں میں مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت ''نقش حیات'' (1954)''، شاد عظیم آبادی کی خودنوشت ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی (1961)''، عبدالغفار مدھولی کی خودنوشت ''ایک طالب علم کی کہانی، یوسف حسین خاں کی خودنوشت ''یادوں کی دنیا (1967)''، شوکت تھانوی کی خودنوشت ''مابدولت''، شورش کاشمیری کی خودنوشت ''بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل اور پس دیوار زنداں''، غلام السیدین کی خودنوشت ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں (1974)''، عتیق صدیقی کی خودنوشت ''یادوں کے سائے (1974)''، احسان دانش کی ''جہان دانش (1975)''، مشتاق احمد یوسفی کی خودنوشت ''زرگزشت (1975)''، قتیل شفائی کی خودنوشت ''گھنگھرو ٹوٹ گئے''، رشید احمد صدیقی کی خودنوشت ''آشفتہ بیانی میری (1985)''، وزیر اعلیٰ سید میر قاسم کی خودنوشت ''داستان حیات سید میر قاسم (1985)''، شہرت بخاری کی خودنوشت ''کھوئے ہوؤں کی جستجو (1987)''، جلیل قدوائی کی خودنوشت ''حیات مستعار (1987)''، ڈاکٹر عبادت بریلوی کی خودنوشت ''یاد عہد رفتہ (1988)''، مسعود حسین خاں کی خودنوشت ''ورود مسعود (1989)''، یونس احمر کی خودنوشت ''ماضی کے تعاقب میں (1991)''، سید زوالفقار علی بخاری کی خودنوشت ''سرگزشت (1995)''، ذکیہ سلطان نیر کی خودنوشت ''بیتے لمحے: یادوں کے چراغ (1998)''، پروفیسر مقبول احمد کی خودنوشت ''صدائے جرس (2002)''، پروفیسر غوث انصاری کی خودنوشت ''عمر رفتہ: حصہ اول (2002)''، جسٹس جاوید اقبال کی خودنوشت ''اپنا گریباں چاک (2003)''، پروفیسر ولی الحق انصاری کی خودنوشت ''مدوجزر (2007)''، عزیز الحسن صدیقی کی خودنوشت ''ہماں خاکم کہ ہستم (2008)'' غلام

مرتضیٰ راہی کی خودنوشت ''راہی کی سرگزشت (2009)''، عابد سہیل کی خودنوشت ''جو یاد رہا (2012)''، محمد ادیب کی خودنوشت ''زندگی ذرا آہستہ چل (2019)'' وغیرہ اسی زمرے میں آتی ہیں۔

ان کتابوں میں مصنفین نے اپنی حالات زندگی، گھر خاندان کا بیان، تعلیم و تعلم، معاصرین کے ساتھ اپنی ادبی، سماجی، سیاسی و معاشی زندگی پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ چوں کہ میرے مقالے کا عنوان محض تحریک آزادی سے متعلق واقعات، تقسیم ہند کے وجوہات اور اثرات ہے اس لیے میں نے صرف اسی پہلو پر نظر ثانی کرتے ہوئے مندرجہ بالا خودنوشتوں کا انتخاب کیا ہے۔

☆☆☆☆

﴿باب چہارم﴾

ترجمہ شدہ خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات

ترجمہ شدہ خودنوشت پر تقسیم ہند کے اثرات

پچھلے باب میں اردو ادب کی ان خودنوشتوں کو شامل مقالہ کیا گیا ہے جن میں تحریک آزادی، تقسیم ہند اور اس کے اثرات پر خودنوشت نگاروں نے اپنے خیالات کا نہ صرف اظہار کیا ہے بلکہ تمام واقعات و حالات کا بیان بھی من و عن پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس باب میں مختلف زبانوں سے اردو میں ترجمہ ہوئی محض ان خودنوشتوں کو شامل کیا گیا ہے، جن میں آزادی کی جدو جہد و تقسیم ہند کے سانحات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان مشاہیروں کی خودنوشت کو اولیت دی گئی جن کا تعلق سیاست سے تھا اور جنہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا۔ یہ خودنوشتیں ہندی، انگریزی اور پنجابی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ اس باب میں جن خودنوشتوں کو شامل کیا گیا ہے ان کے نام کچھ اس طرح ہیں:

1۔ آزادی ہند (مولانا ابوالکلام آزاد)

2۔ اپنی کہانی (ڈاکٹر راجندر پرساد)

3۔ رسیدی ٹکٹ (امرتا پریتم)

4۔ سچ، محبت اور ذرا سا کینہ (خوشونت سنگھ)

اردو میں ترجمہ ہوئی خودنوشتوں میں گاندھی جی کی ''تلاش حق'' اور پنڈت نہرو کی ''میری کہانی'' کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں نے نہ صرف تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ ہندوستان کی سیاست میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ لیکن ان دونوں مشاہیروں کی خودنوشتیں آزادی سے پہلے شائع ہوئی ہیں۔ اس لیے انہیں مقالے میں شامل نہیں کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی تین دہائیوں کے سیاسیات ہند پر رونما ہونے والے اہم واقعات کا تذکرہ کافی تفصیل سے ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ہونے والے مختلف ستیہ گرہ اور تحریکوں کا ذکر ان خودنوشتوں میں موجود ہے۔ انگریزوں کے مظالم، جیل کی روداد، چمپارن تحریک، تحریک عدم تعاون، خلافت تحریک، گجرات ستیہ گرہ، ڈانڈی مارچ، جلیاں والا باغ سانحہ، چوری چوری سانحہ وغیرہ کا بیان خاص طور پر ملتا ہے۔ بہر کیف ان دونوں خودنوشتوں سے ہمیں اس دور کے اہم حالات و واقعات کی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

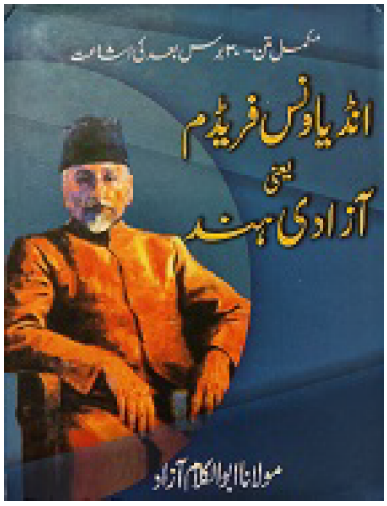

مولانا ابوالکلام آزاد: انڈیا ونس فریڈم

سنہ اشاعت: 1958

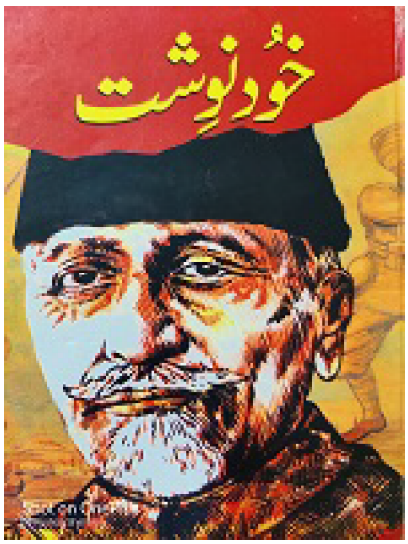

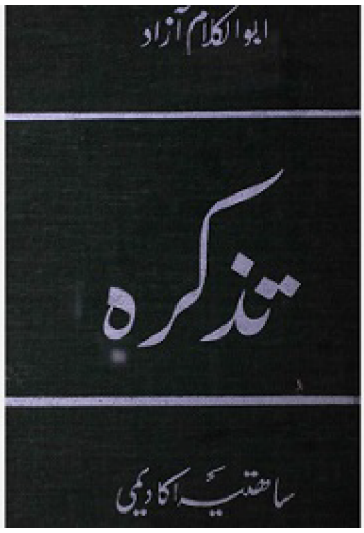

انڈیا ونس فریڈم یعنی آزادی ہند (مولانا ابوالکلام آزاد)

محی الدین احمد المعروف مولانا ابوالکلام آزاد 11 نومبر 1888 کو سعودی عرب میں مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ عالیہ بنت محمد مسلمانوں کے دوسرے مقدس شہر مدینہ منورہ کی رہنے والی تھیں، وہ ہندوستان واپسی کے بعد اسی سال انتقال کر گئیں، اس وقت مولانا تقریباً آٹھ برس کے تھے۔ والد نے مولانا آزاد کا نام فیروز بخت رکھا تھا لیکن بعد میں محی الدین احمد، پھر ابولکلام آزاد کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ فیروز بخت سے مولانا ابولکلام آزاد تک کے کڑے اور مصائب و شدائد سے بھرپور سفر کی پوری داستان ان کی کتاب ''تذکرہ'' اور ''خودنوشت (آزاد کی کہانی)'' میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں ان کی سیاسی زندگی کا احوال ''انڈیا ونس فریڈم (آزادی ہند)'' میں ملتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد مغلیہ سلطنت سے وابستہ تھے اور سب کے سب زہد و تقویٰ اور قناعت و صبر و شکر والے تھے یہ اوصاف مولانا آزاد میں اپنے پرخوں سے آئے تھے۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد مولانا آزاد کے والد محمد خیر الدین اپنے نانا محمد منور الدین کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے سعودی عرب میں سکونت اختیار کی تھی۔ یہ اپنے وقت کے مشہور و معروف عالم دین تھے۔ ان کے بڑے بیٹے اور مولانا کے بڑے بھائی ابونصر بھی اپنی ذہانت اور ذکاوت سے علمی دنیا میں الگ مقام رکھتے ہیں لیکن محض 21 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا آزاد کے والد کا انتقال 1908 میں ہوا۔ اپنا بچپن مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں گزارنے والے مولانا آزاد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے، پھر کلکتہ میں پرائیویٹ ٹیوٹر کے ذریعے حاصل کی۔ ان کو اردو، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ کتب بینی سے ان کو خاص شغف تھا۔ گھر کا ماحول مذہبی ہونے کے سبب بچوں کو گھر سے باہر یا دیگر کھیل کود کی اجازت نہ تھی اس لیے بہت کم عمری میں ہی انہوں نے مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا جس میں شاعری، ناول، مضامین سب ہی شامل تھے۔ سرسید احمد خاں کی تصانیف سے بہت متاثر تھے اور ان کی کوئی ایسی کتاب یا مضمون باقی نہیں تھا جس کا مطالعہ انہوں نے نہ کیا ہو۔ ہمہ وقت مطالعے و تعلیم میں مستغرق رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس برس کی عمر میں ہی ان میں پڑھے لکھے نوجوان کی سی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔ یہ تمام مشغولیات والد سے چھپ کر انجام دی جاتی کیوں کہ والد کی طرف سے درسیات پر توجہ مبذول کرنے کی تلقین ملی تھی۔ کسی بھی مسئلے پر بڑے بڑے لوگوں کے سامنے گھنٹوں بحث کرتے، ان ہی مباحثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم عمری میں ہی وہ نامور مقرر مانے جانے لگے تھے۔

مولانا آزاد نے اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز مختلف مضامین تحریر کرنے و شاعری سے کیا، انہوں نے فارسی و عربی کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ 1900 میں جب وہ صرف 12 سال کے تھے ایک منظوم جریدہ ''نیرنگ عالم'' کی اشاعت شروع کی، جو کہ آٹھ ماہ بعد بند ہو گیا، اسی دوران میں موسیٰ نامی ایک شخص کے ہفتہ وار اخبار ''المصباح'' کی ادارت سنبھال لی تھی، یہ اخبار بھی تین یا چار ماہ جاری رہا۔ یہیں سے ان کی صحافت نگاری کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ''تحفہ محمدیہ'' کی ترتیب کی ذمہ داری بھی بطریق احسن پوری کی۔ اسی دور میں وہ معروف رسالہ ''خدنگ نظر'' کے ادبی حصے کے ایڈیٹر رہے۔ اس وقت تک انہوں نے ملک کے تمام بڑے اخبارات و رسائل کے لیے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ 1903 میں انہوں نے ماہانہ رسالہ 'لسان الصدق' شائع کیا۔ اس پرچے نے معاصر ہندوستانی علماء اور دانشوروں سے بے حد خراج داد و تحسین حاصل کیا۔ شبلی نعمانی کے جاری کردہ پرچے ''الندوہ'' کے علاوہ ''کلکتہ سے شائع ہونے والا اخبار ''دارالسلطنت'' کی ادارت بھی سنبھالی۔ اس کے علاوہ مختلف کانفرنسوں میں لکچر دیتے اور جلوسوں میں تقریریں بھی کرتے۔ انہوں نے برطانوی سامراج سے ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا اور اپنے اس مقصد کے لیے جی جان سے لگ گئے۔

اس کے لیے انہوں نے رائے عامہ ہموار کرنے کی غرض سے جریدے کی اشاعت کو محسوس کرتے ہوئے ایک پریس قائم کیا جس سے 1912 میں اردو ہفت روزہ ''الہلال'' شروع کیا جو ایک سیاسی اخبار تھا۔ یہ اردو کے اولین ایسے اخبارات میں سے ایک تھا جس نے ترتیب اور ڈیزائن سمیت مواد اور پیشکش کو یکساں اہمیت دی۔ اسے مصری اخبارات کے طرز پر آراستہ کیا گیا تھا لیکن اس کا سب سے بڑا اثاثہ پُر اثر مواد تھا۔ عوام میں انقلابی خیالات پیدا کرنے کی وجہ سے الہلال رفتہ رفتہ حکومت برطانیہ کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ چناں چہ 1914 میں الہلال پریس پر حکومت نے قبضہ کر کے اسے ضبط کر لیا۔ ایک سال بعد 1915 میں ایک نیا جریدہ ''البلاغ'' کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے ''الہلال'' کی طرح اس میں بھی انگریزوں کی پالیسیوں کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ حکومت اس اخبار کی جارحانہ تحریر سے بھی درگزر نہ کر سکی۔ ان دونوں اخباروں نے عوام میں بیداری اور جذبہ آزادی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ آخر کار 23 مارچ 1916 کو حکومت بنگال نے انہیں ایک ہفتے کے اندر حدود بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ مجبوراً مولانا آزاد نے رخت سفر باندھا اور 30 مارچ کو کلکتہ سے نکل کر بہار میں رانچی کے ایک گاؤں مورابادی میں پناہ لی کیوں کہ اتر پردیش، دہلی، پنجاب اور ممبئی کی حکومتوں نے اپنے علاقوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ مورابادی میں ان کی نظر بندی کا حکم جاری ہوا۔ دوبارہ 1919 میں ان کو نظر بند کیا گیا 1920 میں حکومت نے رہا کیا۔ مولانا آزاد تقسیم

بنگال کی مہم کے وقت کم عمری ہی میں سیاست کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

یہی وہ دور تھا جب مہاتما گاندھی ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر واضح طور پر سامنے آ چکے تھے۔ بعد میں مولانا آزاد، مہاتما گاندھی کے نظریات بالخصوص ''فلسفہ عدم تشدد'' سے متاثر ہوئے، ان کی سیاسی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ 1920 میں ہی ان کو خلافت کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ ستمبر 1923 میں کانگریس کے ایک خصوصی اجلاس کی صدارت بھی کی، اس وقت ان کی عمر پینتیس سال تھی۔ بقول مولانا آزاد ''لوگوں کے خیال میں، میں کانگریس کا صدر منتخب ہونے والا سب سے کم عمر شخص تھا۔'' 1939 میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور 1946 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے شامل ہوئے اور اس منصب پر 1958 یعنی انتقال تک کام کرتے رہے۔ بحیثیت وزیر تعلیم بہت سے اہم کارنامے انجام دیے۔ یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن اور دیگر تکنیکی، تحقیقی اور ثقافتی ادارے ان ہی کی دین ہے۔

مولانا آزاد جدو جہد آزادی کے سلسلے میں مختلف نوعیت پر کام کرتے رہے اور جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے رہے۔ مثلاً ''نمک ستیہ گرہ''، ''تحریک عدم تعاون''، ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' اور ''خلافت تحریک'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا آزاد کانگریس سے تعلق رکھتے تھے، مسلم لیگ کی پالیسیوں کے سخت مخالف تھے، تقسیم ہند کے مخالفوں میں سے ایک تھے۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ ملک کے بھی سچے رہنما ابھر کر سامنے آئے۔

مولانا آزاد صرف ایک سیاست داں نہیں بلکہ ایک ممتاز قلمکار، عظیم شاعر، بے باک صحافی، مفسر، عالم اور شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ انہوں نے شاعری بھی کی، انشائیے بھی لکھے، سائنسی مضامین بھی تحریر کیے، علمی و تحقیقی مقالات کے علاوہ قرآن کی تفسیر بھی لکھی۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیفات اور تحریری مجموعات میں غبار خاطر، آزادی ہند، تحریک آزادی، ترجمان القرآن، انتخاب تذکرہ مولانا آزاد وغیرہ ہیں۔ 'غبار خاطر' ان کے خطوط کا ایک اہم مجموعہ ہے جو انہوں نے 1942 اور 1946 کے درمیان قلعہ احمد نگر میں قید کے دوران مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام تحریر کیے تھے۔ انہوں نے 'غبار خاطر' میں اچھی چائے اور اچھی سگریٹ کی اپنی کمزوری کے بارے میں بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی تمام چیزوں میں چائے کے پیالے کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ مذکورہ کتاب مولانا آزاد کی زندگی و کوائف کو جاننے کے لیے بہترین ماخذ ہے۔

مولانا آزاد کا انتقال 22 فروری 1958 کو ہوا۔ ان کا مزار اردو بازار جامع مسجد دہلی کے احاطہ میں ہے۔ 1992 میں بھارتی حکومت نے انہیں علمی اور ادبی میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے پر بعد از مرگ 'بھارت رتن

یعنی 'بھارت کا جوہر' ایوارڈ سے نوازا۔ ملک کے نامور لوگ ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ اس کا ثبوت مشاہیر ہند کے درج ذیل جملوں سے بخوبی فراہم ہوتا ہے:

''ابوالکلام کی سی عظمت کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔'' (راجندر پرساد)

''ہم ان کے دماغ کی روشنی کے عادی ہو گئے تھے۔'' (پنڈت نہرو)

''مرحوم استقامت کا پہاڑ اور فراست کا سمندر تھے۔'' (رادھا کرشنن)

''وہ تاریخی شخصیت نہیں تاریخ کا ایک عہد تھے۔'' (آچاریہ کرپلانی)1

1916 میں مولانا آزاد جب رانچی میں نظر بند تھے، وہاں ان کے دوست فضل الدین احمد نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنی سرگزشت لکھیں۔ پہلے تو وہ ٹالتے رہے لیکن جب اصرار زیادہ بڑھا تو انہوں نے لکھنا شروع کیا اور کتاب کی ابتدا اپنے آبا واجداد کے حوالے سے کافی تفصیل سے کی، اس سے مسودہ کافی ضخیم ہو گیا۔ چناں چہ فضل الدین مرزا نے کتاب کے دو حصے کر دیے۔ پہلا حصہ ''تذکرہ'' کے نام سے مرتب کر کے 1919 میں شائع کیا۔ اس کتاب کو لکھنے میں مولانا آزاد کو زیادہ وقت نہیں لگا جیسا کہ کتاب کے مقدمے میں فضل الدین مرزا لکھتے ہیں:

''یہ جون 1916 سے 17 اکتوبر 1916 کے درمیانی پانچ مہینے میں قلم بند ہوئی۔''2

مالک رام نے اس کتاب کو دوبارہ مرتب کر کے 1985 میں ساہتیہ اکادمی، دہلی سے شائع کیا، ان کے پاس مولانا آزاد کی وہ تحریریں دستیاب تھیں جو انہوں نے خود لکھی تھیں۔ تقریباً پانچ سو سے زائد صفحات کی اس کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا۔ ''تذکرہ'' مولانا آزاد کی سرگزشت کا پہلا حصہ ہے جس میں انہوں نے اپنے خاندان اور آبا واجداد کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ سرگزشت کا دوسرا حصہ ''آزاد کی کہانی'' کے نام سے ہے، جو حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے 1958 میں شائع ہوا۔ یہ کتاب ان دنوں میں تحریر کی گئی جب مولانا آزاد کو 1919 کی نظر بندی سے رہائی کے کچھ عرصہ بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ یہ 1920 کی بات ہے جب ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ جس میں عدم تعاون کی تحریک پر غور وخوض کرنے کے علاوہ اسے حتمی شکل دینے سے متعلق بھی اظہار خیال کیا گیا۔ یہ امر حکومت کے لیے سر پر منڈلاتا خطرہ تھا لہٰذا مولانا آزاد سمیت بہت سے کانگریسی رہنماؤں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد ''آزادی ہند'' میں لکھتے ہیں:

''مجھ پر بہت عرصے تک مقدمہ چلتا رہا اور آخر کار مجھے ایک برس کی سزا دی گئی۔ واقعہ یہ

ہے کہ مجھے پہلی جنوری 1923 تک رہا نہ کیا گیا۔''3

ایام اسیری میں ہی مولانا آزاد کے ساتھیوں میں عبدالرزاق ملیح آبادی بھی تھے انہوں نے مولانا آزاد سے سفارش کی کہ وہ ''تذکرہ'' کی دوسری جلد بھی لکھا دیں۔ کافی اصرار کے بعد مولانا نے اس کتاب کا مسودہ لکھوایا۔ جسے مرتب کر کے عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا کی وفات کے بعد ''آزاد کی کہانی'' کے نام سے 1958 میں شائع کروایا۔ راقمہ کے پاس زیر نظر کتاب کا وہ ایڈیشن موجود ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے ''خودنوشت'' کے نام سے 2014 میں منظر عام پر آیا۔ تین سو صفحات پر مشتمل اس حصے کو بھی مختلف ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کی دیگر تصنیفات سے اس لیے منفرد ہے کیوں کہ اس میں انہوں نے اپنے خاندانی پس منظر اور ذاتی حالات و واقعات، مشاہدات و تجربات کو مفصل بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں تبصرہ کرتے ہوئے نعیم احسن لکھتے ہیں:

> ''آزاد کی کہانی سے ہمیں اس عظیم شخصیت کے افکار، خیالات، عادات، نفسیات، طبعی ملانات، ذہنی رجحانات، علمی استعداد، ادبی قابلیت اور شعری ذوق کے علاوہ خاندانی کوائف و تفصیلات سے بھی مکمل واقفیت حاصل ہوتی ہے۔''4

''آزاد کی کہانی'' کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس میں مولانا کے والدین، بھائی، خود ان کے حالات کا بیان ملتا ہے۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس ماحول میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے، پروان چڑھے اور بتدریج مگر حیرت انگیز تیز رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے ''محی الدین سے ابوالکلام'' بن گئے۔ چوں کہ مولانا آزاد کی خودنوشت کہی جانے والی دونوں کتابیں اردو میں ہے لیکن ان میں ان کے خاندانی پس منظر، ان کی روزمرہ کی مشغولیات، تعلیم و تعلم، صحافت و مضمون نگاری وغیرہ کے متعلق ذکر ملتا ہے جو کہ ان کے ابتدائی زمانوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کی سیاسی زندگی اور جدوجہد آزادی کے کارنامے پہلی جلد کو چھوڑ کر دوسری جلد میں بے حد اختصار کے ساتھ موجود ہیں۔ جس سے محض یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کن حالات میں سیاست کی طرف راغب ہوئے اور قومی اتحاد و ہندوستان کی آزادی کو اپنا مقصد بنالیا۔

مولانا آزاد کی خودنوشت کا تیسرا حصہ ''انڈیا ونس فریڈم یعنی آزادی ہند'' ہے جس کو ان کے سیکریٹری پروفیسر ہمایوں کبیر نے انگریزی میں مرتب کیا تھا جو مولانا آزاد کے انتقال کے بعد 1958 میں شائع ہوئی۔ انہوں نے مولانا آزاد کے بیانات کو انگریزی میں لکھا تھا، وہ جب ایک باب کا ڈرافٹ تیار کر لیتے تو اسے مولانا آزاد کے پاس تصحیح کے لیے بھیج دیتے، بعد میں دونوں مل کر مسودے پر نظر ثانی کرتے، اس طرح کئی مراحل سے گزرنے کے بعد جب پوری کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا تو مولانا آزاد نے اس میں سے تیس صفحات، جو کہ ذاتی نوعیت کے واقعات و تاثرات پر مبنی

تھے، نکال کر الگ کر دیے، یہ کہہ کر کہ ان کو میری وفات کے بعد شائع کیا جائے۔

مولانا آزاد کی خودنوشت کے تمام حصوں کو مقالے کے باب چہارم میں شامل کرنے کا جواز یہ تھا کہ ان کی سیاسی زندگی وجدوجہد آزادی اور تقسیم ہند کا تفصیلی تذکرہ ''انڈیا ونس فریڈم'' میں ہی ہے جس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ بقیہ پہلے اور دوسرے حصے اردو میں ہونے کے باوجود، ان سے سیاسی اعتبار سے زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔ اس لیے محض انڈیا ونس فریڈم جسے شمیم حنفی نے اردو میں ترجمہ کر کے ''آزادی ہند'' کے نام سے 1988 میں شائع کیا تھا، موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کی سیاسی سرگرمیوں اور ہندوستان کے ایک خاص عہد کی سیاست کا منظرنامہ پیش کرتی ہے۔ مولانا آزاد نے ہمایوں کبیر سے خواہش ظاہر کی تھی کہ آزادی کے بعد کے واقعات سے متعلق وہ اپنی خودنوشت کا تیسرا حصہ خود تحریر کریں گے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ اس کتاب کے دیباچے میں ہمایوں کبیر نے کتاب کی ترتیب اور اپنی مشکلات کے ذکر کے ساتھ مولانا آزاد کو راضی کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مولانا اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں باتیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے چناں چہ ابتدا میں اس کام کو ہاتھ میں لینے سے جھجکے تھے، بڑی مشکل سے انہیں یہ ماننے پر آمادہ کیا گیا کہ انگریزوں سے ہندوستانیوں کو اقتدار کی منتقلی کے عمل میں بہ حیثیت ایک اہم کردار کے، ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ اس یادگار زمانے کے بارے میں اپنے تاثرات محفوظ کر دیں۔''5

خودنوشت کے پہلے اور دوسرے حصے میں مولانا آزاد کی پیدائش سے لے کر 1923 تک کے حالات و واقعات کا بیان ملتا ہے۔ اس میں بھی پہلے حصے میں ان کے خاندانی پس منظر کی عکاسی زیادہ ملتی ہے۔ انڈیا ونس فریڈم 1935 سے لے کر 1948 تک کے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔ چناں چہ اس کی ترتیب کے دوران انہوں نے اپنی زندگی کے 1937 تک کے حالات پر مشتمل سرگزشت لکھنے کا وعدہ کیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ ہمایوں کبیر دیباچے میں اس سلسلے میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> ''اپنی نجی زندگی کے بارے میں وہ انتہائی کم گو تھے لیکن اخیر میں انہوں نے خود ہی پیشکش کی کہ (سوانح کی) پہلی جلد وہ لکھ دیں گے جو ان کی زندگی کے ابتدائی دور کا احاطہ کرے گی اور ان کے 1937 تک کے حالات پر مشتمل ہوگی۔ انہوں نے واقعتاً ایک خاکہ بھی منظور فرمایا، جو ان کی اپنی خواہش کے مطابق، موجودہ کتاب کے پہلے باب کے طور پر

شامل کیا گیا ہے۔''6

شمیم حنفی کے علاوہ مذکورہ کتاب کا ایک اور اردو ترجمہ رئیس احمد جعفری نے کیا تھا، جو کہ مقبول اکیڈمی، لاہور سے شائع ہوا۔ یہ دونوں ایڈیشن ریختہ ڈاٹ کام پر موجود ہیں۔ جو ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا وہ ایم آر پبلی کیشنز، دہلی سے 2013 میں شائع ہوا۔ جس میں مکمل متن موجود ہے، مع ان تیس صفحات کے جو مولانا آزاد نے الگ کر دیے تھے۔ یہ کتاب مختلف عنوانات کے تحت 16 ابواب میں زائد از تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ضمیمے اور اشاریے بھی شامل ہیں۔

مذکورہ کتاب کا پہلا باب ''کیفیت نما'' کے نام سے معنون ہے جس میں مولانا آزاد نے اپنے خاندانی پس منظر، والدین، اپنی پیدائش، تعلیم و تعلم، اپنی دیگر مصروفیات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ وہی خاکہ ہے جس کی طرف ہمایوں کبیر نے دیباچے میں اشارہ کیا ہے۔ مولانا آزاد نے سیاسی میدان میں اپنا سکہ جمانے اور اپنی کارکردگی کا بھی بیان کیا ہے۔ 1905 میں تقسیم بنگال کے بعد ان کا رجحان سیاست کی جانب ہوا۔ انہوں نے تفصیل کے ساتھ بنگال کی تقسیم اور اس کے پس منظر میں ہونے والے ہندو مسلم فساد، دونوں قوموں کے درمیان بڑھتی نفرتیں اور قومی اتحاد کے سلسلے میں اپنی خدمات کو بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے اور ان کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے بنگال میں ہی نہیں بلکہ ملک کے مختلف مقامات میں خفیہ انجمنیں قائم کیں اور نوجوانوں کو خصوصاً مسلم نوجوانوں کو حصول آزادی کی جانب توجہ مبذول کرائی۔

اس وقت ملک میں فرقہ پرستی نے جنم لے لیا تھا جسے تقسیم بنگال نے اور ہوا دی۔ ان دنوں انقلابی گروپوں میں محض ہندوؤں کے متوسط طبقے کے لوگوں کو ہی شامل کیا جاتا تھا، دراصل تمام انقلابی گروپ سرگرم طور پر مسلم مخالف تھے۔ اس لیے محض مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے نفرت کرنا اور دونوں قوموں کے درمیان خلیج پیدا ہونا انگریزوں کے لیے سودمند ثابت ہو رہا تھا۔ جب انقلابیوں نے دیکھا کہ انگریز مسلمانوں کو سیاسی ہتھکنڈے کی طرح استعمال کر رہی ہے تو وہ کافی مشتعل ہوئے، ان کا ماننا تھا کہ حصول آزادی میں مسلمان ایک رکاوٹ ہیں اور دوسری رکاوٹوں کی طرح انہیں بھی راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔ دوسری طرف انگریزوں کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت چہیتی بیوی کی طرح تھی، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسے ماحول میں جب مولانا آزاد نے انقلابیوں کے ساتھ مل کر جدوجہد آزادی میں حصہ لینا چاہا تو ابتدا میں مسلمان کے نام پر ان کی مخالفت کی گئی لیکن بہت جلد لوگ ان کے طرز فکر سے متاثر ہو کر ان کو اپنے گروپ میں شامل کر لیا۔ بعد میں مولانا آزاد نے شیام سندر چکروتی اور دوسرے انقلابیوں کے ساتھ مل کر فرقہ پرستی کو ختم کر کے قومی

اتحاد پر زور دیا۔اس وقت کے تمام حالات اور اپنی خدمات کے بیان کے ساتھ اپنے بیرون ممالک کے سفر، الہلال و البلاغ کے اجرا، دونوں رسالوں کی پابندی، کلکتہ شہر سے نکالے جانے کی روداد، رانچی میں نظر بندی، خلافت تحریک میں بحیثیت صدر اور ترک موالات ونمک ستیہ گرہ میں حصہ لینا، 1923 میں کانگریس کا صدر منتخب ہونا، سائمن کمیشن، محمد علی جناح کی کانگریس سے علیحدگی، غرض کہ مولانا آزاد نے کتاب کے آغاز میں ''کیفیت نما'' کے نام سے عنوان قائم کر کے 1935 تک کے ہندوستانی سیاست کے اہم واقعات کا خاکہ پیش کر دیا ہے۔

آزادی ہند 1935 کے بعد مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور جدوجہد آزادی کے متعلق ان کے تاثرات پر مبنی داستان ہے۔ کتاب کا باقاعدہ آغاز ''کانگریس اقتدار میں'' باب سے ہوتا ہے۔ جس میں مصنف نے 1935 کے الیکشن، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خودمختاری اور مرکز میں وفاقی حکومت کے قیام کی منظوری، انتخاب میں کانگریس کی جیت، مسلم لیگ کا کانگریس پر یہ الزام کہ ان کی وزارتیں اقلیتیوں کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہیں (جو کہ بے بنیاد تھے)، سردار پٹیل و راجندر پرساد وغیرہ کانگریسی رہنماؤں کی تعصب پسندی (یہ لوگ ہندوؤں کے علاوہ کسی بھی مذہب کے لوگوں کو سرکاری عہدوں پر لانا نہیں چاہتے تھے)، کانگریسیوں میں بڑھتی فرقہ واریت اور مسلم لیگ کی مخالفت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کانگریسیوں کی تعصب پسندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کانگریس جن مقاصد کی دعویدار تھی ان پر عمل پیرا نہیں ہو سکی۔ افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کانگریس کی فوقیت اس درجے تک پہنچ سکی تھی جہاں فرقہ وارانہ مصلحتوں کو وہ نظر انداز کر سکتی اور اکثریت یا اقلیت کے سوال میں الجھے بغیر، لیڈروں کا انتخاب صرف اہلیت کی بنیاد پر کر سکتی۔''7

علاوہ ازیں پہلی گول میز کانفرنس، اس دوران گاندھی جی کی چند سیاسی غلطیاں (مثلاً جب ترک موالات کی تحریک پورے ملک میں اپنے عروج پر تھی اور شاید کامیابی سے ہم کنار بھی ہو جاتی تو گاندھی جی نے چوری چورا حملے کو بنیاد بنا کر تحریک کو ختم کر دیا جس سے عوام کافی مشتعل ہوئی تھی اور جو اتحاد ہندوؤں اور مسلمانوں میں قائم ہوا تھا وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔)، کانگریسیوں کا تحریک آزادی میں حصہ لینے کے بجائے آپس میں ہی اختلاف رائے رکھنا (جس کی وجہ سے کئی اہم امور پر ہار کا سامنا کرنا پڑا)، ان کی فرقہ پرستی، بنگال میں مسلمانوں کی حالت، مسلمانوں کا کانگریس کے بجائے مسلم لیگ کی حمایت کرنا ان تمام نکات پر مولانا آزاد نے مذکورہ باب میں ہی بحث کی ہے، ساتھ ہی اپنے تاثرات بھی دیے

ہیں۔جس کے مطالعے سے اس وقت کے سیاسی بحران کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم اور اس کے ملک پر اثرات کے علاوہ 1939 میں کانگریس میں صدر بنائے جانے کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔کانگریس کے مختلف اجلاس، اس وقت ہندوستان کے حالات، کرپس مشن اور اس کی تجاویزات، کرپس مشن کی ناکامی، اس کے بعد ملک میں پھیلتے انتشار، واردھا میٹنگ، کانگریسیوں کا گاندھی جی پر اندھا وشواس کرنا غرض مولانا آزاد نے بعد کے ابواب میں بحیثیت کانگریسی صدر کے اپنی خدمات، ملک کے سیاسی حالات و کانگریس و مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کو پیش کیا ہے۔

آزادی ہند کا ساتواں باب ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے نام سے ہے۔جس میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے اہم واقعات وحالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔کانگریس نے 1942 میں ایک قرارداد پیش کی جس میں ایک عوامی سطح پر انگریزوں سے ہندوستان چھوڑ کر جانے کے لیے پورے ملک میں تحریک شروع ہوئی، گاندھی جی نے ''کرو یا مرو'' کا نعرہ دیا۔عوام یہ سمجھ رہی تھی کہ گاندھی جی اور کانگریسی رہنماؤں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے کوئی نہ کوئی منصوبہ سوچ رکھا ہوگا جس سے حکومت مفلوج ہوکر مصالحت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجائے گی۔اس سلسلے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی کسی جادو یا فوق الانسانی طریقے کی مدد سے ہندوستان کو آزادی دلا دیں گے، اور اسی لیے وہ لوگ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی خاص انفرادی کوشش کی جائے۔''8

قرارداد کے منظور ہونے کے بعد کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حکومت کے ردعمل کا انتظار کرے گی۔اگر حکومت نے ہمارا مطالبہ منظور کرلیا یا کم سے کم مصالحت کے لیے تیار ہوئی تو آئندہ کی گفتگو کی گنجائش نکال لیں گے۔لیکن اگر برطانوی حکومت نے ہمارا مطالبہ رد کیا تو گاندھی جی کی قیادت میں ایک جدوجہد شروع کردی جائے گی جو کہ عدم تشدد پر مبنی ہوگی۔لیکن قرارداد کے پاس ہوتے ہی حکومت نے بات چیت کرنے سے صاف انکار کردیا۔گاندھی جی حکومت کے انکار کے بعد تحریک کو عدم تشدد پر مبنی ایک بغاوت کا نام دینا چاہتے تھے لیکن یہ تحریک اس پر قائم نہ رہ سکی۔ مولانا آزاد نے قرارداد پاس ہونے سے پہلے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کے نتائج خطرناک بھی ہوسکتے ہیں، تاہم انہوں نے کھلم کھلا بھارت چھوڑ تحریک کی مخالفت تو نہیں کی تھی لیکن اس کی کامیابی میں وہ شک وشبہہ میں مبتلا تھے۔مولانا آزاد نے کافی طویل انداز میں مذکورہ تحریک کے سلسلے میں ہوئی کانگریس کی بیٹھکیں، ان کے فیصلے، بعد ازاں تمام بڑے

لیڈروں کی گرفتاری کے بعد پورے ملک میں ہونے والے تشدد آمیز واقعات کا ذکر کیا ہے۔ کانگریسی رہنماؤں کو گرفتار کر کے احمد نگر جیل میں رکھا گیا تھا وہاں نظر بندی کے حالات اور روزمرہ کے واقعات کا بیان بھی ملتا ہے۔ عدم تشدد کی بنیاد پر شروع ہوئی یہ تحریک تشدد کے رنگ میں رنگ گئی۔ عوام ''کرو یا مرو'' کا نعرہ لگاتے ہوئے سرکاری عمارتوں کی توڑ پھوڑ شروع کر دی اور بینکوں کو لوٹ لیا، ریلوے لائن کو نقصان پہنچایا۔ مولانا آزاد کو یہ خدشہ تھا کہ جب حکومت کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کرے گی تو عوام مشتعل ہوگی، سچ ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''میرا یہ قیاس کہ ہماری گرفتاری کے بعد ملک بھر میں تشدد آمیز ہنگامے برپا ہوں گے، صحیح ثابت ہوا۔ بنگال، بہار، یوپی اور بمبئی حکومت کے خلاف جدوجہد کے معاملے میں پیش پیش تھے۔ رسل ورسائل کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا اور کارخانے بند کر دیے گئے تھے۔ پولیس چوکیوں پر حملے کیے گئے اور انہیں جلا دیا گیا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر لوگ چڑھ دوڑے اور بعض مقامات پر انہیں تباہ کر دیا گیا..... مختصر یہ کہ حکومت کے ظلم وتشدد کا جواب پورے ملک نے تشدد آمیز طریقے سے دیا تھا، اب یہ تحریک تشدد سے عاری مزاحمت تک محدود نہیں تھی۔ اس سب کا اندازہ مجھے پہلے سے تھا اور اپنے کارکنوں کو اس بارے میں کسی حد تک میں نے مشورہ بھی دیا تھا اور ان سے بات چیت بھی کی تھی۔۔۔۔''9

مولانا آزاد جب احمد نگر جیل میں ہی تھے کہ ان کی بیوی اور بہن کا انتقال ہوا۔ بیوی کی طبیعت خرابی کی اطلاع ملنے پر انہوں نے وائسرائے سے کچھ دنوں کے لیے کلکتہ میں بیوی سے ملنے کی اجازت مانگی تھی جو مسترد کر دی گئی۔ وہاں پر مولانا آزاد کے ساتھ ڈاکٹر سید محمود بھی نظر بند تھے۔ جنہوں نے وائسرائے سے خط وکتابت کی اور معافی نامہ لکھ کر اپنی رہائی کے لیے اپیل کی۔ اس واقعے کو مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے ساتھ ہی اپنی اور دوسرے لیڈروں کی رہائی کے متعلق بھی لکھا ہے۔

علاوہ ازیں رہائی کے بعد گاندھی جی کی مسلم لیگ سے مفاہمت کی کوشش، محمد علی جناح سے ملاقات، گاندھی جی کی ان سے ہمدردی کے قصے وغیرہ کو بھی مختلف واقعات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مسٹر جناح کانگریس سے علیحدگی کے بعد اپنی سیاسی اہمیت کھو چکے تھے لیکن مسلم لیگ سے جڑنے کے بعد اور گاندھی جی کے بعض اقدامات اور فروگزاشتیں تھیں جس کا مسٹر جناح نے پورا فائدہ اٹھایا بقول مولانا آزاد ''اس کے بعد وہ اپنی سیاست میں سکہ جمانے لگے۔'' ان سب سے قطع نظر مسلمانان ہند بھی ابتدا میں مسٹر جناح کی پالیسیوں کو شکوک کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ گاندھی

جی بھی کچھ معاملوں میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں تو ان کی نظروں میں مسٹر جناح کی اہمیت بڑھ گئی۔ مولانا آزاد نے تفصیلاً ان نکات پر بحث کی ہے جس کی وجہ سے مسلم لیگ کے ساتھ عام مسلمان بھی مسٹر جناح کا ساتھ دینے لگے تھے۔ اسی طرح انہوں نے گاندھی جی کے عدم تشدد کو بھی واضح کیا ہے۔ علاوہ ازیں کانگریسی رہنماؤں کی نااہلی اور ہر بڑے سے بڑے فیصلے کے وقت گاندھی جی کے ردعمل کا انتظار کر کے ہی فیصلہ کرنا، اور ان کی اندھی تقلید پر چوٹ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مجھے ہمیشہ سے اس بات کا احساس رہا ہے کہ ہمارے یہ دوست اور ساتھی بیشتر سیاسی معاملات پر اپنی عقل سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ گاندھی جی کے پکے مقلد تھے۔ جب بھی کوئی سوال اٹھتا، وہ اس انتظار میں رہتے کہ دیکھیں کہ گاندھی جی کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ گاندھی جی کے احترام وعقیدت میں، میں ان میں سے کسی سے بھی پیچھے نہیں ہوں لیکن ایک پل کے لیے میں یہ نہیں مان سکتا کہ ہمیں گاندھی جی کی اندھی تقلید کرنی چاہیے۔''[10]

ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے اور آزادی دلانے کے لیے 1945 میں شملہ کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ جس میں کانگریس، مسلم لیگ کے علاوہ ملک کی دیگر تمام چھوٹی بڑی پارٹیوں کے رہنماؤں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں سیاسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں تمام بحثیں اور مذاکرات ناکام ثابت ہوئے تھے۔ کیوں کہ جو تجاویز وائسرائے لارڈ ویول نے پیش کی تھی اسے مسلم لیگ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ محمد علی جناح بضد تھے کہ مسلم ممبران کا انتخاب محض مسلم لیگ کرے گی نہ کہ کانگریس۔ مذکورہ کتاب میں مولانا آزاد نے واضح کیا ہے کہ کانگریس ملک کے ہر مذہب کی علم بردار ہے اور وہ ہر فرقے و طبقے سے اپنا نمائندہ چن سکتی ہے۔ اس کے لیے محض ہندو کا ہونا شرط نہیں ہے۔ انہوں نے ان واقعات کے علاوہ اپنی وائسرائے سے ملاقات، انٹرویو، کانفرنس کے مذاکرات، کانگریس کی جانب سے پیش کیے گئے نکات، لارڈ ویول کی تجاویزات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ بالآخر شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی جس کی وجہ مولانا آزاد نے فرقہ پرستی کو بتایا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی کا اقتدار میں آنا، کلیمنٹ ایٹلی کا وزیر اعظم بننا، مولانا آزاد کا انہیں مبارک باد دینا اور 1946 میں ہندوستان کے عام انتخابات کی تفصیلات بھی ''آزادی ہند'' میں ملتی ہے۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد 1946 میں حکومت برطانیہ نے دوبارہ ہندوستان کے مسئلے کو سلجھانے اور اقتدار کی منتقلی کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے تین وزرا پر مشتمل ایک مشن ہندوستان بھیجا، اسے ہی کیبنٹ مشن یا

وزارتی مشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس میں لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس، اے وی الیگزینڈر شامل تھے۔ مشن کا اصل مقصد ہندوستان میں عارضی حکومت کا قیام اور کانگریس و مسلم لیگ کے درمیان موجود آئینی بحران کو ختم کر کے اقتدار کو منتقل کرنا تھا۔مشن کے ہندوستان پہنچتے ہی وائسرائے ہند نے صوبائی گورنروں، ایگزیکٹیو کونسل کے اراکین، کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ اپنی بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔کانگریس کی طرف سے مولانا آزاد، پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور خان عبدالغفار خاں نمائندگی کر رہے تھے۔مسلم لیگ کی طرف سے محمد علی جناح، لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل خاں اور سردار عبدالرب نشتر نے شرکت کی تھی۔لیکن افسوس کہ دونوں سیاسی پارٹیوں کے موقف میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

مسلم لیگ ہندوستان کی تقسیم پر بضد تھی، جب کہ کانگریس ملک کی سالمیت پر آنچ آنے کے لیے کسی بھی قیمت پر راضی نہیں تھی۔آخر کار مشن نے اپنی طرف سے ایک منصوبہ پیش کیا، اس منصوبے کو کیبنٹ مشن پلان کہا جاتا ہے۔اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں دونوں سیاسی پارٹیوں کے نقطۂ نظر کو تناسب کے ساتھ ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔اس منصوبے کے دو حصے تھے، پہلے میں ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں لانا تھا اور دوسرے میں کم از کم دس سال کے لیے تقسیم ہند کو روکنا تھا۔کافی پس وپیش کے بعد دونوں سیاسی پارٹیوں نے منصوبے پر اپنی منظوری دے دی۔مولانا آزاد چوں کہ بحیثیت کانگریسی صدر مشن میں شامل ہوئے تھے اس لیے انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ مشن کی آمد، ان کے پلان، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تنازعے، مشن پر دونوں پارٹیوں کی منظوری، بعد ازاں مشن کے فیل ہونے کے متعلق تمام واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔مسلم لیگ کی پاکستان کی مانگ اور مسلمانوں کی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ایک فرقے کی حیثیت سے مسلمان اپنے مستقبل کے بارے میں انتہائی فکر مند تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض صوبوں میں انہیں واضح اکثریت حاصل تھی۔اسی لیے صوبائی سطح پر ان علاقوں میں انہیں کوئی ڈر نہیں تھا۔مگر مجموعی طور پر ہندوستان میں ان کی حیثیت بہر حال ایک اقلیت کی تھی اور انہیں یہ خوف ستا رہا تھا کہ آزاد ہندوستان میں ان کی پوزیشن اور ان کا مرتبہ محفوظ نہیں رہے گا۔''11

مولانا آزاد مسلمانوں کے خوف وہراس سے بخوبی واقف تھے۔چناں چہ انہوں نے ایسا درمیانی راستہ اپنانے کی کوشش کی تھی جس سے سارے مسائل کا حل بھی ہو جائے اور کوئی نقصان بھی نہ ہو یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔جب وہ کیبنٹ مشن کے ممبران سے ملے تو ان کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ جو پیش کیا وہ تھا ہندوستان میں

بڑھتی فرقہ واریت کو ختم کرنا۔ انہوں نے تمام مسائل کے حل کے لیے ایک طویل منصوبہ بنایا تھا وہ مشن کو دے دیا۔ ان کی تفصیل بھی کتاب میں موجود ہے۔ مولانا آزاد نے جو اسکیم تیار کی تھی اسے کانگریس پارٹی کے رہنماؤں سے بھی ساجھا کی تھی۔ بعد میں انہوں نے 15 اپریل 1946 کو ایک بیان جاری کر وہ اسکیم ہندوستانیوں کے سامنے رکھی۔ ''آزادی ہند'' میں اس پوری اسکیم کو شامل کیا گیا ہے۔

1940 میں مسلم لیگ نے اپنی لاہور کی قرارداد میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی ممکنہ تقسیم کا ذکر کیا تھا۔ جسے بعد میں پاکستان ریزولیشن کے نام سے جانا گیا۔ مولانا آزاد نے تقسیم ہند اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے ہی اپنی طرف سے کچھ تجاویز پیش کی تھیں جس میں مسلم لیگ اور مسلمانان ہند کے اندیشوں کو دور کرنا مقصود تھا۔ اس اسکیم میں مسلمان اور دوسرے اقلیتیوں کے مطالبات کو ملحوظ خاطر رکھ کر تمام مسائل کا حل ڈھونڈا گیا تھا۔

1939 میں مولانا آزاد کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس کے آئین کے مطابق ان کی مدت کار محض ایک سال تک ہی تھی۔ لیکن دوسری جنگ عظیم اور انفرادی ستیہ گرہ کے شروع ہونے کے سبب پارٹی کی معمول کی سرگرمیاں بند تھیں۔ 1940 اور پھر 1942 میں ان کی گرفتاری اور حالات کی وجہ سے 1946 تک کانگریس کے صدر رہے۔ اب چوں کہ کیبنٹ مشن پلان پر مسلم لیگ اور کانگریس کی منظوی کے بعد حالات معمول پر آ گئے تھے، اس لیے کانگریس کے نئے صدر کے انتخاب کی باری آئی۔ سیاسی لیڈروں کے علاوہ عوام نے بھی پرزور حمایت کی تھی کہ مولانا آزاد ہی بحیثیت صدر کام کرتے رہیں۔ لیکن انہوں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور پارٹی کے سامنے پنڈت نہرو کا نام تجویز کیا اور ان کی پرزور سفارش بھی کی۔ صدارت کی کرسی سنبھالتے ہی پنڈت نہرو کے اُس بیان جس نے کیبنٹ مشن کے پلان کو تہس نہس کر دیا تھا، کی تفصیل بھی زیر نظر کتاب میں موجود ہے۔ پنڈت نہرو کے بیان کے بعد مولانا آزاد کو احساس ہوا کہ انہوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ان کا نام تجویز کر کے بہت بڑی غلطی کر دی۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''میں نے حتی الوسع اپنی فہم و فراست کے مطابق قدم اٹھایا، مگر اس وقت سے معاملات نے جو شکل اختیار کی ہے اس کی بنیاد پر میں سمجھنے لگا ہوں کہ یہ میری سیاسی زندگی کی شاید سب سے بڑی بھول تھی۔ میں اپنے کسی فعل پر اتنا پشیمان نہیں ہوا جتنا کہ اس نازک مرحلے میں کانگریس کی صدارت سے اپنا نام واپس لینے کے فیصلے پر۔..... یہ ایک ایسی غلطی تھی جسے گاندھی جی کے لفظوں میں 'ہمالیائی جہات' والی غلطی کا نام دے سکتا ہوں۔ میری دوسری غلطی وہ تھی جب میں نے سردار پٹیل کی حمایت نہیں کی۔ ہم بہت سے معاملات پر اختلاف

رائے رکھتے تھے۔مگر مجھے یقین ہے کہ میرے بعد اگر وہ صدر کانگریس ہوتے تو وہ اس کا خیال رکھتے کہ کیبنٹ مشن پلان کا اطلاق کامیابی کے ساتھ کیا جائے۔ وہ جواہر لعل والی غلطی کبھی نہ کرتے جس نے مسٹر جناح کو سارا منصوبہ خراب کر دینے کا موقع فراہم کر دیا۔ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا جب میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ غلطیاں مجھ سے سرزد نہ ہوتیں تو پچھلے دس برسوں کی تاریخ شاید مختلف ہوتی۔''12

کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کے بعد 10 جولائی 1946 کو ممبئی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران صحافیوں کے سوال پر کہ کیا کانگریس مشن کے پلان بشمول انٹرم حکومت کی تشکیل کو قبول کر لیا ہے؟ تو پنڈت نہرو نے جواب دیا کہ دستور ساز اسمبلی میں کانگریس سمجھوتوں سے یکسر آزاد ہوگی اور وہ تمام حالات جو رونما ہو سکتے ہیں ان کا سامنا اپنی مرضی کے مطابق کرے گی۔ان سے مزید پوچھا گیا کہ کیا کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کی گنجائش ممکن ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ کانگریس مناسب ترین صورتوں میں پلان میں ترمیم یا تبدیلی کر سکتی ہے۔

چوں کہ مسلم لیگ نے دباؤ میں آ کر پلان کو قبول کیا تھا۔بقول مولانا آزاد''اس سے مسٹر جناح بہت زیادہ خوش نہیں تھے۔'' انہوں نے لیگ کونسل کو خطاب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں صاف کہا تھا کہ قبولیت کی سفارش صرف اس لیے کی تھی کہ اس سے بہتر اور کچھ نہیں مل سکتا تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا حل تھا۔لیکن پنڈت نہرو کے بیان نے محمد علی جناح کو ایک موقع فراہم کر دیا اور انہوں نے ایک بیان جاری کر کے مشن سے اپنی منظوری واپس لے لی اور مسلم لیگ کے کونسل کے اجلاس میں انہوں نے پاکستان کا مطالبہ دہرایا۔اس کے لیے 16 اگست 1946 کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے کا اعلان کر دیا۔

مولانا آزاد نے اس اچانک آ جانے والی پریشانی کے حل کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ڈائریکٹ ایکشن ڈے کا اعلان تو کر دیا گیا تھا لیکن مسلم لیگ نے کوئی وضاحت نہیں کی تھی کہ پروگرام اور اس کی نوعیت کیا ہوگی۔''آزادی ہند'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان تمام نکات پر بحث کی گئی ہے۔اس وقت صورتحال بہت خراب ہو چکی تھی، افواہوں کا بازار گرم تھا۔کلکتے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ 16 اگست کو مسلم لیگ کانگریسیوں پر حملہ کر کے ان کی املاک لوٹ لے گی۔مزید سراسیمگی اس وقت پھیل گئی جب حکومت بنگال نے اس دن سرکاری چھٹی کا اعلان کر دیا۔اس دن کلکتہ میں زبردست فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑے۔اس سلسلے میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ہندوستان کی تاریخ میں 16 اگست ایک یوم سیاہ تھا۔ عام تشدد نے جس کی کوئی نظیر

ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کلکتہ کے عظیم الشان شہر کو خون ریزی، قتل اور دہشت کے ایک طوفان میں جھونک دیا۔ سینکڑوں جانیں ضائع گئیں، ہزاروں گھائل ہوئے اور کروڑوں روپے کی املاک تباہ کر دی گئی۔ لیگ کی طرف سے جلوس نکالے گئے جنھوں نے لوٹ مار اور آتش زنی شروع کر دی۔ جلد ہی پورا شہر دونوں فرقوں کے غنڈوں کی گرفت میں آ گیا..... پورے کلکتے میں فوج اور پولیس کھڑی ہوئی تھی، مگر بے عمل رہی جب کہ معصوم مردوں اور عورتوں کو قتل کیا جا رہا تھا۔''13

کلکتہ میں جب فساد شروع ہوا تو مولانا آزاد اسی شہر میں تھے۔ اس دن ان کو دہلی جانا تھا جب وہ گھر سے نکلے تو بلوائیوں نے ان پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اپنے بچاؤ کے لیے ان کے ڈرائیور نے چلا کر کہا کہ یہ کانگریس صدر کی گاڑی ہے، بقول مولانا آزاد ''یہ جاننے کے بعد بھی انہوں نے مطلق پروانہ کی۔'' فوج ہو یا پولیس سب تماشائی بن کر دیکھتے رہے اور پورے شہر میں بے گناہوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ کیبنٹ مشن کی نامنظوری کے بعد تقسیم ہند یقینی ہو جانے سے عوام کافی مشتعل تھی۔ کلکتہ فساد کو بنیاد بنا کر جو پورے ملک میں خون کی ہولی کھیلی گئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ 16 اگست 1946 ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب تھا جس نے ملک کی تقسیم پر مہر لگا دی۔ اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اب کوئی مفاہمت اور پرامن حل کی توقع کرنا ناگزیر تھا۔

مولانا آزاد نے پنڈت نہرو کے بیان اور ماضی میں کی گئی ان کی سیاسی غلطیوں کو بھی بیان کیا ہے، جس کی بنا پر مسلم لیگ کانگریس کی مخالف بنتی گئی۔ ساتھ ہی انہوں نے محمد علی جناح کی ہٹ دھرمی کو بھی پیش کیا ہے، جب انگریزوں اور کانگریس نے تقسیم ہند کے مسئلے کو مصالحت کے ساتھ سلجھانے کے لیے ان کو راضی کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ کیبنٹ مشن پلان تقسیم کو روکنے کی ایک آخری کوشش تھی۔ دونوں پارٹیوں کے اراکین کی منظوری بھی مل گئی تھی لیکن محض پنڈت نہرو کے بیان نے متحد ہندوستان کے تابوت پر آخری کیل ٹھونک دی۔ نتیجتاً محمد علی جناح کے لیے تقسیم ہند کی راہیں بھی ہموار ہو گئیں۔ دوسری جانب فرقہ وارانہ مسائل تھے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ 1946 کے فسادات سے مسلمانان ہند کا حوصلہ پست ہو گیا تھا، وہ مایوس تھے۔ انہیں اپنے مستقبل کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ چناں چہ ان میں اکثریت پاکستان کے مطالبے میں مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئی۔ آخر کار کافی بحث و مباحث کے بعد تقسیم ہند کو منظوری مل گئی۔ تمام مسائل اور اس وقت کے حالات و واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''جیسا کہ میں نے کہا تھا، صورت حال مشکل اور نازک تھی۔ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن

پلان کو پہلے منظور کیا پھر مسترد کر دیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس چل رہا تھا مگر لیگ نے اس حقیقت کے باوجود کہ پورا ملک اپنی آزادی کے مطالبے میں متحد تھا، اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ ایک طرف لوگ آزادی کی حصولیابی کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ہماری بدنصیبی یہ تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ واحد حل کی پیشکش کیبنٹ مشن پلان نے کی تھی اور پھر بھی اپنے اختلاف کو دور کرنے کے لیے ہم مسئلے کو گرفت میں نہیں لے سکے۔'' 14

ہندوستان کے مسائل سے تنگ آ کر وائسرائے ہند لارڈ ویول کا استعفیٰ اور لیبر پارٹی و ان کی حکومت کا ہندوستان کے مسئلے کو سنجیدگی سے لے کر اس کے حل کی کوشش کرنے کو بھی مولانا آزاد نے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لیبر پارٹی و مسٹر ایٹلی کے معترف نظر آتے ہیں۔ برطانوی وزیر اعظما یٹلی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نیا وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا وہ 22 مارچ 1947 کو دہلی پہنچے اور 24 مارچ کو نئے وائسرائے ہند کا حلف لیا۔ وہ مسٹر ایٹلی کی ان ہدایات کے ساتھ ہندوستان آئے تھے کہ 30 جون 1948 سے پہلے ہندوستان کے اقتدار کو لازمی طور پر منتقل کر دیا جائے۔ مولانا آزاد نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنی پہلی ملاقات، انتقال اقتدار اور آزادی کے متعلق ان کے درمیان جو بھی مذاکرات ہوئے، اس کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔

زیر نظر کتاب میں 1946 سے لے کر آزادی تک ملک کے حالات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اس وقت حالات کافی بگڑ چکے تھے، کلکتہ، نواکھلی، بہار، یوپی، پنجاب، ممبئی غرض کہ پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات بڑے پیمانے پر ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ پاکستان مخالف مظاہرے ہو رہے تھے۔ 4 مارچ 1947 کو لاہور میں ایک ایسے ہی مظاہرے میں درجنوں افراد ہلاک ہوئے اور کافی تعداد میں لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔ ایک طرف فرقہ وارانہ جذبات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے تو دوسری طرف انتظامیہ میں ڈھیل پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ جو یورپی ملازم تھے وہ سچے من سے اپنے فرائض انجام نہیں دے رہے تھے کیوں کہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب بہت جلد اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا۔ چناں چہ ہندوستان میں انہیں اپنے کام سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مقامی لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ اب انتظامیہ کی کوئی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے بھی لوگوں میں بے چینی اور بے اطمینانی مزید بڑھتی گئی۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے تمام حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ اب تمام مسائل کا حل ملک کی تقسیم میں ہی مضمر ہے۔ تو اس وقت کانگریس میں سب سے پہلے سردار پٹیل نے اس کی حمایت کی تھی۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد نے

اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''واقعہ یہ ہے کہ نقشے پر ماؤنٹ بیٹن کے نمودار ہونے سے پہلے ہی سردار پٹیل پچاس فیصد تقسیم کے حق میں تھے۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ وہ کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ اگر انہیں مسلم لیگ سے چھٹکارہ مل سکے تو وہ ہندوستان کا ایک ٹکڑا قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ شاید یہ کہنا روا نہ ہوگا کہ ولبھ بھائی پٹیل ہی ہندوستان کی تقسیم کے بانی تھے۔''15

ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کو تقسیم ہند کے لیے قائل کرنے کے بعد پنڈت نہرو کو بھی راضی کرنے کی بھر پور کوشش کی، جس میں وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ ایسے موقعے پر مولانا آزاد نے اپنے دونوں ساتھیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ انہوں نے اپنے طور پر واضح کیا کہ اگر ہم نے تقسیم کو قبول کر لیا تو ملک کے لیے ایک مستقل مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ تقسیم فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے اور بڑھا دے گی۔ اگر ہم نے اپنی رضا مندی دے دی تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ فیصلہ یہ کیا جائے گا کہ تقسیم ہند مسلم لیگ نے نہیں بلکہ کانگریس نے کی تھی۔ لیکن سردار پٹیل نے صاف جواب دیا کہ ہندو مسلمان کا یکجا رہنا اب مناسب نہیں ہے اس لیے ہر روز کی لڑائی کے بجائے کیوں نہ دیانت داری کے ساتھ ان کا حصہ دے دیا جائے۔ ان کا ماننا تھا کہ اس تقسیم سے ہی ہندو مسلم جھگڑے کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

جب مولا آزاد کو سردار پٹیل اور پنڈت نہرو نے مایوس کر دیا تو ان کی تنہا امید گاندھی جی تھے۔ چناں چہ وہ ان کے پاس بھی گئے۔ دونوں کے درمیان جو بھی بات چیت ہوئی اس کی پوری تفصیل بھی ''آزادی ہند'' میں موجود ہے۔ پہلے پہل گاندھی جی نے تو مولانا آزاد سے کہا کہ ''تقسیم کو اگر کانگریس منظور کرنا چاہتی ہے تو ایسا میری لاش پر ہی ہو سکے گا، جب تک میں زندہ ہوں میں ہندوستان کی تقسیم کو کبھی بھی تسلیم نہیں کروں گا۔'' لیکن گاندھی جی کچھ دن بعد جب ماؤنٹ بیٹن اور سردار پٹیل سے ملے تو وہ بھی بدل گئے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنی ملاقات سے واپسی کے فوراً بعد گاندھی جی کے پاس پٹیل آئے اور دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک تنہائی میں ان سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ اس میٹنگ کے دوران کیا ہوا۔ لیکن جب میں دوبارہ گاندھی جی سے ملا تو مجھے یہ دیکھ کر اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا کہ اب وہ بدل چکے تھے۔ وہ ابھی تک کھل کر تقسیم کے حق میں

نہیں تھے مگر اب وہ پہلی شدومد کے ساتھ اس کے خلاف نہیں بول رہے تھے۔اس سے بھی حیران اور افسردہ مجھے جس بات نے کیا، یہ تھی کہ وہ انہی دلیلوں کو دوہرا رہے تھے جن کا استعمال سردار پٹیل پہلے کر چکے تھے۔ دو گھنٹے سے زیادہ میں نے ان سے بحث کی ،لیکن میں ان پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ مایوس ہو کر میں نے کہا، اگر آپ بھی ان خیالات کو اختیار کر چکے ہیں تو مجھے ہندوستان کو تباہی سے بچانے کی کوئی امید دکھائی نہیں دیتی۔'' 16

بالآخر مایوس ہو کر مولانا آزاد نے بھی تقسیم ہند پر خاموشی اختیار کر لی۔ کیوں کہ کانگریس کے قدآور لیڈروں نے تقسیم ہند پر اپنی پوری رضامندی دے دی تھی۔ تقسیم ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ وہ پٹیل ہی تھے جو کھلم کھلا کہتے تھے کہ اب تقسیم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ مولانا آزاد نے ملک کی تقسیم کو روکنے کے لیے اپنی پوری کوشش بھی کی تھی لیکن ناکام رہے۔ اس وقت ہونے والی تمام سیاسی سرگرمیاں مذکورہ کتاب میں موجود ہے۔ کانگریس میں مولانا آزاد ہی ایسے تھے جو آخر تک تقسیم کی مخالفت کرتے رہے۔ ابھی صرف تقسیم کا اعلان ہوا تھا تو پورے ملک میں کس طرح خون کی ہولی کھیلی گئی تھی اس پر عمل ہونے کے بعد کتنی تباہی مچے گی۔ مولانا آزاد کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ آنے والی تباہی تھی جس کا اندازہ انہیں ہو چکا تھا۔ انہوں نے نہ صرف کانگریس بلکہ وائسرائے ہند و دوسرے انگریزی وزراء کو بھی یہ باور کرایا تھا کہ تقسیم ہند مسئلے کا حل نہیں ہے، اس کے نتائج کافی خطرناک ہوں گے۔ انہوں نے ملک میں ہونے والے 1946 کے فساد کا حوالہ بھی دیا کہ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے پر حملے کیے تھے۔ اگر اس طرح کے فرقہ وارانہ ماحول میں ملک کو بانٹا گیا تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور اس کی پوری ذمہ داری مستقبل میں انگریزوں پر ہی عائد کی جائے گی۔ مولانا آزاد کے ان اندیشوں کو دور کرنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی جانب سے پوری تسلی دلائی کہ میرا یقین کریں کوئی خون خرابہ نہ ہوگا۔

لیکن انہوں نے جس یقین کے ساتھ تسلی دے کر مولانا آزاد کو پرسکون کیا تھا سب کچھ اس کے برعکس ہوا۔ ماؤنٹ بیٹن کے بہادرانہ اعلانیے کا جو انجام سامنے آیا اس سے پوری دنیا واقف ہے۔ مولانا آزاد کا اندیشہ سچ ثابت ہوا واقعی تقسیم کے بعد پورے ملک میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ مولانا آزاد نے ان تمام تفصیلات کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے کانگریس، انگریزوں سے تقسیم ہند کو روکنے کے لیے کوششیں کی تھیں۔ اپنے خدشات، تقسیم ہند کے ہونے والے نتائج جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھے تھے ان کی بھی فہرست موجود ہے۔ کانگریس ایسی پارٹی تھی جو ابتدا سے ہی ہندوستان کے اتحاد ملت اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی تھی لیکن اب یہی پارٹی ملک کو بانٹنے کے لیے سرکاری قرارداد

کو منظور کر چکی تھی اور بڑے دعوے کے ساتھ مختلف بے بنیاد دلیلوں کو پیش کر کے تقسیم کی حمایت کی تھی۔ مولانا آزاد نے تقسیم ہند کے حامیوں و مخالفین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو گروپ تقسیم کی حمایت میں تھا اس کے تئیں ان کی پیش کردہ وجوہات کے ساتھ فرقہ وارانہ ذہنیت کا بھی بیان ملتا ہے۔ اس وقت پورے ملک میں فرقہ پرستی کے نام پر ایک پروپیگنڈہ چل رہا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کانگریسی حلقوں میں کھلے عام یہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستان میں ہندوؤں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہیں گے اور اگر پاکستان میں ہندوؤں پر کوئی ظلم ہوا تو اس کا نتیجہ ہندوستان میں مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا۔''17

مولانا آزاد نے جب لوگوں میں اس طرح کی ذہنیت کا مشاہدہ کیا تو وہ بہت فکرمند ہوئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ایسا خطرناک جذبہ عوام میں گھر کر رہا ہے جس کے بہت افسوس ناک اور دوررس نتائج سامنے آئیں گے۔ اقلیتیوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اقتدار کی منتقلی کافی وحشیانہ تھی۔ بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کے اندیشے صحیح تھے۔ خون کی جو ہولی کھیلی گئی وہ اس جذبے کے تحت تھی جس نے یرغمال بنانے اور انتقام کی وجہ سے لوگوں میں جنم لیا تھا۔ یہ صرف مولانا آزاد کو محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ کچھ کانگریسی لیڈر جیسے کرن شنکر راؤ، آچاریہ کرپلانی بلکہ عوام بھی جانتی تھی کہ ایک خاص قسم کا طبقہ جنم لے رہا ہے جو نفرت اور انتقام کی آگ میں جل رہا ہے۔ مولانا آزاد بار ہا ملک کے رہنماؤں سے کہتے رہے کہ اگر عوام کے اس جذبے کو ہوا دی گئی تو ملک تباہ ہو جائے گا۔

ابتدا میں آزادی اور انتقال اقتدار کے انتظامات مکمل کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے پندرہ مہینوں کی مدت مقرر کی تھی۔ دراصل فروری 1947 میں مسٹر ایٹلی نے وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ جون 1948 تک ہندوستان کو آزاد کر کے حکومت کی باگ ڈور مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں دے دی جائے گی۔ لیکن فروری سے لے کر جون 1947 تک ملک میں ایسے حالات رونما ہوئے کہ پندرہ مہینے کی مدت بھی کسی کو یاد نہیں رہی۔ جب تقسیم کا منصوبہ منظور کیا جا چکا تو ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے اسے بروئے کار لانا چاہیے۔ ایک طرف ان کا مقصد اقتدار کی منتقلی تھی تو دوسری طرف انہیں یہ خدشہ تھا کہ اگر تقسیم کی کارروائی میں دیر کی گئی تو کوئی نئی رکاوٹ نہ آ جائے۔ اس لیے انہوں نے محض تین ماہ کی مدت میں تقسیم کی ساری کارروائی پوری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اتنے کم وقت میں اتنے بڑے مسئلے کو حل کرنا بھی خطرناک تھا جس پر مولانا آزاد نے اپنے شکوک کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن وہ ماؤنٹ بیٹن کی کارکردگی

اور اتنے کم وقت میں تمام مسائل کو حل کرنے کے معترف بھی ہیں جس کے لیے انہوں نے مثال کے طور پر بیٹن کی مختلف خدمات کو پیش کیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ملکی پیمانے پر جو فساد ہوئے وہ بڑی تفصیل کے ساتھ ''آزادی ہند'' میں موجود ہیں۔ لوگوں کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور مذہب کے نام پر نفرت کو بھی پیش کیا ہے۔ جب لاہور کا مسئلہ اٹھا کہ یہ ہندوستان میں شامل ہوگا یا پاکستان میں، تو اس وقت ہندو مسلم کے ساتھ سکھ بھی یہ سوچنے لگے کہ لاہور کا مسئلہ تشدد کا طریقہ اختیار کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح میں املاک کے مالک ہندو طبقے کے تھے۔ چناں چہ مسلمانوں نے انہیں لوٹ کر معاشی طور پر کمزور کرنے کا پلان بنایا۔ اس لیے انہوں نے بلا تفریق ہندوؤں کی جائداد لوٹ کر ان کے کارخانے و مکانات جلا دیے۔ اس طرح ہندوؤں نے لاہور میں انتقاماً مسلمانوں پر حملہ کر کے بدلہ لیا۔ ان کے پاس دولت تھی وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح مسلمانوں کو لوٹ مار کر لاہور سے بھگانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ان کی اکثریت یقینی ہو جائے گی۔ اس تعلق سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''کھلے عام یہ کہا جاتا تھا کہ اس جھگڑے میں ایک فریق مال پر حملہ کرتا ہے اور دوسرا جان پر۔ فرقہ پرست جماعتوں کے اہم لیڈران براہ راست یا بالواسطہ طور پر ملوث تھے۔ چناں چہ یہ اطلاع دور دور تک پہنچائی گئی اور بالعموم اس پر یقین کیا گیا کہ مسلم لیگ کے لیڈر مرکزی بھی اور صوبائی بھی، دونوں ہندوؤں پر حملے منظّم کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہندو مہا سبھا کے لیڈروں پر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو اکسانے کا الزام تھا۔''18

اسی طرح کلکتے میں بھی حالات رونما ہوئے۔ ان دونوں شہروں کے مسئلے کو مثال بنا کر مولانا آزاد نے ماؤنٹ بیٹن کی تعریف کی ہے کہ کیسے انہوں نے اپنی دور اندیشی و سوجھ بوجھ سے معاملے کو سلجھایا۔ علاوہ ازیں تقسیم ہند کے بعد ملک کے اثاثوں، دفاتر و اس کے سامان، مالیات، صوبوں یہاں تک کہ فوج کے بٹوارے کے متعلق بھی تفصیل مذکورہ کتاب میں موجود ہے۔ مولانا آزاد فوج کی تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔ دراصل تقسیم کے بعد ہونے والے خوں ریز فسادات کا انہیں اندازہ تھا اس لیے ان کی خواہش تھی کہ فوج کو اتنی جلدی مذہب کے نام پر بانٹ کر ان میں فرقہ پرستی ڈالنا بہت خطرناک ہوگا۔ لیکن انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس معاملے میں میرے رفقا نے بھی ساتھ نہیں دیا بلکہ میری مخالفت کی گئی۔ راجندر پرساد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فوج کی تقسیم میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ حالاں کہ ماؤنٹ بیٹن بھی مولانا آزاد سے اتفاق رائے رکھتے تھے کہ فوجی دستے کی تقسیم کو روک کر کافی حد تک ہونے والے

خون خرابے کو روکا جا سکتا ہے۔ اگر اس وقت فوج کو سیاست سے دور رکھا گیا ہوتا تو شاید اتنے بڑے پیمانے پر قتل عام نہیں ہوتا۔ ماؤنٹ بیٹن نے مولانا آزاد کو بتایا تھا کہ ہندوستانی فوج میں سے اکثریت مسلمانوں کے قتل عام میں شریک ہونے کی اجازت چاہی تھی جنہیں انگریز افسروں نے بڑی مشکل سے روکا تھا۔ چوں کہ یہ بیٹن کی رپورٹ تھی اس لیے مولانا آزاد کو یقین نہ ہو سکا لیکن انہوں نے مشاہدے کے بعد اعتراف کیا کہ ہندوستان میں ہندو اور سکھ فوجوں نے مسلمانوں کا قتل کیا تو پاکستان میں مسلم فوجوں نے ہندوؤں کا۔ اس سلسلے میں اپنی رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ یہ ایک خطرناک فیصلہ تھا۔ اس نے فوج کو فرقوں کی بنیاد پر تقسیم کر دیا۔ مسلمان دستے پاکستان کے حصے میں چلے گئے، اور ہندو و سکھ دستے ہندوستان میں ہی رہے۔ اس نے فوج میں بھی فرقہ پرستی کا زہر پھیلا دیا جو اب تک اس سے بچی ہوئی تھی۔ جب 15 اگست کے بعد بے گناہ مردوں اور عورتوں کا خون سرحد کے دونوں طرف بہا تو فوج خاموش تماشائی بنی رہی۔ اس سے زیادہ برا یہ ہوا کہ بعض معاملات میں فوجی خود بھی اس لڑائی میں شامل ہو گئے۔ ہندوستانی فوج کی شاندار روایت منتشر ہو گئی اور ان کے اب تک کے قابل فخر ریکارڈ پر ایک دھبہ لگ گیا۔''[19]

اسی طرح مولانا آزاد نے دوسری اشیا کی تقسیم پر بھی اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ اس کے نتائج اور انجام کار کو روکنے کے لیے جو تجاویز پیش کیں اس پر کانگریس و مسلم لیگ کے ردعمل کا بھی اظہار کتاب میں موجود ہے۔ لیکن میں یہاں واضح کرنا چاہتی ہوں کہ مولانا آزاد فرقہ واریت کی بنا پر محض فوج اور دیگر اشیا کی تقسیم کے خلاف نہیں تھے بلکہ تقسیم ہند کی مخالفت کانگریسیوں میں سب سے زیادہ انہوں نے ہی کی تھی۔ اپنی مخالفت میں انہوں نے اقدام بھی اٹھائے، نتائج کے تئیں اپنے خدشات کو پیش کیا، تمام مسائل کے حل کے لیے اپنی طرف سے تجاویز بھی پیش کیں، لیکن افسوس کہ ان کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ خود مولانا آزاد نے ''آزادی ہند'' میں بیشتر مقام پر اپنی ناکامی پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد سرکاری عہدوں پر فائز مسلم اراکین کو مسلم لیگ دھمکی دے کر یا زبردستی پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کر رہی تھی، اس سلسلے میں مولانا نے کئی واقعات ثبوت کے طور پر بیان کیے ہیں۔ جب انہوں نے اس صورت حال کو دیکھا تو حکومت ہند سے گزارش کی کہ ایک بیان جاری کر کے سرکاری مسلم افسروں کو یقین دلایا جائے کہ انہیں بھی اکثریت کی طرح مساوی حقوق دیے جائیں گے۔ جسے بعد میں پنڈت نہرو نے باقاعدہ پریس کانفرنس کر کے مسلم

افسروں کو یقین دلایا۔اس یقین دہانی کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کا اعتماد بحال ہو گیا اور انہوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔لیکن جب مسلم لیگ کو پتہ چلا تو ان افسروں کو ورغلانے کی مہم شروع کر دی اور باقاعدہ ڈرایا گیا۔دراصل ان مسلم افسروں کے خاندان اور املاک پاکستان میں بھی تھی جسے مسلم لیگ نے نقصان پہنچانے کی دھمکی دی۔جن لوگوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا ان میں سے کچھ افسران مولانا آزاد کے پاس بھی آئے اور اپنی پریشانی و وجوہات بتا کر معذرت کرتے ہوئے پاکستان چلے گئے۔اس سلسلے میں مولانا آزاد اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمام مسلمان افسروں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کی مسلم لیگ کی یہ کارروائی احمقانہ ہی نہیں نقصان دہ بھی تھی۔اب جب کہ تقسیم کو قبول کر لیا گیا تھا اور پاکستان کا قیام عمل میں آ رہا تھا تو یہ بات صاف تھی کہ نئی ریاست میں مسلمانوں کو ہر فائدہ ملے گا۔اسی کے ساتھ اگر کچھ مسلمان ہندوستان میں ہی ملازمت کرتے رہتے تو نہ صرف یہ کہ اس سے انہیں ذاتی فائدہ پہنچے گا بلکہ پورے فرقے کے لیے یہ نہایت سود مند ہوتا۔چند ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کی موجودگی نے اس فرقے میں پہلے سے زیادہ اعتماد پیدا کیا ہوتا اور بہت سے نامعقول اندیشے رفع ہو جاتے۔میں یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تقسیم پر اصرار کر کے لیگ نے کتنی بڑی نادانی کی تھی،مسلمان افسروں کی طرف لیگ کا رویہ اسی نادانی کی ایک اور مثال ہے۔''20

آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں گورنر جنرل کے انتخاب کی تفصیلات بھی مذکورہ کتاب میں موجود ہیں۔چوں کہ ہر آزاد مملکت کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے گورنر جنرل کا انتخاب خود کر سکتی ہے۔اس لیے ہندوستان اور پاکستان کو آزادی تھی کہ اس عہدے پر کسی کو بھی فائز کرے۔کانگریس نے باہمی اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ ابھی اچانک تبدیلی کرنا مناسب نہیں ہوگا۔اس لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا انتخاب کر کے انتظامیہ اور پالیسی کو برقرار رکھا۔کانگریس کو امید تھی کہ پاکستان بھی ماؤنٹ بیٹن کا انتخاب کرے گا لیکن آخری لمحے میں مسلم لیگ نے بحیثیت گورنر جنرل محمد علی جناح کا نام اعلان کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔شان الحق حقی نے بھی اس تعلق سے اپنی خودنوشت ''افسانہ در افسانہ'' میں طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پاکستانی آج تک اس بات پر خوش ہیں کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا انتخاب نہ کر کے بڑی کامیابی حاصل کر لی اور نہ صرف انگریزوں سے بلکہ ہندوستان سے بھی اپنا بدلہ لے لیا۔لیکن قدرت اللہ شہاب اپنی خودنوشت ''شہاب نامہ'' میں واضح طور پر تو نہیں لیکن اشارتاً لکھتے ہیں کہ جب ماؤنٹ

بیٹن کی جگہ قائداعظم جناح کو اپنا گورنر جنرل بنایا گیا تو بیٹن نے بوکھلا کر اپنا بدلہ لیا جس کے لیے انہوں نے کئی واقعات بھی ثبوط کے طور پر پیش کیے ہیں۔

''آزادی ہند'' کا آخری باب ''منقسم ہندوستان'' کے نام سے ہے۔ جس میں تقسیم ہند اور اس کے اثرات کے متعلق بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا گیا۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان کے نام سے ایک آزاد ملک دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا اور 15 اگست کو ہندوستان کو آزادی ملی۔ ملک کی تقسیم کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ایک قرارداد میں اور مسلم لیگ کے رجسٹر پر ہی تسلیم کیا گیا تھا کیوں کہ بعد کے حالات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ عوام تقسیم کو قبول نہیں کر سکی تھی۔ ان میں سے اکثریت شروع سے ہی تقسیم کے خلاف تھی۔ دراصل مسلم لیگ اور کانگریس نے اپنی منظوری دے دی تھی اس لیے دونوں پارٹیوں کے رہنماؤں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ پوری قوم نے تقسیم کو مان لیا ہے۔ جب کہ صورت حال کافی مختلف تھی۔ یہ سچ ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ساتھ تھی لیکن ان میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی تھا جو شروع سے مسلم لیگ کا مخالف تھا۔ ایسے لوگوں کو ظاہر ہے کہ تقسیم ہند کے فیصلے سے سب سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔ جہاں ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے، بقول مولانا آزاد 'ان کا ایک ایک آدمی تقسیم کے خلاف تھا' کانگریس کی منظوری کے بعد بھی یہ دونوں طبقے مخالفت کرتے رہے۔

ملک کے بنٹوارے کے بعد مسلم لیگ کے حمایتی مسلمان بھی تقسیم کے نتیجے سے خوف زدہ تھے اور کھل کر کہتے تھے کہ یہ تقسیم وہ تو نہیں ہے جو ہم سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان کی اس صورت حال پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ کانگریسیوں میں زیادہ تر لیڈروں نے محض غصے و ناراضگی میں تقسیم کو قبول کیا تھا اور باقی نے حالات سے مجبور ہو کر۔ انہوں نے زیر نظر کتاب میں کئی مقامات پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کانگریسیوں میں سب سے زیادہ تقسیم کے حامی سردار پٹیل تھے۔ وہ، مولانا آزاد اور باقی لوگوں کے سامنے تقسیم کی حمایت میں طرح طرح کی بے بنیاد دلیلیں دیا کرتے تھے جو کہ فرقہ پرستی سے پُر ہوتیں۔ تقسیم کے تئیں سردار پٹیل کی خوش فہمی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''انہیں اس بات کا یقین تھا کہ پاکستان کی ریاست پنپنے والی نہیں ہے اور وہ زیادہ دن قائم نہیں رہ سکے گی۔ انہوں نے سوچا کہ پاکستان کی قبولیت مسلم لیگ کو کڑوا سبق سکھائے گی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پاکستان ڈھیر ہو جائے گا اور وہ صوبے جو ہندوستان سے الگ ہو گئے تھے، انہیں ناقابل بیان مشکلوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سردار پٹیل کو شاید یہ امید تھی کہ ان صوبوں کو واپس ہندوستان میں آنے پر مجبور ہونا پڑے گا، مجھے اس کا

اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ مسلم لیگ کے خلاف انہوں نے اتنے شدید تعصّبات پیدا کر لیے تھے کہ لیگ کی پیروی کرنے والے مسلمانوں کو اگر تکلیف پہنچتی تو انہیں کوئی افسوس نہ ہوتا۔'' 21

ملک کی تقسیم کے بعد لوگوں کے رویے کا اندازہ 14 اگست کو ہی ہو گیا تھا جب پاکستان وجود میں آیا۔ اگر ہندوستانیوں نے پوری رضامندی کے ساتھ تقسیم کو مان لیا ہوتا تو یقیناً پنجاب، سرحد، سندھ اور بنگال کے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی اسی طرح خوشیاں منائی ہوتیں جس طرح ان علاقوں کے مسلمانوں نے منائی تھیں۔ ان تمام صوبوں میں جو حالات پیدا ہوئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس کا یہ دعویٰ کتنا کھوکھلا تھا کہ ہماری منظوری کے بعد پوری عوام بھی راضی خوشی تقسیم ہند پر مان جائے گی۔ بہرحال پاکستان کے مسلمانوں کے لیے 14 اگست جہاں عید کے مانند تھا تو وہیں سکھوں اور ہندوؤں کے لیے ماتم کا دن تھا۔ یہ احساس صرف عوام تک محدود نہیں تھا بلکہ کانگریس کے کچھ اہم لیڈروں کو بھی تھا جو ان علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت کانگریسی صدر آچاریہ کرپلانی نے، جو کہ سندھ کے رہنے والے تھے، 14 اگست کو ایک بیان جاری کر کے کہا تھا کہ 'یہ دن افسوس اور ہندوستان کی بربادی کا ہے۔' پورے پاکستان میں تمام سکھ و ہندوؤں نے غم و غصے کا اظہار کھلے عام کیا تھا۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب اتنے مسائل تھے اور ملک و قوم تقسیم پر راضی نہیں تھی تو پھر اس پر منظوری کیوں دی گئی۔ اس وقت کے حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا اس سے انگریز بھی بوکھلائے ہوئے تھے دوسری جانب کانگریس اور مسلم لیگ کسی طرح مفاہمت کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ ایسے حالات میں انہیں مسئلے کا حل تقسیم میں ہی نظر آیا۔ جب کہ مولانا آزاد نے اپنی بھرپور کوشش کی تھی، یہاں تک کہا تھا کہ مسئلے کے حل کے لیے آزادی میں تھوڑا اور انتظار کر لینا چاہیے جہاں صدیوں سے غلامی کی زندگی جی رہے ہیں وہاں ایک بڑی تباہی کو روکنے کے لیے کیا تھوڑا اور برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انہیں افسوس ہے کہ ان کے ساتھیوں و رفیقوں نے ساتھ نہیں دیا، غصے و مایوسی نے ان کی نظر کو دھندھلا دیا تھا۔

15 اگست کو ہندستان کی آزادی اور لوگوں کے جشن منائے جانے کی تفصیلات بھی کتاب میں موجود ہے۔ اس دن دہلی اور اس کے گرد و نواح سے لوگ جوق در جوق آزادی کی خوشیاں منانے کے لیے لال قلعے کے پاس جمع ہوئے تھے۔ جہاں شام چار بجے آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرایا جانے والا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگست کی تپتی دھوپ میں بھی لاکھوں کا مجمع تھا بلکہ چلچلاتی دھوپ میں لوگ گھنٹوں انتظار کرتے رہے۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی کار سے نکل ہی

نہیں پائے اور وہیں سے بحیثیت گورنر جنرل ہندوستانی عوام کو خطاب کیا۔ خوشونت سنگھ نے بھی اپنی خودنوشت میں اس منظر کو بڑے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔

لیکن یہ مسرت کا عالم بمشکل 48 گھنٹے باقی رہا۔ دوسرے ہی دن فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں نے پورے ملک کی فضا کو مسموم کر دیا۔ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کا ہجوم مسلم گاؤں پر حملہ آور ہوا، ان کے گھروں کو آگ لگا کر بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا۔ ایسے ہی مغربی پنجاب میں مسلمان بغیر کسی تفریق کے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کر رہے تھے، غرض پورا پنجاب بربادی اور کشت وخون کا میدان بن گیا۔ اس کے بعد پورے ملک میں یکے بعد دیگرے کئی واقعات رونما ہوئے۔ ابتدا میں دہلی میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا لیکن جب غارت گیری کی خبریں وہاں بھی پہنچی اور پناہ گزینوں کا ایک بڑا قافلہ لٹ پٹ کر پنجاب سے دہلی پہنچا تو پورے شہر پر قتل کا آسیب چھا گیا۔ یہ قتل عام محض عوام تک محدود نہیں تھا بلکہ سرکاری ملازمین پر بھی حملے ہوئے اور ان کے علاقوں میں بھی بلوہ ہوا۔ مغربی پنجاب کی خوں ریزی کی خبریں پا کر ہندوؤں اور سکھوں نے دہلی کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ بقول مولانا آزاد 'دہلی میں ان قاتلانہ حملوں کو منظّم کرنے میں سکھوں نے نمایاں حصہ لیا۔' یرغمال اور انتقام کا جو جذبہ تقسیم ہند سے پہلے لوگوں میں گھر کر رہا تھا تقسیم کے بعد وہی حقیقت کا روپ لے کر سامنے آیا۔ اس تعلق سے اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''یرغمال بنانے اور انتقام لینے کے خطرناک اصول کی غیر محتاط باتوں نے مجھے کتنا پریشان کیا تھا۔ دہلی میں اب ہم اسی اصولوں پر بھیانک طریقے سے عمل ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اگر مغربی پنجاب کے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے قتل کے قصوروار تھے تو اس کا کیا جواز تھا کہ بدلہ دہلی کے مسلمانوں سے لیا جائے؟ یرغمال بنانے اور بدلہ لینے کا یہ اصول اتنا بہیمانہ ہے کہ کوئی بھی شائستہ یا ہوش مند انسان اس کی مدافعت میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔''22

دہلی میں قتل و غارت گیری کا بازار کئی مہینوں تک گرم رہا۔ مولانا آزاد کے علاوہ انیس قدوائی، ساجدہ زیدی، دیوان سنگھ، سیدہ بانو، آل احمد سرور وغیرہ نے بھی اپنی خودنوشت میں دہلی کے خوں ریز فساد کا ذکر کیا ہے۔ خاص شہر سے قطع نظر قرول باغ، لودی کالونی، سبزی منڈی اور صدر بازار کے علاقے ایسے تھے جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد تھی۔ ان تمام علاقوں میں ان کے جان و مال محفوظ نہیں تھے۔ نہ ہی فوجی دستے حفاظتی کارروائی میں آگے آئے اور نہ حکومت کے اراکین۔ ان علاقوں میں صورت حال اتنی خراب تھی کہ کوئی بھی مسلمان اس اعتماد کے ساتھ رات کو سو نہیں

سکتا تھا کہ اگلی صبح وہ زندہ اٹھے گا۔ مسلم علاقے بڑی تیزی سے خالی ہو رہے تھے، اکثریت ہجرت کرنے پر مجبور ہوئی اور جو نہیں جا سکے وہ کیمپوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ اس وقت دہلی کے سرکاری ملازموں کے گھروں میں بھی مسلمانوں نے پناہ لی تھی۔

رفیع احمد قدوائی کی حویلی کے علاوہ مولانا آزاد کی کوٹھی پر بھی ایک بڑی تعداد میں مسلمان پناہ گزیں تھے۔ جب قرول باغ میں لوٹ مار شروع ہوئی تو پروفیسر ساجدہ زیدی بھی اپنے شوہر، بہنوں اور ماموں کے ساتھ ان کے گھر پناہ گزیں تھیں۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''نوائے زندگی'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ پناہ گزینوں کے لیے مولانا آزاد کے نظم ونسق، ان کی پریشانی وجھنجھلاہٹ کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا آزاد نے فوجی دستوں کے ساتھ دہلی شہر کا دورہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ فسادزدہ علاقوں میں مسلمان بالکل ہزیمت زدہ اور بے بسی وخوف میں مبتلا تھے۔ بعد میں ان علاقوں میں حکومت سے سفارش کر کے فوجی دستے تعینات کرائے۔ جان وعزت وآبرو بچانے کی خاطر مسلمان، پاکستان بھاگ رہے تھے، انہیں مولانا آزاد سمجھاتے، تسلیاں دیتے، بے شمار لوگوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ یہ تمام چیزیں ان کی خودنوشت میں موجود ہے۔

بعد میں جب حالات بہت تشویشناک ہو گئے تو مسلمانوں کو فسادزدہ علاقوں سے نکال کر حفاظتی کیمپوں میں پہنچایا گیا۔ ان کیمپوں اور وہاں کی بدانتظامیوں کا تذکرہ بھی کتاب میں موجود ہے۔ ملک کے بگڑتے حالات کو سدھارنے کے لیے بحیثیت گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کی خدمات کو مولانا آزاد نے تحسین آمیز انداز میں بیان کیا ہے۔ ان تمام صورت حال میں گاندھی جی عجیب ذہنی اذیت میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ملک میں امن وامان اور ہندو مسلم کو متحد کرنے کے لیے اپنی جان لگا دی تھی۔ لیکن اپنی ناکامی پر وہ بہت افسردہ تھے۔ وہ پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور مولانا آزاد کو اپنے پاس روز بلا کر دہلی اور ملک کے حالات معلوم کرتے۔ اس وقت گاندھی جی کو جواب دینے میں ان تینوں شخصیات کے بیانات میں اختلاف ہوتا تو وہ اور پریشان ہوتے۔ حکومت ہند کے اراکین میں بھی اس وقت دو گروپ ہو گئے تھے۔ ایک طرف سردار پٹیل اور ان کے حامی تھے تو دوسری طرف پنڈت نہرو و مولانا آزاد اور ان کے ساتھی تھے۔ اول الذکر گروپ بڑا تھا جو کہ سردار پٹیل کی خوشیوں کو دیکھتے ہوئے ہی کوئی کام کرتا تھا۔ اس وقت ملک کی بگڑتی حالت اور قتل وغارت گیری کے درمیان انتظامیہ کی بدانتظامی وحکومت کے ہی دو حصوں میں بٹے لوگوں پر مولانا آزاد نے افسوس کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔

سردار پٹیل آزاد ہندوستان کے وزیر داخلہ منتخب ہوئے اس طرح دہلی کی انتظامیہ براہ راست ان کے ہی ماتحت

کام کر رہی تھی۔ جب دہلی میں لوٹ مار کی فہرست طویل ہوئی تو گاندھی جی نے سردار پٹیل سے جواب مانگا کہ اس خوں ریزی کو روکنے کے لیے وہ اور ان کی انتظامیہ کیا کر رہی ہے۔ تو انہوں نے گاندھی جی کو یہ کہتے ہوئے یقین دلایا کہ آپ کو جو خبریں موصول ہوئی ہیں وہ مبالغہ آمیز ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو ڈرنے یا شکایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ان کی حفاظت کے لیے انتظام کر دیا گیا ہے۔ اس تعلق سے مولانا آزاد نے تمام تفصیلات پیش کی ہیں۔

ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، جب پنڈت نہرو نے گاندھی جی کے سامنے یہ کہا کہ دہلی میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا ہے، وہ یہ سب برداشت نہیں کر پا رہے ہیں، انہیں اپنے آپ پر شرم آتی ہے۔ یہ سن کر سردار پٹیل کا کہنا تھا کہ دہلی میں ایسے اکا دکا واقعات ضرور ہوئے ہیں لیکن حالات اتنے خراب نہیں ہیں جتنا پنڈت نہرو بیان کر رہے ہیں۔ اس طرح تو یہ اپنے ہی حکومت کے اراکین پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی کے علاوہ وہاں موجود سب کے سب حیران ہوئے کیوں کہ اس وقت یعنی ستمبر 1947 میں دہلی کی حالت کافی تشویش ناک تھی، پنڈت نہرو حرف بہ حرف سچ کہہ رہے تھے، اس وقت پولیس اور حکام خاموش تماشائی بنے تھے۔ جس بے دردی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس کا ذکر ساجدہ زیدی، دیوان سنگھ، آل احمد سرور، سیدہ بانو، خوشونت سنگھ وغیرہ نے بھی اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ بہر حال دہلی کے حالات اور حکام کے اراکین خاص کر سردار پٹیل کا حقیقت کو صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش اور ناکامی پر مولانا آزاد نے کھل کر بڑے ہی طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے، اس سلسلے میں مذکورہ کتاب کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں جس سے حالات کی سنگینی اور حکام کی بے اعتنائی اور ان کے کام کرنے کے طریقہ کار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ''ایک اور واقعے نے جو تقریباً اسی وقت ہوا صاف ظاہر کر دیا کہ سردار پٹیل کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ شاید انہوں نے یہ سوچا کہ مسلمانوں پر ہر روز جو حملے ہو رہے ہیں ان کا کوئی جواز ضروری ہے۔ چناں چہ انہوں نے ایک نظریہ پیش کیا کہ شہر کے مسلم علاقوں سے مہلک اسلحے برآمد کیے گئے تھے..... سردار پٹیل کے حکم سے انہیں گورنمنٹ ہاؤس لایا گیا اور ہمارے معائنے کے لیے کیبنٹ روم کے اینٹی چیمبر میں رکھ دیا گیا۔ جب ہم اپنی روز کی میٹنگ کے لیے یکجا ہوئے تو سردار پٹیل نے کہا کہ پہلے ہم اینٹی چیمبر میں جائیں اور برآمد کردہ اسلحہ دیکھ لیں۔ ہم وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز پر باورچی خانے میں کام آنے والے درجنوں چاقو جن میں زنگ لگا ہوا تھا، جیب میں رکھنے والے اور قلم یا پنسل

تراشنے والے چاقو جن میں بعض دستوں کے ساتھ تھے بعض بغیر دستوں کے۔ اور کچھ لوہے کی سلاخیں جو پرانے مکانات کے جنگلوں سے نکالی گئی تھیں، اور کچھ ڈھلے ہوئے فولاد کے واٹر پائپ رکھے ہوئے تھے۔ سردار پٹیل کے قول کے مطابق یہی وہ اسلحے تھے جو دہلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جمع کیے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک یا دو چاقو اٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ جنہوں نے یہ سامان اکٹھا کیا تھا، وہ جنگی داؤں پیچ کا ایک حیرت انگیز تصور رکھتے ہوں گے، وہ یہ سوچتے ہیں کہ دہلی شہر پر انہی اسلحوں کی مدد سے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔''23

مولانا آزاد نے دہلی کے کیمپوں میں پناہ گزینوں کی مدد کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی تھی، جس کی تفصیلات بھی انہوں نے پیش کی ہیں۔ حکومت کے وہ اراکین جو مسلم دشمنی کو بنیاد بنا کر خفیہ کارنامے انجام دے رہے تھے اس کا بھی اشارتاً ذکر ملتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت سے حکومت کی لاپرواہی اور ملک کے بگڑتے حالات کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے مخالفت میں برت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ ایک یہی ذریعہ ہے جس سے قتل عام کو روکا جا سکتا تھا۔ برت رکھنے کے ان کے فیصلے کی مخالفت بھی کی گئی ان میں سردار پٹیل بھی تھے۔ جسے مولانا آزاد نے مختلف واقعوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ گاندھی جی کے برت رکھنے کے دوسرے دن سردار پٹیل کو ممبئی جانا تھا۔ پنڈت نہرو کے علاوہ مولانا آزاد نے بھی حالات کو دیکھتے ہوئے انہیں روکنے کی کوشش کی، تو انہوں نے گاندھی جی کے برت کو بے مقصد بتا کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔ اس وقت ان کی تلخ کلامی کو بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ انہوں نے غصے میں آ کر گاندھی جی کو ہندوؤں کے نام پر کلنک بتایا تھا۔

دوسری طرف عوام پر گاندھی جی کے برت کا اثر ہو رہا تھا جو لوگ مخالفت کر رہے تھے، ان میں سے بھی اکثر ان کی جان بچانے کے لیے ہر بات ماننے کو تیار تھے۔ مولانا آزاد اور دیگر لوگوں نے گاندھی جی سے برت توڑنے کی گزارش کی۔ بعد میں گاندھی جی نے کچھ شرائط حکومت کے سامنے رکھی جس کی تکمیل کے بعد اپنا برت توڑنے پر راضی تھے۔ ان شرطوں میں پہلی شرط یہی تھی کہ جو مسلمان خوف و ہراس کے عالم میں پاکستان چلے گئے ہیں انہیں واپس بلایا جائے اور ملک میں امن و امان کے لیے ٹھوس اقدامات اٹھائے جائیں۔ ''آزادی ہند'' میں مولانا آزاد نے گاندھی جی کے برت، ان کی تمام شرائط کی نقل، شرط کی تکمیل کے لیے حکومت کے کارنامے، گاندھی جی کے مخالفین، ان کے کارناموں کو پیش کیا ہے۔ مخالفین اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ گاندھی جی کے قتل کی سازش ہی رچانے لگے کیوں کہ ان کو یہ

گمان تھا کہ وہ محض مسلمانوں کی فکر کر رہے ہیں۔ چناں چہ جب انہوں نے قتل عام روکنے کے لیے برت رکھا تو ان لوگوں کو مزید غصہ آیا۔ برت کے خاتمے کے بعد ایک دن پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی پر بم پھینکا گیا لیکن وہ بچ گئے۔ اس وقت پولیس کی تحقیقات میں کوئی سراغ نہیں ملا۔ مولانا آزاد نے افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اتنی بڑی شخصیت کو مارنے کی سازش بھری محفل میں کی گئی ایسا کیسے ممکن تھا کہ قاتل کا کوئی سراغ ہی نہ ملے، حملے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تعداد میں وہ کتنے بھی رہے ہوں لیکن گاندھی جی کے قتل کے درپے ایک گروہ منظّم طریقے سے کام کر رہا تھا۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی گاندھی جی کی حفاظت کے لیے کوئی احتیاطی تدابیر نہیں کی گئی۔

آخر کار اس حملے کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی ان ہی دشمنوں کی سازشوں کا شکار ہو گئے۔ مولانا آزاد نے گاندھی جی کے قتل کی سازش، حکام کی لاپرواہی، ان کی شہادت، اور لوگوں کے ردعمل کا ذکر کتاب کے حرف آخر میں کیا ہے۔ قتل کے دن ایک شخص کا ریوالور کے ساتھ پرارتھنا سبھا میں شامل ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ دہلی پولیس اور سرکاری عہدیدار بھی اس سازش میں ملوث تھے۔ مولانا آزاد نے واضح طور پر تو نہیں مبہم انداز میں کچھ واقعات کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سردار پٹیل براہ راست تو نہیں لیکن کہیں نہ کہیں اس قتل کے ذمہ دار تھے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''ان تمام امور میں سب سے زیادہ لائق توجہ بات یہ تھی کہ سردار پٹیل، گاندھی جی کے خلاف ہو گئے تھے۔ جس وقت گاندھی جی نے مسلمانوں کے تحفظ کے سوال پر برت رکھا تو وہ بے نیاز رہے۔ پٹیل نے سوچا کہ برت کا رخ ان کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے جب میں نے ان سے کہا کہ بمبئی نہ جائیں تو انہوں نے رکنے تک سے انکار کر دیا۔ مقامی پولیس پر ان کے رویے کا انتہائی افسوس ناک اثر پڑا۔ مقامی کارکن سردار پٹیل کی طرف دیکھتے تھے اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ گاندھی جی کی حفاظت کے لیے انہوں نے خصوصی احکامات نہیں جاری کیے ہیں تو خود ان لوگوں نے بھی یہ ضروری نہیں سمجھا کہ کوئی خاص تدابیر کی جائیں۔ گاندھی جی کی موت سے پہلے پٹیل کی بے پروائی اتنی نمایاں تھی کہ لوگوں نے اسے محسوس کر لیا۔ یہ سانحہ جب ہو گیا تو ان پر غم و غصے کی ایک لہر کا دوڑ جانا فطری تھا۔ کچھ لوگ سردار پٹیل کو نااہلی یا اس سے بھی زیادہ خرابی کا قصوروار سمجھتے تھے۔''24

جن لوگوں نے گاندھی جی کی شہادت کے بعد سردار پٹیل کے خلاف آواز اٹھائی تھی مولانا آزاد نے ان کے بھی

نام پیش کیے ہیں۔ مثلاً گاندھی جی کی موت کے بعد دہلی کے تعزیتی جلسے میں جے پرکاش نرائن نے کہا تھا کہ حکومت ہند کے وزیر داخلہ گاندھی جی کے قتل کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتے۔ انہوں نے سردار پٹیل سے جواب طلب کیا تھا کہ جب کھلے عام پروپیگنڈوں کے ذریعہ ان کے قتل پر لوگوں کو اکسایا جا رہا تھا تو انہوں نے خصوصی تدابیر کیوں نہیں اپنائی؟ اسی طرح مسٹر پرفلا چندر گھوش نے بھی سردار پٹیل کی مخالفت کی تھی۔ علاوہ ازیں مولانا آزاد نے بڑی بے باکی سے ان حضرات کا تذکرہ بھی کیا ہے جنہوں نے گاندھی جی کے قتل کے بعد خوشیاں منائی تھیں۔ گوالیار اور اجمیر شہر کا نام مذکورہ کتاب میں شامل ہے جہاں کھلے عام خوشیاں منائی گئیں، مٹھائیاں تقسیم کی گئی تھیں۔ ایسے لوگوں کو ملک کے دوسرے لوگ اپنے غم و غصے کا نشانہ بنا رہے تھے۔ انیس قدوائی نے بھی اپنی خودنوشت میں ان دونوں شہروں کے جشن کا ذکر کیا ہے جو گاندھی جی کی موت کے بعد منایا گیا تھا۔

قاتل ناتھورام گوڈسے کے خلاف ہوئی قانونی کارروائی، گاندھی جی کے مخالفین کا گوڈسے کو بچانے کی جدوجہد، بعد ازاں سپریم کورٹ کے فیصلے پر گوڈسے کی پھانسی کا تذکرہ بھی تفصیل سے ملتا ہے۔ گاندھی جی کی شہادت کے دو مہینے کے بعد ہی سردار پٹیل کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ مولانا آزاد نے اس تعلق سے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'یہ وہ صدمہ تھا جو ان کو عوام اور لیڈروں کی طرف سے کی گئی مخالفت پر پہنچا تھا۔ اس سے قطع نظر وہ بھول نہیں سکے تھے کہ ان کے پاس جو کچھ تھا اس کے لیے وہ گاندھی جی کے ہی مرہون منت تھے۔ جس کا اثر ان کے دماغ پر پڑا اور وہ پریشان رہنے لگے، یہاں تک کہ کسی شریان میں انجماد خون کی وجہ سے ان پر تھرومبوسس کا حملہ ہوا، وہ کوئی چار برس زندہ رہے لیکن ان کی صحت کبھی بحال نہ ہو سکی۔'

ہندوستان کو آزادی تو مل گئی تھی لیکن اس نے اپنی وحدت کھو دی تھی، پاکستان مسلم لیگ کی تخلیق تھی۔ چناں چہ فطری طور پر ان کی ہی حکومت برسر اقتدار آئی۔ وہاں کے حکام کی نااہلی اور نئے ملک کی ناکامی و پریشانی کا ذکر بھی مولانا آزاد نے کیا ہے۔ انہوں نے کتاب کے ''حرف آخر'' میں تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ مسائل کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ تقسیم ہند سے کیا ان مسائل کا حل ہوا جس کی مسلم لیگ یا باقی لوگ حمایت کر رہے تھے؟ بلکہ معاملہ مزید تشویش ناک ہو گیا ہے۔ مسلم لیگ اگر مسلمانوں کے مستقبل اور تحفظ زندگی کی فکر کرتی تو شاید تقسیم کی مانگ اس طرح نہیں کرتے کیوں کہ اُس کے بعد سارے مسلمانوں کی منتقلی پاکستان میں ناممکن تھی، اس طرح ہندوستان میں رہ رہے کروڑوں مسلمانوں کی زندگی کو داؤں پر لگا دیا گیا۔ انہیں آج بھی ہندوستان میں شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ تقسیم کی بنیاد ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی

عداوت تھی، پاکستان کے قیام نے اسے ایک مستقل آئین بنا دیا اور دونوں کے درمیان کی نفرت کو مزید تقویت دی۔ اس طرح دونوں ملک ایک دوسرے کے شدید دشمن بن کر سامنے آئے۔ یہاں تک کہ مشرقی و مغربی پاکستان میں ہی اختلاف شروع ہو گئے، یہ اتنے بڑھے کہ وہ بھی الگ ہو گئے اور بنگلہ دیش کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آیا۔ مولانا آزاد پاکستان کے آپسی تنازعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کوئی یہ امید نہیں کر سکتا کہ مشرقی و مغربی پاکستان، اپنے تمام اختلافات کو درست کر لیں گے اور ایک قوم بن جائیں گے۔ یہاں تک کہ مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب اور سرحد کے تینوں صوبے اندرونی بے آہنگی رکھتے ہیں اور اپنے الگ مقاصد اور مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں۔''25

آخر میں مولانا آزاد نے یہ اعتراف کیا ہے کہ جو ہونا تھا، ہو چکا ہے اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہم نے جو کیا وہ صحیح تھا یا نہیں اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔ لیکن امن و امان قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ملک آپسی تنازعے اور نفرت کو بھول کر مل جل کر کام کریں۔ کتاب کے آخر میں وہ 30 صفحات ضمیمے کی شکل میں شامل ہیں۔ جس کو مولانا آزاد نے پہلی بار کتاب کی اشاعت کے وقت روک دیا تھا یہ کہہ کر کہ وہ صفحات میری موت کے بعد شائع کئے جائیں۔

مختصر یہ کہ مولانا آزاد کی خودنوشت کے مذکورہ تیسرے حصے کو تاریخی و سیاسی اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ آزادی ہند کے سلسلے میں پیش ہوئے واقعات و حالات اور تقسیم کے خوں ریز اثرات کا نقشہ کھینچا ہے۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کی ہجرت کو روکنے اور ان کی دل جوئی کرنے میں کلیدی رول ادا کیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے دہلی کی جامعہ مسجد سے وہ تاریخی خطاب بھی کیا تھا جس میں مسلمانوں کو حوصلہ دینے کے ساتھ ان کو ہجرت سے روکنے کی سفارش کی گئی تھی۔ ہندوستانی سیاست میں مولانا آزاد کی شخصیت و خدمات اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے آزادی سے پہلے بحیثیت کانگریسی صدر حصول آزادی میں نمایاں کردار بھی ادا کیا، اپنے اخباروں و جادو بیانی سے لوگوں میں ذہنی بیداری لانے کا کام کیا، کئی بار جیل کی ہوا بھی کھائی۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی خدمات مسلم ہیں۔ ان کی خودنوشت کے تینوں حصے نہ صرف اردو ادب کے لیے بلکہ مستقبل میں مورخین کو ہندوستان کی تاریخ مرتب کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوں گے۔

حوالہ جات

1۔ مشمولہ مولانا ابولکلام آزاد، خودنوشت (مرتب عبدالرزاق ملیح آبادی)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014، ص: 10

2۔ مولانا ابولکلام آزاد، تذکرہ، (مرتب مالک رام)، ساہتیہ اکادیمی، دہلی، 1985، ص: 18

3۔ مولانا ابولکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم (مرتب پروفیسر ہمایوں، اردو مترجم شمیم حنفی)، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2013 ص: 23

4۔ مولانا ابولکلام آزاد، خودنوشت (مرتب عبدالرزاق ملیح آبادی)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014، ص: 21

5۔ مولانا ابولکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم (مرتب پروفیسر ہمایوں، اردو مترجم شمیم حنفی)، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2013 ص: 8

6۔ ایضاً، ص: 6

7۔ ایضاً، ص: 29

8۔ ایضاً، ص: 107

9۔ ایضاً، ص: 120

10۔ ایضاً، ص: 126

11۔ ایضاً، ص: 183

12۔ ایضاً، ص: 201,200

13۔ ایضاً، ص: 209

14۔ ایضاً، ص: 233

15۔ ایضاً، ص: 242

16۔ ایضاً، ص: 248

17۔ ایضاً، ص: 263

18۔ ایضاً،ص: 266

19۔ ایضاً،ص: 268

20۔ ایضاً،ص: 271

21۔ ایضاً،ص: 274

22۔ ایضاً،ص: 278

23۔ ایضاً،ص: 282,281

24۔ ایضاً،ص: 296

25۔ ایضاً،ص: 301

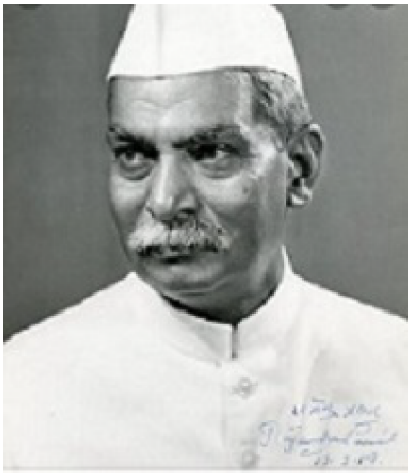

راجندر پرساد: اپنی کہانی

سنہ اشاعت: 1961

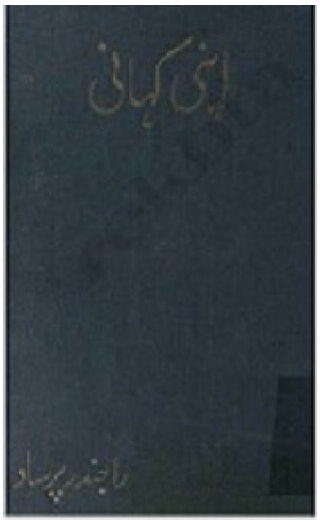

اپنی کہانی (راجندر پرساد)

سابق صدر ہند راجندر پرساد المعروف راجندر بابو 3 دسمبر 1884 کو صوبہ بہار کے سیوان ضلع کے زیرادئی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مہادیو سہائے کو سنسکرت اور فارسی پر عبور حاصل تھا اس لیے انہوں نے اپنے بچوں کی بھی تعلیمی ابتدا فارسی زبان سے کرائی۔ ان کی والدہ کملیشوری دیوی گھریلو خاتون تھیں۔ راجندر پرساد کے آباو اجداد تلاش معاش کی خاطر یوپی سے ہجرت کر کے بہار کے زیرادئی گاؤں میں جا کر بس گئے تھے۔ وہ کائستھ ہندو تھے، چوں کہ یہ لوگ تعلیم یافتہ تھے اس لیے جب زیرادئی گاؤں پہنچے تو ان کی خوب خاطر مدارت کی گئی، کیوں کہ اس گاؤں میں تعلیم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے ترقی کرتے ہوئے مصنف کے بزرگ ہتھوا راج سے منسلک ہو گئے اور ان کے پاس کافی زمین و جائداد بھی آ گئی۔ ان کے دادا کے چھوٹے بھائی چودھری لال ہتھوا راج نے دیوان کے عہدے پر کافی شہرت پائی، جو کہ راجہ راجندر پرتاپ کے کافی قریبی مانے جاتے تھے۔

راجندر پرساد کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھا جن میں ایک بہن کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ جب ان کی عمر پانچ برس کی ہوئی تو والد نے ایک مولوی کے ذریعہ بسم اللہ کی رسم کرا کر حرف شناسی کا آغاز کیا۔ پھر گھر پر ہی مولوی سے فارسی، ہندی، حساب کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ رسمی ابتدائی تعلیم کے بعد چھپرہ کے ضلع اسکول میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد بھائی کے ساتھ ٹی کے گھوش، پٹنہ گئے۔ انہوں نے کلکتہ یونی ورسٹی کے داخلہ امتحان میں اول مقام حاصل کر کے کلکتہ کے مشہور پریذیڈنسی کالج میں داخلہ لیا، کلکتہ یونی ورسٹی سے قانون کے شعبے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں سینئر وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے رہے۔ بارہ سال کی عمر میں ان کی شادی راج ونشی دیوی سے ہوئی۔

راجندر پرساد تحریک آزادی کے نمایاں رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ آزادی کے قبل کانگریس کے بحیثیت صدر اہم کردار ادا کیا تھا۔ آزاد ہندوستان میں مرکزی وزیر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے پورے ملک میں راجندر بابو کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ وہ بہار کے مشہور سیاسی رہنما تھے، تحریک آزادی کے سلسلے میں کئی بار جیل بھی گئے۔ 1946 کے انتخابات کے بعد وزیر برائے زراعت بنے، ملک کی آزادی کے بعد وہ مجلس دستور ساز کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی مجلس نے آئین ہند کو مرتب کیا تھا جس میں راجندر پرساد نے بھی مدد کی تھی، وہ پہلے صدر جمہوریہ ہند بنے۔ دوبارہ 1957 میں صدر منتخب ہوئے، 1962 میں صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ حکومت نے ان کو بھارت رتن سے نوازا تھا۔ 23 فروری 1963 کو انتقال کر گئے۔

راجندر پرساد وکیل اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ایک اچھے ادیب بھی تھے انہوں نے ہندی و انگریزی میں کئی کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں۔ ان کی کتابوں میں آئینۂ سائنس، چہروں کا جنگل، ہندوستان کا دستور، مدن پور بانپور کے مورتی شِلپ اور چِترکلا، ہندوستان کا مستقبل، چمپارن میں مہاتما گاندھی، ستیہ گرہ ان چمپارن، خودنوشت آتم کتھا (اپنی کہانی) کے علاوہ India Divided,The Automation Advantage, At the feet of Mahatma Gandhi وغیرہ اہم ہیں۔

راجندر پرساد نے اپنی خودنوشت ہندی زبان میں ''آتم کتھا'' کے نام سے لکھی، جسے گوپی ناتھ امن نے اردو میں ''اپنی کہانی'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ جو کہ پہلی بار شمع بک ڈپو سے 1961 میں شائع ہوئی تھی۔ پہلے پہل مذکورہ خودنوشت ہندی میں ہی جنوری 1947 میں شائع ہوئی تھی، بعد میں ترمیم و اضافے کے ساتھ دوسرا ایڈیشن 1956 میں شائع ہوا، اس ایڈیشن میں کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں چناں چہ تصحیح کے ساتھ تیسرا ایڈیشن شائع ہوا جس کا اردو ترجمہ بھی ہوا۔ مذکورہ خودنوشت زائد از 1110 صفحات پر مشتمل 162 ابواب میں منقسم ہے۔ ہر باب کو ایک عنوان سے مزین کیا گیا ہے جس سے مذکورہ باب کے متن کی معلومات ہو جاتی ہے۔

راجندر پرساد نے خودنوشت کا آغاز آباواجداد، والدین، بھائی بہن، گاؤں کی زندگی اور بچپن کی حسین یادوں سے کیا ہے۔ گاؤں کی تہذیب وتمدن اور سماجی و معاشی زندگی کا اچھا خاکہ پیش کیا ہے۔ آپسی بھائی چارگی، ہندو مسلم اتحاد کا ذکر بھی کیا ہے۔ گاؤں میں ہر مذہب کے لوگ تہوار مل جل کر مناتے، ہولی، دشہرہ، دیوالی، عید وغیرہ میں ہندو مسلم ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان میں ایک خاص قسم کی تفریق برتی جاتی تھی۔ محرم یا دوسرے مواقع پر ہندو مسلمانوں کے ہاتھ سے کھانا یا پانی نہیں پیتے تھے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ہندو لوگ مسلمانوں کا چھوا پانی یا شربت نہیں پیتے۔ مسلمان بھی اسے برا نہیں مانتے، وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہندوؤں کا دھرم ہے، اس لیے وہ خود ہٹ جاتے۔''[1]

سماج میں ان تفریقات کے باوجود مسلمان بھی ہندوؤں کے تہوار ہولی و دیوالی میں برابر شریک ہوتے تھے۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی روایت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ مصنف نے پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنی وکالت اور اس دور کے حالات وواقعات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے راجندر پرساد جب کلکتہ میں زیر تعلیم تھے تو 1905 میں بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔ بنگال سمیت ملک بھر میں اس کی مخالفت شروع ہوئی، اس تحریک میں طلبہ سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ چناں چہ تقسیم بنگال کی مخالفت میں

جتنے بھی جلوس وریلیاں نکلتی تھیں ان میں مصنف بھی شامل رہتے۔ان جلوسوں میں ولایتی مال ونوکریوں کے بائیکاٹ پر زور دیا گیا۔حالاں کہ راجندر پرساد اوران کے بھائی 1889 سے ہی ولایتی کپڑوں کو ترک کر کے کھدّر کے کپڑے پہننے لگے تھے۔اس لیے تقسیم بنگال کی مخالفت میں سودیشی کپڑوں کو اپنانے کی بات ہوئی تو راجندر پرساد کو کوئی دشواری نہیں ہوئی۔انہوں نے ہاسٹل کے طلبہ کے علاوہ اپنے ساتھیوں اورعزیزوں میں بنگ بھنگ تحریک کے سلسلے میں جوش وجذبے کو بیدار کیا،ان کی ترغیب پر بیشتر طلبہ نے ولایتی کپڑوں اور چیزوں کے بائیکاٹ میں اپنا بھرپور تعاون دیا تھا۔اس وقت انگریزوں سے عوام کی نفرت اورسودیشی چیزوں کے پرچار کے لیے طلبہ کے جنون کو راجندر پرساد نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اسی سلسلے میں ایک واقعہ شاملِ کتاب ہے،مصنف نے ایک بال پین خریدا تھا جو کہ مارکیٹ میں نیا نیا آیا تھا اور وہ پین ولایتی تھا۔جب ان کے ساتھیوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت بگڑے کہ خود ولایتی چیزوں کے ترک کرنے کی بات کرتے ہو،اور یہ ودیشی بال پین اپنے لیے استعمال کر رہے ہیں۔بعد میں سب طلبہ مع راجندر پرساد نے ولایتی چیزوں اور کپڑوں کو نذرِ آتش کیا۔سودیشی کپڑوں کے بائیکاٹ اور تقسیم بنگال کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک مجھے یاد ہے کہ سودیشی تحریک میں یا تقسیم بنگال کے خلاف تحریک میں کبھی تعلیمی اداروں کو چھوڑنے کا پروگرام اس طریقہ میں شامل نہیں تھا جیسے 1920 کی تحریک میں تھا۔میں اس طرح ان چیزوں کے ساتھ ویسے ایک طرح سے باہر سے ہمدردی رکھتا رہا کبھی ان کے اندر داخل نہیں ہوا۔''2

انہوں نے ''اپنی کہانی'' میں 1906 میں ہونے والے کانگریس کے سالانہ جلسے کا ذکر کیا ہے جو کہ کلکتہ میں ہوا تھا،جس میں وہ بحیثیت والنٹیر شریک ہوئے تھے۔1910 میں گوپال کرشنا گوکھلے کی ترغیب پر وطن کی خدمت میں لگ گئے۔جس کا انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔دراصل گوکھلے ان دنوں ''سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی'' کا قیام عمل میں لائے تھے۔جس میں وہ ملک بھر کے ہونہار طلبہ کو شامل کرنا چاہتے تھے۔چوں کہ راجندر پرساد ایک ذہین طالب علم تھے اس لیے گوکھلے نے ان کو اپنی سوسائٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔اس سوسائٹی کا مقصد ایک ہی تھا ملک وقوم کی سچے من سے خدمت کرنا۔1911 میں راجندر پرساد کانگریس کے ممبر بنائے گئے تھے،مرتے دم تک اسی پارٹی سے منسلک رہے۔

1916 میں ہونے والی چمپارن تحریک کا ذکر بھی بڑی تفصیل کے ساتھ شاملِ کتاب ہے۔راجندر پرساد نے اس کے علاوہ مذکورہ تحریک پر الگ سے کتاب بھی لکھی ہے جس میں پورے حالات کا جائزہ لیا ہے۔تجارت کی غرض سے

آئے انگریزوں نے پورے برصغیر میں اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے بے شمار پالیسیوں کے ساتھ ہندوستانیوں پر ہر طرح کے ظلم کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ان کا بس یہیں تک نہیں تھا بلکہ پورے برصغیر کی عوام خصوصاً کسان،مزدور اور غریب طبقے پر ان کے ظلم کی گاج زیادہ گری۔اسی سلسلے میں بہار کے مشہور ومعروف خطہ چمپارن اور وہاں کے کسان کی مظلومیت بھی شاملِ داستان ہے۔انگریزوں نے برصغیر سے مسالے کے ساتھ نیل کی تجارت بڑے زور وشور سے شروع کی کیوں کہ یہ کافی منافع بخش تجارت تھا۔چناں چہ انہوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں جس میں چمپارن ضلع بھی شامل تھا،اپنی کوٹھیاں قائم کیں اور نیل کی زراعت کو فروغ دیا۔نیل کی کھیتی کے لیے کسانوں کو مجبور کیا گیا،ان پر بے شمار ٹیکس لگائے گئے اور تین کٹھیا جیسے معاہدے ان پر تھوپے گئے۔وہاں کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی، لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔بعد میں بقول راجندر پرساد راج کمار شکلا نے گاندھی جی سے مل کر چمپارن کے حالات سے آگاہ کیا اور انہیں وہاں آنے کے لیے راضی بھی کرلیا۔گاندھی جی جب پٹنہ پہنچے تو مصنف کے گھر پر ہی قیام کیا تھا۔گاندھی جی کے چمپارن پہنچتے ہی حکومت نے پہلے انہیں گرفتار کرلیا تھا، وہاں کے لوگوں کی مخالفت کے بعد رہا کر دیا گیا۔ان کی قیادت میں چمپارن میں جانچ شروع ہوئی جس میں راجندر پرساد بھی تھے۔لکھتے ہیں:

> ''چمپارن کی جانچ شروع ہوگئی، ہزاروں کی تعداد میں کسانوں نے بیان لکھوائے۔شاید بیس یا پچیس ہزار بیان ہم لوگوں نے لکھے ہوں گے.....جانچ سے پتہ چلا کہ جو کچھ ہم نے سنا تھا وہاں کی حالت اس سے کہیں زیادہ بری تھی۔''3

یہی موقع تھا جب راجندر پرساد گاندھی جی کے قریب آئے اور دھیرے دھیرے ان کے طریقہ کار ونقطۂ نظر سے کافی متاثر ہوئے جس کا ذکر انہوں نے کتاب میں بھی کیا ہے۔چمپارن میں انگریز تقریباً سو سال سے نیل کی کھیتی کرتے اور کراتے تھے۔وہاں پورے خطے میں ان کی کوٹھیاں قائم تھیں اور بیشتر زمینوں پر ان کا ہی قبضہ تھا۔نیل کی کھیتی کے لیے مقامی باشندوں کو مجبور کیا۔دراصل اس کی کھیتی کے بعد زمین کوئی اور فصل اگانے کے لائق نہیں رہتی تھی۔اس لیے کسانوں نے انکار کرنا شروع کیا،لیکن جو بھی مخالفت کرتا ان پر انگریزوں کا قہر نازل ہوتا۔انہوں نے باقاعدہ ایک قانون بنایا تھا جس کی رو سے انگریز مقامی لوگوں سے جبراً نیل کی کھیتی کراتے تھے اور باقاعدہ دعویٰ کرتے کہ بحیثیت سرکاری رکن انہیں پورا حق ہے کہ وہ رعیت سے ان کے کھیت کے فی بیگھہ یا پانچ کٹھے یا تین کٹھے زمین پر نیل کی کھیتی کرائیں۔اسی کو انہوں نے تین کٹھیا یا پنج کٹھیا کا نام دیا تھا۔

چمپارن میں کسی کو ہمت نہیں تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائیں،اگر کوئی ایسا کرتا تو اس کے کھیت اور

گھر کو لوٹ لیا جاتا، جھوٹے مقدموں میں پھنسایا جاتا، جرمانہ وصول کیا جاتا۔ ان مظالم سے بچنے کے لیے کسان اپنی زمین کے تہائی حصے میں نیل کی کھیتی کرنے پر مجبور تھے۔ جس کے عوض میں ان کو انگریزوں سے انتہائی قلیل رقم ملتی، جس سے گزارا کرنا بے حد مشکل تھا۔ وہاں پر تعینات ہندوستانی افسران بھی چند پیسوں کی لالچ میں انگریزوں کا ہی ساتھ دیتے۔ علاوہ ازیں ان کسانوں پر بے بنیاد ٹیکس بھی لگائے گئے تھے۔ راجندر پرساد نے کافی تفصیل کے ساتھ وہاں کے حالات کا جائزہ لیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''سرکار کے افسران گوروں کی ہی مدد کیا کرتے، اگر کوئی افسر ہمت کر کے انصاف کرنا چاہا تو نیل والوں کا اثر اوپر کے افسروں پر اتنا ہوتا کہ اس ماتحت افسر پر آفت آجاتی۔ جو افسر سچے ہوتے نیل والوں کے ظلم وستم اور تین کٹھیا کے خلاف سرکار کے پاس رپورٹ بھیجا کرتے۔ مگر اس پر کچھ ہوتا جاتا نہ تھا۔ کبھی کبھی گھبرا کر رعیت بلوہ کر دیتی، کسی نیل والے کو مار دیتی یا لوگ آپس میں مل کر کسی دوسرے طریقے کا تہلکہ مچا دیتے۔ پھر بھی وہ نیل والوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ گاؤں کے گاؤں لوٹ لیے جاتے۔ پولیس اور کچہری کی مدد سے بے چاری رعیت ہر طرح زیر کر دی جاتی۔''4

1916 میں گاندھی جی چمپارن پہنچے تھے، راج کمار شکلا نے جب گاندھی جی کو وہاں کے حالات سے آگاہ کیا تو انہیں یقین نہیں آیا لیکن بعد میں جانچ پڑتال کے لیے جانے کو تیار ہو گئے۔ وہاں کے لوگوں سے گاندھی جی نے ملاقات کی اور ان کی دکھ بھری کہانی بھی سنی۔ ان کے ساتھ راجندر پرساد بھی چمپارن گئے تھے اور جانچ کمیٹی میں شامل تھے۔ اس سلسلے میں اپنی اور گاندھی جی کی کارکردگی کا تذکرہ کیا ہے۔ جانچ کے بعد ایک مفصل رپورٹ حکومت کو پیش کی گئی، جس پر کارروائی ہوئی، کسانوں پر سے ٹیکس ہٹائے گئے، نیل کی زراعت کے لیے بھی زبردستی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح گاندھی جی کی قیادت میں چمپارن تحریک کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد ہی ہندوستانی سیاست کے افق پر گاندھی جی مہاتما بن کر ابھرے۔

چمپارن تحریک کی کامیابی کے بعد عوام میں ہمت اور نئی جان آگئی تھی۔ اب وہ چپ چاپ ظلم برداشت کرنے کو راضی نہیں تھے۔ اس تحریک کا راجندر پرساد کی شخصیت پر گہرا اثر ہوا، گاندھی جی کی انسان دوستی اور عدم تشدد کے نظریے سے اتنا متاثر ہوئے کہ ذات پات اور چھوت چھات کو ترک کر دیا۔ انہوں نے خودنوشت میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہوم رول لیگ و اس کے مقاصد اور 1917 میں بقرعید کے موقع پر بہار میں ہونے والے فرقہ وارانہ فساد کو بھی پیش کیا ہے۔

اس سلسلے میں اقتباس ملاحظہ ہو:

''بہار کے شاہ آباد میں ایک بہت بڑا حادثہ ہوگیا۔ بقرعید کے موقعے پر گائے کی قربانی کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا اور بات بہت بڑھ گئی۔ ضلع کے بہت بڑے حصے میں، آس پاس کے گیا اور پلاموضلع میں بھی بہت بڑا فساد ہوا۔ کچھ ہندو پٹے، مگر مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا، بہتیرے مارے گئے، بہتیروں کے گھر لوٹے گئے۔ آخر میں جب فوج پہنچی تو ہزاروں ہندو گرفتار ہوئے۔''5

گجرات کے کھیڑا گاؤں میں لگان کے خلاف کسانوں کی مخالفت وتحریک، مہاتما گاندھی کے سابرمتی آشرم، پہلی جنگ عظیم اور ہندوستان کی سیاست، رولٹ بل اور اس کی مخالفت وغیرہ کا تذکرہ بھی کتاب میں موجود ہے۔ چمپارن تحریک کی طرح کھیڑا گاؤں میں بھی راجندر پرساد نے گاندھی جی کے ساتھ پیدل میلوں کا دورہ کیا تھا۔ اسی تحریک میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی تھی۔ مصنف نے گجرات کے ستیہ گرہ میں اپنی، سردار پٹیل اور گاندھی جی کی کارکردگی کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔

1919 میں انگریزوں نے ایک بل پاس کیا جسے رولٹ بل کہتے ہیں۔ اس کی رو سے کسی بھی ہندوستانی کو محض شک وشبہ کی بنیاد پر گرفتار کر کے جیل بھیجنے کا اختیار حکومت کو حاصل ہوگیا تھا۔ اس کے پاس ہوتے ہی گاندھی جی کی رہنمائی میں ملک گیر مخالفت شروع ہوئی۔ گاندھی جی نے اعلان کیا کہ عدم تشدد کی بنیاد پر پورے ملک میں رولٹ بل کے خلاف ہڑتال اور جلسے منعقد کیے جائیں۔ بل کے خلاف ہونے والے جلسوں و ہڑتالوں کا ذکر کرتے ہوئے راجندر پرساد لکھتے ہیں:

''سارے ملک میں بڑی ناراضی پیدا ہوگئی، سبھی جگہ مخالفانہ جلسے ہونے لگے۔ کونسل میں غیر سرکاری ممبروں نے اس بل کی زبردست مخالفت کی، مگر ان کی کون سنتا تھا۔ آخر بل پاس ہوگیا، گاندھی جی نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ یہ قانون اگر پاس ہوگیا تو ہم لوگ اسے نہیں مانیں گے اور ستیہ گرہ کریں گے۔''6

گاندھی جی نے 6 اپریل کو عوام سے بل کے خلاف برت رکھنے کی اپیل کی، انہوں نے پرامن تحریک کا اعلان کیا، ان کا کہنا تھا کہ ہر مذہب کے لوگ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جا کر دعا کریں، جلوس نکال کر شام کے وقت جلسہ کریں جس میں عدم تشدد کی بنیاد پر کالے قانون یعنی رولٹ بل کی مخالفت کی جائے۔ اس بل کے متعلق تمام واقعات نیز

6اپریل کے دن کی پوری تفصیلات مذکورہ کتاب میں ملتی ہے۔اس دن کی ہڑتال پورے ملک میں کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔راجندر پرساد نے اپنے رہنماؤں کے ساتھ مل کر بہار میں بل کے خلاف احتجاج کیا تھا۔اس مخالفت میں پورے ملک کے لوگ متحد ہو گئے تھے۔ہندو مسلم اتحاد اتنا بڑھ گیا تھا کہ دونوں نے ساتھ ہی سرکار کی گولیاں کھائیں۔ دہلی میں شردھانند نے کھلے عام کہنا شروع کیا تھا کہ انگریزوں کو اگر مارنا ہے تو مجھ پر گولی چلائیں جس سے مسلمان اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو جامع مسجد میں لے جا کر عوام کو بیدار کرنے کے لیے تقریر کرائی۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد دہلی، پنجاب اور آس پاس کے علاقوں میں بلوہ شروع ہوا جسے ختم کرنے کے لیے گاندھی جی پنجاب روانہ ہوئے لیکن راستے میں ہی ان کو پلول اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ان کی گرفتاری کی خبر نے عوام کو مزید مشتعل کیا۔انگریزوں کی مخالفت میں پنجاب کے کئی شہر،احمد آباد،ممبئی وغیرہ میں بھی بلوہ شروع ہو گیا۔امرتسر اور لاہور میں حالات کو بے قابو ہوتے دیکھ کر جنرل اوڈوائر نے مارشل لا نافذ کر دیا۔بعد میں گاندھی جی کو رہا کر دیا گیا۔پھر بھی پنجاب کے حالات میں کوئی سدھار نہیں آیا،اسی دوران امرتسر میں جلیاں والا باغ سانحہ پیش آیا ان سب سے دل برداشتہ ہو کر گاندھی جی نے ستیہ گرہ کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

رہائی کے بعد گاندھی جی کے ساتھ راجندر پرساد نے بھی مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ستیہ گرہ کے خاتمے کے اعلان کے بعد بھی ملک میں بے چینی بدستور قائم تھی۔پنجاب میں مارشل لا کے نام پر انگریزوں کے ظلم وستم بڑھ گئے تھے۔ہزاروں لوگوں کو کڑی سزائیں دی گئیں۔مارشل لا کی وجہ سے اخبارات بند تھے اس لیے پنجاب کی تباہی کی خبر ملک کے دوسرے حصوں میں لوگوں کو نہیں پہنچ رہی تھی۔مارشل لا ختم ہونے کے بعد ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر لارڈ ولیم ہنٹر تھے کمیٹی کو پنجاب کے مظالم کی رپورٹ بنا کر سرکار کو پیش کرنی تھی۔کانگریس نے بھی ایک رپورٹ تیار کی جب دونوں رپورٹیں شائع ہوئیں تو پنجاب کی تباہی کا اندازہ پورے ملک کو ہوا۔راجندر پرساد لکھتے ہیں کہ اس کے بعد پورے ملک میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی تھی اور انگریزوں کے خلاف آواز اٹھنے لگی۔کانگریس کی کمیٹی میں وہ بھی شامل تھے انہوں نے پورے حالات کا جائزہ لیا ہے۔

علاوہ ازیں ترکی میں انگریزوں کے رویے سے ہندوستانی مسلمانوں میں کافی بے چینی پھیلی تھی۔جلیاں والا باغ سانحہ کے بعد کانگریس کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا تھا جس میں راجندر پرساد بھی شامل تھے۔اس جلسے میں ہی علی برادران یعنی مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد و دوسرے مسلم لیڈروں نے خلافت کو بچانے کے لیے تنظیم وتحریک کی خاطر خلافت کمیٹیاں بنانے کا خاکہ پیش کیا اور کچھ ہی دنوں بعد پورے ملک میں کمیٹیاں قائم

ہوگئیں۔ دوسری طرف رولٹ بل اور پنجاب میں ہوئے ظلم وستم کو لوگ بھول نہیں پائے تھے۔ ان سب کی وجہ سے ملک میں عجیب ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس لیے کانگریس وخلافت کمیٹی نے ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے اور انگریزوں کے خلاف مل کر کام کرنا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے بھی خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

چوں کہ گاندھی جی علی برادران سے کافی متاثر تھے اس لیے انہوں نے بھی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں جانا شروع کیا اور مذکورہ تحریک میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔ 1920 میں گاندھی جی نے اسی کمیٹی میں ترک موالات کا پروگرام پیش کیا۔ جس میں علمائے کرام، عوام، خلافت کمیٹی و کانگریس کے لیڈروں نے حصہ لینا شروع کیا۔ بہت جلد خلافت و عدم تعاون تحریکیں (ترک موالات) اور ہندو مسلم اتحاد نے انگریزوں کی نیندیں حرام کردیں۔ ولایتی سامان کا نہ صرف بائیکاٹ کیا گیا بلکہ کسی بھی طرح کے سرکاری تعاون کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ راجندر پرساد نے بھی ان تحریکوں میں حصہ لیا تھا اور اس سلسلے میں مختلف جلسوں میں شرکت کی، بہار میں لوگوں کو بیدار کیا انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ ترک موالات اور خلافت تحریک سے متعلق بہار میں ہونے والے تمام اجلاس وسرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایسے ہی ایک کانگریسی جلسے میں بحیثیت صدر شرکت کی تھی۔ بہار کے چند ایسے لوگوں کے نام کتاب میں شامل ہیں جنہوں نے مذکورہ دونوں تحریکوں کی مخالفت کی تھی۔ ترک موالات سے متعلق اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''ترک موالات کے خاص چار بائیکاٹ تھے۔ سرکاری خطابوں وسندوں کو چھوڑ دینا، سرکاری تعلیمی اداروں سے قطع تعلق یعنی نہ ان میں خود تعلیم پانا نہ وہاں اپنے بال بچوں کو تعلیم پانے دینا، کونسل میں نہ جانا اور نہ اس سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا، سرکاری عدالتوں سے قطع تعلق یعنی نہ ان میں مقدمے دائر کرنا اور نہ ان میں وکالت یا مختاری یا نوکری کرنا۔ امید کی جاتی تھی کہ ہم میں سے ہر ایک ان چاروں مقاطعوں کو جہاں تک جو اس سے تعلق رکھتا ہو پورا کرے گا۔ مجھے تو کوئی خطاب یا سند نہیں ملی تھی۔ مگر میرے بھائی صاحب کو کوا پریٹو قائم کرنے اور ان میں دلچسپی رکھنے کے لیے رائے بہادر کا خطاب ملا تھا۔ میں نے کبھی ان سے خطاب چھوڑنے کے لیے نہیں کہا مگر انہوں نے خود ہی کچھ دنوں بعد واپس کر دیا۔''7

جب مذکورہ تحریک نے زور پکڑا تو بہار واڑیسہ کی حکومت کے گورنر مسٹر ہیلٹ نے اعلان کیا کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ بھی ایک طرح کے سرکاری اجزا ہیں۔ اس لیے ان کے ممبر یا اراکین کسی بھی طرح سے تحریک میں حصہ نہیں

لے سکتے۔اس سے لوگوں میں مزید برہمی پھیل گئی چناں چہ اکثریت نے اپنے خطاب اور سند کو واپس کر دیا۔ راجندر پرساد اور ان کے بھائی نے احتجاجاً اپنے بچوں کو سرکاری اسکول سے نکال کر قومی اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ان کے خاندان والوں نے انفرادی طور پر تحریک میں حصہ لیا تھا۔مصنف نے اس سلسلے میں مختلف جلسوں میں عوام سے خطاب کیا تھا۔ اس وقت حکومت کی طرف سے کی گئی کارروائیوں، اپنی کارکردگی، گاندھی جی کی حکمت عملی وخدمات، ہندو مسلم اتحاد، مکمل سوراج کا نعرہ، ودیشی کپڑوں کے بائیکاٹ کے لیے چرخے و کھدّر کا پَرچار وغیرہ سے متعلق راجندر پرساد نے تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

1922 تک خلافت تحریک وترک موالات میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے برابر حصہ لے کر محبت واخوت کی مثال قائم کی تھی۔اسی دوران کیرالا کے ملابار ضلعے میں موپلہ مسلمانوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔انہوں نے سرکاری خزانوں وعمارتوں پر حملے کیے۔بعد میں ان لوگوں نے ہندوؤں کو بھی نشانہ بنایا اس خبر نے ملک کی فضا کو مکدور کر دیا اور ہندو مسلم اتحاد ٹوٹنے کا خوف بڑھ گیا۔اس سلسلے میں راجندر پرساد لکھتے ہیں:

> ''پہلے تو موپلوں نے سرکاری عہدہ داروں، ریل اور کچہریوں وغیرہ پر حملہ کیا۔مگر کچھ دنوں بعد خبر پھیلنے لگی کہ انہوں نے ہندوؤں پر بھی حملے شروع کر دیے ہیں اور انہیں مارنے و زبردستی مسلمان بنانے لگے ہیں۔اس خبر سے ہندوؤں میں بڑی کھلبلی مچ گئی۔ایک طرح سے تو آپس میں بددلی کا بیج بو گیا جو ہندو مسلم اتحاد ایک طریقہ پر قائم ہوا تھا وہ اس واقعے سے لرزاں سا نظر آنے لگا۔''8

موپلا مسلمانوں کی بغاوت کا ذکر بیشتر خودنوشت نگاروں نے کیا ہے لیکن کسی نے ہندوؤں پر حملے اور زبردستی مسلمان بنانے کے واقعے کا ذکر نہیں کیا ہے۔بہرکیف کچھ ہندو یہ سمجھ رہے تھے کہ گاندھی جی خلافت تحریک جو خالص مذہبی تحریک تھی، کا ساتھ دے کر مذہبی کٹرتا کو بڑھاوا دیا ہے۔جس سے مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوؤں میں بھی مذہبی تعصب اتنا بڑھا کہ جیسے ہی مذکورہ بالا تحریکیں کمزور پڑیں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔حالاں کہ گاندھی جی کو اس بات کا بالکل پچھتاوا نہیں تھا کہ خلافت تحریک کو اپنا تعاون دے کر غلطی کی تھی۔کیوں کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے مصیبت کے وقت دونوں قوموں کا ساتھ دینا ضروری سمجھتے تھے اور بغیر متحد ہوئے انگریزوں سے لڑنا مشکل تھا۔جب مذہبی تعصب بڑھا تو مسلمانوں نے تبلیغ وتنظیم کو بڑھاوا دیا تو ہندوؤں نے شدھی وسنگھٹن کا بگل بجا دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں میں بددلی بڑھتی ہی گئی۔اس بڑھتی خلیج کا پورا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔

ہندو مسلم دشمنی کے متعلق راجندر پرساد نے اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ بھی گاندھی جی کی ہی طرز فکر کے قائل نظر آتے ہیں۔ دونوں قوموں کے درمیان لاکھ اختلاف ہی سہی لیکن یہ سچ ہے کہ جس طرح ہندو اس ملک کے باشندے ہیں ویسے ہی مسلمانوں کا بھی ملک پر پورا حق ہے۔ راجندر پرساد لکھتے ہیں:

''یہاں دونوں طبقات کے خیال کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے۔ مسلمان چاہے جس طرح سے ہندوستان میں آئے ہوں اور چاہے جیسے بھی ان کی تعداد بڑھی ہو۔ آج وہ ہندوستان کے ویسے ہی باشندے ہیں جیسے ہندو۔ ان کے لیے بھی کوئی دوسرا ملک نہیں ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی ملک کے اندر ان کا بھی مرنا جینا، سکھ دکھ اور زندگی کے سبھی ارمان پورے کرنا اور مصیبتیں جھیلنا ہے۔ مرنے کے بعد بھی وہ ملک کے کچھ حصے میں قبضہ جمائے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ مان ہی لینا پڑے گا کہ مسلمانوں کو اس ملک میں غیر نہیں سمجھ سکتے۔''9

اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے بعد راجندر پرساد نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جب مسلمان اسی ملک کے باشندے ہیں تو ان کو بھی ہر میدان میں تمام اختیار حاصل کرنے کا حق ہے۔ نیز سیاسی اختیارات میں بھی ان کا حصہ ہے۔ اگر ہم ان کے حقوق کو دبا کر رکھنے کی کوشش کریں گے تو ظاہر ہے وہ اوپر اٹھنے کے لیے کوشش کرتے رہیں گے۔ جس سے ملک میں سوائے انتشار پھیلنے کے کچھ نہیں ہوگا۔ گاندھی جی کے عدم تشدد کا تصور بھی اسی بنیاد کی ایک کڑی ہے کہ امن و امان کے لیے تمام مذہب کے لوگ مل جل کر زندگی بسر کریں۔ آج جب چاروں طرف مذہب کے نام پر تنازعے ہو رہے ہیں تب گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفے کی بہت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ راجندر پرساد نے باقاعدہ ایک باب قائم کر کے عدم تشدد کے تصور اور اس پر عمل کرنے کے اصولوں کو واضح کیا ہے۔

4 فروری 1922 کو عوام اور پولیس میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ جس سے عوام نے جوش میں آ کر گورکھپور ضلع کے چوری چورا گاؤں میں ایک پولیس تھانے کو آگ لگا دی۔ جس میں کئی پولیس والے مارے گئے۔ گاندھی جی پر اس واقعے کا گہرا اثر ہوا۔ عوام ان کے عدم تشدد کے راز و اہمیت کو سمجھ نہیں سکی تھی اس لیے جب ستیہ گرہ شروع ہوا تو تشدد بھرے واقعات ہونا لازمی تھا۔ نتیجے میں حکومت بھی عوام کے تئیں جابرانہ پالیسی اختیار کرنے لگی جس سے لوگ اور زیادہ مشتعل ہوئے۔ چناں چہ حالات بے قابو ہوتے دیکھ اور چوری چورا سانحہ سے دل برداشتہ ہو کر گاندھی جی نے ترک موالات اور اس سے جڑی تمام سرگرمیوں کو بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد عوام کافی پریشان ہوئی، کچھ لوگوں نے مخالفت بھی کی

کیوں کہ اگر تحریک جاری رہتی تو شاید یہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار پنڈت نہرو، مولانا آزاد، قدرت اللہ شہاب، عبدالمجید سالک وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ راجندر پرساد لکھتے ہیں:

''اس فیصلے کے شائع ہوتے ہی تمام ملک میں ایک عجیب حالت پیدا ہوگئی۔ معمولی کارکنوں کی بات کون کہے، بڑے بڑے جید لیڈر پنڈت موتی لعل نہرو، لالہ لاجپت رائے وغیرہ جو سبھی جیل میں تھے، اس سے بہت جز بز ہوئے۔ اخباروں میں بھی مخالفت کی آواز اٹھی۔ عوام میں ایک طرح کی مُردنی سی چھا گئی، جیسے دوڑتا ہوا آدمی ٹھیس لگ جانے سے گر پڑا ہو۔ حوصلہ اور جوش میں بھرے ہوئے لوگ چاہتے تھے کہ ستیہ گرہ شروع کر ہی دیا جائے کچھ لوگ یہ کہنے کو بھی تیار ہو گئے تھے کہ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کو روک کر ملک کا ستیہ ناس کر دیا ہے۔''10

ترک موالات اور خلافت تحریک سے جڑی تمام سرگرمیوں کو راجندر پرساد نے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس دوران ملک کی ہیجانی کیفیت، انگریزوں کے ظلم وستم، ہندو مسلم فسادات، سوراج پارٹی کا قیام، بہار میں کانگریس کا قیام و اس کی سرگرمیاں، مہاتما گاندھی و دیگر لیڈروں کی گرفتاریاں، فسادات سے عاجز آ کر گاندھی جی کا 21 دن کا برت، امن و امان کے لیے گاندھی جی کی تجاویزات وغیرہ کا بھی مصنف نے ذکر کیا ہے۔ ہندو مسلم تنازعے کو بڑھاوا دینے میں بقول راجندر پرساد ہندو مہاسبھا، آریہ سماج کی طرف سے چلائی جانے والی شدھی و سنگھٹن اور مسلمانوں کی تنظیم و تبلیغ کی تحریک کا اہم رول رہا ہے۔

دونوں قوموں کو متحد کرنے کے لیے مصنف نے مختلف مقامات کا دورہ کر کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس سلسلے میں اپنی کارکردگیوں نیز فرقہ وارانہ فسادات کو بھی پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں ہونے والے مختلف انتخابات، سائمن کمیشن اور اس کی مخالفت و بائیکاٹ، مختلف بغاوتیں، نمک ستیہ گرہ، گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا، ہزاری باغ جیل کے شب و روز کی داستان (جہاں راجندر پرساد گرفتار کر کے بھیجے گئے تھے)، گول میز کانفرنس، اِروِن سمجھوتہ، ترنگے جھنڈے کی قومی شکل، یروداجیل میں گاندھی جی کا ہریجنوں کا ساتھ دینا، 1934 میں بہار کا قیامت خیز زلزلہ، کانگریس کی سلور و گولڈن جبلی، ہندی اردو قضیہ اور اس سلسلے میں واردھا میں ہونے والی کانفرنس، زبان کے نام پر بڑھتی فرقہ پرستی، دوسری جنگ عظیم و اس کے نتائج، شملہ کانفرنس، 1946 کے انتخاب میں مسلم علاقوں میں مسلم لیگ کی جیت، مطالبۂ پاکستان وغیرہ بھی خودنوشت میں شامل ہیں۔

18 اگست 1942 کو کانگریس نے ایک قرارداد منظور کر کے ''بھارت چھوڑو تحریک'' کا آغاز کیا اسی میں گاندھی جی نے لوگوں کو ''کرو یا مرو'' کا نعرہ دیا تھا۔انہوں نے عوام سے اپنے خطاب میں وائسرائے سے ملاقات کر کے آزادی کی خاطر مصالحت کے لیے کوشش کرنے کی بات کی۔لیکن حکومت نے اسے غیر قانونی قرار دے کر تمام بڑے کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔جس کی عوام نے مخالفت کی اور جا بجا بغاوت شروع کر دی۔راجندر پرساد نے طویل انداز میں مذکورہ تحریک اور اس کے زیر اثر ہونے والی گرفتاریوں اور ملک کے بگڑتے حالات کو پیش کیا ہے۔

دراصل یہ تحریک شروع کرنے سے پہلے کانگریس نے واضح بھی نہیں کیا تھا کہ آگے کا پروگرام کیا ہے،اس سے پہلے ہی تمام بڑے سیاستداں مع راجندر پرساد گرفتار ہو گئے۔عوام کو حکومت سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی چناں چہ جب لیڈروں کی گرفتاری کی خبر منظر عام پر آئی تو لوگوں کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا،اور احتجاجاً توڑ پھوڑ شروع کر دی۔شمالی ہندوستان میں اس تحریک کا زور زیادہ تھا اس لئے وہاں کے لوگ حکومت کے غصے کا شکار بھی زیادہ ہوئے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''تمام بہار اور اتر پردیش کے یورپی ضلعوں میں ہی تحریک کی شکل سب سے زیادہ تیز اور زبردست رہی۔لہٰذا یہیں سب سے زیادہ حکومت کی سختی بھی ہوئی۔نہ جانے کتنے آدمی پولیس اور فوجیوں کی گولیوں کا شکار ہوئے،کتنے ہی گھر لوٹے اور جلائے گئے،کتنی ہی اور قسم کی ناقابل بیان تعزیریں سہنی پڑیں۔''11

ابھی لوگ مذکورہ بالا تحریک کے اثر سے نکلے بھی نہیں تھے کہ 1943 میں بنگال میں بھیانک قحط پڑا۔راجندر پرساد اس وقت جیل میں تھے اس لیے قحط اور اس کی تباہی کی خبریں ان کو اخباروں کے ذریعے ملا کرتی تھی۔اپنی خودنوشت میں انہوں نے ایک باب ''قحط بنگال اور ہندوستان کی وحدت'' میں تفصیل کے ساتھ تمام حالات و وجوہات کا تذکرہ کیا ہے۔اس قحط کا اثر بہار و اڑیسہ میں بھی ہوا تھا۔لیکن جو تباہی پورے بنگال میں ہوئی تھی ویسی ان دونوں صوبوں میں نہیں ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت نے 1946 میں اعلان کیا کہ 30 جون 1948 سے پہلے ہندوستانی اقتدار مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں سونپ دیا جائے گا۔چوں کہ اس وقت ملک کے حالات بے حد خراب تھے،فرقہ وارانہ فسادات،کانگریس و مسلم لیگ کے درمیان اختلافات اور مطالبۂ پاکستان نے عجیب ہیجانی صورت پیدا کر دی تھی۔دوسری جانب جنگ عظیم سے نہ صرف ہندوستان بلکہ برطانیہ کی حالت بھی دگرگوں تھی۔لارڈ ویول نے

ہندوستان کے مسائل کو حل کرنے کے لیے برطانوی وزیر اعظم ایٹلی سے درخواست کی کہ جتنی جلدی ہو سکے ہندوستان کو آزاد کر دینا چاہیے۔ چناں چہ ایٹلی نے مذکورہ بالا اعلان کے ساتھ ایک مشن ہندوستان بھیجا جس کا مقصد تھا کہ ملک کے مسائل کے حل کے لیے درمیانی راستہ اختیار کر کے تمام پارٹیوں کے نقطۂ نظر کو ملحوظ خاطر رکھ کر ایک پلان بنایا جائے، جس سے ہر فرقہ اور تمام پارٹی کے لوگ مطمئن ہو جائیں۔ اس کے لیے کانگریس و مسلم لیگ کے رہنماؤں اور وائسرائے ہند کے ساتھ مشن کے افراد نے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا، آخر میں شملہ میں میٹنگ ہوئی۔ وہاں کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلنے کے بعد مشن نے اعلان کیا کہ وہ خود سے ایک پلان تشکیل دے کر منظر عام پر لائے گی۔ چناں چہ تمام ہندوستانی سیاستداں دہلی آ گئے۔ مشن نے جو پلان پیش کیا اسے کیبنٹ مشن پلان کا نام دیا گیا۔ اس سلسلے میں راجندر پرساد لکھتے ہیں:

> ''کیبنٹ مشن اسکیم کے خاص تین حصے تھے، پہلے میں مدلل اسباب کے ساتھ مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبے کو نا قابل عمل بتایا اور کہا گیا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہندوستان کا آئین ایسا ہوگا کہ اس میں ہندوستان کے اصولوں کا ایک فیڈریشن کے اختیار میں تین صیغے ہوں گے۔ فوج اور بچاؤ، غیر ملکوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے معاملے ریل تار وغیرہ۔ دوسرے حصے میں اس آئین ساز کمیٹی کی اسکیم بنائی گئی جس کے ذمہ آئین بنانے کا کام ہوگا، تیسرے میں عارضی قومی حکومت قائم کرنے کی بات کہی۔''12

تمام صوبوں میں تناسب کے حساب سے انتخاب کر کے ہر مذہب کے لوگوں کو اپنا نمائندہ چننے کی بھی آزادی دی گئی۔ جس کے لیے مشن نے الگ الگ اسکیم پیش کی تھی، جس میں کہا گیا کہ برٹش ہند میں کل 292 نمائندے شامل ہوں گے، 210 غیر مسلم، 78 مسلم، اور 4 سکھ ہوں گے۔ صوبوں کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے میں مدراس، بمبئی، اتر پردیش، بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش، دوسرے میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان اور تیسرے میں بنگال اور آسام ہوں گے۔ کافی گفت وشنید کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنی منظوری دے دی۔ کیبنٹ مشن پلان اور اس کے اہم نکات، کانگریس و مسلم لیگ کے ردعمل کی پوری تفصیل راجندر پرساد نے پیش کی ہے۔

مشن پلان پر منظوری ملنے کے بعد ہندوستان کی تقسیم ٹل گئی تھی، لیکن پنڈت نہرو نے ممبئی میں ایک کانفرنس کے دوران کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم اور اس پر کانگریس کے حق کی بات کر کے سب کو چونکا دیا۔ اس واقعے کا ذکر مولانا آزاد اور قدرت اللہ شہاب نے تفصیل کے ساتھ اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ حالاں کہ اس اہم واقعے کو راجندر

پرساد نے اپنی خودنوشت میں کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے جب کہ یہ ایسا معاملہ تھا جس کی وجہ سے مسلم لیگ نے مشن پلان سے اپنی منظوری یہ کہہ کر واپس لے لی تھی کہ اب یہ اپنی اصل حالت میں نہیں رہا۔ چناں چہ محمد علی جناح نے مخالفت میں ڈائریکٹ ایکشن کا پلان پیش کیا اور پورے ملک میں 16 اگست 1946 کو ہڑتال کرنے کا اعلان کر دیا۔ جسے ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مذکورہ خودنوشت میں 16 اگست کو ہونے والے کلکتہ کے فساد کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن یہ واضح نہیں کیا گیا کہ وہ وجوہات کیا تھیں جن کی وجہ سے ملک گیر ہڑتال عمل میں لائی گئی اور ہندو مسلم بلوہ ہوا۔ دراصل کلکتہ میں یہ افواہ پھیلی کہ مسلم لیگ کے کارکن 16 اگست کو کانگریسیوں پر حملہ کر کے ان کی املاک لوٹ لے گی۔ مزید بے چینی اس وقت بڑھ گئی جب بنگال کے وزیر اعلیٰ نے سرکاری تعطیل کا اعلان کر دیا۔ علاوہ ازیں بنگال اور سندھ میں مسلم لیگ کی وزارتیں اختیار میں تھیں، چناں چہ ان صوبوں میں سرکاری تعطیل کا اعلان کر کے دکانوں، دفتروں، بینکوں وغیرہ کو بند کرایا گیا۔ جب ہڑتال والے دن مسلمان جلسے سے نکل کر سڑکوں پر آئے تو پہلے سے گلیوں میں چھپے بلوائیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کی خبر سے دوسرے مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کیا۔ اس طرح 16 اگست کو فرقہ وارانہ فساد نے جو زور پکڑا اس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

راجندر پرساد نے خودنوشت میں کلکتہ میں ہونے والی بربرتا کو پیش کیا ہے۔ اس فساد کا ذمہ دار انہوں نے مسلم لیگ کو ٹھہرایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کانگریس نے پچھلے کئی سالوں سے کامیابی کے ساتھ ہڑتالیں کی تھیں۔ لیکن کبھی بھی سرکاری اختیارات کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ ان علاقوں میں بھی نہیں جہاں ان کی وزارتیں کام کر رہی تھیں۔ لیکن مسلم لیگ نے یہ پہلا موقع پاتے ہی اس اختیار کا بے جا استعمال کیا۔ جس کی مخالفت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ملک میں بھی ہوئی۔ لکھتے ہیں:

> ''لیگ نے موقع پاتے ہی سرکاری اختیار کا بے جا استعمال کیا، اس کی مخالفت سبھی لوگوں نے کی۔ یہ خاص طور پر کہا گیا کہ تعطیل ہو جانے سے بہتیرے لوگ بے کار رہیں گے، اور جلوس، جلسہ اور ہڑتال میں ایسے بے کار لوگ ہمیشہ خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ بنگال اسمبلی اور بنگال کونسل میں بھی یہ باتیں ہوئیں مگر مسٹر سہروردی وزیر اعلیٰ نے ایک نہ سنی۔ الٹے یہ کہا کہ امن قائم رکھنے کے لیے ہی چھٹی دی گئی ہے۔ اس دن سویرے سے ہی دکانیں بند کروانے میں زبردستی شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی لوٹ کھسوٹ اور خون خرابہ بھی جاری

ہو گیا۔'' 13

حکومت کی جانب سے ایک دو دن تک فساد کو روکنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے بلوائیوں کو موقع مل گیا۔ اس دوران ہزاروں آدمی قتل ہوئے اور ہزاروں مکان لوٹے اور جلائے گئے۔ جب فساد کو روکنے کی کوشش شروع ہوئی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کم سے کم چھ تا سات ہزار لوگوں کو قتل کیا گیا، سڑکوں پر دو تین دن تک لاشیں سڑتی رہیں، نالیوں میں، جلے ہوئے مکانوں میں اور ہگلی ندی میں نہ جانے کتنی لاشیں پھینکی گئیں۔ بچے، بوڑھے، مظلوم عورتیں کسی پر بھی ظالموں نے رحم نہیں کیا تھا۔ راجندر پرساد لکھتے ہیں:

> ''جس طرح کا قتل عام کلکتہ میں ہوا تھا، شاید نادر شاہ کے دلی والے قتل عام کے سوا ہندوستان میں کہیں اور ایسا نہیں ہوا۔ لیگ کے ایک خاص لیڈر سر فیروز خاں نون نے ایک بار کہا تھا کہ وہ ایسی حالت پیدا کر دیں گے جیسی چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے بھی نہیں کی تھی۔ لیگ کی براہ راست کارروائی کا نمونہ لوگوں کے سامنے آ گیا.....وہی لوگ، اس لاثانی خونی باب اور بدترین مظالم پر جس کے کرانے میں اگر ان کا ہاتھ صاف صاف نہیں تو کم سے کم جس پر چشم پوشی انہوں نے کی، بالکل چپ تھے۔ مسٹر جناح نے صرف اتنا ہی کہا کہ جس کسی نے بلوہ کیا اس کو سزا ملنی چاہیے اور چوں کہ ان کو اس کی پوری رپورٹ نہیں ملی تھی اس لیے وہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کس کا قصور ہے۔'' 14

علاوہ ازیں راجندر پرساد نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ کلکتہ میں پہلے تو ہندو مارے گئے مگر جب کسی طرح کی حکومتی کارروائی نہیں ہوئی تو ہندوؤں نے بھی ہتھیار اٹھا لیے۔ اس کے بعد جتنے لوگ مرے ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہی تھی۔ اب قتل ہونے والے چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، اس میں شک نہیں کہ مرنے اور تباہ ہونے والوں میں زیادہ تر بے قصور تھے۔ حالاں کہ قدرت اللہ شہاب، مولانا آزاد اور شان الحق حقی نے اپنی خودنوشتوں میں کلکتہ اور دوسرے جگہوں کے فساد کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان فسادات میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے برابر حصہ لیا تھا۔ خصوصاً قدرت اللہ شہاب اور شان الحق کی خودنوشت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلکتہ میں پہلے ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا تھا اس کے بعد انہوں نے بھی جوابی کارروائی کی۔ اب 1946 میں ہونے والے فسادات کا ذمہ دار کون تھا اس کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہے۔ نہ جانے کتنے حقائق تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئے اور اکثر کی تو پردہ داری بھی کی گئی ہے۔ بہر حال مسلم لیگ ہو یا کانگریس، مسلم ہو یا ہندو ان میں کوئی بھی ذمہ دار رہا ہو لیکن اس وقت کے فسادات

نے قیام پاکستان کو یقینی بنا دیا تھا۔

راجندر پرساد کی خودنوشت چوں کہ 1946 میں مکمل ہوگئی تھی لیکن اس کے بعد بے حد اہم واقعات رونما ہوئے جس کی وجہ سے ترمیم واضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کی گئی۔ انہوں نے 1946 کے خونی فسادات اور عارضی حکومت کے قیام سے پہلے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

''اس کے بعد جو پیچیدہ مسائل سامنے پیش ہیں ان کا حل کس طرح کیا جائے گا؟ معلوم نہیں مجھے کون سا صیغہ ملے گا۔ نہیں معلوم لیگ کیا کیا کرے گی اور عوام کا رخ کیا رہے گا؟ اگر ہم نے سچائی کے ساتھ اور غیر جانب دار ہو کر سب کی خدمت کی تو نتیجہ اچھا ہوگا۔ اپنا ارادہ ایسا ہی ہے آگے خدا کے ہاتھ میں ہے۔''15

1946 کے بعد ہونے والے واقعات و حالات کو ضمیمے کی شکل میں لکھا ہے۔ نئی عارضی حکومت میں راجندر پرساد کو خوراک و زراعت کا محکمہ دیا گیا۔ اس حیثیت سے انہوں نے جو بھی کام کیا اس کی تفصیل کتاب میں موجود ہے۔ اسی طرح کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے لیے وائسرائے ہند لارڈ ویول کی کوششیں، عارضی حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت، مذکورہ حکومت کی پالیساں و کارروائیاں، فساد زدہ علاقوں میں گاندھی جی کے دورے، بہار فساد کو روکنے کے لیے گاندھی جی کا برت رکھنا، ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں، پنڈت مدن موہن مالویہ کی وفات و خدمات کے ساتھ اپنے گھریلو حالات کا تذکرہ بھی ضمیمے میں ہی کیا ہے۔

انہوں نے خودنوشت کے مذکورہ ایڈیشن جو راقمہ کے زیر مطالعہ رہا میں ہندوستان کی آزادی، ملک و بیرون ملک کے حالات وغیرہ کو پیش کیا ہے۔ مصنف نے اپنی کہانی کا پہلا ایڈیشن جنوری 1947 میں شائع کیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن 1956 میں شائع ہوا جس کے دیباچے میں ملک کے ان حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے ان کا براہ راست تعلق تھا۔ مثلاً دستور ساز اسمبلی اور اس کا کام، ہندوستان کی آزادی اور اقتدار کا منتقل ہونا، وزیر زراعت کے طور پر منتخب ہونا، گاندھی جی کی شہادت، آزادی کے بعد عام انتخابات میں صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے تقرری، بحیثیت صدر ملک وقوم کی خدمت اور بیرون ممالک کے سفر کا بیان کیا ہے۔ انہوں نے دیباچے میں ہی لکھا ہے کہ:

''یہ تمام معاملے ایسے ہیں کہ جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، مگر اسے پورا کرنے کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ جن حالات میں ہوں ان سے مطابقت۔ اس لیے میں نے اس ایڈیشن میں کوئی بھی نیا مواد شامل نہیں کیا ہے۔ 1947 سے 1956 تک اپنی کہانی

کے مصنف کی زندگی میں کیا کیا واقعات ہوئے اور زندگی کس رو میں بہی اس بارے میں کچھ کہنا غیر مناسب نہیں تو غیر ضروری ضرور معلوم ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں مجھے کچھ کہنے کا حق ہے۔ ہماری قومی زندگی میں قوم نے مجھے جو مقام دیا ہے اس کی جواب دہی میں میں کہاں تک نبھا سکا ہوں اس کا فیصلہ تو ملک کے عوام کے ہاتھ میں ہے۔''16

راجندر پرساد کی خودنوشت سیاسی اعتبار سے کافی اہم ہے کیوں کہ اس میں غیر منقسم ہندوستان اور سیاسی حالات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اگر چہ اس میں تقسیم ہند کے اثرات اور بعد ازاں ملک کے حالات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے لیکن آزادی اور تقسیم ہند کے محرکات کا بیان شامل ہے۔ حالاں کہ راجندر پرساد نے براہ راست تقسیم ہند اور مسلم لیگ و کانگریس کے درمیان اختلافات کی وجوہات کو واضح نہیں کیا ہے لیکن انہوں نے اشارتاً ان حالات کا تذکرہ کیا ہے جس کی وجہ سے ملک کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔ مذکورہ خودنوشت میں مصنف کے خاندان اور گھریلو حالات نیز بیوی بچوں کا تذکرہ بہت کم ہے لیکن اس کتاب سے راجندر پرساد کی سیاسی میدان میں کارکردگی سے ان کی شخصیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کو ہندوستان کا سیاسی مرقع ضرور کہا جاسکتا ہے۔ جس میں مصنف نے ہندوستانی سیاست میں ان ہی حالات و واقعات کا جائزہ لیا ہے جس سے ان کا براہ راست تعلق تھا۔

حوالہ جات

1۔ راجندر پرساد، اپنی کہانی (مترجم گوپی ناتھ امن)، شمع بک ڈپو، دہلی، 1961، ص: 41
2۔ ایضاً، ص: 92
3۔ ایضاً، ص: 173
4۔ ایضاً، ص: 175
5۔ ایضاً، ص: 191
6۔ ایضاً، ص: 211
7۔ ایضاً، ص: 243
8۔ ایضاً، ص: 276
9۔ ایضاً، ص: 289
10۔ ایضاً، ص: 327
11۔ ایضاً، ص: 1015
12۔ ایضاً، ص: 1027
13۔ ایضاً، ص: 1079
14۔ ایضاً، ص: 1080
15۔ ایضاً، ص: 1084
16۔ ایضاً، ص: 7,8

امریتا پریتم: رسیدی ٹکٹ

سنہ اشاعت: 1976

رسیدی ٹکٹ (امرتا پریتم)

امرتا پریتم ادبی دنیا میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ان کی تخلیقی صلاحیتیں پنجابی، ہندی اور اردو میں موجود ہیں۔انہوں نے نثر و نظم دونوں میں لافانی نقوش چھوڑے ہیں۔سو سے زائد کتابیں ان سے منسوب ہیں جو شاعری، ناول، افسانہ اور تنقیدی موضوعات پر مشتمل ہیں۔دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ان کی مشہور تخلیقات میں ناگ منی، پنجر، میرا کمرہ، یہ سچ ہے، انچاس دن، میں جمع توں، دلی کی گلیاں، ایک تھی انیتا، محبت نامے، ایک لڑکی ایک جام، رنگ کا پتہ، تقدیر کی لکیر، رسیدی ٹکٹ وغیرہ ہیں۔ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ساہتیہ اکیڈمی، گیان پیٹھ، پدم شری، پدم وبھوشن جیسے ملک کے بڑے انعام واعزازات سے نوازا گیا۔

امرتا پریتم کی پیدائش 1919 میں گوجرانوالہ (پنجاب، غیر منقسم ہندوستان) میں ہوئی جب کہ بعد میں ان کی پرورش لاہور میں ہوئی۔ یہ عظیم شاعرہ ونثر نگار 86 سال کی عمر میں 31 اکتوبر 2005 کو دہلی میں انتقال کر گئیں۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ان کے والدین پنج کھنڈ بھسوڑ کے ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔گاؤں کے مکھیا کی بیٹیاں بھی اسی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ایک دن ان لڑکیوں نے دعا کی کہ اے بھگوان! ہمارے ماسٹر جی کو ایک بیٹی دے دے۔ان کی دعا قبول ہوئی اور امرتا کا جنم ہوا، والدین نے 'امرتا کور' نام رکھا۔ان کے والد تارک الدنیا تھے اور نند کے نام سے گوجرانوالہ میں سادھوؤں کے ڈیرے میں گیرواں لباس زیب تن کر کے رہتے تھے۔ایک دن امرتا کی والدہ راج بی بی سے ان کی ملاقات ہوئی اور پریم ہو گیا۔بعد میں دونوں کی شادی ہوئی۔شادی تک وہ نند ہی کہلاتے تھے لیکن شادی کے بعد اپنا نام کرتار سنگھ اور تخلص پیوش رکھا۔سنسکرت، پنجابی اور ہندی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔عالم آدمی تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔امرتا اپنے والد سے متاثر ہو کر بہت کم عمری میں ہی پنجابی زبان میں شاعری کرنے لگی تھیں۔

امرتا کور جب گیارہ سال کی تھیں تو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد نانی نے ان کی پرورش کی۔16 کی سن میں ان کی شادی پریتم سنگھ سے ہو گئی یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف تھی لیکن شادی کے بعد انہوں نے اپنے نام سے پریتم کا نام اس طرح جوڑا کہ 1960 میں شادی ٹوٹنے کے بعد بھی یہ نام خود سے الگ نہ کر سکیں، یہ نام چپکا بھی تھا آخر ان کی زندگی پریت پر ہی تو مبنی تھی۔وہ امرتا پریتم کے نام سے ہی امر ہو گئیں۔اپنے رشتہ ازدواج کے جڑنے اور ٹوٹنے کی تھوڑی بہت تفصیل خودنوشت میں دی ہے۔ساحر لدھیانوی سے ان کا معاشقہ ادبی دنیا میں سب سے مشہور معاشقہ تھا۔ان کی شادی کے ٹوٹنے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی محبت تھی۔اپنی خودنوشت میں اس تعلق سے بھی لکھنے سے گریز نہیں

کرتیں۔

امرتا کی سچائی اور بے باکی سے متاثر ہو کر راجیو گاندھی نے انہیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا۔ جب تک راجیہ سبھا کی ممبر رہیں پارلیمنٹ میں بہت سے سماجی اور خواتین کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتی رہیں۔ سرکاری خزانے سے جو پیسے ترقیاتی کاموں کے لیے جاتے تھے ان کے غبن اور بدعنوانیوں پر بھی سوال اٹھاتی تھیں۔ ان کو افسوس رہا کہ وہ چاہ کر بھی ملک کی صحیح خدمت نہیں کر سکیں۔ انہوں نے ایسے کئی اہم مسائل کو اپنی خودنوشت میں بیان بھی کیا ہے۔

''رسیدی ٹکٹ'' کے عنوان سے امرتا پریتم نے اپنی زندگی کو یادداشتوں کی بنا پر مرتب کیا جو سب سے پہلے 1976 میں شائع ہوئی۔ یہ پنجابی زبان میں لکھی گئی تھی جس کے ہندی، انگریزی اور اردو تراجم بھی شائع ہوئے۔ منظور پریس لاہور سے شائع ہونے والا دوسرا ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا۔ اس میں مترجم کا ذکر اور سن اشاعت درج نہیں ہے۔ تقریباً پونے دو سو صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کے مختلف عنوانات قائم کر کے امرتا نے اپنی زندگی کے مختلف گوشوں سے روشناس کرایا ہے۔ امرتا کا شمار صف اول کے پنجابی شعرا اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے قارئین کی تعداد بلاشبہ کروڑوں میں ہے جو بذات خود ایک اعزاز کی بات ہے۔ انہوں نے برصغیر کے اس مشکل معاشرے میں اپنی جگہ بنائی جب بالخصوص متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی کسی خاتون کے لیے ایسا مقام حاصل کر لینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

امرتا نڈر، صاف گو اور بے باک شخصیت کی مالک تھیں اور یہی لہجہ انہوں نے اپنی خودنوشت ''رسیدی ٹکٹ'' کو مرتب کرتے ہوئے اپنایا ہے، اس لیے یہ کتاب ایک کشش رکھتی ہے۔ اس میں وہ تمام باتیں تحریر کی ہیں جن کا اعتراف سالوں بعد بھی کوئی عورت کرنے سے گریز کرے گی۔ امرتا کی زندگی دکھوں سے عبارت تھی اور یہی دکھ ان کی تخلیقات میں بھی منعکس ہوتا ہے۔ جب انہوں نے اپنی خودنوشت لکھی تو گویا دل چیر کر رکھ دیا اور اپنے حزیں قلب پر لگے ہر ایک داغ کو صفحہ قرطاس پر بکھیر کر اپنے قارئین کے سامنے لایا۔ شبانہ سلیم امرتا پریتم اور رسیدی ٹکٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''رسیدی ٹکٹ اگرچہ پنجابی زبان میں لکھی گئی مگر اس کا ترجمہ ہندی اور اردو میں ہو چکا ہے۔ اس کا انداز تحریر اور اسلوب سادہ ہے۔ مگر امرتا پریتم کی خصوصیت حق گوئی اور بے باکی کی ہے اس لیے یہ کتاب ایک کشش رکھتی ہے۔ مصنفہ نے بے جا تعلّی سے گریز کیا ہے اور وہی لکھا ہے جو ان کی زندگی میں وقوع پذیر ہوا، اور وہی زندگی گزاری جو ان کے

مزاج کے مطابق تھی۔ انہوں نے جوڑ توڑ کی ادبی سیاست سے خود کو بچائے رکھا اس کے باوجود ان کو ملک کے اعلیٰ سے اعلیٰ انعام واعزازات سے نوازا گیا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی ایک Legend بن گئی تھیں۔''1

رسیدی ٹکٹ میں امرتا نے خودنوشت کے مروجہ طریقہ کار سے انحراف کرتے ہوئے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو خیالات کی رو میں ناول کے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ طریقہ کار ان کا ہی خاصہ تھا جنہوں نے پنجر جیسا ناول لکھ کر پوری دنیا کو چونکا دیا تھا۔ اپنی زندگی کے اہم واقعات کو من وعن پیش کر دیا ہے۔ انہوں نے خودنوشت کے ابتدا میں لکھا ہے کہ:

''ایک دن خوشونت سنگھ نے دوران گفتگو کہا کہ تمہاری سوانح کا کیا ہے، بس ایک حادثہ، لکھنے بیٹھو تو رسیدی ٹکٹ کی پشت پر درج ہو جائے۔''2

رسیدی ٹکٹ کا سائز کافی چھوٹا ہوتا ہے جب کہ باقی ٹکٹوں کا سائز بدلتا رہتا ہے۔ وہ آگے لکھتی ہیں کہ خوشونت سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا کیوں کہ جو کچھ بھی مجھ پر بیتا وہ دل کی تہوں میں بیتا تھا اور وہ دردان کی تخلیقات میں موجود ہے۔ خودنوشت لکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتی ہیں:

''پھر بھی کچھ سطور لکھ رہی ہوں، کچھ یوں جیسے زندگی کے حساب کتاب کے کاغذ پر ایک چھوٹی سی رسیدی ٹکٹ چسپا کر رہی ہوں۔ نظموں اور ناولوں کے حساب کتاب کی کچی رسید کو پکی کرنے کے لیے۔۔۔''3

امرتا نے اپنے بچپن سے لے کر آخری عمر تک کے اپنے تجربات ومشاہدات اور اپنے سچے خوابوں کو بھی اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے تمام واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ تشبیہات واستعارات اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ خاتون خانہ ہونے کے باوجود امرتا نے اپنے اور ساحر لدھیانوی کے عشق کی داستان بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے شوہر امروز کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کا احوال بھی لکھتی ہیں۔ خودنوشت سے اندازہ ہوتا ہے کہ امرتا نے مادی دنیا کے ساتھ اپنی ایک روحانی دنیا بھی بسائے رکھی تھی۔ جس میں صرف ساحر اور ان کا گزر ہوتا تھا، اس دنیا میں وقت بھی حائل نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں زندگی کے تجربات ومشاہدات کے ساتھ اپنے مختلف ممالک کی سیر اور وہاں کی سماجی وادبی زندگی کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

وہ اپنے بچپن، جوانی اور عمر کے آخری پڑاؤ کے حالات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ مختصر انداز میں پیش کرتی

ہیں۔ زندگی سے متعلق اپنے جذبات، احساسات، تجربات وغیرہ کو بھی بیان کیا ہے۔ امرتا پریتم ایک مشہور شاعرہ تھیں چناں چہ ان کی خودنوشت میں بھی اشاروں، کنایوں میں زندگی کے تجربے ملتے ہیں۔ اپنی زندگی کے سولہویں سال کی تفصیل محبت کے احساس کا استعارہ بنا کر پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں 'سولہواں سال آج بھی میرے عمر کے ہر سال میں شامل ہے۔' گویا ایک طویل عرصے تک اپنے آپ کو جوان محسوس کیا اور نازک احساس و جذبات کو مرنے نہیں دیا۔ امرتا کی مقبولیت و شہرت ایک طرف لیکن ان کے مخالفوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جو ان کو پریشان کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتی تھی۔ ان مخالف لوگوں کا ذکر خودنوشت میں بھی ملتا ہے۔ مصنفہ ایک باہمت خاتون تھیں اپنے عزم اور خلوص کے ساتھ تمام مخالفتوں کا ڈٹ کر سامنا کیا اور تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف عمل رہیں۔

غرض کہ پوری خودنوشت میں زندگی کے اتار چڑھاؤ ادبی و سماجی زندگی سے متعلق ان کا قلم روانی سے چلتا ہے ساتھ ہی وہ سیاسی حالات پر بھی تبصرہ کرتی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد امرتا اپنے خاندان کے ساتھ دہرہ دون پہنچی بعد ازاں دہلی میں سکونت اختیار کی۔ تقسیم سے پہلے لاہور ریڈیو سے منسلک تھیں اور تقسیم کے بعد آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے طویل عرصے تک پنجابی خبریں پڑھتی رہیں۔

رسیدی ٹکٹ میں مختلف موضوعات سے قطع نظر سیاسی احوال اور تقسیم ہند کا المیہ بھی موجود ہے۔ تقسیم ہند کی تباہی نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت کی تباہی و بربادی کا بیان ان کی بیشتر تخلیقات میں موجود ہے۔ ان کا ناول پنجر اسی کی کڑی ہے جس پر فلم بھی بنائی جا چکی ہے۔ انہوں نے غیر منقسم و منقسم ہندوستان کے سیاسی احوال کو مختلف چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ کسی بھی اہم واقعے کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے علامتی انداز میں اس دور کی سماجی و سیاسی زندگی کا احوال لکھتی ہیں۔ امرتا کو بھی ہجرت کے کرب سے دوچار ہونا پڑا تھا اور یہ کرب ان کی مذکورہ خودنوشت میں بڑے اختصار کے ساتھ علامتی انداز میں ملتا ہے۔

ان کی آپ بیتی میں تقسیم سے پہلے اس پنجاب کی جھلک بھی موجود ہے جب آپسی بھائی چارے و اخوت و محبت کا بول بالا تھا، ساتھ ہی جلتے اور آگ کے دھوؤں میں لپٹے اور لوگوں کی چیخوں میں دبے پنجاب کی منظر کشی بھی ملتی ہے۔ تقسیم ہند سے قبل گوجرانوالہ، پنجاب کے سکھوں کی بود باش اور آپسی بھائی چارگی کی مثال بھی خودنوشت میں موجود ہے۔ امرتا پریتم نے اس دور میں آنکھیں کھولیں جب برصغیر میں انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں نے متحد ہو کر ایک محاذ کھول رکھا تھا۔ ان کے خلاف مختلف بغاوتیں، تحریکیں وجود میں آ چکی تھیں۔ 1919ء کا وہی زمانہ ہے جب ترک موالات اور تحریک خلافت کے زیر اثر ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ بنا کسی بھید بھاؤ کے متحد ہو گئے تھے۔ قوم کا اتحاد

دیکھ کر انگریزوں کو بھی تشویش ہونے لگی تھی کہ اب ہندوستان میں مزید حکومت کرنا مشکل ہے۔ ہندو مسلم اس طرح مل جل کر ان کے خلاف نعرے بازی، ریلیاں وجلوس نکالتے، یوں محسوس ہوتا اب آزادی ملنا چند دنوں کی بات ہے۔لیکن انگریزوں کی چالبازیاں، ہندوستانیوں کی تعصب پسندی اور مختلف واقعات نے گاندھی جی و دوسرے لیڈروں کے بنے بنائے پلان پر پانی پھیر دیا اور ہندو مسلم اتحاد جو قائم ہوا تھا اس کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ بہر کیف یہ الگ بحث ہے، امرتا کے ہوش سنبھالنے تک ہندو مسلم دونوں قوموں کے درمیان تعلقات اچھے تھے، ایک دوسرے کی خوشیوں وغموں میں شریک ہوتے، ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہر طرح کے احترام وعقیدت کے باوجود بھی دونوں قوموں کے درمیان ایک خلیج قائم تھی جو کہ مذہب کی بنیاد اور اچھوت کے نام پر سماج میں رائج تھی۔

امرتا پریتم نے اس تعلق سے ایک واقعہ بڑے ہی دلچسپ انداز میں خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ان کے والد کے دوست واحباب میں مسلمان بھی شامل تھے۔ان کا آپس میں ایک دوسرے کے گھروں کو آنا جانا بھی رہتا تھا۔لیکن امرتا کی نانی مسلم دوستوں کے لیے جو برتن استعمال کرتی تھیں اسے ہمیشہ الگ رکھتی تھیں۔ایک دن امرتا ان ہی برتنوں میں کھانے کی ضد کر بیٹھیں۔الگ برتن رکھنے کی بات سے ان کے والد نابلد تھے، چناں چہ امرتا کی ضد کے بعد ان کو حقیقت کا علم ہوا۔انہوں نے نہ صرف برتن الگ رکھنے کی اس تفریق کو ختم کیا بلکہ اس کی پرزور مخالفت بھی کی۔امرتا پریتم کی بغاوت رنگ لائی وہ لکھتی ہیں کہ:

> ''پھر کوئی برتن نہ ہندو رہا نہ مسلمان۔اس گھڑی نہ نانی کو معلوم تھا نہ مجھ کو، کہ بڑی ہو کر زندگی کے کئی سال جس کے منھ کو عشق کروں گی وہ اسی مذہب کا ہوگا جس مذہب کے لوگوں کے لیے گھر کے برتن بھی اچھوت بنا دیے جاتے۔۔۔''4

مصنفہ نے مذکورہ واقعے کے بیان کے ساتھ بڑے ہی خوبصورت انداز میں سماج میں چلے آرہے اس رواج پر طنز کیا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس میں امرتا نے اپنی ساحر سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے مذہبی تعصب اور تفریق کے خلاف ایک خاموش احتجاج بھی کرتی ہیں۔ یہ محض ہندوؤں یا سکھوں کے گھروں کی بات نہ تھی بلکہ مسلم گھرانوں میں بھی اچھوت کی بنا پر تفریق برتی جاتی تھی بلکہ آج بھی یہ چیزیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔مصنفہ نے آگے چل کر اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ شاید ساحؔر کا ہی سایہ بچپن میں دیکھا تھا، جو جوانی میں مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔یہی محبت تھی کہ امرتا جیسی تقسیم وہجرت کا کرب جھیلنے والی خاتون کو اتنا فراخ بنا دیا کہ لوٹ مار میں اپنا سب کچھ تباہ ہونے کے باوجود بھی نفرت کا معدہ ان میں نہیں آیا، اسی محبت کی طاقت تھی یا پھر امرتا کی بے باکی جس کی وجہ سے انہوں نے تقسیم ہند کے زیر اثر ہونے

والے فسادات میں دونوں مذاہب کے لوگوں کی شراکت کو بنا کسی رعایت یا جانب داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

امرتا کی بچپن کی منگنی سولہویں سال کی عمر میں شادی میں تبدیل ہوگئی، ملک کے دیگر فسادات کے علاوہ لاہور کے بگڑتے حالات کے ساتھ امرتا نے اپنی شادی کو اس سال کے اہم واقعات میں شامل کیا ہے۔ اس وقت ہندوستان کی فضا کافی مکدور ہو چکی تھی۔ دوقومی نظریے کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوریاں پیدا ہو رہی تھیں، کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جس کی وجہ سے ملک کی دوسری بڑی پارٹی یعنی مسلم لیگ نے الگ مسلم ملک کی مانگ شروع کر دی، جس کی بدولت پورے ملک میں چھٹ پُٹ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے تھے۔ امرتا نے محض دو چار لائن میں ان تمام حالات کو سمیٹ دیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''مڑ کر کئی میل پیچھے کی طرف دیکھوں تو ملک کی تقسیم سے پہلے کے وہ دن سامنے آتے ہیں، جب اچانک لاہور کی فضا ہولناک افواہوں سے تلخ ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ میرے بیاہ کے سوا کچھ نہیں تھا بیتا۔۔۔''5

یہ 1935 کا دور تھا جب پوری دنیا میں اتھل پتھل جاری تھی، اور دوسری جنگ عظیم کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ ہندوستان میں بھی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی مہم تیز ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر پارٹیاں، ومحبان وطن اپنا اپنا کردار نبھا رہے تھے۔ مسلم لیگ کی قیام پاکستان کی ضد، اور اس سلسلے میں کانگریس سے اس کی رسہ کشی نے ملک کے بٹوارے کو یقینی بنا دیا تھا۔ ان کے آپسی اختلافات کی وجہ سے عوام بھی فکرمند تھی۔ ان کے درمیان مختلف افواہیں گردش کرتی رہتیں جس سے نفرتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ امرتا نے مذکورہ بالا اقتباس میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ملک کے حالات کو اپنی شادی کے واقعے سے جوڑ کر حادثے کا نام دیا ہے وہ بھی ایسی شادی جوان کی مرضی کے خلاف تھی۔

مصنفہ نے خودنوشت میں چند واقعات کے ذریعے برصغیر کی مکدور ہوتی فضا کا نقشہ کھینچا ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند سے پہلے آپسی بھائی چارگی و انسانیت، ہندوستانی اقدار و روایت جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے حسرت کا بھی اظہار کیا ہے، اسی طرح تقسیم ہند کے تحت پرانی اقدار کے ختم ہونے پر ماتم بھی کیا ہے۔

1857 کے غدر میں دہلی کے مسلمانوں کی لوٹ کا احوال بھی ایک واقعے سے کیا ہے۔ جس گھر میں مصنفہ بیاہی گئی تھیں وہاں ایک قالین تھا جو اسی خاندان کے کسی سردار نے جنگ آزادی میں دہلی سے لوٹ کر لاہور لایا تھا۔ امرتا کی شادی تک وہ قالین موجود تھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ اس قالین کا رنگ کیا تھا، نہیں معلوم لیکن جب میں نے دیکھا تو وہ رنگوں اور

ریشم کا کھنڈر سا تھا۔' گھر کے جو بزرگ تھے وہ اسی قالین پر سوتے تھے۔ جب 1947 میں تقسیم ہند کے بعد لوٹ مار شروع ہوئی اور ہندو مسلم آبادی کا تبادلہ شروع ہوا تو وہ خاندان بھی دہلی آ گیا لیکن گھر کے ایک بزرگ نے ہجرت سے انکار کر دیا کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ یہ افراتفری چند دنوں کی ہے، حکومتیں لوگوں کے گھر نہیں چھن سکتیں۔ اس لیے انہوں نے ہجرت نہ کر کے گھر کی حفاظت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب حالات زیادہ بگڑ گئے تو ملٹری والوں نے ان کو بھی ایک ٹرک سے ہندوستان بھیج دیا۔ وہ اپنے ساتھ اس قالین کے سوا کوئی چیز نہ لا سکے۔ ان کو ہجرت راس نہیں آئی، راستے کی تکالیف اور بھرے گھر کے چھوڑنے کے غم نے ان کی جان لے لی۔ جب ان کی موت ہوئی تو وہ اسی قالین پر سوئے تھے جو لوٹ کر دہلی سے لاہور لے جایا گیا تھا۔ امرتا پریتم اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''وہی قالین اس کے نیچے بچھا ہوا تھا جب اس کی موت ہوئی۔ اس کے بعد وہ قالین کسی غریب غربا کو دے دیا گیا۔ ایک ذکر تھا جو اس وقت سب کی زبان پر تھا۔ دہلی کے غدر کے موقع پر ہم نے یہ قالین دہلی میں لوٹا تھا۔ آج دہلی کی لوٹ ایک صدی کے بعد دہلی کو واپس موڑ دی۔۔۔''6

امرتا پریتم کا خیال ہے کہ لوٹ مار یا کسی پر کیا گیا تشدد ایسا قرض ہے جو ایک نہ ایک دن قدرت کی طرف سے ظالم کی طرف لوٹتا ضرور ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کی مصنفہ چشم دید گواہ نہیں تھیں بلکہ اس سانحے کو ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اپنے بزرگوں کے ذریعے امرتا اس کی ہولناکیوں کو سنتی رہتی تھیں۔ اس کی تباہی و بربادی کی منظر کشی علامتی انداز میں پیش کرتی ہیں، ملاحظہ ہوں:

> ''1857 کے غدر کا مجھے کچھ علم نہیں، لیکن یہ غدر لفظ دادی اماں سے سنی ہوئی کسی کہانی کی طرح، میرے اندر اٹکا ہوا تھا۔ یہ لفظ کسی جیتی جاگتی شے جیسا بھی تھا اور مَری ہوئی شے ایسا بھی۔ کبھی کئی طرح کی آوازیں اس میں سے سنائی دیتی تھیں، معلوم نہیں کس کی، تاہم انسانی آوازیں۔ ایک دوسرے سے کھوئی ہوئی، ایک دوسرے کو ڈھونڈتی ہوئیں، تلواروں کی طرح جھنکارتی بھی، زخموں کی مانند رستی ہوئیں بھی، کئی رنگ بھی اس لفظ میں لہو کی طرح بہتے تھے۔۔۔''7

امرتا پریتم نے ہندوستان کی تقسیم اور اس سے ہونے والے خونی فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خودنوشت میں بھی '1947' کے نام سے باب قائم کر کے بے حد اختصار کے ساتھ پورے حالات کو پیش کر دیا ہے۔

انہوں نے اس باب میں تقسیم ہند کے بعد ماحول میں پھیلی اداسی اور خوف کو بیان کیا ہے۔ ان کی شخصیت اور قلم پر ہندوستان بالخصوص پنجاب کی تقسیم کا زخم انتہائی گہرا تھا اور تقسیم کے بعد ان کی آنے والی نظموں اور ناولوں میں اس کی بھرپور چھاپ ملتی ہے۔ اس وقت ملک میں ہونے والی قتل وغارت گیری، لوٹ مار اور اس سلسلے میں مصنفہ کے تجربے ومشاہدے ان کے ہی الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

''قدیم تواریخ کے بڑے ظلم وستم سے بھرے ابواب ہم لوگوں نے پڑھے ہوئے تھے۔ پھر بھی ہمارے ملک کی تقسیم کے موقع پر جو کچھ ہوا، کسی کے تصور میں بھی اس قسم کا خونیں باب نہیں آ سکتا۔ غم والم کے افسانے کہہ کہہ کر لوگ تھک گئے تھے۔ لیکن یہ افسانے عمر سے پہلے ختم ہونے والے نہیں تھے۔ میں نے لاشیں دیکھی تھیں اور لاشوں جیسے لوگ دیکھے تھے۔''8

تقسیم ہند کے بعد جب حالات حد سے زیادہ خراب ہوئے تو امرتا بھی اپنے خاندان کے ساتھ لاہور سے دہرہ دون ہجرت کر گئی تھیں۔ اپنے گھر بار چھوڑنے کا غم اور خونی فضا نے ان پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ ہجرت کے بعد رہائش کی غرض سے دہرہ دون سے دہلی گئیں۔ جب وہ دہلی سے واپس دہرہ دون ٹرین سے جا رہی تھیں، تو باہر کی بھیانک فضا اور اس کے مناظر کو استعاراتی انداز میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

''گاڑی کے باہر کی گہری تاریکی وقت کی تاریخ جیسی تھی۔ ہوا یوں شائیں شائیں کر رہی تھی جیسے تاریخ کی آغوش میں کراہ رہی ہو۔ باہر اونچے اونچے پیڑ غموں کی طرح اُگے ہوئے تھے۔ کئی جگہ پیڑ نہ ہوتے، صرف ویرانی ہوتی اور اس ویرانی کے ٹیلے یوں لگتے جیسے قبریں بنی ہوں۔۔۔''9

ٹرین کے اس سفر اور فضا کی ویرانی نے امرتا کو پریشان کر دیا تھا۔ انہوں نے تقسیم ہند کے زیر اثر ہونے والے مظالم کا مرثیہ پڑھا ہے جو پنجاب کے مشہور بزرگ وارث شاہ کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔ وارث شاہ نے پنجاب کی ہیر کے غم کو نظم کی صورت میں پیش کیا تھا۔ چناں چہ امرتا نے پنجاب کی تباہی اور وہاں کی لاکھوں بیٹیوں اور عورتوں کے غم کو وارث شاہ کو مخاطب کر کے نظم کے پیرائے میں ڈھال دیا جو امرتا پریتم کی خاص پہچان بن گئی۔ نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

اجّ آکھاں وارث شاہ نوں، کتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا، کوئی اگلا ورقہ کھول

اک روئی سی دھی پنجاب دی، تو لکھ لکھ مارے وین
اجّ لکھاں دِھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ دردمنداں دیادردیا! اُٹھ تک اپنا پنجاب
اجّ بیلے لاشاں وچھیاں، تے لہو دی بھری چناب

امرتا کی یہ نظم ان کے حساس اور دردمند انسان ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ یہ نظم چھپنے کے بعد وہ کافی مقبول ہوئی، لوگ اسے اپنی جیبوں میں رکھتے اور پڑھ کر روتے تھے۔ ملتان میں ''جشن وارث شاہ'' کی شروعات اس نظم سے کی جاتی تھی۔ لیکن پنجاب کے اخبارات نے امرتا کے خلاف بہت زہر اگلا اور اس نظم کے خلاف کئی نظمیں لکھی گئیں۔ لوگوں کو اعتراض یہ تھا کہ مصنفہ نے ایک مسلم بزرگ کو مخاطب کیوں کیا ہے۔ اس دور میں لوگوں کی تعصب پسندی اور نفرت کا اندازہ ان کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''لیکن یہی نظم تھی، جب لکھی تھی تو اپنے پنجاب میں کئی اخبارات میرے لیے تہمتوں سے پُر ہو گئے تھے۔ سکھوں کو اعتراض تھا کہ میں نے یہ نظم وارث شاہ کو مخاطب کر کے کیوں لکھی تھی، گورو نانک کو مخاطب کر کے لکھنی چاہیے تھی، اور کمیونسٹ کہتے تھے کہ میں لینن یا اسٹالین کو مخاطب کر کے کیوں نہیں لکھی، یہاں تک کہ اس نظم کے خلاف کئی نظمیں لکھی گئیں۔۔۔''10

غرض کہ مصنفہ نے محض ایک دو واقعات کے ذریعے پورے حالات کی منظر کشی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مغویہ عورتیں، بے گناہوں کا قتل، مہاجروں اور شرنارتھیوں کے دکھوں کی داستان بھی پیش کرتی ہیں۔ سماجی و مذہبی اقدار جس میں بھائی چارہ، محبت و اخوت تھی اس کے ٹوٹ جانے اور ہندو مسلمانوں کے درمیان بڑھتی خلیج، دونوں ملکوں کی دشمنی کو بھی اشارتاً پیش کیا ہے۔ ہجرت کے کرب کی تپش ان کو تا عمر جھلساتی رہی اور وہی تپش ان کی بعد کی تخلیقات میں شعلہ بن کر سامنے بھی آتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے حالات خاص کر پس ماندہ طبقے کی حالت زار کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ راجیہ سبھا میں بحیثیت ممبر اس سلسلے میں آواز بھی اٹھاتی رہیں۔

چوں کہ یہ کتاب پنجابی سے ترجمہ کی گئی ہے اس لیے اس میں بلاغت و روانی کی کمی کھلتی ہے۔ لیکن امرتا پریتم نے ''رسیدی ٹکٹ'' ناول کی ہیئت میں اپنی داستانِ زندگی لکھ کر صنف خودنوشت میں اضافہ کیا ہے۔ یہ کہیں ڈائری کی صورت میں ہے تو کہیں ان کی نظموں اور مختلف واقعات کی صورت میں ہے۔ ڈائری کے اقتباسات میں وہ شامل ہیں جو

انہوں نے اپنے بیرونی ممالک کے قیام کے دوران لکھے تھے۔اس خودنوشت سے ان کے ذہنی رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔اپنی بے باک طبیعت کی وجہ سے ہی داستان عشق کے ساتھ اپنی سگریٹ اور شراب نوشی کی عادت کا برملا اظہار کرتی ہیں۔اپنی سماجی و ادبی زندگی کے ساتھ ملک کی تقسیم اور سیاست پر پوری ایمانداری سے تبصرہ بھی کرتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ شبانہ سلیم، اردو میں خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں: تجزیاتی مطالعہ، باب العلم پبلی کیشنز، بھوپال، 2015ء، ص: 225
2۔ امرتا پریتم، رسیدی ٹکٹ، منظور پریس، لاہور، 1977ء، ص: 11
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، ص:14
5۔ ایضاً، ص: 26
6۔ ایضاً، ص: 34
7۔ ایضاً، ص: 33
8۔ ایضاً، ص: 29
9۔ ایضاً
10۔ ایضاً، ص: 30

خوشونت سنگھ: سچ، محبت اور ذرا سا کینہ

سنہ اشاعت: 2018

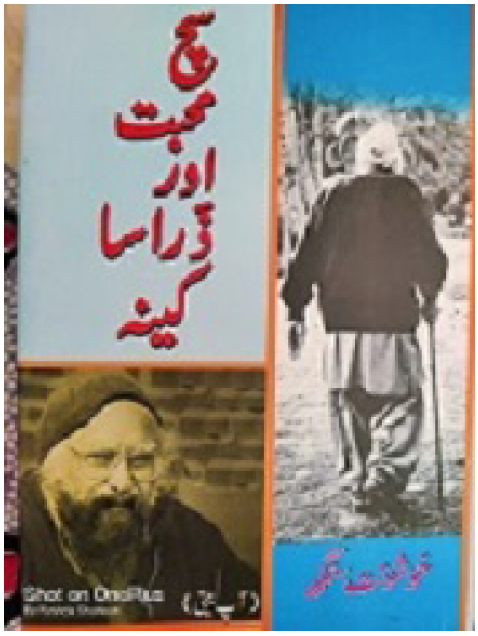

سچ، محبت اور ذرا سا کینہ (خوشونت سنگھ)

مشہور و معروف صحافی، ناول نگار، مؤرخ اور مترجم خوشونت سنگھ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک بھی انتہائی مقبول ہیں۔ بحیثیت صحافی ملک کے مختلف انگریزی اخباروں مثلاً ہندوستان ٹائمز، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا، نیشنل ہیرالڈ وغیرہ کے علاوہ 'یوجنا' کی ادارت بھی کی۔ اپنے اداریوں کے ذریعے بڑی دلیری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ پورے برصغیر میں بحیثیت صحافی کافی مشہور ہوئے اور صحافت میں اپنی الگ پہچان بنائی۔ وہ ایک دلیر اور منھ پھٹ صحافی تھے، بے باکی سے لکھتے اور اپنی تحریروں سے پیدا ہونے والے شدید ردعمل کو بھی خوش دلی اور بہادری سے برداشت کرتے۔ جس کا اندازہ مذکورہ خودنوشت سے بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کی ادبی خدمات بھی مستحکم ہے انہوں نے زائد از سو کتابیں تحریر کی ہیں جن میں بیشتر افسانوں و ناولوں پر مبنی ہیں، علاوہ ازیں کچھ کتابیں تاریخی نوعیت کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کی تخلیقات زیادہ تر رنگین مزاجی و بے باکی کا مظہر ہیں۔

ان کی مشہور کتابوں میں Dehli:A novel, Train to Pakistan,The End of India,My Bleeding Punjab,Black Jasmine,The Company of Women,A History of the Sikhs,The Portrait of a lady, The Good, the Bad and the Ridiculous, Khushwant Singh on Women, Sex, Love And Lust, Khushwantnama: The Lessons of My Life وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے اپنی خودنوشت ''Truth, Love and a Little Malice'' کے نام سے لکھی۔ ان میں اکثر کتابوں پر احتجاج بھی کیا گیا۔ ان کی کتابوں کا اردو کے علاوہ دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔

پاکستان کے شہر خوشاب کے پاس ہڈالی نامی گاؤں میں 1915 میں جنم لینے والے خوشونت سنگھ کا کتاب و قلم سے رشتہ زندگی کے آخری لمحات تک مضبوط و مستحکم رہا۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو قابل تعریف ہے کہ انہوں نے ہر بات واضح الفاظ میں اور کھل کر لکھنے کو ترجیح دی۔ منافقانہ رویے اور زندگی سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ ان کے والد سوبھا سنگھ دہلی میں تعمیراتی ٹھیکے کا کام کرتے تھے۔ لیکن خوشونت سنگھ ہڈالی میں ہی رہے جہاں ان کی پرورش دادی لکشمی بائی نے کی، کچھ سالوں بعد وہ بھی دہلی آ گئے۔ ان کا اصل نام خوشحال سنگھ تھا جسے بعد میں انہوں نے تبدیل کر دیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے بعد ازاں دہلی کے ماڈرن اسکول، سینٹ اسٹیفن کالج سے حاصل کی۔ ڈگری کالج، لاہور سے گریجویشن کے

بعد 1934 میں لندن روانہ ہوئے، جہاں کنگز کالج سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔اس کے علاوہ ان کو موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا۔اس کے لیے انہوں نے کلکتہ کے شانتی نکیتن میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی بیماری کی وجہ سے واپس دہلی آنا پڑا۔پوری زندگی مختلف ممالک کا سفر کرتے رہے لیکن اپنے گاؤں ہڈالی کو نہ بھلا سکے۔20 مارچ 2014 کو 99 سال کی عمر میں دہلی میں انتقال کر گئے۔اپنے گاؤں سے انسیت کے سبب اپنی راکھ کو وہاں لے جا کر دریا میں بہانے کی خواہش ظاہر کی تھی جس پر عمل بھی کیا گیا۔

خوشونت سنگھ نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا وکالت سے کی تھی، جس کے لیے لاہور میں پریکٹس کرتے رہے، پھر تقسیم ہند کے بعد دہلی چلے آئے۔ ہندوستانی وزارت خارجہ سے بھی وابستہ رہے،اس سلسلے میں ان کی تقرری مختلف ممالک میں ہوتی رہی۔لیکن جلد ہی انہوں نے سرکاری ملازمت کو خیر باد کر دیا اور پوری توجہ صحافت اور تصنیف وتالیف کی جانب مرکوز کر دی۔اگرچہ لکھنے کا ذریعہ انگریزی زبان کو بنایا لیکن اردو اور پنجابی سے بھی شغف رکھتے تھے۔بحیثیت کالم نویس ان کی تحریریں ملک کے مختلف اخباروں میں شائع ہوتی تھیں جو انگریزی کے علاوہ کچھ اردو میں بھی ہوتیں۔اردو کے مشہور شاعر غالبؔ،اقبالؔ وفیضؔ کو بے حد عزیز رکھتے تھے،ان کے کلام کو اپنی تحریروں میں بلا تکلف استعمال بھی کرتے تھے۔اقبالؔ کی شاعری خصوصاً شکوہ، جواب شکوہ کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔تقسیم ہند کے تناظر میں لکھا گیا ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' نے ان کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا،اس کے اردو کے علاوہ کئی زبانوں میں تراجم ہوئے،اور فلم بھی بنائی گئی۔

1980 سے 1986 تک راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے۔حکومت ہند نے پدم شری و پدم بھوشن جیسے اعزازات سے نوازا۔اس کے علاوہ ادبی خدمات پر دیگر انعام واکرام بھی وقتاً فوقتاً حاصل کرتے رہے۔وہ ایک حسن پرست انسان تھے،حسن جہاں بھی اور جس شکل میں ہو اس کی قدر بھی کرتے تھے۔تقسیم ہند کے بعد مصنف لاہور چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن حالات اتنے سنگین ہوئے کہ ان کو ہجرت کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔آزادی کے قبل مختلف قوموں کے درمیان فاصلے بڑھ گئے تھے، پرانی قدریں ٹوٹ چکی تھیں جو صدیوں پر محیط تھیں۔جب لاہور میں فسادات شروع ہوئے تو ان کے پڑوسیوں نے گھر کے دروازے پر پارسی کا مکان لکھ کر ٹانگ دیا تھا تاکہ خوشونت سنگھ اور ان کے اہل وعیال بلوائیوں سے محفوظ رہ سکیں۔لیکن صورت حال کا ادراک ہونے پر انہوں نے گھر کی چابی اپنے دوست منظور قادر کو دی کہ جب حالات سازگار ہوں گے تو وہ واپس آجائیں گے۔13 اگست 1947 کو لاہور سے ہجرت کر کے دہلی اپنے والد کے گھر پناہ لی۔

خوشونت سنگھ نے اپنی زندگی کے شب و روز کی داستان انگریزی میں Truth,love and Little

Malice کے نام سے تحریر کی ہے۔ یہ کتاب 1995 میں مکمل ہو چکی تھی لیکن اس کے کچھ حصے جب پروموشن کی غرض سے انڈیا ٹوڈے، ٹیلیگراف اور دی ہندو میں شائع ہوئے تو اس میں وہ حصہ بھی شامل تھا جس میں سنجے گاندھی کی حادثاتی موت کے بعد مینکا گاندھی اور اندرا گاندھی کے درمیان اختلافات اور مینکا گاندھی کو وزیر اعظم ہاؤس سے نکالے جانے کا تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں مینکا اور ان کے خاندان پر کچھ نقطہ چینی کی گئی تھی وہ بھی شائع ہوا تو مینکا گاندھی نے کتاب کی اشاعت پر روک لگانے کے لیے عدالت کا سہارا لیا۔ دہلی ہائی کورٹ نے ان کی درخواست پر پابندی لگا دی۔ عدالتی کارروائیوں میں تقریباً چھ سال لگ گئے۔ بالآخر عدالت نے امتناع کو ختم کر کے مینکا گاندھی پر دس ہزار روپیے ہرجانے کے طور پر دینے کا حکم دیا۔ بعد میں اس کتاب پر پابندی لگانے کے لیے انہوں نے سپریم کورٹ کا بھی دروازہ کھٹکھٹایا لیکن وہاں سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی اور مذکورہ کتاب کی اشاعت عمل میں آئی۔

اس خودنوشت کا اردو ترجمہ محمد احسن بٹ نے کیا ہے جو کہ ایم آر پبلی کیشنز سے 2018 میں منظر عام پر آیا۔ چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف عنوانات کے تحت کل 19 ابواب میں منقسم ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی حالات زندگی کو بلا کم و کاست پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں بھی ان کا لہجہ کافی بے باکانہ ہے۔ اپنے بچپن و جوانی کے واقعات، تعلیم و تعلم، صحافتی و ادبی خدمات، دیگر مصروفیات، سرکاری ملازمت، سماجی و معاشی حالات کے ساتھ ہندوستان کی سیاست اور چوٹی کے سیاست دانوں کی شخصیت پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے بغیر کسی ڈر و خوف کے ملک کے بدعنوان لیڈروں کے خلاف زہر افشانی بھی کی ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف دوسروں کی بلکہ اپنی بھی جنسی بے راہ روی کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ چند اشخاص کے انتہائی نجی معاملات پر بھی بحث کرنے سے نہیں چکتے۔ خودنوشت کا سب سے اہم جز صداقت ہے جس پر یہ کتاب کھری اترتی ہے۔

کتاب کے ابتدا میں ہی خوشونت سنگھ نے آپ بیتی لکھنے پر معذرت طلب کی ہے، تمہید میں ہی لکھنے کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ جب مذکورہ خودنوشت لکھنے کی شروعات کی تو مصنف 87 سال کے ہو چکے تھے۔ اپنے حافظے اور تخلیقی صلاحیتوں کے کھو جانے سے پہلے اپنی سرگزشت ختم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن خودنوشت مکمل ہونے کے چھ سال بعد منظر عام پر آئی۔ اس بیچ خوشونت سنگھ کی درجنوں کتابیں شائع ہوئیں۔ حالاں کہ اس کتاب کے ابتدا میں یہ اعتراف کیا ہے کہ اب ان کی زندگی کے بہت کم دن بچے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس آپ بیتی کو قدرے اضطراب کے ساتھ شروع کیا تھا۔ یہ لازماً میری آخری کتاب ہوگی، میری آخری تحریر جو میں نے اپنی زندگی کی شام میں قلم بند کی ہے۔ میں تیزی

سے ادیبانہ اہلیت واستعداد کھو رہا ہوں۔''1

تمہید کے بعد مصنف نے اپنی پیدائش، خاندان، والدین کے تذکروں کے ساتھ اپنے گاؤں ہڈالی کی تہذیب و تمدن کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس گاؤں میں تقریباً تین سو خاندان آباد تھے۔ جن میں بیشتر بلوچ نسل کے مسلمان تھے، جن کی قد کاٹھی و بہادری کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔ ان میں اکثریت ان کی تھی جو برطانوی فوج میں ملازمت کرتے تھے یا وہاں سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ خودنوشت میں مصنف نے خلاصہ کیا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے ہڈالی نے سب سے زیادہ فوجی مہیا کیے تھے۔ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، محبت و اخوت اور معاشی حالات کا ذکر بھی کتاب میں شامل ہے۔ اس گاؤں میں ہندو مسلم اتحاد کے متعلق خوشونت سنگھ لکھتے ہیں:

> ''ہڈالی میں رہتے ہوئے ہم ہندوؤں اور سکھوں کا مسلمانوں کے ساتھ ایک بے سکون مگر پرامن ماحول تھا۔ گو کہ ہم ان کے بڑوں کو اپنوں کی طرح چچا یا خالہ کہا کرتے تھے، تاہم سوائے شادیوں اور اموات کے ہم ایک دوسرے کے گھروں میں بہت کم ہی آیا جایا کرتے تھے۔.....کس نے یہ جھوٹ گھڑا ہے کہ مسلمانوں اور سکھوں نے ایک دوسرے سے دشمنی کی قسم کھا رکھی ہے؟ ہڈالی کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کو کسی نفرت نے تلخ نہیں کیا ہے۔''2

تقسیم ہند کے بعد ہڈالی پاکستان کے صوبہ پنجاب میں آیا۔ اگرچہ مصنف ہجرت کے بعد دہلی آ گئے تھے لیکن جب بھی موقع ملتا وہ اپنے گاؤں ضرور جاتے۔ وہاں ان کے مکان پر مہاجروں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لکھتے ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد ہڈالی سے وہاں کے سکھوں اور ہندوؤں کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔ خوشونت سنگھ نے اپنے بچپن کے ذکر کے ساتھ اپنی تعلیم اور اس عہد کی سماجی وسیاسی حالات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ جب دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں زیر تعلیم تھے تو ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی عروج پر تھی۔ مختلف تحریکوں و بغاوتوں میں ہندو مسلم مل کر حصہ لے رہے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں دونوں قومیں متحد تھیں اور آپسی محبت واخوت کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آواز بلند کر رہی تھیں۔ لیکن بہت جلد یہ اتحاد شر پسندوں اور مذہبی تعصب میں گھرے لوگوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ دوقومی نظریہ وجود میں آیا اور فرقہ پرست تنظیموں نے جنم لیا۔

گاندھی جی آزادی کی لڑائی اور ہندوستانی عوام کی نظر میں مہاتما بن کر ابھرے۔ ان کی قیادت میں خلافت تحریک اور ترک موالات جیسی تحریکیں وجود میں آ چکی تھیں۔ اسی دور میں مجاہد آزادی بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو

پھانسی دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف پورے ہندوستان میں احتجاج ہو رہا تھا، اسکول کالج سب بند تھے۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''سینٹ اسٹیفن کالج میں میرے دوسرے برس کے دوران میں تین انقلابیوں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ سزا کے خلاف احتجاج کے طور پر سارے ہندوستان کے اسکول اور کالج بند کر دیے گئے تھے۔ سینٹ اسٹیفن بند نہیں ہوا۔ صبح کی اسمبلی کے بعد میں نے اور ایک دوسرے لڑکے نے نعرہ لگایا 'بھگت سنگھ زندہ باد'۔ ہم نے سینٹ اسٹیفن کالج کے علامتی نشان سرخ صلیب اور کالج کے ماٹو 'خداوند کی شان کے لیے' کی جگہ کالج کے جھنڈا لہرانے والے کھمبے پر ہندوستانی ترنگا لہرا دیا۔ ہمیں مونک نامی انگریز عارضی پرنسپل نے اپنے دفتر میں بلوا بھیجا۔ اس نے ہمیں ڈانٹا ڈپٹا اور تنبیہ کی کہ اگر ہم نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو ہمیں کالج سے نکال دیا جائے گا۔''3

مصنف نے انگریزوں کے خلاف اپنے طور پر یہ پہلا احتجاج کیا تھا۔ اپنے کالج کے ان مسلم طلبہ و اساتذہ کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کی حمایت اور مسلم لیگ کی الگ ملک کی مانگ کو جائز قرار دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے چند عیسائی دوستوں و جاننے والوں کے حوالے سے ہندوستان کے عیسائیوں کا تحریک آزادی سے لاتعلقی کو بھی پیش کیا ہے۔

خوشونت سنگھ کی آپ بیتی ''سچ، محبت اور ذرا سا کینہ'' میں دیگر موضوعات اور ان کی شب و روز کی داستان و ہم عصروں کے متعلق بیان کے علاوہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مصنف نے غیر منقسم ہندوستان اور آزادی کے بعد کی ملکی سیاست پر کھل کر تبصرہ کیا ہے۔ پانچویں باب ''لاہور، تقسیم اور آزادی'' کے نام سے مختص ہے۔ جس میں انہوں نے تعلیم مکمل ہونے کے بعد لاہور میں اپنی وکالت کی پریکٹس اور اس دوران کے حالات، تقسیم ہند کے بعد ہونے والی خوں ریزی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں دوسری جنگ عظیم کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مصنف ہندوستان کی آزادی کے لیے ہٹلر، مسولینی اور ان کے یورپی اتحادیوں و جاپان کی شکست کو ضروری سمجھتے تھے۔ جب کہ ہندوستانی عوام ان کی فتوحات پر خوش ہوتے تھے ان کی انگریزوں کے ساتھ دشمنی اس کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ اسی طرح خوشونت سنگھ نے گاندھی جی کی ہندوستان چھوڑو تحریک کی بھی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے برصغیر کے ان حصوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی (موجودہ

پاکستان و بنگلہ دیش) کو ایک الگ مسلم ملک کے طور پر حمایت بھی کی تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''میں نے گاندھی کی 'ہندوستان چھوڑ دو تحریک' کو بالکل پسند نہیں کیا۔ میں نے اس یقین کے ساتھ کہ ہندوستان اپنے دونوں سروں پر دو خود مختار مسلمان اکثریتی ریاستوں کے ساتھ ایک ملک کے طور پر چلتا رہے گا، مسلمانوں کے ان علاقوں میں الگ ریاست کے مطالبے کی حمایت کی، جہاں وہ اکثریت میں تھے۔''4

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ملک کے بگڑتے حالات کو دیکھ کر زیادہ تر ہندوستانیوں کو یہ گمان ہونے لگا تھا کہ انگریز راضی خوشی سے بہت جلد ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ 1946 میں ہونے والے ملک گیر فرقہ وارانہ فسادات اور ممبئی کے بحریہ فوجوں کی بغاوت نے انگریزی حکومت کی چولیں ہلا دی تھیں، حالات پر قابو پانا ان کی طاقت سے باہر ہو گیا تھا۔ دوسری جانب جنگ عظیم دوم کی تباہیوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ برطانوی حکومت کے اپنے ہی ملک کے بے شمار مسائل تھے جن کو حل کرنا پہلے ضروری تھا۔ جنگ کے بعد لیبر پارٹی کی جیت ہوئی اور کلیمنٹ ایٹلی وزیر اعظم بنے تو برصغیر کے بگڑتے حالات سے عاجز آ کر وائے سرائے لارڈ ویول نے ان کو ایک خط کے ذریعے درخواست کی کہ جتنی جلدی ہو سکے ہندوستان کو آزاد کر کے اقتدار مقامی لوگوں کے ہاتھ میں دے دینا چاہیے۔

چناں چہ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ 28 جون 1948 کو ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا تا کہ اس معاملے کو نپٹایا جا سکے۔ لیکن مسلم لیگ کی پاکستان کی مانگ اور کانگریس کے ساتھ بگڑتے تعلقات نے ملک کی فضا کو حد سے زیادہ مکدور کر دیا تھا۔ اس لیے برطانوی حکومت نے معاملات کو شانتی سے سلجھانے اور دونوں پارٹیوں کے سیاستدانوں کے باہمی فیصلے سے ملک کو آزاد کرنے کے لیے کیبنٹ مشن کا ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ مشن کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ ملک کو تقسیم کرنے کے بجائے مسلم اکثریتی علاقوں میں ان کی حکومت بنائی جائے اور مرکزی حکومت میں بھی ان کی شمولیت ہو۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے باہمی اتفاق رائے سے اپنی منظوری دے دی لیکن بہت جلد ایک کانفرنس میں پنڈت نہرو کے بیان نے تقسیم ہند کو روکنے کی آخری کوشش کو ناکام بنا دیا۔

پنڈت نہرو نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا کہ کیبنٹ مشن کی شرائط کو موقع محل کے لحاظ سے ردوبدل کیا جا سکتا ہے اور اس کے اہم فیصلے وکارکردگی کے تئیں فیصلہ کرنے کا حق محض کانگریس کو ہے۔ محمد علی جناح کو ایک موقع مل گیا

انہوں نے مشن سے اپنی منظوری واپس لے کر ڈائریکٹ ایکشن ڈے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح گاندھی جی و دیگر لوگوں کے غیر منقسم و متحد ہندوستان کا خواب ادھورا رہ گیا۔ دوسری طرف ملک میں ہونے والے خوں ریز فسادات سے مسلمان عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا تھے۔ ان کو اپنے مستقبل کی فکر تھی چناں چہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر مسلم عوام بھی پاکستان کی حمایت کرنے لگے کیوں کہ ان کو سارے مسائل کا حل اسی میں نظر آتا تھا۔

حالاں کہ مسلمانوں میں اکثریت ان کی تھی جو تقسیم ہند اور مسلم لیگ کی پالیسیوں کے خلاف تھے۔ تاہم ان کو بھی اپنے جان و مال کی فکر تھی، اس لیے ایسے لوگ سارے مسائل کے حل کے لیے مصالحت کے ساتھ درمیانی راستہ اختیار کر کے ملک میں پرامن فضا قائم کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ تمام حالات نے ملک میں عجیب بے چینی و نفرت پیدا کر دی تھی۔ مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے سے کترانے لگے تھے۔ ان سارے نکات پر تبصرہ کرتے ہوئے خوشونت سنگھ لکھتے ہیں:

> ''مجھے عمومی ہندو مسلم، سکھ تقسیم کے بارے میں کوئی وہم نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن اور لائبریری میں بھی وسیع لاؤنج میں مسلمان وکیل، ہندوؤں اور سکھوں سے الگ گوشوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ شادیوں اور جنازوں پر ایک خاص حد تک سطحی سا اختلاط ہوتا تھا، تاہم یہ محض ظاہرداری کو برقرار رکھنے کے لیے ہوتا تھا۔ مسلم لیگ کی پاکستان کے مطالبے کی قرارداد کے بعد تقسیم وسیع ہو گئی تھی اور وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ پاکستان کا مطالبہ بہت تیزی سے قوت پکڑتا جا رہا تھا۔ ہر دوسری سہ پہر مسلمانوں کے بڑے بڑے جلوس مال روڈ پر نکلتے تھے جو ایک آواز ہو کر نعرہ لگاتے تھے، پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ۔۔۔۔''5

مصنف نے خودنوشت میں ملک میں بڑھتی فرقہ واریت کو چند واقعات کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے 1946 میں کلکتہ، نواکھلی، بہار، اتر پردیش، پنجاب وغیرہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس وقت ملک کے حالات کافی دگرگوں تھے، خوف کے مارے لوگ اکیلے سڑکوں پر چلنا ترک کر چکے تھے، پڑوس اور جان پہچان کے لوگ بھی ایک دوسرے سے میل ملاپ میں احتیاط برتتے تھے۔ نفرت و انتقام کے جذبوں میں ڈوبے بلوائی ایک دوسرے پر مذہب کے نام پر حملہ کر رہے تھے۔

اس کے علاوہ کیبنٹ مشن کی ناکامی، عوام میں بڑھتا خوف، فرقہ واریت، مذہبی تعصب، بلوائیوں کے ذریعے

کی گئی قتل و غارت گیری کو بھی خوشونت سنگھ نے پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل لاہور اور مغربی پنجاب میں سکھوں و ہندوؤں کے قتل عام اور لوٹ مار سے ان علاقوں میں تناؤ کافی بڑھ گیا تھا۔ چناں چہ جب حالات بے قابو ہوئے تو مصنف نے بھی ہجرت کرنا مناسب جانا۔ لوٹ مار کو بھی انہوں نے مختلف واقعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔ لاہور اور مغربی پنجاب کے فساد میں مسلمانوں نے جس جانب داری کا مظاہرہ کیا تھا اور سکھ قوم کا جس بے دردی سے قتل عام کیا گیا تھا اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے خوشونت سنگھ لکھتے ہیں:

> ''سارے صوبے میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ قتل عام میں مسلمانوں کو بالادستی حاصل تھی۔ وہ اکثریت میں تھے، پنجاب پولیس زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل اور شرمناک حد تک جانب دار تھی۔ ہماری راتیں ایک طرف اللہ اکبر اور دوسری طرف ست سری کال یا دوسری طرف سے ہر ہر مہادیو کے ایک دم پھٹ جانے والے نعروں سے پریشان ہو جاتیں۔ مسلمان زیادہ پراعتماد تھے وہ ہندو اور سکھ علاقوں کے قریب چلے جاتے اور چلاتے، ہوشیار! شکار کا ہے انتظار۔۔۔''6

لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں نے جنہیں مغربی پنجاب میں مار پڑی تھی، وہی مشرقی پنجاب میں معصوم مسلمانوں سے خونیں انتقام لے رہے تھے اور ایک کے بعد دوسری بستی کا صفایا کر رہے تھے۔ مصنف نے مشرقی پنجاب و ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں پر ہوئے تشدد کو بھی بیان کیا ہے۔ آزادی سے قبل دونوں ملکوں سے تبادلۂ آبادی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ٹرینوں اور پیدل قافلوں پر حملوں کی اندوہ ناک کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں، جن میں لاکھوں افراد کو بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، لوگ اپنا غم بیان کر کر کے تھک گئے تھے لیکن کہانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

خوشونت سنگھ کا نوکر دلیپ سنگھ نے ہجرت کرنے کے بجائے ان کے لاہور والے گھر میں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ مصنف کے دوست منظور قادر نے دلیپ سنگھ کو بلوائیوں سے بچانے کی بھرپور کوشش کی لیکن ایک دن جب بلوائیوں کو پتہ چلا کہ ایک سکھ کو اس گھر میں پناہ دی گئی ہے تو وہ گھر کی تلاشی کے لیے پہنچ گئے اس سے پہلے ہی منظور قادر پولیس کو بلانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح دلیپ سنگھ کی جان اس وقت تو بچ گئی لیکن معاملے کی سنگینی کو دیکھ کر منظور نے اسے وہاں لا کر چھوڑ دیا جہاں ہندو پاک کی نئی سرحد بن رہی تھی۔ دلیپ سنگھ کی ملاقات دہلی جانے والی سڑک پر اپنے مالک خوشونت سنگھ سے ہوئی اس نے پورا واقعہ سنایا۔ مصنف نے اسے بھی اپنے ساتھ لیا اور دہلی کی طرف بڑھ گئے۔

راستے میں سکھوں کا ایک گروہ ملا جن سے خوشونت سنگھ نے جب پوچھا کہ اس راستے سے دہلی جانا محفوظ ہوگا کہ نہیں، تو ان کا جواب ملاحظہ ہوں:

''میں نے ان سے پوچھا کہ کیا دہلی تک جانا محفوظ رہے گا یا نہیں۔ 'بالکل محفوظ' انہوں نے مجھے یقین دلایا۔ 'ہم نے سڑک کے ساتھ واقع بستیوں سے تمام سوروں کو صاف کر دیا ہے۔' انہوں نے مسلمانوں کے لیے سوروں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس سے میرے معدے میں اینٹھن ہونے لگی۔ یہ جگہ ان سے بحث کرنے کی نہیں تھی۔۔۔''7

مصنف کو باقی شرنارتھیوں کی طرح کیمپوں کی پریشانیوں اور دوسری مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا کیوں کہ دہلی میں ان کے والد کا بڑا مکان تھا۔ پاکستان سے آنے والے شرنارتھی کیمپوں، قدیم عمارتوں، ریلوے پلیٹ فارموں، دکانوں اور دفتروں کے باہر رہنے پر مجبور تھے، اکثریت نے تو فٹ پاتھوں کو ہی اپنا مسکن بنالیا تھا۔ اس وقت رونما ہونے والے المیے نے آزادی کی خوشیوں کو دبا دیا تھا۔ خوشونت سنگھ نے ان واقعات کے ساتھ آزادی کے دن کی عارضی خوشیاں اور بحیثیت وزیر اعظم پنڈت نہرو کی تقریر کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان ہی واقعات کے بیان میں مصنف نے خلاصہ کیا ہے کہ جو قوم آزادی سے پہلے جس قوم کے لیے سب سے زیادہ نفرت کا جذبہ رکھتی تھی، آزادی کے بعد دونوں قومیں یعنی ہندو اور انگریز ایک دوسرے کے تئیں سب سے زیادہ محبت کے قابل غیر ملکی بن گئے تھے۔ مذکورہ خودنوشت میں کافی جذباتی انداز میں ہندوستان کی آزادی اور لال قلعے سے یونین جیک کا جھنڈا اتار کر ترنگا لہرانے کی تقریب کو بیان کیا گیا ہے۔

ہجرت کے بعد کسی بھی شخص کی اپنے ملک اور سرزمین پر واپسی ناممکن تھی، تاہم ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کو یہ امید تھی کہ حالات سنبھلنے کے بعد وہ اپنے گھروں کو دوبارہ ضرور لوٹیں گے۔ ان ہی لوگوں میں خوشونت سنگھ بھی ایک تھے جو چاہ کر بھی اپنے وطن واپس نہیں جا سکے۔ تمام تر پابندیوں اور مشکلات کے باوجود ان کو پاکستان سے خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اعتراف کیا ہے کہ لاہور سے زبردستی نکالے جانے کے باوجود میں جذباتی طور پر پاکستان سے منسلک رہا۔ تنازعے کی جڑ کشمیر جس پر دونوں ملکوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں، کے حوالے سے وہ ہندوستان کے مقابلے پاکستان کے مقدمے و نکات کو زیادہ مضبوط سمجھتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی ریاستوں کے الحاق اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے، خصوصاً حیدرآباد کے پولیس ایکشن کا بیان خودنوشت میں ملتا ہے۔

تقسیم ہند سے ہونے والی قتل و غارت گیری کے بعد ہندوستان میں نفرت کے نام پر جو سب سے بڑا سانحہ ہوا،

جس نے ہر مذہب اور ہر فرقے کو ہلا کر رکھ دیا، وہ تھا 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کا قتل۔ خوشونت سنگھ نے اس سانحے کو بڑے افسوس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس وقت وہ لندن میں قیام پذیر تھے، گاندھی جی کی تعزیت کے لیے انڈیا ہاؤس میں تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس کی تفصیل بھی خودنوشت میں موجود ہے۔ بقیہ لوگوں کی طرح مصنف بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم ایک بڑی غلطی تھی اور اس سے بڑی غلطی یہ کی گئی کہ اسے بہت عجلت میں اور غیر منظّم طریقے سے عمل میں لایا گیا، جس کی وجہ سے لاکھوں معصوم و بے گناہوں کی جانیں چلی گئیں، ہزاروں افراد بے گھر ہوئے، نہ جانے کتنے ایسے تھے جن کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

گئوکشی کے نام پر ہونے والے قتل عام کو بھی مصنف نے مختلف واقعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دو مسلمانوں کی جان بھی بچائی تھی۔ جس کی پوری تفصیل خودنوشت میں ملتی ہے۔ علاوہ ازیں مشرقی و مغربی پاکستان کے تنازعے، وہاں ہونے والے قتل عام اور بنگلہ دیش بننے تک کے واقعات بھی کتاب میں شامل ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں ملکوں کی آپسی چشمک اور جنگوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ پاکستان سے لگاؤ ہونے کے باعث خوشونت سنگھ کو ''ملا'' اور ''پاکستانی ایجنٹ'' کہا جاتا تھا، جس کی انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس سلسلے میں کئی واقعات کتاب میں درج کیے ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاست، اندرا گاندھی کی شخصیت، ان کے ذریعے لگائی گئی ایمرجنسی میں ملک کے حالات، آپریشن بلیو اسٹار کے نام پر گولڈن ٹیمپل پر حملہ اور ہزاروں سکھوں کا قتل عام، سنجے گاندھی کی قابلیت و حادثاتی موت، ان کی بیوی مینکا و اندرا گاندھی کے درمیان تنازعے، راجیو گاندھی و سونیا گاندھی کی شادی، راجیو گاندھی کا اقتدار میں آنا، اندرا گاندھی و راجیو گاندھی کے قتل، ملک کے بدعنوان لیڈروں کی فہرست، پارلیمنٹ میں بحیثیت ممبر اپنی خدمات وغیرہ کی تفصیل بھی خوشونت سنگھ نے پیش کی ہے۔

خودنوشت کا چودھواں باب ''پاکستان'' کے نام سے ہے جس میں مصنف نے پاکستان میں سکھوں کے تئیں نفرت، معاشی حالات، مختلف جرائم، پردے و اسلامی شعائر سے دوری اور دیگر مسائل کو پیش کیا ہے۔ نیز اپنے پاکستانی دورے کو بھی بیان کیا ہے۔

غرض کہ خوشونت سنگھ کی خودنوشت ''سچ، محبت اور ذرا سا کینہ'' ایک بے حد دلچسپ کتاب ہے جس میں مصنف کی حالات زندگی کے علاوہ ہندوستانی سیاست کے ایک اہم دور کا بیان بھی ملتا ہے۔ اس میں کچھ ایسے تلخ حقائق بھی پیش کیے گئے ہیں جو کافی معلوماتی ہیں۔ مصنف کی سچائی اور بے باکی نے کتاب کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ خوشونت سنگھ، سچ، محبت اور ذرا سا کینہ (مترجم محمد احسن بٹ)، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی، 2018، ص: 5
2۔ ایضاً، ص: 10,16
3۔ ایضاً، ص: 40
4۔ ایضاً، ص: 112
5۔ ایضاً، ص: 113
6۔ ایضاً، ص: 118
7۔ ایضاً، ص: 121

☆☆☆☆

ماحصل

ماحصل

ادب اور زندگی کا رشتہ اٹوٹ اور گہرا ہے۔ادب زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں جینے کا ہُنر بھی سکھاتا ہے۔اسی طرح ادب اپنے عہد کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ ہر عہد میں سامنے آنے والی ادبی تخلیقات میں اُس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات نیز تہذیب وتمدن کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ ایک ادیب عام انسانوں کے مقابلے زیادہ حساس ہوتا ہے،اس لیے جس معاشرے میں اور آس پاس کے ماحول میں وہ پروان چڑھتا ہے،شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی تخلیقات میں اس معاشرے کے باریک سے باریک پہلو کا نہ صرف مشاہدہ کرتا ہے بلکہ اسے اپنی فہم وفراست کی بنیاد پر تحریر کرنے کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو بھی واضح اور پیش کرتا ہے۔جن حالات وواقعات کو ایک عادم آدمی دیکھنے کے بعد یوں ہی بھول بیٹھتا ہے وہاں ایک ادیب اپنے فن کو بروئے کار لاکر انہیں لفظوں کا ایک ایسا جامہ پہناتا ہے کہ وہ حیاتِ ابدی کا روپ اختیار کر جاتے ہیں۔

ادبی اصناف میں سب سے دلچسپ، پرکشش اور پراثر کوئی صنف ہے تو وہ محض ایک اچھے تخلیق کار اور ادباء کے قلم سے تحریر کردہ 'خودنوشت' ہے۔جس میں مصنف سماجی وتہذیبی قدروں کی پرواہ کیے بغیر اپنی زندگی کے شب وروز کی داستان حقائق کے ساتھ پیش کرنے کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔ جو خودنوشت ہر طرح کی بناوٹ، تصنع، علامتوں، استعاروں سے مبرا ہو اور جس میں زبان وبیان کی چاشنی وندرت، سادہ وسلیس عبارت، واقعات ومناظر کی دلکش تصویر کشی، خوشیوں اور فرصت وانبساط کا بیان، خامیوں وکوتاہیوں کا برملا اظہار کیا گیا ہو وہی خودنوشت اچھی اور بہترین کہی جاسکتی ہے۔اسی وجہ سے ایک کامیاب خودنوشت سماج ومعاشرے کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے ہمارے سامنے آتی ہے۔

اردو کے غیر افسانوی ادب میں خودنوشت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔خودنوشت ایک ایسی صنف ہے جس میں موضوع، اسلوب یا کتاب کی ضخامت کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ یہ نظم ونثر دونوں میں تحریر کی جاسکتی ہے اور اس کی مثال بھی اردو میں مل ہی جاتی ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ خودنوشت کو نثر میں ہی لکھنا زیادہ بہتر ہے کیوں کہ نثر میں اپنی بات کو مفصل انداز میں پیش کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ ایسا میدان ہے جس میں اپنی بات بے لاگ کہی جاسکتی ہے۔ جب کہ نظم کی اپنی بندشیں ہوتی ہیں اور اس کے اپنے اصول وضوابط ہوتے ہیں۔

خودنوشت میں اُن ہی حالات وواقعات کو ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے جو مصنف کی ذات سے گہری وابستگی رکھتے

ہوئے ان کی ساخت و پرداخت میں کارفرما رہے ہوں۔ اس میں سچائی، شخصیت اور فن کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مصنف بہترین زبان و بیان کے استعمال کے ساتھ اپنی ادبی صلاحیتوں کے جوہر بکھیرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت لکھنا بھی ہر کس و ناقص کے بس کی بات نہیں ہے اس کے لیے مصنف میں تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ اپنے گزرے ہوئے حالات و واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کا حوصلہ وسلیقہ بھی ہونا چاہیے۔

تقسیم ہند، ہندوستان کی تاریخ کا ایک الم ناک سانحہ ہے۔ سیاسی و معاشی سطح پر اس کے دوررس نتائج اب بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم کیوں ہوئی اور کیا جو کچھ بھی ہوا وہ ناگزیر تھا؟ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور سارے حقائق و راز دنیا کے سامنے بھی آ گئے ہیں، اُس وقت جو کچھ بھی ہوا وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب بن چکا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بہت کچھ جھیلا اور آج بھی ہم جھیل رہے ہیں۔ دوقومی نظریے کی بنیاد پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظریہ اچانک کہاں سے آیا؟ ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی ہوا وہ اچانک تو نہیں ہوا۔ دراصل دوقومی نظریے کا بیج بھی یہیں کی مٹی کی نمی میں پل رہا تھا اور جیسے ہی حالات نے کروٹ بدلے اس میں کونپلیں پھوٹنے لگیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد سے لے کر مسلمانوں کی صدیوں پر محیط حکومت کے دوران مسلمانوں و ہندوؤں کے درمیان بھائی چارہ ہمیشہ برقرار رہا۔ بلکہ اس سے پہلے بھی ہر مذہب کے لوگ بغیر کسی بھید بھاؤ کے ہنسی خوشی رہتے تھے۔ دوقومیں ضرور آباد تھیں لیکن دوقومی نظریہ نہیں تھا۔ اس لیے ہر قوم آپس میں نہ صرف مل جل کر رہتی تھیں بلکہ ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے۔ برصغیر میں اتحاد و اتفاق اور تہذیب و تمدن کی مثالیں اتنی واضح، روشن اور زندہ ہیں کہ وہ جدید ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہری باب بن گئی ہیں۔

ہندوستان میں ایک ایسا دور بھی آیا جب یہاں کی نااتفاقیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باہری طاقتیں غالب ہونے لگیں۔ ان ہی میں انگریزوں نے بھی اس ملک پر بغرض تجارت اپنے قدم رکھے۔ انہوں نے اپنی پالیسیوں کو بروئے کار لا کر نہ صرف اس ملک کے زرخیز وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا بلکہ یہاں کے باشندوں کو بھی مذہب و ذات پات کی بنیاد پر بانٹنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ تمام کرۂ عرض پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد ملک کو غلام بناتے ہوئے یہاں کی عوام پر بے جا ظلم بھی ڈھائے جس کی اپنی الگ داستان ہے۔

انگریزوں کے مظالم سے عاجز آ کر ان کے خلاف آزادی کے جانبازوں نے بغاوتوں اور تحریکوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ اس جدوجہد میں کبھی کامیاب ہوئے تو کبھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ بے شمار جانیں تلف ہوئیں،

نہ جانے کتنے مجروح ہوئے، ملک کا اثاثہ درہم برہم ہو گیا، تہذیب وتمدن جو اس ملک کا خاصہ تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ ان تباہیوں کے علاوہ سب سے بڑھ کر ہندو مسلم، جو ایک عرصے سے آپس میں مل جل کر رہتے آئے تھے، ان کو آپس میں لڑا کر ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا۔ دونوں قوموں کے درمیان نفرت کو بڑھاوا دینے میں مقامی شر پسندوں کا بھی ہاتھ ہے۔ بہر کیف جب طویل جدوجہد کے بعد انگریزوں نے اس ملک کو آزاد کر کے خیر باد کہا تو ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنے منصوبے کو بھی یقینی بنایا۔ جس سے نہ صرف ایک آزاد ملک کا شیرازہ بکھر گیا بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کے لیے آزادی کا آفتاب جان لیوا ثابت ہوا۔

ملک کو بانٹنے میں محض انگریزوں کا رول نہیں رہا بلکہ یہاں کے سیاست دانوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مسلم لیگ و کانگریس کے آپسی تصادم اور دونوں پارٹیوں کے چند لیڈروں کے تعصّبانہ رویوں نے ملک کو داؤ پر لگا دیا۔ تقسیم کے عمل اور سرحدوں کے تعین میں جس بدعقلی و بدعملی اور جلد بازی کا ثبوت دیا گیا اس سے واضح ہو گیا کہ قومی امتیاز پر قومی تفاخر کا جذبہ غالب آ چکا تھا۔ جس کا نتیجہ مختلف فسادات کی صورت میں نکلا۔ آزادی کا جشن دوسرے دن ہی مدھم پڑ گیا جب سرحد کے دونوں جانب سے قتل و غارت گری کی دلسوز خبریں آنے لگیں۔ مذہبی تعصب کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کو مارنے لگے، جسے دیکھ کر انسانیت کا بھی سر شرم سے جھک گیا۔

تقسیم ہند کے ہندو پاک کی زندگی پر براہ راست اور بالواسطہ طور پر اس کے متنوع اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ایک نئے ملک کا قیام عمل میں آیا، فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور لاکھوں افراد نے ترکِ وطن کیا۔ تقسیم کے بعد کے واقعات کے نتیجے میں برصغیر ہندو پاک جغرافیائی، سیاسی، تہذیبی، نفسیاتی، مذہبی، لسانی اور علاقائی اعتبار سے متاثر ہوا۔ انفرادی اور اجتماعی رشتوں کے نئے پہلو ظاہر ہوئے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت نے دیرپا جسمانی، ذہنی، سیاسی زخم دیے۔ اس سانحے سے شعراء، ادباء اور فن کار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ لہٰذا کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی زندگی اور فن پر تقسیم ہند کے اثرات کا اعتراف کیا ہے۔

ہمارا ادب بھی تقسیم سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ چناں چہ ادب کی تمام اصناف میں تقسیم ہند اور اس کے اثرات کا ذکر مل جاتا ہے۔ ہندو پاک میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے اس موضوع پر نظم و نثر کی صورت میں اپنی تخلیقات کو پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہونے والی بربرتا کو ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں بڑے دلسوز انداز میں بیان کیا ہے۔

خودنوشت بھی تخلیقی ادب کی ایک صنف ہے۔ لہٰذا اس پر بھی فطری طور پر تقسیم ہند کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

چوں کہ خودنوشت میں اپنی ذات کا بیان ہوتا ہے اس لیے مصنف کی زندگی کے ساتھ ساتھ سیاسی وسماجی حالات کا ذکر آنا لازمی ہے۔ اردو میں بے شمار خودنوشتیں منظرِ عام پر آئیں لیکن 1947 اور اس کے بعد جو خودنوشتیں شائع ہوئیں ان میں تقسیم ہند کے واقعات و حالات اپنے آپ ہی سرایت کر گئے ہیں۔ ان میں کہیں ضمنی طور پر تو کہیں تفصیل سے اس موضوع پر مصنفین نے اظہار خیال کیا ہے۔ مختلف ادیبوں، سیاست دانوں اور مشہور شخصیتوں نے اپنی خودنوشتوں میں تقسیم ہند کے موضوع پر گفتگو کی ہے اور اس وقت کے حالات و واقعات کی منظر کشی کی ہے۔ ایسی خودنوشتوں کی فہرست لمبی ہے۔

جن لوگوں نے ہجرت کا کرب جھیلا، فسادات کا بذات خود مشاہدہ کیا، بلوائیوں کے ہاتھوں لوٹے گئے یا پھر تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان لوگوں نے اس وقت کے حالات و واقعات کا بیان بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔ ان خودنوشت نگاروں میں آدا جعفری، اختر حسین رائے پوری، گوپال متل، رتن سنگھ، جتیندر بلو، جوشؔ ملیح آبادی، انیس قدوائی، اطہر صدیقی، دیوان سنگھ مفتوں، حبیب تنویر، ہوشؔ بلگرامی، قاضی جلیل عباسی، قدرت اللہ شہاب، ساجدہ زیدی، عبدالمجید سالک، شان الحق حقی، شکیل الرحمٰن، عبدالطیف بجنوری، نواب احمد خاں چھتاری، کرنل غلام سرور، مہندر سنگھ بیدی، کشور ناہید، انتظار حسین، رشید امجد، ظفر حسن ایبک، عبدالماجد دریابادی، اختر الایمان، آغا جانی کاشمیری، حمیدہ سالم، خلیق ابراہیم خلیق، ملک زادہ منظور، ندا فاضلی وغیرہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی خودنوشتوں میں تقسیم ہند کے محرکات، سانحات اور اثرات پر کھل کر لکھا ہے۔ کسی نے تفصیل سے تو کسی نے اختصار سے کام لیا ہے۔

علاوہ ازیں جن خودنوشتوں کا دوسری زبانوں مثلاً انگریزی، ہندی، پنجابی، گجراتی وغیرہ سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے ان میں بھی مصنفین نے تحریک آزادی اور تقسیم ہند کے بعد کے واقعات کی منظر کشی کی ہے۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، راجندر سنگھ بیدی، خوشونت سنگھ، امرتا پریتم، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو وغیرہ نے اپنی خودنوشتوں میں تمام حالات و واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

راقمہ نے ترجمہ شدہ خودنوشتوں میں بیشتر ان مشاہیروں کے قلم سے تحریر کردہ تصانیف کو اولیت دی ہے جنھوں نے ہندوستان کی عملی سیاست میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ آزادی کی جدوجہد میں اپنی بے لوث خدمات بھی انجام دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی سیاست اور اس وقت کے حالات و واقعات کے متعلق بعض اہم حقائق پر روشنی ڈالنا ناگزیر تھا۔ اگرچہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی خودنوشتیں آزادی سے قبل شائع ہوئی ہیں اس لیے ان کی خودنوشتوں کو مقالے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن برصغیر کی تاریخ کے اہم دور یعنی انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر بیسویں صدی کی تیسری

دہائی تک کے سیاسی کارناموں اور انگریزوں کے خلاف ہونے والی بغاوتوں وتحریکوں کا ذکر گاندھی جی (تلاش حق) و پنڈت جواہر لعل نہرو (میری کہانی) کی خودنوشتوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔

اردو خودنوشت لکھنے کا باقاعدہ آغاز انگریزوں کے مظالم کی داستان قلم بند کرنے سے ہی ہوا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے خودنوشت کے دھندلے دھندلے نقوش ضرور ملتے ہیں لیکن انہیں خودنوشت کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی شکست کے بعد انگریزوں کے غم وغصے کی پوری گاج ملکی باشندوں پر گری۔ بے شمار لوگ قید کیے گئے، ہزاروں کو پھانسی دی گئی، سیکڑوں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ان ہی آزادی کے مجاہدوں میں ایک نام مولانا جعفر تھانیسری کا آتا ہے۔ انہیں بھی کالے پانی کی سزا دی گئی تھی۔ انہوں نے جنگ آزادی سے متعلق واقعات اور اپنے قید و بند کی صعوبتوں کو بلا جھجھک بیان کیا ہے۔ جب کہ اس وقت انگریزوں کے خلاف لکھنا کیا، بولنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن مولانا جعفر تھانیسری نے بے خوف ہو کر اپنی خودنوشت ''کالا پانی'' میں جنگ آزادی کے واقعات اور انگریزوں کے مظالم کا برملا اظہار کیا ہے۔ یہ خودنوشت وہاج الدین علوی کے مطابق 1302ھ (1884) میں منظر عام پر آئی۔

جعفر تھانیسری کی ہی خودنوشت کو اردو کی اولین خودنوشت قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اب تک بے شمار خودنوشتیں منظر عام پر آئیں۔ جن میں انگریزوں کی آمد، ان کی پالیسیاں وچالاکیاں، ان کے ظلم وستم، آزادی کی جدوجہد، مختلف بغاوتوں وتحریکوں وغیرہ کا ذکر خودنوشت نگاروں نے کیا ہے۔ جن کا ان کی شخصیت پر بھی نمایاں اثر دکھائی دیتا ہے۔ برطانوی راج میں خودنوشت کا آغاز ہوا تھا چناں چہ اس عہد کے حالات کا ذکر مصنفین نہ کریں یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی ایک ادیب کافی حساس ہوتا ہے، سماج میں ہورہی تبدیلیوں اور حالات وواقعات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اسے اپنی تخلیقات میں پیش کر کے سماج کے سامنے لاتا ہے۔ ان چیزوں کو پیش کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں مثلاً ناولوں اور افسانوں میں کہانی کا روپ دے کر ادیبوں نے تقسیم ہند کا خاکہ پیش کیا ہے لیکن جب ایک مصنف خودنوشت لکھتا ہے تو اپنی روداد زندگی کے ساتھ ان حقیقی حالات وواقعات کا بیان بھی کرتا ہے جو اس کے ارد گرد رونما ہوئے ہیں، جن کا اثر اس کی شخصیت پر ہوا ہو۔

آزادی سے پہلے کی خودنوشتوں میں بھی جدوجہد آزادی اور انگریزوں کے مظالم کا تذکرہ مل جاتا ہے، لیکن یہ سچ ہے کہ ایسی خودنوشتوں کی تعداد بہت کم ہیں۔ ماقبل آزادی کی خودنوشتوں کا بنیادی موضوع ادبی وسماجی ہی ہے، سیاست پر بات کرنے میں خودنوشت نگاروں نے کافی پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ جو میں سمجھتی

ہوں تب انگریزوں کا راج تھا جس میں ان کے خلاف لکھنا اپنی ہی شامت بلانے جیسے تھا۔شاید اسی وجہ سے اُس وقت کے خودنوشت نگاروں نے اپنی آپ بیتی میں خود کی ذات، اپنے اردگرد ماحول اور اپنے ادبی و علمی کارناموں کو پیش کرنا ہی مناسب سمجھا۔لیکن جب ہندوستان آزاد ہوا تو ایک آزاد ملک میں ماضی میں ہوئے ظلم و ستم اور اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لیے ایک مصنف بھی آزاد ہو گیا اسی لیے آزادی کے بعد کی خودنوشتوں میں بیشتر کا موضوع سیاسی ہے۔ بہرحال ماقبل آزادی کی خودنوشتوں میں 1857 کے واقعات اور حالات کا بیان کالا پانی (جعفر تھانیسری) اور داستان غدر (ظہیر دہلوی) کی خودنوشت میں موجود ہے۔اس کے علاوہ سرسید رضا علی کی خودنوشت ''اعمال نامہ'' میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا تذکرہ سرسری طور پر ملتا ہے خصوصاً انہوں نے 1942 کی بھارت چھوڑو تحریک کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح مولانا حسرت موہانی نے ''قید فرہنگ'' میں سیاسیات ہند پر سرسری بیان کرتے ہوئے اپنے قید و بند کی روداد کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ چودھری افضل حق کی خودنوشت ''میرا افسانہ'' کا شمار اس دور کی سیاسی خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔جس میں ایک محبّ وطن کی قربانیوں اور انگریزوں کے مظالم کا بیان تفصیل سے ملتا ہے۔

آزادی کے بعد کم و بیش جتنی بھی خودنوشتیں منظر عام پر آئیں ان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے رخصت ہونے تک کے تمام واقعات خصوصاً ان حالات کا ذکر ضرور ملتا ہے جن کی بنیاد پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔ دراصل ملک کی تقسیم ایک عظیم سانحہ تھا۔اس وقت جس بربریت اور بداخلاقی کا مظاہرہ کیا گیا اس نے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ایسے حالات میں ایک ادیب کیسے خاموش رہ سکتا تھا؟ جب بات خودنوشت کی آتی ہے تو صداقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تمام واقعات و سانحات کو خودنوشت نگاروں نے من و عن پیش کر دیا ہے۔جس کی وجہ سے ایسی خودنوشتوں کی تاریخی لحاظ سے اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

انگریزوں کی غلامی اور ان کی حکومت کا دم بھرنے والے ہندوستانیوں خصوصاً راجاؤں، نوابوں اور زمینداروں کی پول دیوان سنگھ نے اپنی خودنوشت ''ناقابل فراموش'' میں کھولی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے مختلف شواہد بھی پیش کیے ہیں۔علاوہ ازیں بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں ہونے والی تحریکوں مثلاً عدم تعاون و خلافت تحریک کا تذکرہ بیشتر خودنوشت نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ یہ تاریخ ہند کا وہی دور تھا جب 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہندو ہو یا مسلمان ہر فرقے کے لوگ بغیر کسی تفریق کے ایک پلیٹ فارم پر انگریزوں کے خلاف جمع ہو گئے تھے۔اس وقت یہ اتحاد دیکھ کر انگریز بھی خوفزدہ ہو گئے تھے۔اسی اتحاد کو خودنوشتوں میں پیش کیا گیا ہے لیکن ان تحریکوں کا زور ختم ہونے کے بعد ہی دونوں قومیں ایک دوسرے کی سخت حریف بن کر سامنے آئیں۔اس وقت جو خلیج

دونوں کے درمیان قائم ہوئی وہ آج تک ختم نہ ہوسکی۔ اس سلسلے میں شر پسند لوگوں اور متعصب لیڈروں نے نمایاں کردار ادا کیا اور افسوس ہے کہ آج بھی ہندو مسلم دشمنی کو بڑھاوا دینے میں اس ذہنیت کے حامل افراد اپنا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

حالاں کہ کچھ روشن فکر لوگ بغیر کسی ذات پات کے ملک کی آزادی کے لیے ایک ساتھ کام کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے اور آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مذہبی تفریق سے اٹھ کر ملک کی ترقی کے لیے ایک ساتھ کام کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن سماج کے انتہا پسند گروپ جو ہمیشہ سے انتشار پھیلانے کے درپے ہوتے ہیں ان کا تذکرہ خودنوشتوں میں غیر ارادی طور پر آ گیا ہے کیوں کہ 1947 یا اس سے پہلے کی جو بھی خودنوشتیں منظر عام پر آئیں ان میں انتشار پر مبنی حرکتوں کا ذکر آنا لازمی تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے حالات نے جو کروٹ بدلی اور جیسے ملک میں ہیجانی صورتحال پیدا ہوئی اس پر کچھ لکھنے سے ایک ادیب اپنے قلم کو کیسے روک سکتا تھا اور وہ بھی وہ ادیب جو اپنی ذات کے حوالے سے سماج و معاشرے اور سیاسی حالات پر گفتگو کر رہا ہو۔

1919 میں انگریزوں نے رولٹ بل پاس کیا جس کی شدید مخالفت کی گئی۔ اسی مخالفت میں گاندھی جی نے عدم تشدد کی بنیاد پر ملک گیر ہڑتال کی مانگ کی۔ لیکن پنجاب، دہلی وغیرہ کے علاقوں میں بلوے شروع ہو گئے، جنرل سر مائیکل فرانسس اوڈوائر نے پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ اس دوران انگریزوں نے پنجابی عوام پر ظلم ڈھانے کی انتہا کر دی۔ علاوہ ازیں اسی سال جلیاں والا باغ سانحہ بھی پیش آیا ان تمام واقعات کا ذکر دیوان سنگھ اور عبدالمجید سالک نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دیگر خودنوشتوں میں بھی اس حوالے سے تذکرہ مل جاتا ہے۔

ان ہی ادوار میں مختلف تنظیموں و گروہوں کے زیر سایہ ملک کے کونے کونے خصوصاً شمالی ہندوستان میں فرقہ پرستی نے جنم لینا شروع کیا۔ اس کو بڑھاوا دینے میں اس وقت کے سیاست دانوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اردو خودنوشتوں میں مختلف شواہد کے ذریعہ فتنہ پرور لوگوں کا تذکرہ موجود ہے۔ خودنوشت نگاروں کے خیال میں سماج کے ان ہی فتنہ پرور لوگوں کے پروپیگنڈے نے ملک کا بٹوارا کروایا۔ آزادی سے پہلے یا اس کے بعد جتنے بھی ملک میں بلوے ہوئے ان میں یہی لوگ پیش پیش رہے ہیں۔ دیوان سنگھ لکھتے ہیں ''جتنی بھی لوٹ مار کی وارداتیں ہوئیں اس میں ادنیٰ قسم کے لوگ ہی سب سے آگے تھے۔ بقیہ دہلی کی بابو کلاس جن کی شہ پر بلوے کرائے جاتے تھے۔''

مسلموں اور غیر مسلموں میں نفرت پھیلانے میں شدھی و سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم نے جو کردار ادا کیا اس کی تفصیل بھی خودنوشت نگاروں نے دی ہے۔ علاوہ ازیں ہندو جماعتیں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ، ہندو مہاسبھا وغیرہ کے ذریعے

منافرت پھیلانے والے لوگوں کا تذکرہ بھی اشاروں، کنایوں میں کیا گیا ہے۔اسی طرح ہندوستان میں لسانی قضیے نے اتنا طول پکڑا کہ اردو مسلمان ہوگئی اور ہندی ہندو۔اس سلسلے میں جس طرح سے اردو کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کیا گیا اس کا ذکر آل احمد سرور، ساجدہ زیدی، جوشؔ، اختر حسین رائے پوری، خلیق ابراہیم خلیق، عبدالماجد دریابادی وغیرہ کی خودنوشتوں میں ملتا ہے۔

اداؔ جعفری، اختر حسین رائے پوری، قدرت اللہ شہاب، جوشؔ، انتظار حسین، گوپال متل، جتیندر بلو، رتن سنگھ، شان الحق، جگن ناتھ آزاد، رشید امجد، امرتا پریتم، خوشونت سنگھ، مہندر سنگھ وغیرہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہجرت کا کرب جھیلا تھا۔ہجرت کا کرب، شرنارتھیوں ومہاجروں کی پریشانیوں، کیمپوں کی بدحالیوں کے بیان کے ساتھ اس وقت ہونے والے فسادات اور سرحد کے دونوں پار رونما ہونے والے انسانیت سوز کارناموں کا ذکر ان کی خودنوشتوں میں ملتا ہے۔ ساتھ ہی شمالی ہندوستان اور دہلی میں جو تباہی برپا ہوئی اس کا آنکھوں دیکھا حال بیشتر خودنوشت نگاروں نے کیا ہے۔

مولانا آزاد، راجندر پرساد، پنڈت نہرو، گاندھی جی، عبدالطیف بجنوری، قاضی جلیل عباسی، ہوشؔ بلگرامی، ظفر حسن ایبک، کرنل غلام سرور، نواب احمد خاں چھتاری وغیرہ نے جدوجہد آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا تھا، ان میں بیشتر کا تعلق سیاست سے بھی تھا۔چناں چہ ان کی خودنوشتوں میں تحریک آزادی سے متعلق کم وبیش تمام واقعات اور ان کی ذات کے حوالے سے اس عہد کے سیاسی احوال کا ذکر ملتا ہے۔ان لوگوں میں سے کچھ نے جدوجہد آزادی میں چلائی گئی کچھ تحریکوں و بغاوتوں کی ناکامی اور کانگریس و مسلم لیگ کے درمیان رسہ کشی کی وجوہات کو بھی پیش کیا ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو ان کی خودنوشت سیاسی نوعیت کی ہیں، جو تاریخی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔

ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے 1946 کا سال کافی ہنگامہ خیز تھا۔کیبنٹ مشن کی ناکامی کے بعد مسلم لیگ نے مطالبہ پاکستان کے حق میں 'راست اقدام' کا اعلان کیا اور 16 اگست 1946 کو ملک گیر مظاہرے کی گزارش کی۔ حالاں کہ مسٹر جناح نے پرامن مظاہرے کی مانگ کی تھی لیکن غیر مسلم راست اقدام کا نام سنتے ہی غم وغصے سے بھر اٹھے۔ یوم راست جسے ڈائریکٹ ایکشن ڈے کا نام دیا گیا تھا، یہ دن پورے ملک میں امن وامان سے تو گزر گیا لیکن کلکتہ میں بھیانک فساد پھوٹ پڑا جس نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا۔ بہار، یوپی، نواکھلی، پنجاب، ممبئی، دہلی وغیرہ میں فساد نے جو تباہی مچائی اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ یہ ہندوؤں یا مسلمان دونوں کے لیے یکساں شرمندگی کی بات تھی کیوں کہ اس میں لاکھوں بے گناہ مظلوم مارے گئے تھے۔ یہ فسادات اور مارکاٹ ملک کی آزادی تک جاری رہی بلکہ آج بھی مختلف صورتوں میں جاری وساری ہے۔

1946 کے فسادات کا نقشہ بیشتر خودنوشت نگاروں نے کھینچا ہے کیوں کہ اس کے بعد ہی تقسیم ہند پر مہر لگ گئی تھی۔ ان میں سے کچھ مصنفین نے ملک کے بٹوارے کا سب سے بڑا ذمہ دار ہندو مسلم فساد کو ہی قرار دیا ہے۔ بہر کیف کلکتہ میں ہونے والے فساد کے ذمہ دار کم وبیش تمام خودنوشت نگاروں نے ہندو مسلم دشمنی کے پیش نظر غیر مسلموں کو بتایا ہے لیکن مولانا آزاد نے اشاروں کنایوں میں اور راجندر پرساد نے برجستہ طور پر مسلم لیگ کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ کلکتہ فساد کی تفصیلات سب سے زیادہ شان الحق اور مولانا آزاد کی خودنوشتوں میں ملتی ہے۔ اسی طرح بہار و دوسرے علاقوں کی تفصیل شکیل الرحمٰن، اختر حسین رائے پوری، قدرت اللہ شہاب وغیرہ نے اپنی خودنوشتوں میں پیش کی ہے۔ اس سلسلے میں کلیم عاجز کی خودنوشت سرفہرست ہے جس میں بہار میں ہونے والے قتل عام کو بڑے دلسوز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی فساد میں کلیم عاجز کے پورے خاندان والے مارے گئے تھے۔ ان کا درد نہ صرف خودنوشت میں بلکہ دیگر تخلیقات میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

آج ان فسادات کے متعلق تمام حقائق کو سامنے لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ اکثر سہی واقعات اور حقائق کو چھپائے گئے تو کچھ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے۔ بہر حال ان فسادات کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو لیکن دونوں قوموں کے تعصب اور شر پسند لوگوں کی وجہ سے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں مزید دوریاں پیدا ہوئیں بلکہ ان کی سازشوں نے ملک میں بھیانک فساد برپا کروا کر ملک کو داؤ پر لگا دیا۔

1946 میں ہی ممبئی کے بحریہ سپاہیوں کی بغاوت نے بھی انگریزوں کی کمر توڑ دی تھی۔ دراصل انگریزوں کے رویوں اور خراب کھانوں کی شکایتوں کو لے کر بحری جوانوں نے ممبئی میں ہڑتال شروع کر دی تھی جو بغاوت کا روپ دھار کر پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس حوالے سے ہوش بلگرامی، راجندر پرساد، رفعت سروش خصوصاً حبیب تنویر نے اپنی خودنوشت میں کافی تفصیل کے ساتھ تمام واقعات کا جائزہ لیا ہے، جس سے ہمیں اس بغاوت سے متعلق پوری معلومات حاصل ہوتی ہے۔

ان خودنوشت نگاروں میں سبھی کے یہاں 1946 تا 1948 یعنی گاندھی جی کے قتل تک کے حالات خصوصاً 1946 میں ہونے والے ملک گیر فسادات، اس کی وجوہات کا ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں کانگریس و مسلم لیگ کے سیاسی رہنماؤں کی تعصب پسندی، ہندو مہاسبھا و راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی پالیسیوں، آزادی کے بعد ہونے والی بربرتا، کیمپوں میں پناہ گزینوں کی پریشانیوں، تقسیم کے بعد پورے ملک خصوصاً شمالی ہندوستان اور دہلی کی تباہیوں، مذہب کے نام پر دونوں قوموں میں بڑھتی دوریوں، آزادی کے بعد مسلمانان ہند کی مشکلات، پاکستان کے سیاسی احوال، گاندھی جی

کے قتل وغیرہ کا تذکرہ کسی نے تفصیل سے تو کسی نے مختصر انداز میں پیش کیا ہے۔ کسی نے محض ایک واقعے کو بنیاد بنا کر اس وقت کے حالات کا خاکہ کھینچا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد منظر عام پر آنے والی خودنوشتوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اکثریت ان ہی کی ہے جن کا موضوع نہ چاہتے ہوئے بھی سیاسی ہو گیا ہے۔ خودنوشت نگاروں نے اپنے شب و روز کی داستان، خاندانی پس منظر، ادبی، علمی، سماجی، ہم عصروں کے سلسلے میں بیان کرتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا وہ اپنے قلم کو اس وقت کی سیاست اور حالات سے بچا لیتے۔ چناں چہ جب ایسے ہی ادیبوں نے اپنی خودنوشت لکھنے کا ارادہ کیا تو تقسیم ہند کے محرکات و سانحات اور بعد کے حالات کا جائزہ بھی لینے سے گریز نہیں کر سکا اور بلا جھجک تمام حالات کے بیان کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو بھی واضح کر دیا ہے۔ دراصل اس وقت ایک عام آدمی کے ساتھ ادیبوں کی نفسیات کے علاوہ شخصیت پر بھی ان حالات کا گہرا اثر ہوا تھا۔ بیشتر خودنوشت نگاروں کی نشو نما ان ہی حالات میں ہوئی تھی۔

پاکستان جانے والے یا وہاں کے اکثر ادیبوں نے تقسیم ہند کے عمل کو درست بتایا ہے۔ ان کے نزدیک تمام مسائل کا واحد حل تقسیم ہند میں ہی مضمر تھا۔ لیکن ہندوستانی ادیبوں نے نہ صرف پرزور مخالفت کی ہے بلکہ تقسیم ہند کے دوررس نتائج کو واضح بھی کیا ہے، جن خدشات کا انہوں نے اظہار کیا ہے اس سے آج تک ہم جھیل رہے ہیں۔ انہوں نے مسلم لیگ اور ان کی پالیسیوں کو ملک و قوم کے لیے خطرناک بتایا ہے، اس ضمن میں کچھ خودنوشت نگاروں نے ثبوت پیش کرنے کے ساتھ اپنے خدشات کو بھی ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کا یہ کہنا کہ تقسیم ہند سارے مسائل کا حل ہے اس پر ہندوستانی خودنوشت نگاروں نے طنز بھی کیا ہے کہ اب تک مسئلے حل نہیں ہوئے ہیں بلکہ نئے مسائل نے جنم لیا ہے۔ دونوں ملک تو ایک دوسرے کے سخت دشمن بن کر سامنے آئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت غیر یقینی ہو گئی، فسادات بھی رکنے کا نام نہیں لے رہے بلکہ آزادی کے بعد بھی نہ جانے کتنی بار بلوے ہوئے۔

لیکن پاکستان سے ہندوستان آنے والے خودنوشت نگاروں جن میں رتن سنگھ، گوپال متل، جگن ناتھ آزاد، مہندر سنگھ بیدی، جتندر بلو وغیرہ شامل ہیں، نے تقسیم ہند کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط، اس سلسلے میں واضح طور پر اپنے نقطۂ نظر کو پیش نہیں کیا ہے تاہم ان میں کچھ نے یہ اشارہ ضرور کیا ہے کہ تقسیم جن حالات اور بے سروسامانی میں ہوئی وہ غلط تھی، اگر منظّم ڈھنگ سے ہوئی ہوتی تو شاید اتنی تباہیاں دیکھنے کو نہ ملتیں۔ اسی طرح ہندوستانی ہوں یا پاکستانی دونوں جگہ کے خودنوشت نگاروں کے یہاں حقائق کے لحاظ سے کسی واقعے یا سانحے کو دیکھا جائے تو ان میں تضاد بھی موجود ہے۔ حالاں کہ واقعات وہی ہیں جو اس وقت وقوع پذیر ہوئے تھے بس ان کے نقطہ نظر یا اظہار خیال میں تفریقات دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس

کی نشاندہی مقالے میں خودنوشتوں کے تجزیے کے دوران کی گئی ہے۔

تقسیم کے بعد مغویہ عورتوں ولڑکیوں کی دردبھری داستان انیس قدوائی، آداجعفری، کشورناہید وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح فسادات کے دوران عورتوں پر ظلم وستم اور عصمت ریزی کے واقعات کو آداجعفری، دیوان سنگھ، شکیل الرحمٰن، شان الحق، وزیرآغا، امرتا پریتم، قدرت اللہ شہاب، ساجدہ زیدی، کلیم عاجز وغیرہ نے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد سرحدوں کے تعین اور ریاستوں کے الحاق میں جس طرح بدعملی اور زبردستی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس کے نتائج کافی خطرناک نکلے۔ ہوش بلگرامی، اختر حسین رائے پوری، قدرت اللہ شہاب، ساجدہ زیدی، جلیل عباسی وغیرہ نے اس موضوع پر بھی اپنی خودنوشت میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت ہند کی پالیسیوں اور تعصّبانہ رویے پر ساجدہ زیدی اور قدرت اللہ شہاب نے بے باک انداز میں اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح سرکاری فائلوں، کتابوں، سامانوں اور فوجیوں کی تقسیم کا ذکر بھی خودنوشتوں میں موجود ہے۔ خصوصاً مولانا آزاد، راجندر پرساد، اختر حسین رائے پوری، قدرت اللہ شہاب وغیرہ نے اس سلسلے میں تفصیل کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے۔

تقسیم کے بعد خاص طور پر جموں وکشمیر اور حیدرآباد ریاستوں کو ہندوستان کے ساتھ ملانے اور اس سلسلے میں کی گئی بربرتا کو ہوش بلگرامی، ساجدہ زیدی، قدرت اللہ شہاب وغیرہ نے اپنی خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ ہوش نے حیدرآباد میں ہوئے پولیس ایکشن اور نظام کی تباہی میں لائق علی اور ان کے ساتھیوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں پر ہورہے ظلم وستم پر پوری دنیا خاص طور پر مسلم ممالک کی خاموشی پر سخت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ملک کی آزادی محض کانگریس اور اس کے رفقا کی کوششوں کی بدولت نہیں ملی بلکہ بے شمار مجاہدوں کی قربانیوں، بغاوتوں نے قبل از وقت ہمیں آزادی نصیب کردی۔ ملک کے بگڑتے حالات اور کانگریس ومسلم لیگ کے آپسی تنازعے نے آزادی کو آسان بنایا۔ ان ہی وجوہات کی بنیاد پر وائسرائے ہند لارڈ ویول نے برطانوی وزیراعظم ایٹلی سے درخواست کی تھی کہ ہندوستان کو جلد از جلد آزاد کرکے اقتدار ہندوستانیوں کو سونپ دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کو 30 جون 1948 سے قبل آزاد کردیا جائے گا ساتھ ہی ماؤنٹ بیٹن کو نیا وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا تاکہ وہ ملک کے مسائل کو حل کرکے آزادی کی کارروائیوں کو پورا کرسکیں۔ لیکن حالات نے ایسی کروٹ لی کہ معینہ وقت سے پہلے ہی ہندوستان کے دوٹکڑے کرکے آزاد کردیا گیا۔ اس حوالے سے بھی خودنوشت نگاروں نے اہم

واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

لکھنؤ اپنی پرانی قدروں، تہذیب وتمدن اور محبت واخوت کو روا رکھنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مکدور بھرے ماحول میں لکھنؤ والوں نے امن شانتی کی فضا بنائے رکھنے اور بھائی چارہ کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا جو کہ قابل تعریف ہے۔ جب پورا ملک نفرت کی آگ میں جل رہا تھا، لوٹ مار اور کشت وخون نے لوگوں کے حواس باختہ کر رکھے تھے تب لکھنؤ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر شہر کو لوٹ، قتل وغارت گیری سے بچانے کے لیے مختلف تنظیمیں قائم کی تھیں جس نے وہاں پر امن وامان قائم کرنے کے لیے جی توڑ محنت کر کے ہندو مسلم اتحاد کی مثال پیش کی تھی۔ اس سلسلے میں خاص طور پر آدا جعفری، سیدہ بانو احمد، آل احمد سرور، انیس قدوائی وغیرہ نے اپنی خودنوشت میں تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح اس منافرت بھرے ماحول میں بغیر کسی تفریق کے دونوں قوموں کے لوگوں کا آپس میں مدد کرنا بھی ایک مثال بن کر سامنے آیا تھا۔ ہندو مسلم دونوں نے اپنی جان پر کھیل کر ایک دوسرے کی جان بچائی تھی۔ دیوان سنگھ، خوشونت سنگھ، ساجدہ زیدی، آل احمد سرور، ادا جعفری، گوپال متل وغیرہ نے اپنی خودنوشتوں میں اس تعلق سے کئی سبق آموز مثالیں پیش کی ہیں۔

آزادی کے بعد بے شمار خودنوشتیں منظر عام پر آئی ہیں لیکن ہر کسی نے تقسیم ہند کے اثرات یا تحریک آزادی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ایسے لوگوں نے اپنی علمی، ادبی وسماجی کارناموں اور اپنی روداد زندگی پیش کرنے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ 1947 کے بعد شائع ہونے والی خودنوشتوں میں اکثریت ان کی ہی ہے جس میں تقسیم ہند کے محرکات اور سانحات کا خاکہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ ان میں مصنفین نے مختلف واقعے کے ذریعے اس وقت کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے۔ دونوں ملکوں سے ہجرت کرنے والے خودنوشت نگاروں کی تحریروں میں ایک کسک، اداسی اور درد کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اردو ادب کی ''خودنوشت'' جو کہ انگریزوں کی بربرتا اور اس وقت کے سیاسی احوال کے بیان سے وجود میں آئی، آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس صنف میں مصنفین نے نہ چاہتے ہوئے بھی سیاسیات ہند پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ چاہے وہ چند صفحات پر ہی کیوں نہ ہوں۔ آزادی سے پہلے کی خودنوشتوں میں سیاست سے گریز بھی کیا گیا ہے تو ان میں ہندو مسلم اتحاد کے ٹوٹنے، ان کے درمیان بڑھتی نفرتوں اور پرانی روایتوں کے بکھرنے کا ذکر تو ضرور مل جاتا ہے جو کہ بعد میں تقسیم ہند کا محرک بنتی ہیں۔ بہر حال آزادی کے بعد خودنوشت نگار تقسیم ہند کے سانحات کے بیان سے اپنے دامن کو بچانے کی کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں لیکن وہ اپنی کاوشوں میں ناکام ہوئے ہیں

کیوں کہ کوئی ایک حادثہ یا سانحہ ان کی شخصیت پر اثر انداز ضرور ہوا، جس کا ذکر آتے ہی پس منظر میں اس وقت کے حالات کا بیان بھی مختصر انداز میں کیا گیا ہے۔ کم وبیش سبھی خودنوشت نگاروں نے اپنے بچپن کی حسین یادوں اور آپسی محبت واخوت کو بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد بدلتے حالات اور سماج میں بڑھتی نفرتوں سے وہ لوگ حد درجہ نالاں ہیں۔ ان لوگوں نے تقسیم ہند کو ایک ایسا غیر شعوری عمل قرار دیا ہے، جس نے مسائل کو حل نہیں کیا بلکہ اس نے نہ صرف سیکڑوں مسئلے کو جنم دیا بلکہ دو ملکوں اور دو قوموں کو ایک دوسرے کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا اور اس دشمنی کے ثبوت آئے دن مختلف صورتوں میں آج بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ دونوں قوموں میں نفرت پیدا کرنے میں جہاں ملک کے لوگوں نے اہم کردار ادا کیا وہیں ہم انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی پالیسی کو نظر انداز نہیں کر سکتے، کیوں کہ ان لوگوں نے ہی دونوں قوموں میں پھوٹ ڈالی۔ ورنہ اس سے پہلے بھی ہندو مسلم آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ ایسی دشمنی تو نہ تھی جو آج ہے۔ دو قومیں ضرور آباد تھیں لیکن دو قومی نظریے کے تحت جدائی ڈالنے والا احساس تو نہیں تھا۔ نہ ہندوؤں کے راج میں ایسی چپقلشیں ہوئیں اور نہ مسلمانوں کے عہد میں تقسیم ہند کے بعد جیسی خون آشامیاں ہوئیں۔ مقالے میں راقمہ نے اس وقت ہونے والے حالات کے ذکر کے ساتھ حال میں ہونے والی تباہیوں سے جوڑنے کی بھی کوشش کی ہے تا کہ آج کا قاری یا ملک کا عام باشندہ موجودہ حالات کو صحیح تناظر میں سمجھ پائے اور تاریخ سے سبق حاصل کر کے پرامن مستقبل کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرے۔

☆☆☆☆

کتابیات

بنیادی ماخذ

نمبر شمار	مصنف	تصانیف	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1۔	آل احمد سرور	خواب باقی ہیں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2000
2۔	آغا جانی کاشمیری	سحر ہونے تک	امپریل پریس، دہلی	1966
3۔	اجیت کور	خانہ بدوش	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2001
4۔	اختر حسین رائے پوری	گرد راہ	مکتبہ افکار، کراچی	1984
5۔	اختر الایمان	اس آباد خرابے میں	اردو اکادمی، دہلی	1999
6۔	احسان دانش	جہان دانش	.....	1975
7۔	ادا جعفری	جو رہی سو بے خبری رہی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	2011
8۔	امرتا پریتم	رسیدی ٹکٹ	منظور پریس، لاہور	1977
9۔	انیس قدوائی	آزادی کی چھاؤں میں	قومی ایکتا ٹرسٹ، دہلی	1974
10۔	انتظار حسین	چراغوں کا دھواں	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	1999
11۔	انتظار حسین	جستجو کیا ہے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2012
12۔	پروفیسر ایم کمال الدین	چاندنی دھوپ کی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2017
13۔	پروفیسر اطہر صدیقی	میں کیا میری حیات کیا	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	2003
14۔	پروفیسر اقبال حسین	داستان میری	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	1989
15۔	پروفیسر ساجدہ زیدی	نوائے زندگی	اردو اکادمی، دہلی	2012
16۔	پروفیسر مقبول احمد	صدائے جرس	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	2002
17۔	پروفیسر غوث انصاری	عمر رفتہ	کتابی دنیا، دہلی	2002
18۔	پروفیسر ولی الحق انصاری	مد و جزر	رضا لائبریری، رامپور	2007
19۔	پنڈت جواہر لعل نہرو	میری کہانی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	.....

20۔	جتیندر بلو	دیکھو ہم نے کیسے بسر کی	کتاب دار، ممبئی	2017
21۔	جسٹس جاوید اقبال	اپنا گریباں چاک	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	2003
22۔	جوشؔ ملیح آبادی	یادوں کی برات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2018
23۔	جلیل قدوائی	حیات مستعار	المخزن پرنٹرز، کراچی	1987
24۔	حبیب تنویر	پردہ کھلتا ہے	دہلی کتاب گھر، دہلی	2013
25۔	حمیدہ سالم	شورش دوراں	ادب پبلی کیشنز، دہلی	1995
26۔	خواجہ حسن نظامی	آپ بیتی	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	1967
27۔	خلیق ابراہیم خلیق	منزلیں گرد کے مانند	فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹیڈ، کراچی	1999
28۔	خوشونت سنگھ	سچ، محبت اور ذرا سا کینہ	ایم آر پبلی کیشنز، دہلی	2018
29۔	ڈاکٹر عبادت بریلوی	یاد عہد رفتہ	ادارہ ادب وتنقید، لاہور	1988
30۔	ذکیہ سلطان نیر	بیتے لمحے: یادوں کے چراغ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1998
31۔	رشید امجد	تمنائے بے تاب	حرف اکادمی، راولپنڈی، پاکستان	2001
32۔	رشید احمد صدیقی	آشفتہ بیانی میری	دہلی کوہ نور پریس، دہلی	1972
33۔	رتن سنگھ	بیتے ہوئے دن	اردو اکادمی، دہلی	2013
34۔	راجندر پرساد	اپنی کہانی	شمع بک ڈپو، دہلی	1961
35۔	رفعت سروش	بمبئی کی بزم آرائیاں	نورنگ کتاب گھر، دہلی	1986
36۔	رفعت سروش	پتہ پتہ بوٹا بوٹا	نورنگ کتاب گھر، دہلی	1996
37۔	سرسید رضا علی	اعمال نامہ	ہندوستانی پبلشر، دہلی	1943
38۔	سید محمد عقیل	گئو دھول	انجمن تہذیب نو، پریاگ راج	1995
39۔	سعیدہ بانو احمد	ڈگر سے ہٹ کر	سجاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1996
40۔	سید علی شاہ گیلانی	ولر کنارے	.....	2011
41۔	ساقی فاروقی	آپ بیتی پاپ بیتی	ایم آر پبلی کیشنز، دہلی	2016
42۔	سید میر قاسم	داستان حیات	ادارہ ادبیات، دہلی	1985

43۔	سید ذوالفقار علی بخاری	سرگزشت	غالب پبلشرز، لاہور	1995
44۔	شارب ردولوی	نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2017
45۔	شائستہ سہروردی	پردے سے پارلیمنٹ تک	.....	2002
46۔	شاد عظیم آبادی	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	معاف پریس، اعظم گڑھ	1961
47۔	شکیل الرحمٰن	آشرم	عرفی پبلی کیشنز، گڑگاؤں، ہریانہ	2011
48۔	شان الحق حقی	افسانہ در افسانہ	ایم آر پبلی کیشنز، دہلی	2018
49۔	شیخ عبداللہ	آتش چنار	علی محمد اینڈ سنز، سرینگر	1986
50۔	شورش کاشمیری	بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل	چٹان لمیٹیڈ، لاہور	.....
51۔	شورش کاشمیری	پس دیوار زنداں	فرید بک ڈپو، دہلی	2015
52۔	شہرت بخاری	کھوئے ہوؤں کی جستجو	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	1987
53۔	شوکت تھانوی	ما بدولت	.....	.....
54۔	صالحہ عابد حسین	سلسلہ روز و شب	لبرٹی آرٹ پریس، دہلی	1984
55۔	ظفر حسن ایبک	خاطرات	منصور بک ہاؤس، لاہور	1964
56۔	عابد سہیل	جو یاد رہا	اردو اکادمی، دہلی	2012
57۔	عابدہ سلطان	انقلابی شہزادی	آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی	2007
58۔	عبدالطیف بجنوری	لطیف کی کہانی	مدینہ پریس، بجنور	1967
59۔	عبدالمجید سالک	سرگزشت	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور	1993
60۔	عزیز الحسن صدیقی	ہما خاکم کہ ہستم	مکتبہ حسن، غازی پور	2008
61۔	عشرت رحمانی	عشرت فانی	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	1985
62۔	عبدالغفار مدھولی	ایک طالب علم کی کہانی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	2011
63۔	عتیق صدیقی	یادوں کے سائے	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	1974
64۔	غلام مرتضیٰ راہی	راہی کی سرگزشت	ایچ ایس آفسیٹ پریس، دہلی	2009
65۔	قاضی جلیل عباسی	کیا دن تھے۔۔۔	جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	1985

66۔	قدرت اللہ شہاب	شہاب نامہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2018
67۔	قتیل شفائی	گھنگھرو ٹوٹ گئے	تخلیق کار پبلشرز، دہلی	2008
68۔	کرنل غلام سرور	آئینہ ایام	نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی	1981
69۔	کنور مہندر سنگھ بیدی	یادوں کا جشن	ثمر آفسیٹ پریس، دہلی	1986
70۔	کلیم عاجز	ابھی سن لو مجھ سے	سٹی پرنٹرس، دہلی	1992
71۔	کشور ناہید	بری عورت کی کتھا	ادب پبلی کیشنز، دہلی	1995
72۔	کلیم الدین احمد	اپنی تلاش میں	کلچرل اکیڈمی، گیا، بہار	1975
73۔	گوپال متل	لاہور کا جو ذکر کیا	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2015
74۔	مشتاق احمد یوسفی	زرگزشت	مکتبہ دانیال، کراچی	1976
75۔	مولانا عبدالماجد دریابادی	آپ بیتی	مکتبہ فردوس، لکھنؤ	1978
76۔	مولانا ابوالکلام آزاد	تذکرہ	ساہتیہ اکادمی، دہلی	1919
77۔	مولانا ابوالکلام آزاد	آزاد کی کہانی	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1958
78۔	مولانا ابوالکلام آزاد	آزادی ہند	ایم آر پبلی کیشنز، دہلی	1988
79۔	محمد لطف اللہ خاں	ہجرتوں کے سلسلے	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	1998
80۔	ملک زادہ منظور	رقص شرر	رہبر آفسیٹ پریس، دہلی	2004
81۔	مسعود حسین خاں	ورود مسعود	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	1989
82۔	محمد ادیب	زندگی ذرا آہستہ چل	براؤن پبلی کیشنز، دہلی	2019
83۔	مولانا حسین احمد مدنی	نقش حیات	مکتبہ دینیہ، دیوبند	1953
84۔	مہاتما گاندھی	تلاش حق	نوجیون پرکاش، پریاگ راج	1995
85۔	ندا فاضلی	دیواروں کے بیچ	ایم آر پبلی کیشنز، دہلی	2016
86۔	ندا فاضلی	دیواروں کے باہر	ایم آر پبلی کیشنز، دہلی	2016
87۔	نواب احمد خاں چھتاری	یادایام	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	1974
88۔	وہاب اشرفی	قصہ بے سمت زندگی کا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2008

89۔	ہوش بلگرامی	مشاہدات	انقلاب پریس، حیدرآباد	1955
90۔	یونس احمر	ماضی کے تعاقب میں	فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹیڈ، کراچی	1991
91۔	یوسف حسین خاں	یادوں کی دنیا	معارف پریس، اعظم گڑھ	1967

ثانوی ماخذ

نمبر شمار	مصنف	تصانیف	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1۔	الطاف فاطمہ	اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا	اعتماد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1974
2۔	اظہار احمد	آل احمد سرور کی ادبی خدمات	کتابی دنیا، دہلی	2010
3۔	اظہار اثر (مترجم)	ہندوستان چھوڑو تحریک	نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی	1992
4۔	امیر اللہ خاں شاہین	فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین	طاہر بک ایجنسی، دہلی	1973
5۔	انو بندھو پادھیائے	گاندھی جی کے مختلف روپ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	1974
6۔	بی آر نندا	مہاتما گاندھی	ترقی اردو بیورو، دہلی	1986
7۔	بانو سرتاج	ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2012
8۔	پینڈرل مون	ہند میں انگریز ریاست	تخلیقات، لاہور	1995
9۔	پروفیسر محمد عارف	اردو ناول اور آزادی کے تصورات	پاکستان رائٹر کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور	2011
10۔	پی سی جوشی	انقلاب 1857	ترقی اردو بیورو، دہلی	1972
11۔	پروفیسر بپن چندر	حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2014
12۔	پریم گوپال متل	گوپال متل: ذات وصفات	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2012
13۔	پروفیسر ایشوری پرشاد	تاریخ ہند حصہ دوم	انڈین پریس لمیٹیڈ، پریاگ راج	1926
14۔	پروفیسر وہاج الدین علوی	اردو خودنوشت: فن وتجزیہ	لبرٹی آرٹ پریس، دہلی	1989

15۔	تقی رحیم	تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	1998
16۔	تاراچند	تاریخ تحریک آزادی ہند	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2001
17۔	ثناءاللہ بٹ	کشمیر 1947 سے 1977 تک	علی محمد اینڈ سنز، سرینگر	1980
18۔	حقانی القاسمی	انداز بیاں	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	2016
19۔	خلیق انجم	آل احمد سرور شخصیت و ادبی خدمات	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	2011
20۔	خان عبدالودود خاں (مرتب)	مولانا ابوالکلام آزاد: تحریک آزادی اور یک جہتی	جے کے آفسیٹ پریس، دہلی	1983
21۔	خوشونت سنگھ	بھارت کا خاتمہ	نگارشات لاہور	2003
22۔	خوشونت سنگھ	پاکستان ایکسپریس	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1996
23۔	دھرمیندر ناتو	دہلی اور آزادی 1957 تا 1947	اردو اکادمی، دہلی	2011
24۔	ڈاکٹر ایس مظفرالدین	اردو کی شہرہ آفاق خودنوشت (ایک تجزیاتی مطالعہ)	سرمدی پبلی کیشنز، چنئی	2005
25۔	ڈاکٹر درخشاں تاجور	ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	1991
26۔	ڈاکٹر محمد ضمیر رضا	بہار میں اردو خودنوشت کا ارتقا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2019
27۔	ڈاکٹر محمد سراج اللہ	1980 کے بعد اردو خودنوشت سوانح نگاری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2017

28۔	ڈاکٹر محمد نوشاد عالم	اردو خودنوشت سوانح حیات آزادی کے بعد	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	2011
29۔	ڈاکٹر سید عبداللہ	میرا من سے عبدالحق تک	سودیس پریس، دہلی	1965
30۔	ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی	جوشؔ کی انقلابی نظمیں	تنویر پریس، لکھنؤ	1982
31۔	ڈاکٹر محمد ہاشم	جدید ہندوستان کے معمار: رفیع احمد قدوائی	انجمن ترقی اردو بیورو، دہلی	1994
32۔	ڈاکٹر فوزیہ خانم	آپ بیتیاں ٹیڑھی پسلیوں کی	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	2017
33۔	ڈاکٹر صغیر احمد	اختر الایمان: شخصیت اور فن	کتابی دنیا، دہلی	2013
34۔	ڈاکٹر تحسین فراقی	عبدالماجد دریابادی احوال وآثار	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	1993
35۔	ڈاکٹر صبیحہ انور	اردو میں خودنوشت سوانح حیات	نامی پریس، لکھنؤ	1982
36۔	ڈاکٹر عبدالمالک	کلیم الدین احمد کی ادبی خدمات	کتاب منزل، پٹنہ	2002
37۔	ڈاکٹر محمد عمر رضا	اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت	کتابی دنیا، دہلی	2010
38۔	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو نثر کا فنی ارتقا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1994
39۔	ڈاکٹر قیام الدین احمد	ہندوستان میں وہابی تحریک	نفیس اکیڈمی، کراچی	1976
40۔	ڈاکٹر نکہت جہاں	اردو ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات	سلور لائن پرنٹرس، حیدرآباد	2006
41۔	ڈاکٹر ظفر سعید	تقسیم ہند اور اردو افسانہ	کراؤن آفسیٹ پریس، پٹنہ	2000
42۔	ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ	مسعود حسین خاں کی ادبی خدمات	دکن پبلشرز، حیدرآباد	1995
43۔	رمیض احمد تقی	کہانی اپنے ہندوستان کی	مرکزی پبلی کیشنز، دیوبند	2018
44۔	راجندر پرساد	ہندوستان کا مستقبل	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1946

45۔	ریحانہ اختر نقوی	اردو کے نمائندہ ناولوں میں نسوانی کردار	نیشنل آرٹ پرنٹرس، پریاگ راج	1987
46۔	راجندر پرساد	پاکستان	کتابستان اردو، لاہور	.....
47۔	راجندر پرساد	باپو کے قدموں میں	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	1953
48۔	رئیس احمد جعفری	حیات محمد علی جناح	شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس، ممبئی	1946
49۔	سید شاہ علی	اردو میں سوانح نگاری	گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی	1961
50۔	سید حامد	علی گڑھ تحریک	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	1986
51۔	سلطان جہاں	اردو خودنوشت نگاری	الحمرا پبلشرز، دہلی	1974
52۔	سید عبداللہ	میر امن سے عبدالحق تک	مجلس ترقی ادب، لاہور	1965
53۔	سید خورشید مصطفےٰ رضوی	تاریخ جنگ آزادی ہند	یو پبلشرز، لاہور	2007
54۔	سید ابراہیم فکری	ہندوستانی مسلمانوں کا جنگ آزادی میں حصہ	لبرٹی آرٹ پریس، دہلی	1997
55۔	سید نصیر احمد	گاندھی جی کی جان بچانے والے بطخ میاں انصاری	آزاد ہاؤس آف پبلی کیشنز، اُنڈاولی، آندھرا پردیش	2019
56۔	شبانہ سلیم	اردو میں خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں: تجزیاتی مطالعہ	باب العلم پبلی کیشنز، بھوپال	2015
57۔	شری میوارام گپت	ہندوستان کی جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین	ادارہ شہیدان وطن پرکاشن، ممبئی	1988
58۔	شاہد ماہلی	جوش ملیح آبادی فکر و فن	غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی	2011
59۔	شائستہ خان	آزادی کے بعد علی گڑھ کے دانشوروں کی سوچ اپنی خودنوشت کے آئینے میں	مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ یونیورسٹی	2013

60۔	ضیاء الرحمٰن صدیقی	تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ	سویرا آفسیٹ پریس، اورنگ آباد	2003
61۔	ظفر احمد نظامی	ہندوستان کے چند سیاسی رہنما	انجمن ترقی اردو، دہلی	2000
62۔	عقیل احمد	اردو ناول اور تقسیم ہند	نعمانی آفسیٹ پریس، دہلی	1987
63۔	عابدی سمیع الدین	ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ	ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ	1990
64۔	عبداللہ یوسف علی	انگریز عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ	ہندوستان اکیڈمی، پریاگ راج	1936
65۔	عظیم الشان صدیقی	مشاہیر کی آپ بیتیاں	اردو اکادمی، دہلی	2007
66۔	عزیز قریشی (مرتب)	صالحہ عابد حسین نمبر (کتاب نما)	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	2012
67۔	عتیق اللہ (مرتب)	بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2002
68۔	عبیداللہ سندھی	شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	کتاب خانہ (پنجاب) لاہور	1942
69۔	عرش ملسیانی	جدید ہندوستان کے معمار: ابوالکلام آزاد	پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی	1974
70۔	عبدالعزیز عرفان	تحریک آزادی ہند کے چند مجاہدین	شالیمار بک ڈپو، اورنگ آباد	2010
71۔	فہیم محمد جان فیروز	اردو اور بنگلہ افسانے پر تقسیم ہند کا اثر	نرالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی	2002
72۔	فاروق ارگلی	داستان 1947	فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، دہلی	2015
73۔	فرمان فتح پوری، طارق	آدا جعفری: شخصیت اور فن	ایجوکیشنل پریس، کراچی	1998

74۔	قدوس جاوید	ادب اور سماجیات	کتاب محل، پریاگ راج	1984
75۔	قدرت اللہ شہاب	یا خدا	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	1999
76۔	کے ایل نارنگ ساقی	ہندوستانی ادب کے معمار: کنور مہندر سنگھ بیدی	ساہتیہ اکادمی، دہلی	2007
77۔	گوپی چند نارنگ	بیسویں صدی میں اردو ادب	ساہتیہ اکیڈمی، دہلی	2002
78۔	گوپی چند نارنگ	آزادی کے بعد اردو افسانہ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
79۔	گوپی چند نارنگ	ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	2003
80۔	مشتاق احمد یوسفی	چراغ تلے سے آب گم تک	الحمد پبلی کیشنز، لاہور	1997
81۔	مولانا ندیم الواجدی	آزادی سے جمہوریت تک	دارالکتاب، دیوبند	2017
82۔	ممتاز فاخرہ	اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا	رونق پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1984
83۔	مفتی محمد سرور فاروقی ندوی	یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کی مختصر تاریخ	مکتبہ پیام امن، ندوہ	2018
84۔	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	مولانا ابوالکلام آزاد (مذہبی افکار صحافت اور قومی جدوجہد)	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	2014
85۔	منصور احمد	تقسیم ہند 1947	کتاب بھون، دہلی	2003
86۔	محمد مظفر الدین فاروقی	ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ	انجمن ترقی اردو، دہلی	2008
87۔	مسعود الحق (مرتب)	حبیب تنویر کا رنگ منچ	دلی کتاب گھر، دہلی	2012
88۔	مرزا خلیل احمد بیگ	نذر مسعود (مجموعہ مضامین)	بیکن بکس، ملتان، پاکستان	1989
89۔	محمد منظور عالم	جگن ناتھ آزاد: فکر و فن	محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، دہلی	1999

90۔	محمد ذاکر	آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	1981
91۔	ناگیندر موہن پرشاد شری واستو	بہار میں قومی تحریک کا ارتقا	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	2000
92۔	وسیم بیگم	ہندوستانی ادب کے معمار: رفعت سروش	ساہتیہ اکادمی، دہلی	2013

﴿انگریزی و ہندی کتب﴾

1- Dr. Shaik Abdul Ghani- Bapu: The Massage of Peace- Academic Exellence, Dehli- 2020

2- Syed Obaidur Rahman- Biographical Encyclopedia Indian Muslim Freedom Fighters- Global Media Publications, Dehli

3- Syed Obaidur Rahman- Ulema Role in Indian's Freedom Movement with focus on Silk Letter Movement (Reshmi Rumal Tahreek)

4- Encyclopedia Britanica, Benton, Helen Hemingway, Volume 2, Chicago, 1973-74

5۔ محمد اشرف قادری، راشٹریہ آندولن اور چمپارن کے ستیہ گرہ تا سناتنی (ہندی میں)، ساہتیہ کنج، دہلی، 1997

6۔ ایم ڈبلیو انصاری، بطخ میاں انصاری کی انوکھی کہانی (ہندی میں)، شیری اکادمی، بھوپال، 2021

﴿رسائل، جرائد و نیوز ایجنسیاں﴾

1۔ زمانہ، کانپور، دیانارائن نگم، 1903 تا 1942
2۔ آج کل، ماہنامہ، دہلی، مئی 2022
3۔ ایوان اردو، ماہنامہ، اردو اکادمی دہلی، جنوری 2022
4۔ اردو دنیا، ماہنامہ، NCPUL دہلی، اکتوبر 2021
5۔ اردو، سہ ماہی، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1986
6۔ ادب لطیف، ماہنامہ، لاہور، انتظار حسین 1962 تا 1964
7۔ اعتراف، ندا فاضلی نمبر، (رام پنڈت، اسلم پرویز، وقار قادری) ممبئی، 2005
8۔ ہمارا ادب، سعادت حسن منٹو نمبر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، 2012-13
9۔ تحریک، ماہنامہ، دہلی، گوپال متل
10۔ خواتین دنیا، ماہنامہ، NCPUL دہلی، دسمبر 2020
11۔ نقوش، آپ بیتی نمبر (جلد اول و دوم)، لاہور، 1964
12۔ نقوش، لاہور، جنوری 1977
13۔ ہماری زبان، اداریہ (آل احمد سرور)، علی گڑھ، 22 ستمبر 1969
14۔ آج کل، ماہنامہ، (ڈاکٹر خالد علوی، مضمون: خواب باقی ہیں) دہلی، 2012
15۔ روشنائی، سہ ماہی، کراچی، جولائی تا ستمبر 2006
16۔ روشنائی، سہ ماہی، کراچی، جولائی تا ستمبر 2010
17۔ روشنائی، سہ ماہی، کراچی، اکتوبر تا دسمبر 2010
18۔ چہارسو، ماہنامہ، راولپنڈی پاکستان، نومبر 2010
19۔ انڈپینڈنٹ اردو، برطانیہ، (ظہور حسین کی رپورٹ: جب بطخ میاں انصاری نے مہاتما گاندھی کی جان بچائی) 30 جنوری 2022
20۔ انڈپینڈنٹ اردو، برطانیہ، (سجاد اظہر کی رپورٹ: ریڈکلف نے آخری لمحے میں سرحدیں کیوں تبدیل کیں)

2مارچ2022

21۔ بی بی سی ہندی، دہلی (ریحان فضل کی رپورٹ: 1857 کی جنگ آزادی 'جب دلی نے موت کو رقصاں دیکھا) 11 مئی2020

22۔ بی بی سی ہندی، دہلی (ریحان فضل کی رپورٹ: انڈین بحریہ کے جوانوں کی وہ بغاوت جس نے انگریزوں کو 'وقت سے پہلے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا') 21فروری2021

23۔ بی بی سی اردو، اسلام آباد، (ظفر سید کی رپورٹ: انگریزوں نے ہندوستان کو کل کتنا مالی نقصان پہنچایا؟) 15اگست2018

24۔ بی بی سی اردو، اسلام آباد، (ظفر سید کی رپورٹ: جب پرتگالیوں نے ہندوستان کی تاریخ پلٹ کر رکھ دی) 9جولائی2018

25۔ قومی آواز، دہلی، (شاہد صدیق علیگ کی رپورٹ: بھارت چھوڑو نعرے کا خالق- یوسف مہر علی، تحریک کی 79ویں سالگرہ کے موقع پر)، 8اگست2021

26۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، (عارف محمد خاں کی رپورٹ: تحریک خلافت اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ سیاست کا فروغ)، 18نومبر2020

27۔ بی بی سی اردو، اسلام آباد، (دنیار پٹیل کی رپورٹ: برطانوی ہندوستان کے انوکھے فسادات: جب ہندو مسلمان اتحاد نے بمبئی کی اقلیتی برادریوں کو خوف میں مبتلا کر دیا) 21نومبر2021

28۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، جنگ آزادی کے روشن چراغ، خصوصی پیشکش (آزادی نمبر) 15اگست 2006

29۔ بی بی سی اردو، اسلام آباد، (عقیل عباس جعفری کی رپورٹ: انڈیا اور پاکستان میں اثاثوں کی منصفانہ تقسیم کے لیے گاندھی کا آخری مرن برت اور ان کا قتل)، 12جنوری2021

30۔ بی بی سی اردو، اسلام آباد، (عارف شمیم کی رپورٹ: کہانی ریڈکلف کی ریڈ لائن کی) 8جنوری2014

☆☆☆☆

काशी हिन्दू विश्वविद्यालय

BANARAS HINDU UNIVERSITY

अन्तर्राष्ट्रीय संगोष्ठी

''भारतीय धर्म, दर्शन और साहित्य''

بین الاقوامی سیمینار

موضوع: ہندستانی مذاہب، فلسفہ اور ادب

International Seminar on "Indian Religion, Philosophy & Literature"

25 - 27 February 2019

Certificate

This is certify that Prof./Dr./Ms./Mrs./... Rushda Shaheen ..... Research Scholar Dept. of Urdu, University of Hyderabad ....*has participated and presented his/her paper entitled* Warood-e-Masood me Mazhabi wa Saqafati Pahlu .....
in the 3 day International Seminar on "Indian Religion, Philosophy & Literature" and contributed towards the success of the seminar.

Organizing Secretary
Dr. Mosharraf Ali
Department of Urdu, BHU

Convener
Prof. Aftab Ahmad Afaqui
Head, Department of Urdu, BHU

Organized By: **Department of Urdu** Faculty of Arts, Banaras Hindu University

Shot on OnePlus
By Rushda Shaheen

GOVT. DEGREE COLLEGE (W)
HUSSAINI ALAM, HYDERABAD, T.S

گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین
حسینی علم حیدرآباد، تلنگانہ

دوروزہ قومی سیمینار بعنوان: اردو کی نثری اصناف

Two-day National Seminar on **"GENRE OF URDU PROSE"** held on 18th & 19th March 2021

Sponsored by: NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE (NCPUL), New Delhi
in Collaboration with TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Organized by: DEPARTMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that Dr./Mr./Ms. RUSHDA SHAHEEN

of KHUDNAWISHT KI TAREEF - O - FUN *has presided/attended as*

resource person/participated/presented a paper titled
in Two-day National Seminar in GENRE OF URDU PROSE held on 18th & 19th March 2021.

Dr. Abdul Quddus
Convener

B Sunitha Padmavathi
Dr. B. Sunitha Padmavathi
Principal

www.urducouncil.nic.in

قیمت ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مئی 2022

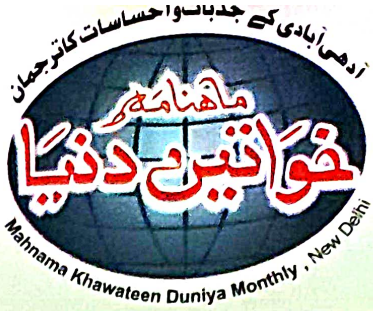

جلد: 6 شمارہ: 5 مئی 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	خدیجہ مستور	روبینہ پروین	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں	خطوط لیلیٰ کا مطالعہ تانیثیت کے پرتو میں	ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری	10
	خواتین کی بااختیاری اور اعلیٰ تعلیم	ڈاکٹر محمد احسن	13
	عصمت چغتائی کے ناولٹ 'دل کی دنیا' کا تجزیاتی مطالعہ	محمد شاہ نواز قمر	18
	خواتین کی خودنوشتوں میں ہندوستانی شناخت کی عکاسی	رشدہ شاہین	24
	اکبر الہ آبادی: بحیثیت شاعر	نوشین عثمانی	30
اعتراف ہنر	نگار عظیم کے چند افسانے	پروفیسر علی احمد فاطمی	34
	مجری اردو ادب اور پروین شیر کی شاعری	گلزار احمد سوہل	40
حسن سخن	رخشاں ہاشمی، جبین نازاں		46
افسانہ	خواہش جنوں	نیلوفر پروین	48
	زویا	عذرا انجم	50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		52
صحت	سرطان عنق الرحم اور ایچ پی وی وائرل لوڈ	نگہت فاروق	54
آرائش وزیبائش			60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		62

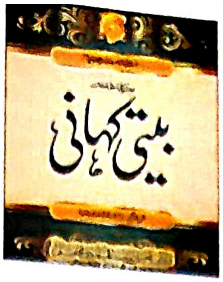

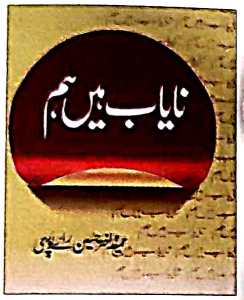

رشدہ شاہین

خواتین کی خودنوشتوں میں ہندوستانی شناخت کی عکاسی

خودنوشت کسی انسان کی حالاتِ زندگی کی وہ داستان ہے جسے مصنف خود صفحہ قرطاس پر خوبصورت اسلوب وپیرائے میں اپنی تخلیقی صلاحیت سے پروتا ہے۔اس صنف کا صداقت پر مبنی ہونا لازمی جز قرار پایا کیوں کہ لکھنے والا مرکزی شخصیت کے طور پر خود ہی گواہ بن کر اپنی رودادِ زندگی پیش کرنے کے ساتھ اپنی بیتی زندگی کے تجربات ومشاہدات کو بھی بلا کم وکاست بیان کرتا ہے۔ یہ صنف ایک طرف جہاں تخلیق کار کی ذات کا آئینہ ہوتی ہے تو وہیں دوسری طرف اس کے عہد کے تمام نشیب وفراز مثلاً سیاسی، سماجی،، ادبی، ثقافتی، معاشی وتہذیبی پہلوؤں کا کھاتہ ہوتی ہے۔ یہی خصوصیت اس صنف کو ادب میں الگ مقام عطا کرتی ہے۔ چوں کہ خودنوشت صداقت پر مبنی ہوتی ہے اس لیے یہ اپنے قارئین کے ذہن ودل کو زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ بیسویں صدی کی نصف دہائی کے بعد یکے بعد دیگرے کئی خودنوشت منظر عام پر آئیں جن کا تعلق مرد حضرات سے ہے۔ خواتین نے بھی اپنی سرگزشت اور اپنی سوچ وفکر سے قارئین ادب کو روشناس کرانا چاہا چنانچہ اسی خیال کے زیر اثر اردو ادب کی نامور ادیباؤں کے علاوہ ان خواتین نے بھی اپنی حالات زندگی تحریر کی ہے جن کا تعلق براہ راست ادب سے نہیں ہے۔

حوا کی ان بیٹیوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے عہد اور اقدار کی شکست وریخت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس پر کھل کر اظہار خیال بھی کیا۔ اپنی ذاتی زندگی کی مصیبتوں اور تکالیف کو سہتے ہوئے اجتماعی زندگی کے کرب میں بھی مکمل شریک رہیں۔ یہ مثل مشہور ہے کہ لکھنے والے کا عکس ان کی تحریروں میں موجود ہوتا ہے، جب یہ مثال خودنوشت کے حوالے سے دیکھی جائے تو یہ تمام ادیبائیں اپنی خوبیوں وخامیوں کے ساتھ قاری کے سامنے مکمل طور پر موجود ہیں۔ شہر بانو بیگم (بیتی کہانی)، وزیر سلطان (نیر نگئ بخت)، عابدہ سلطان (انقلابی شہزادی)، شائستہ سہروردی (پردے سے پارلیمنٹ تک)، حمیدہ حسین اختر (ہم سفر، نایاب ہیں ہم، وہ کون تھی) ادا جعفری (جو رہی سو بے خبری رہی)، ساجدہ زیدی (نوائے زندگی)، صالحہ عابد حسین (سلسلہ روز وشب)، صغرا مہدی (حکایت ہستی)، کشور ناہید (بری عورت کی کتھا)، نفیس بانو شمع (جنت سے نکالی ہوئی حوا)، حمیدہ سالم (شورش دوراں)، سعیدہ بانو احمد (ڈگر سے ہٹ کر)، امرتا پریتم (رسیدی ٹکٹ)، بیگم انیس قدوائی (آزادی کی چھاؤں میں) وغیرہ نے اپنی خودنوشت میں خود کی ذات کے تناظر میں اپنی سوچ وفکر سے نہ صرف قارئین کو روشناس کرایا، بلکہ اپنے عہد کے ہر پہلو کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ انھوں نے کھل کر اپنی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

جہاں تک تہذیب وتمدن کا سوال ہے تو تمام خواتین نے سماج کے ہر پہلو اور منظر نامے کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کی خودنوشتوں میں شادی بیاہ کی رسومات، پردہ، تیوہار، میلوں

ٹھیلوں وغیرہ کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ خواتین کی خودنوشتوں میں تہوار اور شادی بیاہ کی رسومات کے تذکروں پر مبنی اس مضمون کو سامنے رکھنے کی میری حتی المقدور کوشش رہے گی۔

ہندوستان مختلف نسلوں، مذاہب، ثقافتوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ جس طرح مختلف مذاہب اور نسلیں موجود ہیں اسی طرح ان کی بولیاں اور زبانیں مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب وتمدن میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ اس رنگارنگی اور گنگا جمنی تہذیب نے ہندوستان کو جو دلکشی عطا کی ہے وہ شاید کسی دوسرے ملک میں نہیں پائی جاتی۔ اسی وجہ سے یہ ملک ہمیشہ سے باہری لوگوں اور سیاح کی دلچسپی وکشش کا باعث بنا رہا ہے۔ یہاں کی رنگارنگ تہذیبوں میں مختلف تہوار اور شادی بیاہ کی رسومات اہم مقام رکھتی ہیں جس میں بغیر کسی تفریق کے ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

ہندوستان کو تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کا مرکز کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہاں تقریباً ہر مہینے کسی نہ کسی علاقے میں کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا ہے۔ جہاں تک شادی بیاہ کی رسومات کی بات ہے یہ بھی بالکل ایک تہوار کی طرح ہی خوشی خوشی انجام پذیر ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں اکثر تہواروں کا تعلق الگ الگ مذاہب سے ہے۔ اس کے باوجود ملک کے دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی ان میں بغیر کسی تعصب کے برابر شریک ہوتے ہیں اور مشترکہ تہذیب کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ مثلاً ہولی، دیوالی، دسہرہ، عید و بقرعید، کرسمس وغیرہ ایسے تہوار ہیں جو ملک کے کونے کونے میں ہر مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مناتے ہیں، ان تہواروں کی دھوم اب تو بیرونی ملک میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

شب برات، رمضان، عید و بقرعید، محرم سے منسلک رسومات اور روایات کا تذکرہ تقریباً خواتین کی تمام خودنوشتوں میں ملتا ہے۔ چونکہ ان سب کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا، اس لیے اسلام کے احکام کی پابندی کے ساتھ مذکورہ تہواروں کی تیاریوں وخوشیوں کا تذکرہ کرتی ہیں۔ ادا جعفری کے ''ٹونک والے خاندان'' میں شعبان سے ہی رمضان کی تیاریاں شروع ہوتیں اور پورے مہینے خوب چہل پہل رہتی۔ تمام لغویات سے دور گھر کے افراد نہ صرف پابندی سے روزہ رکھتے بلکہ سحری اور افطار کا عمدہ اہتمام کیا جاتا اور غریب غربا میں بھی بانٹا جاتا۔ لیکن عید بڑی خاموشی سے منائی جاتی تھی، سویاں پکتیں، سارے لوازمات بھی ہوتے، گھر کے سب لوگ نئے کپڑے بھی پہنتے، مرد عید کی نماز کے لیے بھی جاتے، بچوں کو عیدی بھی ملتی، لیکن ان سب میں خوشی سے زیادہ رازداری ہوتی کیوں کہ یہ اس خاندان کی سماجی مجبوری تھی۔ چونکہ خاندان کے کسی بزرگ کا انتقال عید کے دن ہی ہوا تھا اس لیے دیوان خانے میں اس کا غم ضرور منایا جاتا، جب کہ ان کے انتقال کو کافی عرصہ گزر چکا تھا لیکن عید کے دن غرباء میں کھانا بانٹنا اور فاتحہ خوانی اور ماتم کرنا، یہ روایت صدیوں سے اس خاندان میں چلی آرہی تھی۔ بقیہ خودنوشتوں میں یہ تہوار جس طرح آج خوشی اور دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں ویسی ہی تفصیلات ملتی ہیں۔

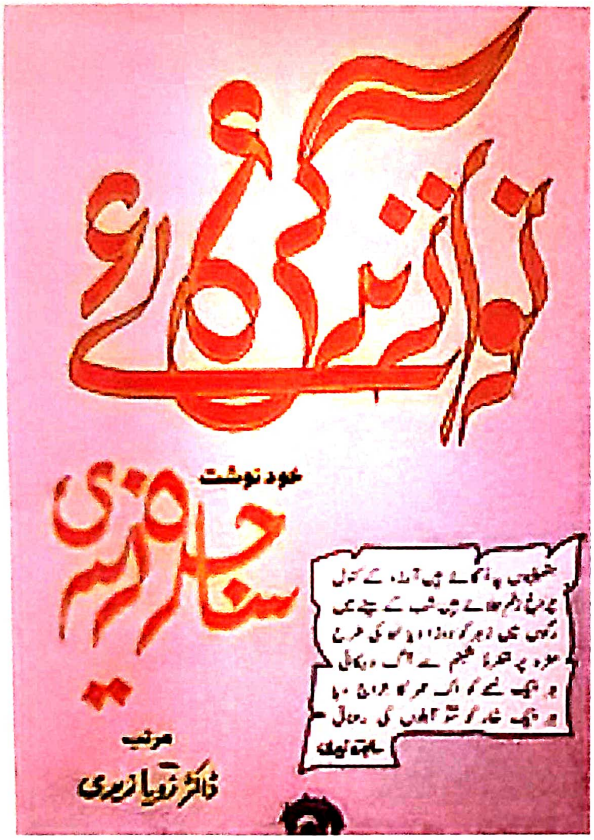

اسی طرح دیوالی، ہولی، کرسمس کا بھی تذکرہ موجود ہے چونکہ ہندوستان مشترکہ تہذیب کا ابتدا سے ہی گہوارا رہا ہے اس لیے ہندو ہو یا مسلمان، خوشی خوشی ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں، مبارک باد دیتے ہیں، ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے ہیں اور مٹھائیوں و پکوانوں کی تقسیم بھی آپس میں کرتے ہیں۔ دراصل ہندوستان جیسے وسیع اور گنگا جمنی تہذیب والے ملک میں تہوار ایک دوسرے کو قریب لانے، ہنسنے بولنے، دوستی ویگانگت پیدا کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

رکشا بندھن بھائی بہن کا اہم تہوار مانا جاتا ہے جس میں دیگر تہواروں کی طرح دھوم دھام نہیں ہوتی۔ دراصل یہ بھائی بہن کی محبت کا سادگی سے منایا جانے والا تہوار ہے جس میں بہنیں بھائیوں کی کلائی پر راکھی باندھ کر اپنی رکشا کا وَچن (وعدہ) لیتی ہیں۔ جو کہ بھائیوں کے تئیں بہنوں کی محبت کی علامت مانا جاتا ہے۔ بہرحال اس تعلق سے سعیدہ بانو کی

خودنوشت ''ڈگر سے ہٹ کر'' میں ذکر ملتا ہے۔ دراصل ان کے دوستوں میں غیر مسلم بھی تھے لیکن خصوصاً رادھا کرشن نام کے اپنے پڑوسی کا ذکر کرتی ہیں جو مسوری میں ان کے ساتھ تھے۔ جیسے آج نوجوان نسل چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو لڑکوں کو راکھی باندھ کر اپنا بھائی بنا لیتی ہیں اسی طرح ان خودنوشتوں میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں ان کے جاننے والے یا دوستوں میں کوئی ہندو فیملی ہوتی تو اس مقدس تہوار پر ضرور راکھی اور مٹھائی بھجواتی تھیں۔ مثال کے طور پر سعیدہ بانو کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''میں رادھا بھائی کو راکھی باندھی چکی ہوں، ہر سال نیگ ملتا ہے اور بھابھی رادھا کس قدر عزیز ہیں۔'' (ص:59)

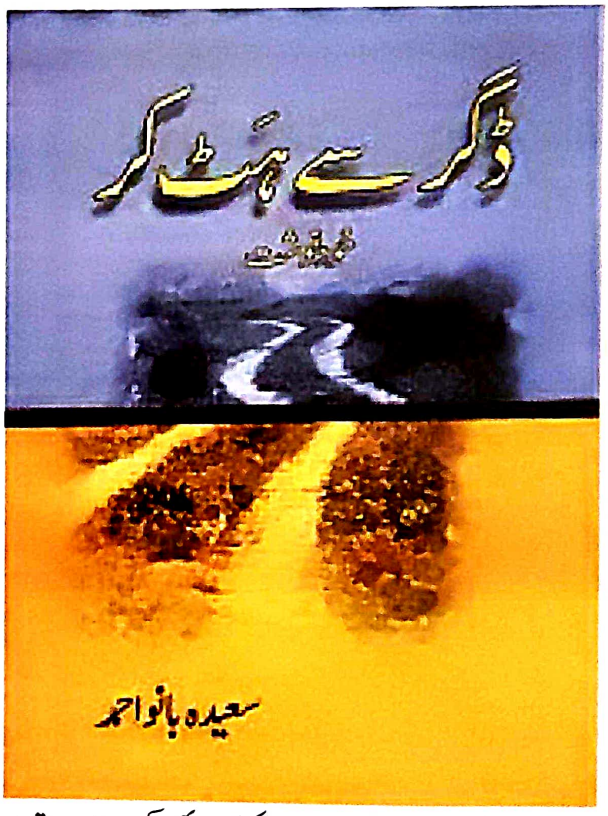

اسی طرح ہندوستان میں ساون کی آمد پر بھی کچھ مقامات پر تہوار کے طور پر باقاعدہ منایا جاتا ہے۔ ساون کے مہینے میں جھولے کا ڈلنا، طرح طرح کے پکوانوں کا بننا، ساون کا گیت گانا عام تھا۔ ''حکایت ہستی'' میں صغرا مہدی نے بھوپال میں منائے جانے والے ساون کے تہوار کا ذکر کیا ہے۔ جس میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ساون میں ایک بھجریوں کا تہوار ہوتا۔ ساون کے مہینے میں جب گیہوں میں بالیاں آتیں، ان کو توڑ کر ڈلیا میں سجایا جاتا تھا۔ کسان عورتیں رنگ برنگے کپڑے پہن کر، ڈنڈے ہاتھ میں لے کر ڈانس کرتیں۔ ان کو پیسے دیے جاتے۔'' (ص:15)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان میں مشرقی و مغربی تہذیب کے زیر اثر انگریزی تعلیم و تربیت پر بھی لوگوں نے توجہ دی۔ اس کا اشارہ شائستہ سہروردی کی خودنوشت ''پردے سے پارلیمنٹ تک'' میں ملتا ہے۔ ان کے والد اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم و تربیت کی خاطر صاحب بہادروں کے ہی محلے میں اپنا گھر لیا۔ چنانچہ ان کے بچوں کے ساتھ شائستہ سہروردی کا بچپن میں کھیلنا، تعلیم حاصل کرنا ساتھ ساتھ تھا۔ اس لیے ان کی تہذیب و تمدن کا اثر شائستہ اور ان کے گھر والوں پر ہونا فطری تھا۔ وہ اپنی خودنوشت میں جہاں اپنی تہذیب و روایات کا ذکر کرتی ہیں تو انگریزوں کی تہذیب، تہواروں وغیرہ کا بھی بیان موجود ہے جس میں کرسمس کا خاص تذکرہ ملتا ہے کیوں کہ یہ بڑے اہتمام کے ساتھ سال کے آخری مہینے میں منایا جاتا ہے۔ چوں کہ انگریزی حکومت تھی اس لیے اس تہوار پر چھٹیاں بھی لمبی کی جاتی۔ اس کا انداز حمیدہ سالم کی خودنوشت ''شورش دوراں'' سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''اس زمانے میں سال میں دو لمبی چھٹیاں ہوتی تھیں، گرمیوں کی اور کرسمس کی۔ ہولی دیوالی عید بقرعید کی بھی چھٹی ہو جاتی تھی۔۔۔۔'' (ص:19)

ہولی میں رنگوں کی پھوار، دسہرے میں مورتیوں کے پنڈال، دیوالی میں پٹاخوں اور دیے جلانے کی رسومات، عید بقرعید پر نماز اور صدقے، شب برات کی عبادت، محرم کے ماتم کا ذکر خواتین نے اپنی سرگزشت میں کیا ہے ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے، مٹھائیوں و پکوان بھجوانے اور ایک دوسرے کی دعوت کرنے کی روایت کو بھی بیان کرتی ہیں۔ سماج میں لوگ تیوہار ایک ساتھ مناتے، چاہے وہ مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقتباسات پیش خدمت ہے۔ سعیدہ بانو لکھتی ہیں:

''ہر فرقے و مذہب کے لوگ محرم بڑے اہتمام سے مناتے۔ پلاؤ، شیرمال، خمیری روٹی اور کباب وغیرہ کی مجلسوں میں دھوم تھی۔ عام طور سے بڑے بھائی جان سید آل رضا مجالس پڑھتے مراثی سوز خوانی کرتے۔ عورتیں امام باڑے کی دوچھتی پر بیٹھ کر مجلس سنتیں۔۔۔'' (ص:55)

حمیدہ سالم لکھتی ہیں:

''ہم کو اپنے بچپن میں محرم اور دیوالی بھی عید بقرعید کی طرح

دلچسپ تہوار لگتا تھا اور ہم اس کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ محرم اب زیادہ شیعہ طبقہ سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور دیوالی تو بہ تو بہ وہ تو ہے غیر مسلموں کا تہوار، اس سے ہمارے بچوں کا کیا واسطہ۔ ہم اپنے بچپن میں ثواب و گناہ کی اس قسم کی تعلیم سے نا واقف تھے۔'' (ص:38,37)

اسی طرح لوگ ایک دوسرے کے عقائد و روایات کا احترام کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے، علاوہ ازیں دونوں فرقوں میں شادی بیاہ بھی کر دی جاتی، یہ مشترکہ تہذیب آج بھی موجود ہے۔ اس تعلق سے حمیدہ سالم کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

''محرم کے دس دن ہم لال گلابی رنگ سے احتراز کرتے تھے۔ ہمارے گھروں میں روزانہ رات کو شہادت نامہ پڑھا جاتا۔ عشرہ کے دن ہم میں سے کسی کے گھر چولہا نہیں جلتا تھا۔ غرض کہ پہلی سے بارہ محرم تک ہم سب کے گھروں پر محرم کی فضا چھائی رہتی تھی۔ چالیسویں تک تو کسی خوشی کی تقریب کا سوال ہی نہیں تھا۔ شادی بیاہ کے رشتوں میں شیعہ سنی کی تمیز نہ تھی۔ محرم کے جلوسوں میں سنیوں کو تو چھوڑیے ہندو بھی برابر کے شریک ہوتے تھے۔'' (ص:39)

تیوہاروں کے علاوہ ہندوستان میں لگنے والے مختلف میلوں ٹھیلوں، عرس وغیرہ کو بھی خواتین نے اپنی خودنوشت میں پیش کیا ہے۔ جن میں بلا تفریق ہر دھرم و فرقے کے لوگ عقیدت کی بنا پر شامل ہوتے، سماج میں یہ اتحاد آج بھی بدستور قائم ہے۔ ادا جعفری بدایوں کے عرس اور حمیدہ سالم نے ردولی میں مختلف مواقع پر لگنے والے میلوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتی ہیں، مثلاً بارہ وفات کا میلہ، چراغ دان کا میلہ، صحبت کے باغ کا میلہ، نوچندی کا میلہ، شیخ سیاہ کا میلہ۔ وہ لکھتی ہیں کہ ان میلوں میں لوگ دور دور سے آتے اور عقیدت مندوں میں ذات پات اور مذہب کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ اسی طرح ان خودنوشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیوہاروں پر غریب طبقے کا خیال کرنا، ان میں کھانا یا دوسری اشیا کی تقسیم کرنے کا رواج بھی معاشرے کا حصہ تھا، جس پر آج بھی عمل کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ عید کی سویاں اور دیوالی کی مٹھائیاں ہوں، بقرعید میں قربانی کا گوشت ہو یا شب برات کے حلوے ہوں، غریبوں میں ضرور تقسیم کیے جاتے۔ شادی بیاہ اور تہواروں پر ادنیٰ طبقے کا خاص خیال رکھنا بھی اس عہد میں سماج کی ایک اہم بات تھی۔ اسی طرح مختلف نیازوں، میلاد، مجلسوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

سماج میں شادی بیاہ کے وہ رسم و رواج اور طور طریقے جو مشترکہ تہذیب کے زیر اثر مسلم گھرانوں میں راہ پا گئے اس کی تفصیلات بھی خواتین کی تقریباً تمام خودنوشتوں میں ملتی ہیں۔ مثلاً جہیز، مانجھے، مہندی و ابٹن، آرسی مصحف، منھ دکھائی، سلام کرائی، پیر دھلائی، چوتھی و چالے وغیرہ کی رسموں کے علاوہ ناچ گانا، ڈھول باجے، آتش بازیوں وغیرہ رواج کا خمیر اسی سرزمین سے اٹھا، یہ تمام رسومات سماج کے ہر فرقوں میں اس طرح گھل مل گئیں ہیں کہ آج ان میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ شادی بیاہ و جہیز وغیرہ کے حوالے سے مروج روایات کا ذکر کرتے ہوئے حمیدہ سالم لکھتی ہیں:

''سلام کرائی و منھ دکھائی پر دولہا دلہن کا حق سمجھا جاتا۔ جہیز و چڑھاوے کا حساب کتاب بھی میری نظر میں آج سے بہتر تھا۔ لڑکی والوں کی طرف سے زیور، برتن، بستر اور مسہری کا انتظام ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ایک جوڑا کپڑا چوتھی کا اور ایک چالے کا بن جاتا۔ لڑکے والوں کی طرف سے چڑھاوے کے کپڑے جو تعداد میں سات، نو، گیارہ جوڑے ہوتے تھے اور ناک کی نتھ اور پیر کے زیور کا انتظام ہوتا تھا۔ پیر کا زیور عام طور پر چاندی کا ہوتا۔'' (ص:28,27)

سعیدہ بانو ''ڈگر سے ہٹ کر'' میں اپنی پیر دھلائی کی رسم اور اس کے شگون کے حوالے سے لکھتی ہیں:

میرے دلہا میاں کو حکم ہوا کہ دلہن کے پیر دھلاؤ لوٹے میں دودھ تھا۔۔۔ اس رسم کا شگون یہ ہے کہ دولہا دلہن کا تابعدار رہے اور دلہن دودھو نہائے پوتو پھلے۔'' (ص:39)

منھ دکھائی کی رسم کے تعلق سے صالحہ عابد حسین کی خودنوشت ''سلسلہ روز و شب'' کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں:

میری پھوپھی زاد بہن باجی عابدہ نے میرا نئے فیشن کا سنگار کرنے کی کوشش کی۔۔۔ کیوں کہ دلہن کی نمائش بھی تو ہونی تھی۔'' (ص:126)

جہیز کی رسم سماج میں تب بھی تھی اور آج بھی ہے۔ خواتین نے اپنی خودنوشتوں میں اس تعلق سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ متوسط گھرانوں کی مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے جہیز کا سامان اس کے بچپن سے اکٹھا کرنے لگتی ہیں۔ لیکن جن کی حیثیت نہیں ہوتی ہے ان کی بیٹیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ سماج کا ایک ایسا کلنک ہے جسے ختم کرنا بے حد ضروری ہے۔ بہت سے ایسے لڑکے والے بھی موجود ہیں جو محض سماج کو دکھاوے اور رشتے داروں کی تسلی کی خاطر لڑکی والوں سے

کہتے ہیں کہ ہم سب کو یہی بتائیں گے کہ آپ نے ہمیں بڑی رقم دی ہے اس کے پیچھے لڑکے والوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سماج میں لڑکی کے باپ کی عزت بنی رہے۔اس سلسلے میں امرتا پریتم کی خودنوشت ''رسیدی ٹکٹ'' میں ایک واقعہ ملتا ہے امرتا کی شادی کی رات تھی، بارات آچکی تھی، رات کا کھانا بھی ہو چکا تھا، ان کے سسرال والوں نے امرتا کے والد کو پیغام بھیجا کہ رشتہ داروں کو بتا دیجیے گا کہ آپ نے ہمیں پیسے دیے ہیں۔امرتا کے والد یہ پیغام پیسے لینے کا اشارہ سمجھے۔ چناں چہ وہ بہت گھبرائے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر امرتا پریشان ہوتی ہیں۔تب ہی ان کی مدد کے لیے ایک رشتہ دار نے اپنے ہاتھوں کے کنگن اتار کر دے دیے۔بعد میں معلوم ہوا کہ رشتہ داروں کی تسلی کے لیے لڑکے والوں نے وہ پیغام بھیجا تھا نہ کہ ان کا ارادہ جہیز لینے کا تھا۔امرتا نے اس انسانیت کی مثال کو بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔تو وہیں ایسی خودنوشتیں بھی موجود ہیں جس میں جہیز کے نام پر بے شمار زیورات، کپڑے اور دیگر چیزوں کا تذکرہ ملتا ہے۔مثلاً شہر بانو بیگم، وزیر سلطان، سعیدہ بانو کی خودنوشتوں میں ایسی تفصیل موجود ہے۔اسلام میں بیوی کو نکاح کے بعد حق مہر دیا جاتا ہے، اس کی تفصیلات بھی مذکورہ خودنوشتوں میں موجود ہے۔

سعیدہ بانو، صالحہ عابد حسین، کشور ناہید، نفیس بانو شمع، عابدہ سلطان وغیرہ کی خودنوشتوں سے سماج میں ایک سے زائد شادی کرنے کے رواج کی طرف اشارہ ملتا ہے۔میاں بیوی کی عمر میں تفریقات بھی ایک عام بات تھی اور آج بھی یہ کوئی اہم بات نہیں سمجھی جاتی۔مثلاً ساجدہ زیدی اور صالحہ عابد حسین کی شادی ایسے شخص سے ہوئی جو ان کی عمر سے کافی بڑے تھے۔جس کا تذکرہ وہ اپنی خودنوشتوں میں بھی کرتی ہیں بلکہ اس حوالے سے اپنے نظریے بھی قائم کرتی ہیں۔بچپن میں شادی طے کرنا، اپنے ہی خاندان یا فرقے میں شادی کرنے کی روایت بھی موجود تھی۔شہر بانو کی منگنی ان کی چھٹی کے دن ہی کر دی گئی۔کشور ناہید نے اپنے خاندان سے باہر غیر سید سے شادی اپنی مرضی سے کی جس کی مخالفت بھی خوب ہوئی۔

شادی بیاہ میں دل کھول کر خرچ کر کے اپنی بڑائی دکھانا بھی عام بات تھی لیکن اگر یہی شادی نواب زادیوں کی ہو تو بات کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ایسے مواقع پر لاکھوں کے خرچ، جہیز کے نام پر بے شمار تحفے تحائف، زیورات وملبوسات، بارات وغیرہ کی شان وشوکت کی تفصیلات نوابی خودنوشتوں مثلاً شہر بانو، وزیر سلطان، عابدہ سلطان کے یہاں ملتی ہے۔جب کہ اسلام میں سادگی سے نکاح کرنے پر زور دیا گیا، اس تعلق سے بھی ان خواتین نے اپنی رائے پیش کی ہیں۔ حالانکہ مذکورہ تمام خودنوشتوں میں بارات کا ذکر موجود ہے اور اس کی دھوم دھام بھی، لیکن نوابی خودنوشتوں میں شادی بیاہ اور تہواروں کی دھوم دھام وشان وشوکت کے بیان میں صفحے کے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں۔محض بارات کی شان و شوکت شہر بانو کے درج ذیل اقتباس سے لگائی جا سکتی ہے:

> ''ایک پلٹن پیادہ اور پانچ سو سوار، ایک توپ خانہ، گھیاں، خاصے گھوڑے، ہاتھی، رتھیں، تمام دہلی اور آس پاس کے رئیس، امیر، سینکڑوں تماشائی، نفیری والے نقارچی، سو ڈیڑھ سو طائفے، بیسیوں دکان دار اس سارے بکھیڑے کو ساتھ لیے ہوئے پاٹودی سے دو میل کے فاصلے پر، جہاں پڑاؤ ہے آن کر اترے اور پڑاؤ سے قلعے تک دو رویہ ٹھاٹر بندی کرائی۔سنا ہے رات بھر اس میں چراغوں کی ایسی روشنی رہتی تھی کہ دن کے اجالے مات کرتے تھے۔ ہر چند کہ میرے ابا جان ایک چھوٹی ریاست کے مالک تھے مگر اس پر بھی لاکھ سوا لاکھ روپیہ میری شادی میں صرف کیے تھے۔''(ص:51)

واضح رہے کہ یہ بات انیسویں صدی کی نصف دہائی کی ہو رہی ہے جب لاکھ سوا لاکھ کی قیمت بہت ہی زیادہ ہوتی تھی۔علاوہ ازیں حوا کی بیٹیاں شادی بیاہ اور تیج تیوہار کے لباس اور پکوان کا تذکرہ بھی کرتی ہیں۔مثلاً شادی کے متعلق لباس میں لال جوڑا ضرور شامل رہتا جو کہ ساڑی، غرارہ، شلوار قمیض وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے سعیدہ بانو نے دلہن کے ایک خاص جوڑے کا ذکر کیا ہے جس میں کرتا، پاجامہ اور دوپٹہ کچھ اس طرح ایک میں سلا جاتا کہ قینچی کا استعمال بالکل نہیں ہوتا۔اس کا شگون انہوں نے یہ بتایا کہ دولہا دلہن ہمیشہ شیر وشکر بن کر قینچی کی کاٹ سے محفوظ رہیں گے۔ان ہی خودنوشتوں میں لکھنؤ کے بارہ گز کا فرشی پاجامہ، چولی وڈھائی گز کا دوپٹہ اور بھوپال کے چوڑی دار پاجامے وکرتے کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔زیورات میں چوڑیاں، گلے کا ہار، کان کے بندے، پائل، بازو بند، کمر بند وغیرہ اور بندیا وسندور کے نام ملتے ہیں۔شادی کے کھانوں میں ادا جعفری نے کھانے کا ذکر کیا ہے جس میں سات قسم کے لوازمات ہوتے تھے جسے بدایوں میں ''بندی'' کہا جاتا تھا۔اسے مٹی کی کوری رکابیوں اور پیالوں میں پروسا جاتا۔شادی کے کھانوں میں مختلف قسم کے شاہی پکوان کی تفصیلات نوابی خواتین مثلاً شہر بانو، وزیر سلطان اور عابدہ سلطان کی خودنوشتوں میں ملتی ہیں۔جس میں مغلئی، ہندوستانی کھانوں کا ذکر ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے الگ الگ پکوانوں کی فہرست بھی مذکورہ خودنوشتوں میں ملتی ہے مثلاً ہندوؤں کی عقیدت کا احترام کرتے ہوئے

مختلف قسم کی سبزیوں، پوری، سوجی کے حلوے، طرح طرح کی مٹھائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں شہر بانو کا اقتباس ملاحظہ ہوں:

''تین روز تک اپنے تمام لشکر اور امیروں، رئیسوں مہمانوں کی دعوت کی۔ ہندوؤں کو پوری کچوری، مٹھائی دی، مسلمانوں کو پلاؤ، زردہ، تنجن وغیرہ انواع واقسام کے کھانے کھلائے۔'' (ص:52)

لڑکے لڑکوں کی نسبت طے کرنے کا فریضہ بھی ایک خاص طبقہ کرتا تھا، لڑکیوں کو خاص کر دور رکھا جاتا ان کو یہی معلوم نہ ہوتا کہ جس کے ساتھ وہ بیاہی جارہی ہیں وہ کون ہے۔ اس خاص طبقے کو نائن کہا جاتا، ان کا کام بات پکی کرنے کے علاوہ دلہن کو ابٹن لگانا، نہلانا، لڑکیوں کے بال دھونا، جسم کی مالش کرنا، شادی کی مٹھائیوں اور تہواروں کے پکوان کو محلے محلے بانٹنا اور دعوت دینا بھی ہوتا تھا۔ بیسویں صدی میں سماج میں یہ رواج تھا کہ یہ سارے کام گھر کے افراد کو چھوڑ کر یہی طبقہ سرانجام دیتا۔ اس طبقے اور ان کی ذمہ داریوں کا ذکر ساجدہ زیدی، اداجعفری، صالحہ عابد حسین، حمیدہ سالم نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنا بھی بڑی معیوب بات سمجھی جاتی، بلکہ آج بھی ایسا ہی ہے۔ کشور ناہید نے اپنی پسند سے شادی کی جو کہ بڑی سادگی سے ہوئی۔ دراصل وہ خود رسم و روایات کے خلاف تھیں۔ شادی کے بعد نام بدلنے کی روایت کو بھی انھوں نے توڑا۔ اسی طرح دوسرے مذاہب و فرقے میں شادی بیاہ کرنے کی روایت کو بھی خواتین نے پیش کیا ہے۔ ساجدہ زیدی نے اپنے ایک رشتہ دار کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ایک ہندو سے شادی کی، وہ لکھتی ہیں آپا چھادی کی شادی خاندان کی پہلی ہندو مسلم شادی تھی، ان کے بچوں نے بھی غیر مسلم سے شادی کی۔ اس سے ان کے سیکولر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد بدلتی روایات کو بھی خواتین خودنوشت نگاروں نے پیش کیا ہے بلکہ تقسیم کے بعد بڑھتے انتشار کو دور کرنے پر بھی زور دیتی ہیں کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ یہ تعصب وانتشاری ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے مضر ہوسکتا ہے، وہ نہیں چاہتیں کہ اس کے نتیجے میں ملک کی اصل خوبصورتی ختم ہوجائے۔ ہندوستان کی مختلف اقوام کے آپسی میل ملاپ کی وجہ سے ان کی تہذیب وروایات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا فطری عمل ہے۔ گنگا جمنی تہذیب کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کی صحیح روایات وتہذیب تمدن کو اپنائیں بلکہ ایک دوسرے کے رسومات کا احترام بھی کریں۔ بقول حمیدہ سالم:

''تہذیب وتمدن کی صحت مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لیں بھی اور دیں بھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے رہن سہن، سوچ سمجھ پر ایک دوسرے کے اثرات پڑنا ناگزیر ہیں۔ غیر شعوری طور پر یہ اثرات تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔''

(ص:29)

دراصل یہ تیوہار اور شادی بیاہ کے ہی مواقع ایسے ہوتے ہیں جس میں سماج کا ہر طبقہ خوشی خوشی بغیر کسی تعصب کے گھل مل جاتا ہے، ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوکر نہ صرف انسانیت کی مثال پیش کرتا ہے بلکہ ان مواقع پر ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ اس لیے تمام خواتین خودنوشت نگاروں نے اس کی ترقی اور سماج میں اخوت ومحبت اور بھائی چارگی پر زور دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان خودنوشتوں میں شادی بیاہ اور تیوہار کے تعلق سے تذکروں کی نسبت ہمیں ایک مخصوص عہد (انیسویں صدی کی نصف دہائی سے لے کر تقسیم ہند تک) میں سماج کے رسم ورواج کی جانکاری ملتی ہے۔

Rushda Shaheen
Research Scholar
Dept of Urdu, University of Hyderabad
Gachibowli, Hyderabad, 500046
rushdashaheen25@gmail.com

اردو اسکالرس کی دنیا

International Refereed Journal for Urdu Literature

EISSN: 2320-8910, ISSN: 2320-5369

Volume VIII Special Issue February 2020

URDU SCHOLARS KI DUNIYA-IRJU

IMPACT FACTOR: 0.383

INDEXING:

Cosmos Impact Factor-Berlin Brandenburg, Kleinmachnow- Germany
Ulrich's Web- Global Series Directory, USA
Directory of Research Journals Indexing, India
Open J- Gate, India
Pub_Res_ (International Research Library)
Yumpu-Gewerbestrasse-Diepoldsau- Switzerland

MAAZ PUBLICATIONS ▪ Malegaon▪ MAHARASHTRA▪ INDIA

Special Issue

J.A.T. Arts, Science & Commerce College (For Women)

Malegaon Dist. (Nashik)

One Day Multidisciplinary National Conference on

حسرت موہانی صفات و جہات

17th February

Organized by

Department of Urdu/Persian

Organizing Committee

Dr. Ansari Md. Haroon Md. Ramzan (Principal & Convener)

Dr. Ansari Fahmeeda Md. Haroon (Organizing Secretary)

Dr. Sk. Sajeda Ab. Wase (Coordinator)

Maaz Publications

40	حسرت کی سیاسی شاعری محمد الیاس: ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ انڈیا	163-166
41	حسرت کی صحافت ثمرین شفیق احمد: شعبہ اردو، ایم ایس جی کالج، مالیگاؤں (کیمپ)، ناسک، مہاراشٹر۔ انڈیا	167-169
42	مولانا حسرت موہانی شخصیت اور کارنامے زرین ناز محمد اقبال: اسسٹنٹ پروفیسر، سٹی کالج، ناسک، مہاراشٹر۔ انڈیا	170-173
43	حسرت کی شاعری میں متصوفانہ عناصر نور محمد برکاتی: صدر شعبہ اردو، نیشنل سینئر کالج، ناسک، مہاراشٹر۔ انڈیا	174-178
44	حسرت موہانی کی غزلیہ شاعری اور ان کی غزلوں کی تقطیع رعنا کوثر شیخ حسین، ڈاکٹر اصفیاذ کریا مدنی: شری بنکٹ سوامی کالج، بیڑ، مہاراشٹر۔ انڈیا	179-183
45	آزادی ہند کا مرد مجاہد: حسرت موہانی رشدہ شاہین: ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدر آباد، حیدر آباد۔ انڈیا	184-190
46	حسرت اور ان کا عہد ندا آفرین، ریسرچ اسکالر، ڈاکٹر فہمیدہ محمد ہارون: اسسٹنٹ پروفیسر و گائیڈ، مہاراشٹر۔ انڈیا	191-197
47	حسرت کی شاعری تصور حسن و عشق ڈاکٹر فرزانہ: جے اے ٹی کالج (فور وومن)، مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر۔ انڈیا	198-203
48	مولانا حسرت موہانی کی صحافت انصاری جمیلہ بنت شمس الدین: اسسٹنٹ ٹیچر، جے اے ٹی گرلس ہائی اسکول اینڈ جونئیر کالج، مالیگاؤں، ناسک	204-213
49	حسرت موہانی کی غزل گوئی: ایک مطالعہ ثناء نہال احمد: ٹی وائے بی اے، جے اے ٹی آرٹس، سائنس و کامرس کالج، مالیگاؤں، ناسک، مہاراشٹر۔ انڈیا	214-219

آزادی ہند کا مردِ مجاہد: حسرتؔ موہانی

رشدہ شاہین
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد۔ انڈیا

مولانا حسرتؔ موہانی محض ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بے باک صحافی، ایک سچے محب وطن، مجاہدِ آزادی اور ایک سرگرم سیاسی رہنما بھی تھے۔ ان میں قلندرانہ شان پائی جاتی تھی۔ سادگی اور صاف گوئی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ایک پکے مسلمان اور روشن خیال بھی تھے۔ اپنی آزاد خیالی ہی کی بنا پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تین بار نکالے گئے۔ لیکن آزادی کا جو جذبہ ان کے دل میں روشن ہوا تھا وہ روز بروز تیز تر ہوتا گیا۔ انہوں نے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا اور اس کے حصول کے لیے ہر ممکن طریقے کو جائز سمجھا۔ وہ گاندھی کے نظریہ اہنساوادی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریزوں سے منتیں کر کے آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اسی وجہ سے کچھ سیاسی رہنماؤں سے ان کا اختلاف بھی تھا لیکن ملک کی آزادی کے لیے اتفاق اور اتحاد بھی ضروری سمجھتے تھے۔ وہ مسلم پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت کے روادار نہیں تھے اردو زبان سے ان کو پیار تھا اور اس کی ترقی و ترویج اپنے قلم سے کرتے رہے۔ سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ان کی تخلیق بھی اس سے متاثر ہے، چاہے وہ نثر ہو یا نظم۔

حسرتؔ کا زمانہ (1878-1951) برصغیر ہند کی تاریخ کا ایک تغیر پذیر دور ہے اسی دور میں برصغیر آزاد ہوا اور دنیا کے نقشے پر دو ملک معرض وجود میں آئے۔ ان کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی، اصلاحی، ثقافتی، ادبی اور مذہبی احیا پرستی کے انقلاب اور اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ اس وقت برصغیر ہند بے شمار مسائل سے دوچار ہے اگر ان کے جواز کی تلاش و جستجو کریں تو ہمیں ان مسائل کے پیچھے تقسیم ہند ہی سب سے نمایاں پہلو ملے گا۔ جس کانگریس نے ایک صوبہ بنگال کی تقسیم قبول نہیں کی اسی کانگریس نے ہندوستان کی تقسیم قبول کر لی ایسی صورتحال میں حسرتؔ موہانی نے جو کردار ادا کیا وہ نہ صرف اہم ہے بلکہ تاریخی و قابل دید بھی ہے۔ لیکن ان کو عوامی تائید حاصل نہ ہو سکی تھی۔ وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے خواہش مند تھے یہی جذبہ حریت تھا جو ان کو انقلابی بنا دیا۔ انہوں نے انقلابی شہیدوں کے نام یہ اشعار کہے تھے ؎

شہیدوں کی چیتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا
بہت جلد ٹوٹیں گی غلامی کی یہ زنجیریں
کسی دن آزاد یہ ہمارا ہندوستاں ہوگا

سیاسی رجحانات کے اعتبار سے حسرتؔ کے زمانے کا علی گڑھ وہ علی گڑھ تھا جس میں برطانوی افسروں کو اعلیٰ درجے کا مقام حاصل تھا۔ سرسید نے اپنی تعلیمی و اصلاحی تحریک کے آغاز میں بعض مصالح کی بناء پر مسلمانان ہند کو سامراج دشمن تحریکوں اور سیاست سے الگ تھلگ رہنے کا جو مشورہ دیا تھا علی گڑھ والے اپنے سرپرستوں کے زیر سایہ آنکھ بند کیے ہوئے اس پر عمل پیرا تھے۔ بقول پروفیسر شیروانی:

''اس زمانے کے علی گڑھ میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو برطانوی حکومت کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی ہمت کرتے ہوں۔''

حسرتؔ نے ابھی بی۔ اے کا امتحان بھی نہ دیا تھا کہ علی گڑھ کی رائج الوقت پالیسی کے خلاف ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس جرأت اور بے

انجام یہ ہوا کہ پرنسپل ماریسن کے حکم سے ایک یا دو نہیں بلکہ تین بار کالج سے نکالے گئے۔ بی۔اے کا امتحان پاکرتے ہی انہوں نے یونیورسٹی کے ہاسٹل
باد کہہ کر شہر محلہ رسل گنج میں سکونت اختیار کی۔ اس کے بعد انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ اس کے
ی شماروں میں ہی ایسے مضامین کا سلسلہ شروع کیا جن کا مقصد ملکی سیاست میں مسلمانوں کے رول کو واضح کرنا اور قومی تحریکوں کی حمایت کرنا تھا۔ اس
ع پر حسرتؔ نے خود بھی لکھا اور اپنے دوستوں سے بھی کئی مضامین لکھوائے۔ اردوئے معلیٰ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اور کانگریس کے موضوع
ری 1904 کے شمارے سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو کئی سال تک چلتا رہا۔ یہ بات واضح کردوں کہ حسرتؔ کے دل میں سرسید کی قدر و منزلت
تھی یا وہ ان کی سوجھ بوجھ کے قائل نہیں تھے۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ:

رسید نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکارِ انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور بغاوت کا مجرم سمجھتی تھی تو
ی خوب کیا۔ اگر انہوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام ملکی معاملات سے علیحدہ کر کے صرف اعلیٰ تعلیم کی طرف مائل کر دیا تو اور بھی خوب کیا۔''

(اردوئے معلیٰ، ستمبر 1904)

رتؔ اپنے اس مضمون میں ایک اہم سوال اٹھاتے ہیں جس سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت میں تھی؟ کیا سرکارِ انگریزی کو اب بھی اسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر
ب و عار کا موجب کون امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لیے خود کوشش نہ کریں بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ رکھیں اور اپنے جائز حقوق کے طلب
رنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید کی وجہ سے بعض رہیں۔'' (اردوئے معلیٰ، ستمبر 1904)

رتؔ موہانی نے طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے پایا کہ ملک دو الگ الگ راہوں پر گامزن ہے ایک
استہ علی گڑھ تحریک کا تھا جس کی بنیاد سرسید احمد خاں نے رکھی تھی یہ بھرپور سیاسی تحریک تو نہ تھی لیکن تعلیمی و معاشرتی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ انگریزوں کی
فاداری کی طرف مائل تھی دوسری راہ کانگریس نے نکالی تھی۔ اس زمانے میں کانگریس محض قراردادوں کے ذریعہ کچھ مراعات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کانگریس
کی نرم روی سے اس میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو رہا تھا جو اس طریقہ کار کے خلاف تھا۔ اس لیے کانگریس دو گروہوں نرم دل اور گرم دل میں منقسم ہو گئی۔ نرم دل
کے سربراہ دادا بھائی نوروجی، گوپال کرشن گوکھلے اور سریندر ناتھ بنرجی وغیرہ تھے۔ گرم دل میں بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ
تھے۔ گرم دل والے قراردادوں کو منظور کرانے کے بجائے احتجاج کرنے کا قائل تھا اور حقوق مانگ لینے کے بجائے چھین لینے پر زور دیتا تھا۔ حسرتؔ کی فطرت
میں شروع سے ہی حق گوئی، بے باکی اور حریت پسندی تھی۔ ان کا باغیانہ ذہن بھلا مصلحت پسندی کو کیوں کر پسند کرتا۔ وہ علی گڑھ کے طالب علم ہو کر بھی علی گڑھ
تحریک سے متاثر نہ ہو سکے انہوں نے اس کے برخلاف کانگریس میں شامل ہوئے اور گرم دل کے طریقۂ کار کو اپنایا۔ 1906 سے پہلے مسلمان ہندوستان کی
سیاست سے کافی دور تھے چند گنے چنے مسلمانوں کا نام ہی سیاسی سلسلے میں کبھی کبھی آجاتا تھا لیکن حسرتؔ وہ واحد مسلمان ہیں جنہوں نے کھل کر علی گڑھ تحریک
کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا اور اردوئے معلیٰ کے ذریعہ اپنے سیاسی نظریوں کو پیش کیا۔ ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''حسرتؔ موہانی کارل مارکس اور لینن کے معتقد تھے اور گاندھی جی کے لائحہ عمل سے ان کو اختلاف تھا اور یہ اختلاف سب سے زیادہ 1921 میں احمد آباد کا
گریس میں کھل کر سامنے آیا۔ وہ گاندھی جی کے چرخہ کاتنے کی تجویز کے خلاف تھے لیکن اپنے دیش میں بنا کپڑا خواہ ہینڈلوم کا بنا ہوا ہو یا پاورلوم کا سب سودیشی
تحریک میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس غرض سے انہوں نے سودیشی اسٹور پہلے علی گڑھ میں پھر کانپور میں قائم کیا تھا۔ وہ انقلاب تھے اور آزادی کی لڑائی سست
لڑائی سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے فرماتے ہیں:

گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخہ — لینن کی طرح دیں گے دنیا کو ہلا ہم''

(نفیس احمد صدیقی، حسرت موہانی کی شاعری میں احتجاج، ص: 109)

1903 میں حسرت موہانی نے اپنا رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' کا ڈیکلیریشن داخل کیا اور اس کا پہلا شمارہ 1903 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر جوش بھرنا شروع کیا اور انہیں سیاست میں حصہ لینے کی ترغیب دینے لگے۔ حالات کے پیش نظر انہوں نے بال گنگا دھر تلک کو سب سے بڑا سیاسی لیڈر تسلیم کیا اور ان کی متابعت کرتے ہوئے کانگریس میں باضابطہ شرکت قبول کی اور اکابرین جماعت کے شانہ بشانہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ حسرتؔ نے اپنا پہلا مضمون 1904 میں اردوئے معلیٰ میں ''مسلمان، کانگریس اور ایجی ٹیشن'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سرسید کی پالیسی ان کے دور کی مناسبت سے درست تھی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں پانی سر سے گزر چکا ہے اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان سیاست میں حصہ لے کر میدان عمل میں آجائیں اور حصول کے لیے بھرپور کردار ادا کریں۔ مذکورہ مضمون سے حسرتؔ کے تین رجحانات کا پتہ چلتا ہے، پہلا مسلمانوں کو سیاست سے دوری نہ رکھ کر اس میں دلچسپی لینی چاہیے، دوسری یہ کہ حصول آزادی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں، تیسرے یہ کہ ایجی ٹیشن سے برطانیہ حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات پورا کرانے میں آگے آئیں۔ حسرتؔ تلک کا نعرہ ''سوراج ہماری پیدائشی حق ہے اور ہم اسے لے کر رہیں گے'' سے بہت متاثر تھے اور اسی طرز پر انہوں نیا نقلاب کا نعرہ دیا تھا۔

اردوئے معلیٰ میں ان کا دوسرا فکر انگیز مقالہ جون 1907 میں ''مسلمانان ہند کا پالیٹکل مستقبل'' کے عنوان سے شائع ہوا اور ایک فلسفیانہ مضمون دو قسطوں میں اردوئے معلیٰ کے اگست اور دسمبر 1907 کے شماروں میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں سودیشی اشیاء کو اپنانے کی اپیل اور برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کے علاوہ دفاعی مزاحمت کا لائحہ عمل پیش کیا گیا تھا۔ جب کانگریس نرم اور گرم دل میں تقسیم ہوئی تو تلک کے ساتھ حسرتؔ بھی کانگریس سے نکل آئے۔ ان کا کانگریس سے نکل آنا ان کی انتہا پسندی کے سیاسی رجحانات کی غمازی کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی ہی کوشش اور تجویز پر خلافت کمیٹی نے 23 نومبر 1919 کے اجلاس میں ''عدم تعاون'' جو بعد میں ''نان کوآپریشن'' کے نام سے مشہور ہوا اور برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کی قرار دادیں پاس ہوئیں۔

دسمبر 1904 میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ بحیثیت مندوب شریک ہوئے اور بال گنگا دھر تلک جو انتہا پسند گروہ (گرم دل) کانگریس کے رہنما تھے ان کو اپنا رہنما تسلیم کیا۔ 1905 میں انگریزوں نے بنگال کو تقسیم کر دیا جس سے کانگریس کا انتہا پسند گروہ ہی نہیں بلکہ دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی پرزور احتجاج کیا۔ اسی دوران بدیشی اشیا کا بائیکاٹ اور سودیشی چیزوں کے استعمال پر زور دیا جانے لگا۔ حسرتؔ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1906 میں کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں شروع ہوا جس میں تلک، اربند گھوش، لالہ لاجپت رائے کے ساتھ حسرتؔ موہانی بھی شریک ہوئے تھے۔ اس انتہا پسند گروہ (گرم دل) کی کوشش سے سوراج یا حکومت خود اختیاری کو کانگریس نے اپنا مطمع نظر بنایا۔ ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ کی صدارت میں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا اور آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آئی۔

1907 میں صدارت اور حسرتؔ موہانی کی دفاعی مزاحمت کی قرارداد، سورت کانگریس میں پیش کرنے پر نرم دل اور گرم دل میں تصادم ہو گیا۔ حسرت موہانی اردوئے معلیٰ میں لکھتے ہیں:

''حاکم سے محکوم اپنی ملکی حقوق کو تین ہی صورتوں میں لے سکتے ہیں۔ اول درخواست مرحمت کے ساتھ گدایانہ دستِ طلب دراز کر کے، جس کا بے کار ہونا قطعی ثابت ہو چکا ہے۔ دوسرے خونریزی وفساد کے ذریعے حاکم کو مغلوب ومجبور کر کے، بہ ظاہر حالات کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ پس اب ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی کارروائی مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ فی الحال نہ تو ہم گداگری کی ذلت اختیار کریں، نہ جنگ وجدل کی آزمائشوں میں پڑیں بلکہ ان دونوں سے علیحدہ رہ کر دفاعی مزاحمت کے اس درمیانی طریقے پر چلنا شروع کر دیں جو مفید ہونے کے بجائے مضر ہو ہی نہیں سکتا۔''

(اردوئے معلیٰ، دسمبر 1907)

یہ اجلاس ناگپور میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں ہونے والا تھا لیکن ان کو ملک بدر کر دیا گیا تھا اس لیے یہ اجلاس سورت میں ڈاکٹر راس بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تلک اور گوکھلے کے حامیوں میں تصادم ہو گیا جس سے تلک اور ان کے ساتھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے جس میں حسرتؔ موہانی بھی

شامل تھے۔ بعد میں یہ گروہ 1916 میں دوبارہ کانگریس میں شامل ہو گیا۔

27 دسمبر 1921 کو احمد آباد میں کل ہند کانگریس کا جلسہ شروع ہوا پہلے تو سبجیکٹ کمیٹی میں پھر کھلے اجلاس میں حسرت موہانی نے ''سوراج'' کو ''مکمل آزادی'' کی شکل میں ایک قرارداد پیش کی جس کی پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے نوجوانوں نے تائید کی لیکن گاندھی جی نے اس قرارداد کی مخالفت کی۔ قرارداد کے الفاظ یہ تھے:

''نیشنل کانگریس کا مقصد جائز اور پرامن ذریعے سے ہندوستان کے لوگوں کے لیے سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا جو تمام بیرونی تسلط سے آزاد ہو۔''

لیکن گاندھی جی کی مخالفت کی بنا پر یہ قرارداد پاس نہ ہو سکی۔ کانگریس کے اجلاس کے بعد حسرتؔ نے مکمل آزادی کی تجویز خلافت کمیٹی کے جلسے میں اور مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی پیش کی تھی لیکن یہ وہاں بھی پاس نہ ہو سکی۔ حسرتؔ کو 1922 میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر انگریز حکومت نے بغاوت کے دو مقدمات دفعات 121 اور الف 124 تعزیرات ہند درج کیے۔ دفعہ الف 124 کے تحت سیشن جج احمد آباد نے عمر قید کی سزا سناتے ہوئے بمبئی ہائی کورٹ میں واسطے تائید ارسال کر دیا۔ جہاں حسرتؔ نے خود ہائی کورٹ میں بحث کر کے اس مقدمے میں کامیابی حاصل کی لیکن دفعہ الف 124 والے مقدمے میں انہیں دو برس کی سزا مزید کاٹنی پڑی۔

اس مقدمے اور مکمل آزادی کی تجویز کا چرچہ اخباروں میں خوب رہا اور حسرتؔ اس وقت نوجوانوں کے آئیڈیل بن گئے تھے۔ 1924 میں جب وہ جیل سے رہا ہو کر آئے تو بھگت سنگھ لاہور سے بھاگ کر کانپور ان سے ملنے آئے۔ اس وقت ان کی عمر محض سترہ یا اٹھارہ برس تھی۔ حسرتؔ کا رجحان اشتراکیت کی طرف ہونے لگا تھا اس لیے انہوں نے بھگت سنگھ کو بھی سوشلزم کی طرف راغب کیا۔ بعد میں بھگت سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے مل کر انڈین ری پبلکن سوشلسٹ ایسوسی ایشن بنائی۔

کانگریس نے 1927 میں مدراس میں مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا اور 1929 کے لاہور کانگریس میں اس کو اپنے مقاصد میں شامل کیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب نہرو رپورٹ پیش ہوئی تو اس میں ہندوستان کے لیے محض Dominion Status کی بات کہی گئی تھی۔ جب 1927 میں کانگریس نے مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر لی تھی تو پھر اس درجۂ ماتحتی کی کیا ضرورت تھی؟ خیر حسرتؔ پہلے شخص تھے جنہوں نے نہرو رپورٹ پر سب سے پہلے فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کو ''مجنونِ آزادی'' کہا گیا۔ 1925 میں ہندوستان میں پہلی کمیونسٹ کانفرنس کا انعقاد کانپور میں کیا گیا۔ حسرتؔ اس آل انڈیا کانفرنس کے صدر استقبالیہ کمیٹی تھے اس میں بھی جو خطبہ انہوں نے پڑھا تھا اس کا پہلا جملہ مکمل آزادی کے مطالبے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح 1931 میں جمعیۃ العلماء ہند (کانپور) کا جو جلسہ الہ آباد میں ہوا اس کی صدارت بھی حسرتؔ موہانی نے کی تھی اور اس میں بھی مکمل آزادی کی بات دہرائی تھی۔

1925 میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس کانپور میں طے ہونا پایا اور صدارت کے لیے سروجنی نائیڈو کا نام تجویز ہوا۔ حسرتؔ موہانی یروداسینٹرل جیل سے رہا ہو کر آ گئے تھے۔ ادھر کانپور سازش کیس کا فیصلہ ہوا جس میں عدالت نے کمیونسٹ یا مارکسی خیالات رکھنا جرم کا جواز قرار نہیں دیا۔ حسرتؔ، ستیہ بھگت اور نرائن پرساد اروڑہ نے ہندوستان میں پہلی کمیونسٹ کانفرنس کی تجویز رکھی۔ ستیہ بھگت کے مطابق کانپور جہاں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا اسی کے پاس پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر کمیونسٹ کانفرنس کا شامیانہ لگایا گیا اس کا سارا خرچ حسرت موہانی نے اٹھایا۔ اس میں تقریباً آٹھ سو مندوبین نے شرکت کی۔ حسرت اس کانفرنس کے چیرمین استقبالیہ کمیٹی تھے جو انہوں نے اردوئے معلیٰ اپریل، جون 1926 میں بھی شائع کیا تھا۔

12 دسمبر 1912 کو بلقان کے خلاف ترکی کی ہمدردی میں شہر لکھنؤ میں نواب رام پور حامد علی خاں کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں حسرتؔ موہانی بھی موجود تھے جنہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف زبردست احتجاجی تقریر کی تھی۔ ان کی شاعری میں بھی یہ احتجاجی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں قید و بند و ظلم و جبر کا تذکرہ ملتا ہے، یہ قید و بند ان کو وطن کی آزادی کے لیے تحریک آزادی میں شمولیت سے ہوئی کیوں کہ ان کو جمہوریت پر اعتماد تھا۔ اس تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے انہوں نے انتہا پسند رہنما بال گنگا دھر تلک کو اپنا گرو مانا لیکن اعتدال پسند رہنماؤں کی مصلحت پسندی اور عیاری کے رویہ کو

سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ حسرتؔ فرقہ پرستی کے سخت مخالف تھے اور وطن کی آزادی کے لیے ہندو مسلم کے اتحاد کو لازمی قرار دیتے تھے۔ انہوں نے سرمایہ داری نظام اور امپیریلزم کی بخیہ ادھیڑی ہے اور کمیونزم کی موافقت کرتے ہوئے سرمایہ داری نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

حسرتؔ موہانی نے کانگریس کی رکنیت 1904 میں قبول کی اور جنگ آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ کانگریس میں وہ گرم دل کے حامی تھے ان کا ماننا تھا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنی ہے تو پھر کھل کر میدان جنگ میں اتر کر ان کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ وہ سیاسی رہنماؤں میں تلک کے بعد دوسرے ہندوستانی سیاسی قیدی اور مسلمانوں میں اولین قیدی تھے۔ تلک کو 1857 میں اپنے رسالے کیسری میں چند انقلابی نظمیں لکھنے کے جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ 23 جون 1908 کو اردوئے معلیٰ پر ڈی۔ آئی۔ آر کے تحت بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا اور 14 اگست 1908 کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ علی گڑھ نے حسرتؔ کو دو سال کی قید با مشقت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کا حکم سنایا۔ اس سزا کو الہ آباد ہائی کورٹ نے محض ڈیڑھ سال کی قید میں تبدیل کر دیا۔ اس قید کی میعاد پوری کرنے کے لیے ان کو پہلے علی گڑھ پھر نینی جیل میں رکھا گیا۔ اس زمانے میں جیل جانا کوئی عزت کی بات نہیں تھی اور قید بھگتنا ایک معمولی بات تھی پھر بھی حسرتؔ مایوس نہ ہوئے ؎

ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے　　مایوس کر سکا نہ ہجوم بلا مجھے

جیل میں رہتے ہوئے ان کو روز ایک من آٹا پیسنا پڑتا تھا ان کا یہ شعر اسی دور کی ترجمانی کرتا ہے ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

یہ وہ زمانہ تھا جب گریجویٹ قیدیوں کو بھی عام قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا حسرتؔ کی اس سزا سے ان کے والد کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور انہوں نے اسی زمانے میں انتقال کیا۔

حسرتؔ موہانی جب کانگریس میں شامل ہوئے تھے تو اس وقت بمبئی اور مدراس کے کچھ مسلمان ہی پارٹی میں شامل تھے لیکن علی گڑھ کا حلقہ جو شمالی ہند میں مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت ہونے سے منع کر رہا تھا۔ 1907 میں تلک کے ساتھ حسرتؔ بھی سورت کانگریس میں اختلاف کی وجہ سے کانگریس سے الگ ہو گئے تھے انہوں نے گرم دل کو جوائن کر لیا۔ ظاہر ہے ان کا یہ باغیانہ رجحان اور حریت پسندی کسی طرح علی گڑھ والے کے لیے قابل قبول نہیں تھا اس لیے ان کو کالج سے نکالا گیا لیکن ان کے جوش میں کوئی کمی نہیں آئی اور اپنی عملی سرگرمیوں کے ساتھ اردوئے معلیٰ کے ذریعہ سیاسی خیالات کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان کی دوسری قید و نظر بندی 1916 سے 1918 تک تھی برطانوی حکومت ان کو ایک خطرناک قیدی سمجھتی تھی اس لیے ان کو ایک جیل میں نہیں رکھا گیا تھا بلکہ چند ماہ علی گڑھ، للت پور، جھانسی، الہ آباد، فیض آباد اور نظر بندی کے لیے میرٹھ میں رکھا جاتا تھا۔ برطانوی حکومت کا ماننا تھا کہ اگر ان کو ایک جیل میں ہی رکھا جائے گا تو وہ ضرور کوئی ایسی سازش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس سے ان کی حکومت کا تختہ پلٹ سکتا تھا۔ ان کی اس گرفتاری کی وجہ یہ پیش کی گئی کہ حکومت صوبہ متحدہ کا کہنا ہے کہ حسرتؔ غیر ممالک سے ساز باز رکھتے ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں جو اختلافات ہو گئے تھے ان کے سلسلے میں وہ کابل جانے والے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آغا خاں اور ان کے ہم نواؤں نے حسرت کو ہی نہیں بلکہ مولانا آزاد، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو بھی نہ بخشا تھا اور ان کو جیل بھجوانے کی ہر طرح کی الزام تراشیاں کی گئیں تھیں۔

حسرتؔ موہانی 1922 میں تیسری بار گرفتار ہوئے۔ احمد آباد سیشن جج کی عدالت نے ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ احمد آباد کے سالانہ کانگریس اجلاس میں انہوں نے سبجیکٹ کمیٹی میں سوراج کو مکمل آزادی کے معنوں میں استعمال کرنے کا ریزولیوشن پیش کیا لیکن وہ وہاں پاس نہ ہو سکا اس کی مخالفت گاندھی جی نے بھی کی تھی۔ اس پر حسرتؔ نے جو تقریر کی تھی اس کو حکومت نے باغیانہ قرار دے کر بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ حسرتؔ کو بمبئی ہائی کورٹ میں اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے کوئی وکیل نہ ملا تو انہوں نے خود بحث کی اور یہ سزا عمر قید سے محض دو سال کی رہ گئی۔

حسرتؔ موہانی کو ''مجنون آزادی'' کے لقب سے نوازا گیا ان کو آزادی کا ''دیوانہ ملا'' بھی کہا گیا۔ انہوں نے آزادی کی جنگ میں اس وقت قدم رکھا جب

برطانوی حکومت تقریباً آدھے گلوب میں پھیلی ہوئی تھی اور ان کی حکومت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ کانگریس کے باقاعدہ ممبر بننے کے بعد ملک کو آزاد کرانے میں ایسے مگن ہوئے کہ پھر ان کا نصب العین آزادیٔ کامل بن گیا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا جنون کم تو ہوا تھا لیکن وہ چنگاری بجھی نہیں تھی بلکہ ہندوستانیوں کے سینے میں جلتی رہی۔ اس چنگاری کو بال گنگا دھر تلک نے اپنے اندر ضرور دبا رکھا تھا جو کبھی ''ہوم رول'' اور کبھی ''آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے جسے ہم لے کر رہیں گے'' کے نعروں میں دہرایا جاتا رہا تھا لیکن یہ چنگاری 1921 میں شعلہ بن گئی جب حسرت موہانی نے سوراج جیسے مبہم لفظ کو ''مکمل آزادی جو بیرونی تسلط سے پاک ہو'' سبجیکٹ کمیٹی میں قرارداد کی شکل میں رکھا۔ اس وقت وہ یو۔پی کانگریس کمیٹی کے صدر اور نوجوانوں کے آئیڈیل تھے۔

حسرت وطن پرستی کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے تھے اور وطن پر مرمٹنا ان کے لیے اعزاز کی بات تھی ؎

تم پر مر مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

وہ گرم دل کے سیاست داں تھے اور نرم دل جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے ان کی پالیسیوں سے ان کو سخت اختلاف تھا اور اس کی تنبیہہ بھی کرتے تھے۔ تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں خصوصاً مسلمانوں میں وہ سب سے آگے تھے انہوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور عمل کے ذریعہ اہل ہند کو شامل ہونے کی دعوت دی۔

مولانا حسرت موہانی دراصل اس مسلک اور قبیل کے مرد مجاہد تھے جو نہ تو کانگریس کی پالیسیوں سے اعتراف کرتے تھے اور نہ ہی لیگ کی۔ ان کی دونوں سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے نظریاتی نباہ نہ ہو سکا۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''حسرت کا مسلک کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے الگ تھا۔ وہ خود ہندوستان کے سیاسی جماعت کے گرم سے گرم فرقے سے بھی زیادہ گرم تھے۔ وہ صحیح معنوں میں باغی تھے اور اس وقت تک بغاوت کرتے رہنا ان کا ایمان تھا جب تک ملک میں ایسا فطری نظام قائم نہ ہو جائے جو انسانی ناموس کی حفاظت کے لیے لازمی ہو اور جس سے بندگان خدا کی فلاح ہو سکے۔ وہ فرنگی حکومت کو ایک غیر طبعی نظام سمجھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ ایسا نظام زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکتا۔ ادھر فرنگی حکومت حسرت کو اپنے لیے بڑا خطرہ تصور کرتی تھی۔''

(مشمولہ رسالہ آج کل، حسرت نمبر، 1986، ص: 22)

حسرت نے جس وقت حریت کا نعرہ بلند کیا تھا اس وقت انگریزوں کی گرفت ہندوستان پر مضبوط تھی ان کی حکومت کو چیلنج کرنا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے حال میں حریت کا نعرہ بلند کرنا کوئی مذاق نہیں تھا بلکہ خود کو جلتی آگ میں جھونکنے کے مصداق تھا لیکن حسرت نے اپنے عزم اور حوصلے کی بنیاد پر آزادی کا علم بلند کیا جب سوائے تلک کے کوئی سیاسی رہنما ہندوستان کی سیاست میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اس زمانہ کے ماحول کی وجہ سے لوگ ان کو ''دیوانہ ملا، سودیشی قلی'' کہتے تھے۔ علی برادران ''دیوانہ ملا'' کہتے، مولانا آزاد اور سید حیدر رضا علی دہلوی ''سودیشی قلی'' اور عام لوگ ملک کا غدار کہتے تھے۔ اگر حسرت سفر کرتے تو ان کا ٹکٹ نمبر لکھ لیا جاتا تھا اور سی۔آئی۔ڈی کو مطلع کر دیا جاتا وہ انگریز حکومت کے خطرناک دشمن تصور کیے جاتے تھے۔

حسرت خلافت تحریک میں بھی حصہ لیا اور اس کے مسئلے پر ہڑتال اور سیاسی جلسوں کے حق میں تھے۔ ان کی ہی تحریک پر عدم تعاون یا ترک موالات یا عدم اشتراک کی قرارداد خلافت کانفرنس میں پاس ہوئی تھی۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی کا جلسہ 24,23 نومبر 1919 کو ہوا جس میں مندوبین کی تعداد تین سو کے قریب تھی اس میں نصف سے زائد یو پی سے تھے 23 نومبر کے اجلاس کی صدارت حسرت موہانی نے کی تھی۔

جب سائمن کمیشن ہندوستان پہنچا تو ہر جگہ اس کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ سائمن جہاں جہاں ہندوستان میں دورے پر گیا وہاں وہاں مہاتما گاندھی کی قیادت میں رضا کار ''سائمن واپس جاؤ'' کا نعرہ لگاتے۔ جب کمیشن کانپور پہنچا تو گاندھی جی بھی وہاں پہنچے۔ حسرت اپنے ساتھیوں کے ساتھ ''گاندھی واپس

جاؤ'' کا نعرہ لگایا۔ اس سے ان کی باغیانہ فطرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ گاندھی جی کے قراردادوں سے حصول آزادی کے خلاف تھے۔ وہ باغی آدمی تھے اور بغاوت کرنا جانتے تھے۔ سائمن کے بائیکاٹ پر کانگریس نے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل کی جو ہندوستان کا آئین تیار کرے۔ اس رپورٹ کو تیار کرنے کے بعد پیش کر دیا گیا جس پر حسرت موہانی نے اس کی توضیحات ڈومینین اسٹیٹس اور اقلیت کے حقوق کی پامالی کی نسبت سب سے پہلے فاتحہ پڑھا اور اس کی سخت تنقید کی۔ انہوں نے تقاریر کے علاوہ اپنے روزنامہ مستقل میں نہرو رپورٹ پر تین مضامین شائع کیے۔ انہوں نے نہرو رپورٹ میں اتحادی ترتیب کی بھی مخالفت کی کیوں کہ ہندوستان کو وفاقی جمہوری ملک بنانا چاہتے تھے۔ وہ آزادی ہند کے لیے 1907 سے 1947 تک مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی سے نظریاتی اختلاف کیا اور محمد علی جناح سے بھی، جہاں ان کو مناسب لگا کھل کر تکرار لی۔ لیکن یہ اختلاف ان کے ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی اور سیاسی تھے۔ قومی دھارے کی تشکیل میں جو رول انہوں نے ادا کیا اس کا اعتراف بظاہر تو نہیں کیا گیا لیکن حقیقتاً قوم کو ان کے ہی راستے پر گامزن دیکھا گیا۔

ہندوستان کی سیاست میں فرقہ وارانہ جذبات کو اس طرح تحلیل کر دیا گیا تھا کہ سیاستدانوں کے نقطہ نگاہ ہی بدل گئے تھے۔ ایسے حالات میں حسرت موہانی جو سیکولرزم، سوشلزم اور قومی یکجہتی کے مبلغ تھے ان کی آواز کون سنتا۔ گاندھی جی کی سربراہی میں ہندوستان آزاد ہوا لیکن یہ ملک ایسے ہاتھ کی سربراہی میں گیا جہاں کچھ دنوں کے بعد تمام اقدار پامال ہونے لگیں۔ اس لیے حسرت نے سیاست کی طرح پارلیمنٹ میں بھی اپوزیشن لیڈر کا کردار ادا کیا۔ حسرت موہانی کی مکمل آزادی کی قرارداد کو عملی جامہ 15 اگست 1947 کو پہنایا گیا۔ انگریزوں نے اقتدار کو دو گروہوں میں منتقل کر کے ملک کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حسرت اس طرح کی آزادی سے ناخوش تھے۔ وہ چاہتے اگر تو ملک کی بڑی سے بڑی مسندِ اقتدار پر قابض ہو سکتے تھے لیکن وہ ملک کے بے لوث سپاہی تھے اور اپنے ضمیر کے خلاف کسی بھی قدر سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں اپنی بات ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی کے نظریے سے ختم کرتی ہوں وہ لکھتے ہیں:

''تحریک آزادی میں دو رہنما جتنے سادہ لوح، سادہ مزاج اور سادگی پسند معلوم ہوتے ہیں ان کی شخصیات اتنی ہی پہلودار اور پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں بزرگ رہنما ہیں مہاتما گاندھی اور مولانا حسرت موہانی۔ مہاتما گاندھی نے آشرم قائم کیا اور ملک وقوم کی خدمت میں لگ گئے۔ حسرت موہانی ہندوستان کی گلیوں اور کوچوں میں چل کر عوام سے گھل مل کر ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے۔ ان دونوں بزرگوں نے ملک وقوم کو دیا، کبھی کچھ لیا نہیں۔ مہاتما گاندھی آزادی کے بعد ہندوستان کے بابائے قوم کہلائے، حسرت ملک وقوم کے ایک مجاہد اور مجنون آزادی۔''

(ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی، حسرت موہانی اور انقلاب آزادی، ص:545)

☆☆☆